
دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب
اکتوبر 2020
عمران ڈائجسٹ
PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM



اکتوبر 2020ء قیمت -/60 روپے جلد 49 شمارہ 06



آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37-اردو بازار، کراچی

ریشمی پھندا

ایم الیاس

محبت ایک ایسا لفظ ہے جس کی خواہش اور چاہت دنیا میں بسنے والے ہر جان دار، چرند پرند کو ہوتی ہے۔ ہر انسان کی یہ ہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ محبوب کی آنکھوں کا تارا ہو۔ وہ چاہا جاسکے۔ عموماً لوگ کہتے ہیں کہ محبت میں کسی ایک کا ہی ہو کر رہنا پڑتا ہے۔ مگر یہ حقیقت نہیں ہے۔ کیونکہ ایک عورت دوسری عورت کو برداشت نہیں کرتی۔ اس لیے جب اس کا محبوب شوہر بے وفائی کرتا ہے تو پھر وہ ناگن بن جاتی ہے اور اپنے شوہر سے انتقام لیتی ہے۔ کیونکہ کچھ لوگ محبت کے نام پر غلیظ کھیل کھیلتے ہیں۔ ادھر وہ بیوی کو دھوکا دے رہے ہوتے ہیں اور دوسری طرف معصوم لڑکیوں کو ورغلا رہے ہوتے ہیں۔

ایم الیاس نے جب بھی قلم اٹھایا، معاشرے میں پھیلی کسی نہ کسی برائی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی تحریروں کی کاٹ بظاہر قاری کو محسوس نہیں ہوتی لیکن جب وہ ان کے الفاظ کو سمجھتا ہے تو چونک جاتا ہے۔

بیوی کو دھوکا دینے والے حضرات کے لیے ایک نصیحت۔





دوسری اور آخری قسط

تھانے دار اسے لاتیں مارتا اور ایک سے ایک پولیس کی زبان میں گالیاں دیتا ہوا جانو کو لے گیا۔ چند قدم چل کر رکا اور بولا۔

''ناجائز اسلحہ رکھتا ہے .....تو جب تک وہ ریوالور نہیں نکالے گا تجھے چھوڑوں گا نہیں......جیل میں ڈال دوں گا۔''

جب تھانے دار اور اس کے ساتھ آئے ہوئے سپاہی گلی اور محلے کے لوگ چلے گئے تو کانتا نے اپنے گھر میں آ کر دروازہ بند کرلیا اور پھر چار پائی پر گر کر ہنسنے لگی۔ بہت مدت کے بعد اس کے ہونٹوں پر ایسی ہنسی آئی تھی جس میں تازگی تھی۔ شوخی بھری تھی۔ دل کشی تھی۔ منوہر اس کے بھرے بھرے شیریں گداز ہونٹوں پر تبسم کی یہ کلیاں دیکھ کر چرالیتا تھا۔ کہتا تھا کہ تیری ہنسی بھی ایک حسن ہے۔ اس میں کتنا امرت ہے۔

بستر سے نکل کے کانتا نے اپنے کپڑے اور زیر جامے اتار کے بستر پر ڈال دیے۔ پھر اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو ناقدانہ انداز سے اور ہر زاویے سے دیکھا۔ پھر اس نے دل میں تھانے دار اور جانو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ......اگر میں تدبیر کر کے ریوالور کو چھپا نہ دیتی تو تم دونوں بھیڑیے میرے اس نازک مرمریں اور گداز بدن کو ملکیت بنا لیتے۔ وہ پھر ہنسی...... جانو اب ساری رات تھانے دار اور سپاہیوں کی لاتیں اور جوتے کھائے گا۔ پولیس کو ملازموں پر تشدد کرنے اور ایذا دینے پر خوب لطف اور مزا آتا ہے۔ اس کی کھال ادھیڑ دی جائے گی۔ لیکن اب بتائے گا خاک ...... پولیس اور اس کے فرشتے بھی ریوالور کا کھوج نہیں لگا سکتے۔ اس نے سنا ہوا تھا کہ پولیس والے ملزم کا سواگت اپنے روایتی انداز سے اس طرح کرتے ہیں کہ ملزم چاہے اس نے کوئی جرم ہی کیوں نہ کیا ہو وہ اس کا اقرار کرلیتا ہے۔ کانتا کو اپنے کلیجے میں ایک عجیب سی فرحت بخش شانتی کا احساس ہوا۔

تین دن بعد اس کی پڑوسن میں جس نے اسے جانو کی چیرہ دستیوں اور آبرو تباہ ہونے سے بچایا تھا اس نے بتایا کہ پولیس نے جانو کو ثبوت نہ ہونے اور اس کی بہن کے ہر طرح سے خوش کرنے کی بنا پر جانو کو رہا تو کردیا ہے لیکن اب وہ اس قابل نہیں رہا ہے کہ سیدھا چل سکے اور آٹھ دس دن تک سیدھا سو بھی نہیں سکتا ہے۔ کانتا جب سونے کے لیے بستر پر دراز ہوتی تھی تو اسے کل والی ہنسی سروجنی بھابھی کی بات سن کر ہونٹوں پر نمودار ہوگی۔ بڑی دیر تک وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتی رہی تھی۔

کانتا نے محسوس کیا کہ جیسے امرلال اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ میں نے کہا تھا تاکہ حفاظت کا طریقہ آنا چاہیے۔

پھر اس پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ پھر وہ ہنستے ہنستے یک لخت خاموش ہوگئی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی اور بھی اس کے ساتھ ہنس رہا ہو۔ کوئی مرد جس کی ہنسی کی آواز بالکل امرلال جیسی ہے۔ وہ کان لگائے بیٹھی رہے۔ مگر باہر رات سرد سناٹا تھا۔ جس میں گیدڑ چیخ رہے تھے۔ رات کا گھپ اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیے وہ اس سرد موسم میں بے لباسی کی حالت میں دراز نہ تھی اور نہ ہی امرلال کی آغوش میں تھی جو کوئی ہنسے بستر سے نکل کے اچھی طرح سے جسم کے گرد کمبل لپیٹ کے باہر نکلی اور زمین کھود کر ریوالور نکال لائی۔

☆☆☆

وہ بھی ایک ایسی ہی سیاہ سرد اور سنسان رات تھی جس کا آسیب زدہ سناٹا موت کے احساس کی طرح ہر سمت مسلط ہوگیا تھا۔ گلی میں کوئی کتا اپنی منحوس آوازیں آسمان کی طرف منہ اٹھائے رو رہا تھا۔ کانتا نے سرِ شام ہی کھانا کھالیا تھا۔ دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے بستر پر دراز ہوگئی تھی۔ جنگل میں گیدڑ اس طرح چیخ رہے تھے جیسے انہوں نے کوئی خوں خوار درندہ دیکھ لیا ہو۔ لال ٹین کی زرد روشنی کو اس نے ایک گوشے تک محدود کرلیا تھا۔ اس روشنی میں اس نے

تھوڑی دیر تک فطری حالت میں دیکھتی رہی۔ پھر وہ خود لذتی میں ڈوبی رہی۔ پھر جاڑا لگنے لگا تو بھی اس نے خود کو اس حالت اور کیفیت میں رہنے دیا تھا۔ اس لیے کہ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ امرلال کی آغوش میں ہے اور اس کے ہاتھ سارے بدن پر بہک رہے ہوں۔ پھر اس نے اس خیال سے زیر جامے اور لباس پہن لیا کہ کہیں سروجنی بھابھی کوئی چیز لینے یا مانگنے نہ آ جائے۔ اب اندھیرے میں خود کو مختلف صورتیں اختیار کرتی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ اس کے چشم تصور میں ایک مرد تھا جو اس کا محافظ تھا اور اس دنیا میں اب صرف وہی ایک تھا جس کے بارے میں سوچتی اور اس کا سپنا دیکھتی تھی۔ یہ چہرہ ہر رات اس کے چہرے پر جھک کر اور اس کی آنکھوں میں ڈوب کر اور سرگوشی میں کہتا تھا کہ آدمی کو اپنی حفاظت کا ہر طریقہ آنا چاہیے۔ خصوصاً ایک ایسی عورت کو جو گھر میں دن رات اکیلی رہتی ہے۔ وہ تکیئے کے نیچے ریوالور کی موجودگی محسوس کر کے مطمئن ہو جاتی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ ایسا ازل سے ہوتا آ رہا ہے وقت کے ساتھ وہاں چہرے بھی بدل گئے تھے۔ منوہر تو اب اس کے تصور ہی نہیں سپنے کی دنیا سے بھی نکل گیا تھا۔ اس کی جگہ امرلال نے لے لی تھی اور اب صرف اور صرف اس کی یاد باقی رہ گئی تھی۔ وہ یوں ہر رات چشم تصور میں ایسا محسوس کرتی تھی کہ وہ امرلال کی آغوش میں ہے اور اپنا سب کچھ اسے سونپ رہی ہے۔ یہ شیریں لذتیت اسے گدگداتی رہتی تھی جو دل کے ہر کونے میں بھی ہوتی تھی کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ امرلال کی ہم آغوشی سپنا یا وہم نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ وہ اس کے بوسے صرف چہرے پر ہی نہیں گردن اور جسم کے نشیب و فراز پر تپش دیتے ہوئے محسوس کرتی تھی۔ کیوں کہ اس کی نشانی یہ ریوالور تھا جو اس کی آبرو اور لاج کا محافظ تھا۔ اس ریوالور سے ایک ڈھارس بندھی رہتی تھی اور پھر وہ کلہاڑی بھی سرہانے دیوار سے کھڑی کر کے سونے کے لیے لیٹ جاتی تھی۔ پھر چشم تصور میں امرلال سے باتیں کرتے کرتے سو جاتی تھی۔

اچانک اس نے محسوس کیا کہ آنگن میں کوئی کودا ہے کون درندہ صفت ہے جو اسے اکیلی پا کر فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ کیا اسے موت نے دعوت دی ہے؟ کیا وہ یہ بھول گیا ہے کہ ایک عورت اپنی آبرو بچانے کے لیے زخمی یا قتل کر دے تو یہ جرم نہ ہوگا۔ وہ ایسی رات تھی جب امرلال کود کر اندر آیا تھا اور اس کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار کا ایک خوش گوار جھونکا بن کر آیا تھا۔

اب امرلال کیوں آئے گا۔ جب وہ اس سے مل کے گیا تھا تو اس نے اس خیال سے بڑی خود پردگی اور گرم جوشی سے اسے من مانیاں کرنے دیا تھا کہ امرلال اسے کسی دن آ کر اپنا لے گا۔ وہ بے نیام تلوار ہو گئی تھی۔ اگر امرلال حد سے تجاوز کر جاتا تو وہ انکار نہ کرتی اس لیے کہ دل میں اس نے امرلال کو پتی سوئیکار کر لیا تھا۔ امرلال نے حد سے تجاوز نہیں کیا تھا اور اسے لال ٹین کی روشنی میں دیکھتا رہا تھا۔ ان دونوں نے خود کو ان جانے راستے پر دور تک جانے سے روکا تھا جو آسان نہ تھا۔ جب امرلال گیا تو وہ نڈھال اور بے سدھ بستر پر پڑی رہی۔ اس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ اس میں اتنی ہمت اور سکت نہ تھی کہ اٹھ کر لباس پہن لیتی ابھی کئی دنوں تک امرلال کی راہ دیکھنے کے بعد اس سے مایوس ہو گئی تھی۔ اس کا خیال دل سے نکالنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ لیکن اسے امرلال کی یاد آ ہی جاتی تھی۔ جب وہ سونے کے لیے بستر پر دراز ہو جاتی۔ وہ امرلال کے بوسے، قرب اور جذباتی کیفیت محسوس کرتی تھی۔ مگر اب وہ کیوں آئے گا؟ کس لیے آئے گا وہ اسے بری طرح چوم اور گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ کر جو گیا ہے؟ بالفرض وہ آئے گا بھی تو اس طرح نہیں آئے گا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ دوسرے لمحے جیسے ہی وہ آواز کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ اس نے بجلی کی سی سرعت سے زیر جامے اور لباس کو پہنا۔ کیا جانو آیا ہوگا؟ اس کا سینہ بڑے زور سے دھڑک اٹھا۔ دل

کی دھڑکنیں بگڑنے لگیں۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ کیا اس روز کی ذلت اور ارمانوں کی ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کے لیے تھانے دار نے اس سے کہا ہوگا کہ تو جا کر شب خون مار اور میں آ کر تم دونوں کو رنگے ہاتھوں دھولوں گا اور رات اس کے ہاں اس کے ساتھ گزاروں گا۔ پھر اس کا ہاتھ تیزی سے تکیے کے نیچے رینگ گیا۔ اس نے ریوالور کو مضبوطی سے تھام کر اس پر اپنی گرفت سخت کر کے فیصلہ کیا۔ جانو ہو یا تھانے دار، وہ بلا تامل شوٹ کر دے گی۔ خون میں نہلا دے گی۔ ریوالور میں ایک نہیں پانچ گولیاں بھری ہیں۔

''کون ہے......؟'' کانتا نے بڑے تیز لہجے میں کہا اور اس کی کرخت آواز کمرے میں گونج گئی۔ ''بولو کون ہو تم؟ بولتے کیوں نہیں؟''

''کانتا......!'' کسی مرد کی دبی ہوئی آواز جواب میں سرسرائی۔ ''ڈرنے کی بات نہیں......تم جلدی سے دروازہ کھول دو۔''

کانتا کو یہ آواز قدرے مانوس سی لگی۔ چوں کہ وہ سرگوشی میں بہت آہستگی سے بول رہا تھا۔ یہ جانو کی آواز میں نہیں تھی۔ وہ چوروں کی طرح آنے سے رہا تھا۔ کیوں کہ تھانے میں اس کا حشر نشر کر کے ایک طرح سے اسے معذور سا کر دیا گیا تھا۔ اس لیے اس کی آواز میں بولتا تو اس کی شناخت ہو جاتی۔ اس کے دل کے کسی کونے میں شک کسی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ جانو ایک نمبری بدمعاش تھا۔ وہ اپنا لہجہ بدل کے اسے فریب دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ شاید اس روز کا بدلہ اس کی عزت سے کھیل کر لینا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس نے یہاں آ کر اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ اس نے ریوالور کی طرف دیکھا جس میں پانچ گولیاں تھیں'' کانتا !'' اس آواز والے شخص نے جواب نہ پا کر اس نے پھر سرگوشی کے انداز میں مخاطب کیا۔ یہ انداز پراسرار سا تھا جیسے وہ اس کے رات گزارنے کی نیت سے آیا ہو اور احتیاط برت رہا ہو۔ ''سنو میری جان! میں تمہارا پتی ہوں۔ حیرت کی بات ہے کہ تم میری آواز کو نہیں پہچان پا رہی ہو؟ یقین نہیں آ رہا ہے تو دروازہ کھول کے دیکھو میں تمہارا پتی منوہر ہوں۔''

نہیں نہیں کانتا نے اپنے آپ سے کہا منوہر مر گیا ہے۔ منوہر اب میری ویران اور سنسان زندگی میں بھولے سے بھی لوٹ کے نہیں آ سکتا۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ مرنے والے آ گئے ہوں؟ ایک ایسا شخص جس نے اپنا دھرم اور وطن چھوڑ دیا اور ایک حسین اور جوان عورت کو اپنا لیا ہو۔ اس کی خاطر منوہر نے خود کو بدل لیا۔ وہ بھلا کیوں اور کس لیے آ سکتا ہے؟ اب یہاں اس کے لیے کیا رکھا ہے؟ یہ کوئی یقیناً جانو کا ساتھی ہے جو منوہر کی آواز نکال کے دھوکا دے رہا ہے۔ دروازہ کھلوانا چاہتا ہے۔

''اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو دروازے سے دس قدم پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ گولی مار دوں گی۔'' کانتا نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''اسے تم صرف دھمکی سمجھنا۔''

چند لمحوں کے بعد کانتا نے دروازے کی جھری میں سے دیکھا۔ کوئی شخص دس قدم دور اندھیرے کی آغوش میں تھا۔ کانتا نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ اگر جانو یا اس کا کوئی ساتھی ہوا تو وہ اسے بلا تامل گولی مار دے گی۔ اپنی عزت پر آنچ دینا ایسا ہی تھا جیسے ساری زندگی کے لیے خود کو داغ دار کر دیتا۔ کانتا نے اندھیرے میں گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

''کون ہو تم؟ یہ کوئی وقت ہے کسی اکیلی عورت کے گھر پر دستک دینے کا؟ اس وقت کیا لینے آئے ہو؟'' اندھیرے کی پناہ میں کھڑا ہوا شخص آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ کانتا چلانے کی بجائے اب بے اختیار پیچھے ہٹ گئی۔ وہ جانو یا اس کا کوئی ساتھی یا اجنبی نہ تھا۔ وہ منوہر ہی تھا جو اندر آ کر دروازے سے کمر لگا کر کھڑا ہوگیا۔ کانتا اسی طرح ریوالور تھامے بے حس و حرکت اور جامد کھڑی رہی۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے صاف پہچان لیا تھا۔

ہے کی اب کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس کا دل سینے میں بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

''یہاں اب کیا لینے آئے ہو......؟'' کانتا نے سرد لہجے میں کہا۔ کمرے کا سکوت ٹوٹ گیا۔ ''اب یہ تمہارا گھر نہیں رہا ہے؟''

''کیوں......؟'' مسکرا دیا۔ ''جان من! کیا تم میری پتنی نہیں ہو؟ کیا میں تمہارا پتی نہیں ہوں؟ کیا پتی کا گھر کیا پتی کا گھر نہیں ہوتا ہے؟''

''ہوتا ہے...... کیوں نہیں ہوتا ہے؟'' کانتا نے سابقہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن اب تم میرے پتی نہیں رہے۔ تم جس کے پتی ہو وہ اب سرحد کے پار ہے۔''

''وہ میری غلطی تھی، بھول تھی کانتا!'' منوہر نے ندامت سے کہا۔ ''میں دانستگی میں غلطی کر بیٹھا۔ کون ایسا انسان ہوگا جو غلطی نہ کرے۔ غلطیاں آدمیوں سے ہی ہوتی ہیں۔''

''غلطی......؟'' کانتا نے استہزائیہ لہجے میں کہا اور پھر سر ہلا دیا۔ ''غلطی آدمی کرتے ہیں مجھے اس بات سے انکار نہیں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ آدمی غلطی سے ہی سبق حاصل کرتا ہے۔ لیکن کب؟ سزا پانے کے بعد لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ تمہاری اس غلطی کی سزا صرف مجھے ملی ہے اور میں اسے بھگت رہی ہوں۔ معلوم نہیں کب تک مجھے بھگتنا پڑے گا۔''

''مجھے یہ سن کر بڑا دکھ اور افسوس ہو رہا ہے، میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ میں واقعی تمہارا مجرم ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا وہ اچھا نہیں کیا منوہر نے دکھ سے کہا۔''

''اگر ایسی بات تھی تمہیں یہاں آنا نہیں چاہیے تھا'' کانتا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تم یہ سمجھ لیتے کہ میری پتنی مر چکی ہے۔ اب میں وہاں کیوں اور کس لیے جاؤں؟ کیوں کہ میرے چہرے پر کالک کے سوا کچھ نہیں ہے اب یہ چہرہ پتنی کو دکھانے کے قابل ہی نہیں اور نہ ہی دنیا کو...... لیکن تم بے غیرت، بے شرم اور ڈھیٹ بن کر آ ہی گئے۔''

''مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع تو دو کانتا......!'' منوہر نے بے بسی سے کہا۔ ''اتنی کٹھور تو نہ بنو اور نہ ہی اتنی بے رخی سے پیش آؤ۔''

''صفائی؟ جانتے ہو صفائی کون پیش کرتے ہیں؟'' کانتا نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''تمہیں صفائی پیش کرنے کا کوئی حق نہیں منوہر!'' عدالت تو ہر مجرم کو اپنی صفائی پیش کرنے کا حق دیتی ہے۔'' منوہر نے کہا۔ ''قانون نے یہ حق دیا ہوا ہے میں تو تمہارا پتی ہوں۔ حیرت کی بات ہے کہ تم اپنے پتی کو پتنی ہوتے ہوئے حق نہیں دو گی؟''

''سنو کیپٹن منوہر! صفائی ہمیشہ جرم کا اعتراف نہ کرنے والے پیش کرتے ہیں۔'' کانتا نے زہرخند کہا۔ ''تم پہلے ہی یہ اعتراف کر چکے ہو۔ میرے پاس تمہاری تحریر بھی موجود ہے۔'' کانتا نے پورے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بولا۔ ''اس بات کا گواہ تمہارا ایک دوست امرلال بھی ہے۔ کیا یہ ثبوت کافی نہیں ہے؟''

''امرلال......؟'' منوہر نے بڑے زور سے چونکتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے پر حیرت اور غصہ ابھر آیا۔ ''تمہیں اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟''

''کیوں؟ کیا نام معلوم نہیں ہو سکتا تھا؟'' کانتا تنک کے بولی۔ ''کوئی اپنا نام کیوں چھپانے لگا؟ آج کل تو عورت اپنا بدن نہیں چھپاتی ہے اور نہ ہی جسم کے باریک سے باریک خدوخال تک بھی کہیں وہ دشمنوں کا جاسوس تو نہیں؟ تمہیں غصہ کیوں آ رہا ہے؟''

''لیکن اس نے تو کہا تھا کہ بلکہ مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ خاموشی سے خط ڈال کر آئے گا۔'' منوہر نے کہا۔ ''لیکن اس نے مجھ سے وعدہ خلافی کی جس کی مجھے امید نہیں تھی۔ ایک طرح سے نہ صرف وعدہ خلافی کی بلکہ دھوکا بھی دیا۔ دھوکے باز کمینہ۔''

منوہر نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ رات کے وقت اس مکان میں گھسا ہو۔ امرلال نے کانتا کا شعلہ بدن دیکھ کر اس کے

خلاف فطرت کا زہر بھر دیا تا کہ کانتا کو اسیر بنالے۔ اس نے جی بھر کے کانتا کے بدن کے کشش کے خزنے لوٹے ہوں گے۔ کانتا نے بھی اپنا سب کچھ امر لال تو اس لیے سونپ دیا ہوگا۔ کہ وہ کسی اور عورت کا اسیر بن گیا تھا۔ وہ دونوں ان جانے راستے پر معلوم نہیں کب تک بھٹکتے رہے ہوں گے۔

وہ ان خیالات کے گرداب میں تھا کہ کانتا کے ذہن میں ایک خیال آیا تو وہ زبان پر لائے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ بے رخی سے بولا۔

''تم اسے دوش نہ دو بہتر ہے۔ ایک امر فطری ہوتا ہے کیوں کہ نیت کے ساتھ ساتھ ارادے بھی بدل جاتے ہیں۔''

''نہیں......ایک فوجی افسر اس قدر ہوس پرست اور جذباتی نہیں ہوتا ہے کہ ایک عورت کو بے حجابی کی حالت میں دیکھ کر بہک جائے اور اس کی نیت میں فتور آجائے۔'' منوہر نے کہا۔ ''میں اسے کیوں نہ دوش دوں۔''

''اگر یہ بات ہے تو پھر یہ بتاؤ کہ جب تم محاذ پر گئے تھے تو کیا تمہاری نیت میں کوئی کھوٹ تھا؟'' کانتا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''کیا تمہارا یہ ارادہ تھا کہ تم اپنی پتنی کو زندگی میں لاوارث چھوڑ دو گے؟ جسے تم غلط کہتے ہو وہ جرم ہے۔ تم سرحد کے اس پار بھی مجرم ہو اور ادھر بھی......تم نے سارے رشتے ایک جھٹکے اور بے رخی سے توڑ لیے۔ کس نے یہ کہا تھا کہ باپ دادا کا دھرم ترک کردو اور اپنے ملک سے غداری کرو۔ اب تمہارا کیا رشتہ رہا ہے؟ اس زمین سے اور اپنے دھرم سے اب یہاں صفائی پیش کرنے کیوں آئے ہو؟ کس لیے آئے ہو منوہر؟ آخر کس بات سے مجبور ہو کر آئے ہو۔ جو بھی بات ہو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ رہنے دو......گھر لوٹ جاؤ جو تم نے غداری کر کے بسایا ہے۔ میں تم پر نہیں بلکہ اس عورت پر ترس کھا کر یہ بات کہہ رہی ہوں جس کا مجھے نام تک معلوم نہیں......نام تو مجھے تمہارا نہیں معلوم مگر میں اس دوسری عورت کا گھر اجاڑنا نہیں چاہتی ہوں جو نردوش ہے تم نے اسے بتایا نہیں ہوگا کہ تم ایک شادی شدہ شخص ہو۔ اگر تم اسے بتا دیتے وہ تمہارے ساتھ یقیناً اپنا گھر آباد نہیں کرتی۔ میں اس لیے بھی تمہیں واپسی کی اجازت اور مہلت دے رہی ہوں کہ دنیا کی ہر عورت میری طرح بدنصیب ہوتی ہے۔''

منوہر کے چہرے کا رنگ اس طرح فق ہو گیا جیسے دشمن نے اسے نرغہ میں لے لیا ہو اور ان کی بندوقوں کی نالیں موت کے فرشتوں کی طرح گھور رہی ہوں اور کسی بھی لمحے شعلے اگلنے والی ہوں اور اسے بھون دینے میں تامل نہیں کیا جائے گا۔ اگر ایسی صورت حال ہوتی تو شاید اس کی یہ حالت ہرگز نہ ہوتی۔ کانتا کے بے رحم لہجے کا ایک ایک لفظ گولی سے کہیں مہلک تھا۔ اس کا زخم اس میں ایسی جلن اور ٹیس تھی کہ اس سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ اگر کانتا اس کے سینے میں چاقو اتار دیتی تو شاید اتنی تکلیف اور اذیت نہ ہوتی جتنی اس وقت ان جملوں سے وہ محسوس کر رہا تھا جو زہریلے ڈنک تھے۔ وہ تو نہ جانے کیسے کیسے رنگین اور ان جانے سپنے دیکھنے چلا تھا کہ کانتا اس کے انتظار میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتی ایک ایک دن کی راہ تک رہی ہوگی۔

منوہر کی حالت بتاتی تھی کہ وہ سخت حالات سے گزر کے وہاں پہنچا ہے۔ وہ بے حد تھکا ہوا نڈھال اور برسوں کا بیمار لگتا تھا۔ اس کا شیو اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ جیسے آٹھ دس دنوں سے شیو نہیں کیا۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے اور ان میں گرد وغبار کے علاوہ تنکے اور خشک پتے بھی اٹکے ہوئے تھے۔ اس کے پرانے فوجی جوتوں پر گرد تھی نیلی زمین کی پتلون کے گھٹنے بھی نکل آئے تھے۔ سفید قمیص کا رنگ کہیں سے بھی سفید نہ تھا۔ کالر بھی بے حد میلا کچیلا ہو رہا تھا۔

''کانتا......!'' چند لمحوں کے بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے تھکے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ اب میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اس سے کہا......چلو ہم رات کے

اندھیرے میں نکل جاتے ہیں مگر وہ ڈر گئی۔ اس نے کہا کہ وہ میرے ساتھ بے گھر نہیں ہوسکتی۔ وہ یوں کہ...... یہاں تو میرے ماں باپ ہیں۔ بھائی بہن اور تمام رشتہ دار بھی تم مجھے اپنے ہمراہ لے کر کہاں جاؤ گے؟ کیوں کہ تمہارا گھر تو کہیں بھی نہیں ہے؟''

''نور جہاں......!'' میں نے کہا۔ ''خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔ میں نے تمہارے لیے کتنی بڑی قربانی دی...... کیسا ایثار کیا...... میں نے تمہارے لیے اپنا گھر، اپنا مذہب اور اپنا ملک۔ سب کچھ ہی تو چھوڑ دیا۔ تم میری خاطر صرف گھر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ صلہ دے رہی ہو تم؟'' اس کے جواب نے مجھے مشتعل کر دیا۔ وہ کہنے لگی۔

''تم نے جو غلطی کی تھی سلیم!'' میں نے اپنا نام سلیم رکھ لیا تھا جو ایک جذباتی حماقت تھی کیوں کہ ہندوستان کی ملکہ کا نام نور جہاں اور اس کے شوہر کا نام سلیم تھا...... نور جہاں کی بات پر میرا دماغ خراب ہوگیا۔ میں پہلے ہی بہت پریشان اور غمگین بھی تھا۔ میں جرم اور گناہ کے اذیت ناک احساس میں مبتلا تھا۔ میرا ضمیر مجھے دن رات ملامت کرتا تھا۔ نور جہاں کا انکار کرنا اور طعنہ دینا مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ میں نے نور جہاں کو گولی ماردی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے ایک ہفتہ جنگلوں کے راستے پیدل سفر کر کے گزارا پتے اور گھاس کھانے پر مجبور ہوگیا اور رات کی سردی میں جانوروں کی طرح گڑھا کھود کر یا کسی غار میں گھس کر خود کو موت سے بچایا۔ اس ایک ہفتے کے دوران تمہارے سوا میرے ذہن میں کسی اور کا خیال نہیں تھا۔ تمہیں منہ دکھانے سے بہتر تھا کہ ڈوب مرتا۔ مجھے امید تھی کہ تم مجھے معاف کر دوگی۔ اس امید نے مجھے زندہ رکھا۔ اس امید پر میں موت سے نبرد آزما رہا۔ اس معافی کی امید نے مجھے زندہ بھی رکھا اور اس وقت تمہارے سامنے لا کھڑا کیا۔ پلیز! مجھے معاف کر دو کانتا!'' وہ ہاتھ جوڑ کے گڑگڑایا۔

''سلیم صاحب!'' کانتا نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا تو اس میں طنز بھرا ہوا تھا۔ ''آپ نے واپسی میں بہت دیر کر دی۔ اب میں کیپٹن امرلال کی پتنی ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ عورت جب پتنی بنتی ہے۔ اسے اپنا سب کچھ سونپ دیتی ہے۔ میں آپ کو معاف بھی کر دوں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس لیے کہ امرلال کسی قیمت پر آپ کو معاف نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ میرا حسن، پرشباب گداز بدن، کشش کے خزانوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور پھر وہ نہ صرف وطن پرست ہی نہیں بلکہ فرض شناس فوجی افسر بھی تو ہے۔''

وہ پتھرائی آنکھوں سے کانتا کو اوپر سے نیچے تک ایسی ناقدانہ نظروں سے دیکھتا رہا جیسے ایک سنگ تراش مجسمہ تراشنے کے بعد دیکھتا ہے۔ اس وقت وہ پیٹی کوٹ اور بلاؤز میں ملبوس تھی۔ اوڑھنی بھی نہیں تھی جو اس کے کھلے بلاؤز کے گریبان کی پردہ پوشی کرتی۔ اس حالت میں اور رات کے فسوں میں عورت کا حسن وشباب قیامت بن جاتا ہے۔ وہ فطری حالت میں لگتی ہے۔ اس پر بے نیام تلوار کا گمان ہو رہا تھا۔ یہ کانتا جو کل تک اس کی محبت تھی۔ سپنا تھی۔ پتنی تھی۔ جیون ساتھی۔ اس کی ملکیت تھی جس سے وہ ہر طرح کھیلتا اور دل بہلاتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کھلونا بنی رہتی۔ اس کی کسی بات، حرکت اور خواہش سے انکاری نہیں ہوتی تھی۔ اس کی خاطر دینے کے لیے بھی تیار تھی۔ اس کا ایسا اثاثہ جس پر وہ ہمیشہ نازاں رہتا تھا۔ ایک غرور سا تھا۔

''کانتا......!'' منوہر کو اپنی ویران اور کھوکھلی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ''تم نے امرلال سے بیاہ رچالیا ہے۔ اپنا سب کچھ اسے فیاضی سے سونپ دیا اور اسے بھی اس طرح سے خوش کرتی رہی ہو اور کر رہی ہو جس طرح مجھے خوش کیا کرتی تھیں۔ تم میری ملکیت تھیں۔ میری زندگی میں تھیں۔ میری ذات کا ایسا جزو جو الگ اور جدا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کمینہ اور ذلیل بھیڑیا گدھ بن گیا ہوگا۔ اس لیے کہ تم جیسی حسین اور پرشباب گداز بدن کی عورت لاکھوں میں ایک ہوتی ہے۔''

”ہاں...... میں اس لیے اس پر بدلی بن کر برسی...... برستی ہوں اور برستی رہوں گی کہ اب وہ میرا پتی ہے۔“

یہ کہتے کہتے کانتا کے سینے میں سانسوں کا زیروبم ہچکولے کھانے لگا تو یہ نظارہ ہیجان خیز بن گیا۔ سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ منوہر کے دل میں آیا کہ کانتا کو آغوش میں لے لے لیکن کانتا کے چہرے پر نفرت اور حقارت اور ریوالور دیکھ کر ہمت نہ ہوئی۔

”اور ہاں تم نے محاذ جنگ پر جاتے سمے مجھ سے کیا وعدہ لیا تھا......؟“ کانتا نے اسے خاموش اور گنگ سا پا کر طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا تمہیں اپنا وہ وعدہ یاد نہیں رہا؟ یاد نہیں آیا؟“

”وعدہ؟ کیسا وعدہ؟“ اس وقت منوہر کا دماغ ایسا ماؤف تھا کہ اسے ذہن پر بہت زور دینے پر بھی یاد نہیں آیا۔ اسے لگا کہ کانتا جھوٹ بول کے فریب دے رہی ہے۔ وہ زچ کر بولا۔ ”تم کس وعدے کی بات کر رہی ہو؟“

”کیا تم نے جاتے سمے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا اور کہا نہیں تھا کہ...... اب تم آزاد ہو اور پھر اب تم منوہر کہاں رہے۔ تم تو سلیم ہو۔ اس لیے میں نے امرلال کو اپنا کر اپنا سب کچھ سونپ کر پتی بنا لیا۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ میرا پتی آتا ہی ہوگا۔“

”کیا کہا......؟ امرلال یہاں ہے......؟“ منوہر نے بے یقینی کے لہجے میں کہا۔ ”تم جھوٹ بول رہی ہو تا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ میں تمہارے فریب میں آنے سے رہا کانتا! میں تمہارا پتی ہوں۔ تم میری ملکیت ہو۔ میں یہاں اب رہوں گا۔ ہم پھر سے پرانی یادیں تازہ کریں گے۔“

”تم اپنے دوست کے اس ریوالور کو خوب اچھی طرح پہچانتے تو ہو گے۔ یہ عام قسم کا ریوالور نہیں ہے میرے پاس اور گاؤں میں کس کے پاس ہو سکتا ہے؟“ کانتا نے اس کی آنکھوں میں ڈال کر بے خوفی سے کہا۔ ”میں اس کی ملکیت ہوں۔ وہ کسی کام سے گیا ہوا ہے۔“

”خاصی رات ہو گئی ہے۔“ منوہر نے تکرار کی یہ اسے اس کے گھر پر ہونا چاہیے تھا۔ ”تم مجھے بہلانے اور بھگانے کی کوشش مت کرو۔“

”دن ڈوبنے کے بعد اسے اچانک ایک ضروری کام یاد آ گیا تو وہ شہر چلا گیا۔ خاصی دیر ہو گئی ہے۔ بس اب آتا ہی ہوگا۔“ کانتا نے کہا۔ ”اگر وہ آ گیا تو تم جانو اور وہ جانے...... میں تمہیں بچاؤں گی نہیں۔“

”جب کہ وہ تمہارے ساتھ رہ رہا ہے تو اس کا ریوالور تمہارے پاس کیوں اور کس لیے ہے؟“ منوہر مشکوک ہو کر تمسخر سے بولا۔ ”کیا وہ اس لیے دے گیا ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں جنگل میں جا کے شکار کھیلو......؟“

”یہ ریوالور...... امرلال مجھے اس لیے دے گیا ہے کہ جانو میرے لیے خطرہ بن گیا تھا۔“ کانتا کہنے لگی۔ ”جب اسے پتا چلا تم اسی سنسار میں نہیں رہے تو اس نے دو ایک مرتبہ مجھے دبوچ کے میری بے حرمتی کرنا چاہی تھی جو میں نے ناکام بنا دی۔ ایک روز باہر کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ وہ بھیڑیا گھس آیا۔ مجھے دبوچ لیا اور بے بس کرنا چاہتا تھا کہ میرے شور کرنے پر سروجنی بھابھی نے میری آبرو بچائی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ریوالور کا استعمال کرنا خود تم نے مجھے سکھایا تھا۔ کیوں کہ میری خوب صورتی اور جسمانی کشش مردوں کو پاگل کیے دیتی ہے۔ میرے اکیلے ہونے پر کوئی بھیڑیا اندر گھس نہ آئے۔ امرلال شرما کی دو دن کی چھٹی باقی ہے۔ تم یہ دو دن ساتھ والے گھر میں چھپ کے گزار سکتے ہو۔ اس کے بعد ہم سوچیں گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟“

منوہر کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ اس کا چہرہ امید کی ایک ان جانی کرن سے روشن ہو گیا۔ گھپ اندھیرے میں یہ کرن کسی شعاع سے کم نہیں تھی۔ کانتا کے رویے میں جو یک لخت تبدیلی آئی تھی اس سے

اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ کانتا کے دل کے کسی کونے اس کے لیے آخر جگہ ہے وہ جو اس کا پتی رہا تھا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ کانتا نے ہم کا لفظ استعمال کیا تھا۔ وہ امرلال کی غیر موجودگی میں اس گھر میں آئے گی جہاں وہ روپوش رہے گا۔ پھر دونوں پتی پتنی بن جائیں گے۔ یہ سنسنی خیز اور اس قدر ہیجان انگیز سپنا تھا کہ وہ ان جانے سینے میں دور تک چلا گیا۔

''لیکن اس گھر میں تو تمہارا بھائی آنند پال اور سروجا دیوی رہتی ہے۔'' منوہر نے کہا۔ ''بھلا میں وہاں چھپ کر کیسے رہ سکتا ہوں؟ کیا تمہارا بھائی آنند میرا وہاں روپوش رہنا پسند کرے گا؟''

منوہر نے لمحے بھر کے لیے دل میں سوچا کہ وہ وہاں نہ تو کانتا کو چوم سکے گا اور نہ ہی کوئی ارمان پورا ہو سکے گا۔

''سروجا بھابھی ایک مردہ بچے کو جنم دے کر اس سنسار سے سدا کے لیے رخصت ہو چکی ہے۔ اور میرا بھائی آنند جیل میں بند ہے۔'' کانتا اسے بتانے لگی۔ ''تم نے جانو پر جو جھوٹا الزام لگا کر اسے جیل بھیجا بجھوایا تھا۔ جانو نے اس کا بدلہ میرے بھائی سے لے لیا ہے۔ وہ بھی جھوٹی گواہی پر جیل میں ہے۔ اس پر جانو نے یہ الزام تھوپا تھا کہ اس نے ایک نوعمر لڑکی اور لڑکے سے زیادتی کی تھی۔''

پھر کانتا نے اندر سے چابیاں لا کر اور تاکیدی لہجے میں بولی۔

''تم وہاں خاموشی سے بیٹھو میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔ بتی جلانے کی ضرورت نہیں چپ چاپ کھانا کھا سو جانا۔''

کانتا کی بات سن کر اس نے اثباتی انداز سے سر ہلا دیا۔ وہ دل میں خوش ہوگی۔ پھر وہ دروازہ کھول کے نکل گیا۔ کانتا نے اسے درمیان کی دیوار سے کودتے دیکھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ منوہر کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ وہ محتاط ہوگئی۔ پہلے تو اس نے ریوالور چھپایا اور کھانا نکالنے لگی۔ منوہر اندھیرے میں لیٹا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ ''آواز نہ نکالنا۔'' کانتا نے روٹی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس پر اچار کے تین چار ٹکڑے رکھے تھے۔ ''اس سمے صرف یہی تھا۔''

پھر منوہر نے اس کی عریاں مرمریں اور گداز بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''کھانا تو بعد میں کھاؤں گا۔ پہلے میں چاہتا ہوں کہ تم کو چوم لوں اور ہم بستر ہو جاؤں۔''

''سنو...... امرلال شرما آ گیا ہے۔'' کانتا نے سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔ ''میں تمہارے لیے کھانے کے لیے کچھ اور نہیں کر سکتی۔ اس وقت یہی تھا گھر میں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔

آدھی رات سے کچھ پہلے کانتا نے بیچ کی دیوار کو خاموشی اور بڑی احتیاط سے عبور کیا۔ خوف زدہ ہونے اور ڈرنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ منوہر تھکن سے بے حال گہری نیند ڈوبا ہوا ہوگا۔ وہ کسی شور سے بھی جاگ نہیں سکتا۔ اتنے دنوں کے دشوار گزار سفر سے اسے ٹھیک سے کہاں سونے کو ملا ہوگا۔ وہ موت کی سی حالت میں ہوگا۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی اس کے سرہانے جا کھڑی ہوئی۔ اس کے بدن سے پھوٹتی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک کمرے کی فضا میں بسنے لگی۔ اس کے چہرے پر ایک سفاک اجرتی قاتل کی درندگی ابھر آئی اور آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس نے لوہے کا وہ پائپ اٹھا لیا جو صحن میں پڑا تھا اور پوری قوت سے منوہر کے سر پر دے مارا۔ منوہر کے منہ سے ایک کراہ نکلی اور اس نے منوہر کے سر کی ہڈی چٹخنے کی آواز صاف سنی۔ پائپ پھر نیچے آیا۔ منوہر کا جسم تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ کانتا کچھ دیر تک سانس اندر لیتی رہی۔ اس کی سانسیں سینے میں ہچکولے کھانے لگی۔ پھر اس نے منوہر کو پائپ سے ہلاک کیا۔ وہ بغیر حرکت پڑا رہا۔ کانتا نے پیچھے ہٹ کے موم بتی جلائی اور اس کی مدھم روشنی میں منوہر کو غور سے دیکھا۔ خون بہت کم نکلا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بہت خون نکلے گا اس لیے وہ فطری حالت میں آئی تھی کہ کہیں خون کے چھینٹے کپڑوں پر نہ آ جائیں۔ بدن پر آنے سے انہیں دھویا جا سکتا ہے۔ اس پر نشان

آ جائے تو کون دیکھ لے گا۔ لیکن پاؤں پر سے لاکھ دھونے پر مٹ نہیں پاتا۔ وہ بھی منہ پر پڑنے والی ضرب جس نے شوہر کی ناک اور سامنے کے دو دانت توڑ دیے تھے۔ ابھی وہ زندہ تھا لیکن بے ہوش تھا۔ کانتا نے اسے بستر پر پڑی چادر میں لپیٹا۔ اس طرح کہ اگر وہ ہوش میں آ بھی جائے تو حرکت نہ کر سکے گا۔ چارپائی کی رسی کو اس نے چادر کے گرد کئی بل دیے۔ اور پھر بڑی مضبوطی سے گرہ لگا دی تاکہ چادر کھل نہ جائے۔

آخری سرے کو تھام کر اس نے منوہر کو چارپائی سے نیچے گھسیٹا۔ منوہر کا سر اینٹوں کے فرش سے ٹکرایا۔ پھر اس نے مکان کا عقبی دروازہ کھولا اور موم بتی بجھا دی۔ اسے اس بات کی فکر اور پریشانی، کوئی ڈر اور خوف نہ تھا کہ وہ فطری حالت میں ہے۔ اگر کوئی اس حالت میں دیکھ لے تو......! لیکن وہ جانتی تھی کہ آدھی رات کے سمے کوئی گھر سے باہر نہیں آتا ہے۔ یہ گاؤں ہے۔ شہر نہیں جہاں دن اور ساری رات گاڑیوں اور آدمیوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ سورج ڈوبتے اور دھند لکے اندھیرے کی آغوش میں سما جاتے ہیں پھر وہ منوہر کو کسی مردہ کتے کی باہر گھسیٹتی لے گئی۔ دروازہ بند کر دیا۔ باہر دسمبر کی سرد رات کا سناٹا تھا۔ برہنہ ہونے کے باوجود اسے سردی محسوس نہیں ہو پا رہی تھی۔ دور جنگل میں روز کی طرح گیدڑ چلا چلا رہے تھے۔ وہ ہر احساس سے بے نیاز آگے بڑھتی گئی۔ میدان میں جہاں اس نے ایک بار ریوالور چھپایا تھا۔ وہاں دو گنی جھاڑیوں بیلچہ رکھا ہوا تھا۔ کانتا نے پورے اعتماد کے ساتھ بیلچہ اٹھایا اور زمین تیزی سے کھودنے لگی۔ تین دن پہلے رات کو جو بوندا باندی شروع ہو کر صبح تک جاری تھی۔ اس نے مٹی نرم کر دی۔ وقت کا خیال کیے بغیر وہ نرم مٹی کو باہر پھینکتی رہی۔ اسے ایسی جلدی بھی نہیں تھی۔ اس وقت تک وہ کھدائی کرتی رہی تھی کہ یہاں تک تین فٹ چوڑا گڑھا گہرا ہو گیا۔ اب اس کی آغوش میں بڑی آسانی سے منوہر کی لاش سما سکتی تھی اور اس کی سمادھی کا کسی کو بھی پتا نہیں چل سکتا تھا۔

کانتا کے عریاں اور مرمریں بازو شل ہو گئے تھے جو مرد کو تو اپنی آغوش میں لے سکتے تھے اور اس کے ہاتھ مضبوطی سے تھام سکتے تھے لیکن ایک بھاری بیلچہ کسی مرد مزدور اٹھا کر کھودنے سے قاصر تھے۔ یہ ایک عورت کے ہاتھ تھے لیکن اتنا بڑا گڑھا جو کھود دیا۔ وہ نفرت کا ایک انتقامی جذبہ تھا۔ باہر جو سرد ہوا چل رہی تھی اس کی شدت میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔ حالاں کہ اس کے تن پر ایک دھجی تک نہ تھی لیکن اس بڑھتی ہوئی سردی میں بھی اسے پسینہ آ گیا۔ اس نے ایک طرف بیلچہ رکھا۔ پہلے تو منوہر کی نبض دیکھی جو بند ہو گئی تھی۔ پھر اس نے مزید تسلی کے لیے اس کے سینے پر دل کی جگہ کان رکھ کے دھڑکنیں سننے لگی۔ اس کے دل کی حرکت بھی بند ہو چکی تھی۔ وہ اس سنسار سے اپنے پاپ کی گٹھڑی لے سدھار چکا تھا۔ کانتا نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اس لیے بھی کہ منوہر کے دل میں خنجر اتارنے کا روح فرسا مرحلہ نہیں آیا تھا جو کہ بے حد مشکل ترین تھا۔ اگر منوہر کی سانس چل رہی ہوتی تو وہ اس کے سینے میں دل کی جگہ خنجر اتارنے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں کرتی۔ چوں کہ وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی اس لیے خنجر بھی ساتھ لے کر آئی تھی۔ اس لیے کہ اس بات کا بھی امکان تھا کہ شوہر کو زندہ دفن کرنے کی صورت میں شاید معجزانہ طور پر بچ جائے اور سمادھی سے نکل آئے۔ آخر وہ ایک جوان اور کڑیل مرد تھا۔ اس کا جسم مضبوط اور سخت تھا۔ وہ فوجی بھی تھا۔ فوجی جو آخری وقت تک دشمن اور موت سے لڑتا ہے۔

کانتا نے منوہر کی موت کا اچھی طرح سے اطمینان کرنے کے بعد لاش کو کسی مردہ جانور کی طرح گھسیٹ کر گڑھے میں ڈالا اور مٹی برابر کرنے لگی۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوئی تو مشرقی افق پر صبح کا ستارہ نمودار ہو گیا تھا۔ وہ دشمن جو منوہر نہ تھا اور نہ ہی سلیم تھا۔ وہ جو کسی کانتا کا پتی تھا اور نہ ہی کسی نور جہاں کا شوہر تھا...... جو سرحد کے ادھر تھا اور نہ ادھر تھا اور اب کہیں بھی نہ تھا۔ اس نے نور جہاں کے قاتل کو

موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وہ اسی عبرت ناک سزا کا مستحق تھا۔ اب نہ صرف وہ بلکہ اس کا دل اور ضمیر بھی مطمئن تھا...... اور ایک عجیب فرحت اور سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے وہی کیا جو انصاف کا تقاضا تھا۔ اس کے سوا چارہ نہیں رہا تھا۔

صبح کا اجالا ہوتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس اجالے میں وہ بے نیام تلوار کی طرح دھار کی طرح چمک رہی ہے۔ اگر اسی کسی نے دیکھ لیا اس حالت میں اور اسے دبوچ کر قابو میں کر کے فائدہ اٹھانا چاہا تو...... لیکن وہ اسے قریب پھٹکنے تک نہیں دے گی۔ اس کے پاس نہ صرف بیلچہ بلکہ خنجر بھی ہے۔ وہ خنجر گھونپ دے گی۔ لیکن اس کی نوبت ہی کیوں آنے دے۔ وہ بیلچہ اٹھا کے تیزی سے گھر کی طرف کوندا بن کے لپکی اور آنند پال کے گھر میں گھس گئی۔ گلی ویران اور سنسان پڑی تھی۔ اتفاق سے باہر اسے اس حالت میں کسی عورت یا مرد نے نہیں دیکھا۔ کپڑا لپٹا ہوا پائپ اب بھی چارپائی کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ کانتا نے پائپ کو بیلچے کے ساتھ صحن میں ڈال دیا۔ اس کے کپڑے چارپائی پر بے ترتیبی سے بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ اس جلدی سے کپڑے پہنے تو اس کے جسم کی ٹھنڈک کم ہوگئی۔ پھر بستر لپیٹ کے دروازے کو قفل لگا دیا اور درمیان کی دیوار عبور کر کے اپنے آنگن میں اتر آئی۔ اور چولہا جلا کر نہانے کے لیے پانی گرم کرنے لگی۔ نو بجے سے پہلے اسے عدالت پہنچنا تھا۔ کیوں کہ آج عدالت میں آنند پال کی پیشی تھی۔ سدھو نے کہا تھا کہ وہ ٹھیک آٹھ بجے تانگا لے کر آجائے گا۔ سدھو جیسے لوگ سدھو کے نام سے پکارتے تھے اس کے بھائی کا بڑا اچھا اور مخلص دوست تھا۔ بدمعاش ہونے کے باوجود وہ عورتوں سے دور رہتا تھا۔ نوجوان لڑکیوں کو نگاہ بھر کے نہیں دیکھتا تھا۔ اس کی رگوں میں شریف باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔ لڑکیاں اور عورتیں جو شہر یا کسی قریبی گاؤں میں تنہا جایا کرتی تھیں وہ بڑے اعتماد سے اس کے تانگے میں بیٹھتی تھیں۔ اس لیے کہ انہیں ویرانے سے گزرنا پڑتا تھا۔ نوجوان کو جوان فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے اور انہیں زیادتی کا نشانہ بناتے۔ دن ڈوبنے کے بعد بھی اگر وہ اکیلی جاتی تھیں تو سدھو ان کی طرف میلی نگاہ سے بھی نہیں دیکھتا۔

پانی گرم ہو چکا تھا۔ وہ غسل خانے میں گھس گئی۔ پھر اس نے کپڑے اتار کے بڑے سکون، اطمینان نیم گرم پانی سے نہایا تو اس کی ساری تھکن، کسل مندی اور بدن کا جوڑ جوڑ جو درد کر رہا تھا وہ ختم ہوگیا۔ اگر اسے عدالت نہ جانا ہوتا تو وہ اور سکون سے نہاتی۔ اسے ہمیشہ سے نہانے میں ایک لذتیت محسوس ہوتی تھی۔ جب وہ اور منوہر نہاتے ہوتے اس کی لذت اور ہی ہوتی تھی۔ منوہر کو قتل کر کے دفن کرنے کے بعد اس کے دل کے کسی کونے میں احساس جرم اور ندامت تھی۔ نہ ہی ضمیر نے ملامت کی، کیوں کہ اس نے نور جہاں کے قاتل کو قتل کیا...... نور جہاں کے قاتل کو نہیں بلکہ ایک عورت کے قاتل کو جو بدنصیب اور بے گناہ تھی۔ اگر وہ یہ کہتا کہ اس نے نور جہاں کو گولی نہیں ماری بلکہ طلاق دے کر چلا آیا ہے تو شاید اسے قبول کر لیتی۔ جب وہ نہا کے کمرے میں کپڑے پہننے آئی تو اس کے سارے بدن میں توانائی اور چستی آ گئی تھی۔ منوہر کو قتل کر کے جو اسے شانتی ملی اس نے آتما کو ایک عجیب اور مسرت انگیز طمانیت بخش دی تھی۔ اس کا سارا جسم سوندھی سوندھی خوشبو سے مہکنے لگا تھا۔

ٹھیک آٹھ بجے وہ دوسری طرف پڑوس میں رہنے والے بھوپت سنگھ کے چچا کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گئی اور دو بجے لوٹ آئی۔ آنند پال کو تین برس کی سزا ہوگئی تھی۔ جب کہ اس کے وکیل نے کہا تھا چھ ماہ کی ہوگی۔ آنند پال پر دو کنواری لڑکیوں کی آبرو لوٹنے کا الزام تھا۔ دوسری عدالتوں میں لڑکیوں لڑکوں کے ساتھ زیادتی کرنے والے مجرموں کو عموماً چھ سات ماہ یا ایک برس کی ہوتی تھی۔ لیکن جج بڑا سخت مزاج کا تھا۔ وہ مجرموں کو سخت سے سخت اور لمبی میعاد کی سزائیں دیتا تھا۔ کانتا گھر آ کر بستر پر گرتے ہی اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس سنسار میں اب اس کا کوئی

نہیں رہا تھا اور چاروں طرف ایسا گھپ اندھیرا تھا اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا سینہ ... طرح کٹ رہا تھا اور دل بھی بے تحاشا شور رہا تھا۔

وہ روتے روتے جیسے بے ہوش ہو گئی تھی۔ جب اسے ہوش آیا تو اسے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ جانو تھا جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا بیڑی پھونک رہا تھا۔ وہ دندناتا اندر گھس آیا تھا۔ کب سے کھڑا ہوا تھا۔

کانتا اک دم سے ہڑبڑا کے بستر سے نکل آئی۔ اس نے بال اور لباس کو درست کرتے ہوئے اسے گھورا۔

''نمستے کانتا جی ......!'' جانو نے اسے گرسنہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''ارے آپ کیسی مدہوشی کی نیند سوتی ہیں اور نہ ہی آپ کو اپنا ہوش ہوتا ہے اور نہ ہی لباس کا...... میں نے آپ کو بیدار کرنے کے لیے کتنی ہی آوازیں دیں...... آپ کا شانہ ہلایا تھا۔ اگر میری جگہ ہوتا تو آپ کو عریاں حالت میں دیکھ کر خود پر قابو نہ پاتا...... وہ جانے کیا کیا ان جان حرکتیں کرتا۔''

کانتا سمجھ گئی تھی کہ جانو کے ہونٹوں اور ہاتھوں نے جانے کیا کیا حرکتیں نہیں کی ہوں گی۔ اس کے جی میں آیا کہ اس ذلیل، کمینے اور حرام زادے کے منہ پر تھوک دے۔ جوتے مار کر نکال دے۔ اگر اسے ہوش نہ آیا ہوتا جانو اس کی آبرو سے کھیل چکا تھا۔ لیکن اس سمے غصے میں آنے اور نفرت کا اظہار کرنے کا موقع نہیں تھا۔ جب اس کی جانو سے سگائی ہوئی تھی تب وہ اس سے دست درازی کرتا رہتا تھا۔

''تم اس وقت کیوں اور کس لیے آئے ہو؟'' کانتا نے برافروختہ ہو کر کہا۔

''میں کپتان صاحب سے ملنے آیا تھا؟ کیا وہ کہیں گئے ہوئے ہیں؟ کب تک لوٹیں گے؟'' اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

کانتا کا ہاتھ تکیے کی طرف غیر محسوس انداز سے رینگتے رینگتے رک گیا۔ اس نے غور سے جانو کی طرف دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ایک ان جانے خوف کی ایک لہر اس کے سارے بدن کو مفلوج کرنے لگی۔ کیوں کہ جانو اسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل بھی خوف زدہ اور پر خیال نہیں تھا۔ اس کی یہ کیفیت کسی خطرے سے خالی نہیں تھی۔ اس کا سینہ دھڑکنے لگا۔ سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

''کون کپتان صاحب ......!'' کانتا نے انجان بن کر اپنی پلکیں جھپکائیں۔ ''تمہارا دماغ ٹھکانے تو ہے۔''

جانو نے بیڑی کا ایک لمبا کش لے کر ٹوٹا ایک طرف اچھال دیا۔ پھر ایک وہ بھونڈا اور بے ہنگم قہقہہ مار کے بڑے زور سے ہنسا۔

''دیکھ کانتا...... مجھے سب معلوم ہے مگر ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔'' جانو نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''میرے ہوتے ہوئے۔''

''یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟'' کانتا نے تنک کر کہا اور غضب ناک نظروں سے گھورا۔ اس کے جی میں آیا کہ رسوئی سے سبزی کاٹنے والی چھری لا کر اس کے سینے میں بھونک دے۔ ''چلو...... نکلو یہاں سے ......''

''تیری اور منوہر کی کوئی جوڑی نہیں تھی۔'' جانو اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اپنی کہتا چلا گیا۔ ''وہ ایک بزدل، دغاباز اور ذلیل قسم کا شخص تھا۔ کمینہ اور پاپی تھا۔ مجھ میں صرف ایک خرابی ہے کہ میں بدمعاشوں کا دوست ہوں۔ بدمعاش ہوں۔ میں بزدل اور اس جیسا شخص نہیں ہوں۔ وہ فوجی ہو کر بھی ناکارہ تھا۔''

''جوڑی تھی یا نہیں؟ تجھے اس سے کیا کمینے۔'' کانتا پھنکاری۔ ''تجھ سے بڑا ذلیل کون ہو سکتا ہے۔ تیری مجھ سے سگائی ہوتے ہی مجھے کسی وحشی کی طرح جھنجھوڑنے اور مجھے بے آبرو کرنے تل گیا تھا۔ اس روز سروجنی بھابھی عین وقت پر نہ آتی تو میں بے آبرو ہو کر رہ جاتی۔ مجھ سے بڑا ذلیل کیا کون ہو سکتا ہے کہ تو نے میرے معصوم بھائی کو جھوٹی گواہی دے کر

سزا دلوا دی۔'' کہ اس نے بس میں دو لڑکیوں کی آبروریزی کی۔ آبروریزی تو درکنار اس نے کسی لڑکی کو چوما اور نہ ان سے دست درازی تک کی تھی۔''

''آنند پال اس لیے جیل گیا تھا کہ اس سے مجھے بدلہ لینا تھا۔'' جانو نے کہا۔ ''بدلہ بزدل نہیں بلکہ بہادر لوگ لیتے ہیں۔ یہ کوئی جرم نہیں ہے؟'' پھر اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ ''تو نے بھی تو بدلہ لے لیا ہے اور کوئی جرم نہیں کیا۔ لینا تو بہادروں کا شیوہ ہے۔''

''کیسا بدلہ؟ جانو تو یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' کانتا نے اپنی طاقت جمع کر کے کہا مگر اس کا لہجہ اعتماد سے خالی تھا۔ ویران اور کھوکھلا کانتا نے بہ مشکل اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو جانو کا وار سہنا اس کے بس کی بات نہ ہوتی۔ ''یہ کیا کہ تو اندھیرے میں تیر چلا رہا ہے؟ میں نے کس سے بدلہ لیا؟''

''تو یہ سمجھتی ہے کہ لوگ نہیں جانتے ہیں اور ساری دنیا بے وقوفوں سے بھری ہوتی ہے۔'' جانو کا لہجہ یکایک پُراسرار سا ہو گیا۔ ''لیکن میں جانتا ہوں۔''

''یہ تو پہیلیوں میں باتیں کیوں اور کس لیے کر رہا ہے۔'' کانتا کا دل ان جانے خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ ''تو کیا جانتا ہے؟ بتا کیا جانتا ہے؟''

''میں صاف صاف بتا رہا ہوں لیکن تو ہے کہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہی ہے یا پھر انجان بن کر اداکاری کر رہی ہے۔'' جانو رازدارانہ انداز سے کہنے لگا۔ ''میرے لیے تیری اداکاری اور ان جان بن جانا اس سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گاؤں کے لوگ واقعی نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں۔ مگر جو لوگ دشمن کی قید سے چھوٹ کے آئے ہیں ان میں بھی میرا ایک یار تھا۔ اس نے تو مجھے پہلے بتا دیا تھا کپتان صاحب بھاگ گئے تھے۔ منوہر کو بھگوڑا قرار دے دیا گیا تھا۔ لوگ تو بہت ساری عجیب وغریب، بے تکی اور معنی خیز باتیں کرتے ہیں جو مجھے معلوم ہے۔ میرے کچھ دوستوں کو بھی ..... مگر فکر کی کوئی نہیں۔ میں انہیں سنبھال لوں گا۔ لیکن تجھ جیسی بہادر عورت کا منوہر سے کیا رشتہ، تیرے لیے تو جانو جیسا دلبر مرد ہونا چاہیے جو تیری حفاظت کر سکے۔'' مجھ جیسا مرد ہی بستر کا ساتھی بن سکتا ہے۔''

''یہ تو کیا اوٹ پٹانگ بکے جا رہا ہے؟'' کانتا سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''تو کمینہ ہے، کمینے لوگ بہادر نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ حد درجہ رذیل ہوتے ہیں۔ تو اپنی بہن سے پوچھ تو سہی کہ کیسے مرد بستر کے بہترین ساتھی ہوتے ہیں۔ وہ بتا سکے گی۔ کیوں کہ وہ لڑکوں اور شوہروں کو پھانس کر انہیں فیاضی سے نوازتی رہتی ہے۔''

''منوہر راستے سے ہٹ گیا اب کوئی دیوار نہیں رہی ہے۔'' جانو نے ان جملوں کو نظر انداز کر دیا جو کانتا نے اس کی بہن کے بارے میں کہے تھے۔ وہ بے غیرت اور بے شرم جو تھا۔ وہ کانتا کو اس طرح سے گھورنے لگا جیسے ایک شکار کو شکاری اپنے جال میں پھنسا دیکھ کے فاتحانہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک کوندگئی۔ ''سن کانتا تو برہم نہ ہو۔ جذباتی نہ ہو۔ اس تلخ حقیقت کو جان لے کے تو میری مٹھی میں ہے۔ میں نے پنچھی کو قید کر کے اس کے پر کاٹ دیے ہیں۔ اب تجھے میرے ہر اشارے پر ہر طرح سے خوش کرنا ہوگا۔ تو انکار نہیں کر سکتی میری جان......!''

''یہ تیری بھول ہے۔'' کانتا نے بگڑ کے برہمی سے کہا۔ ''میرے بھائی کو سزا ہو گئی ہے۔ اس لیے تو گیدڑوں کی طرح باتیں کر رہا ہے۔ تو اس کتے کی طرح ہے جو اپنے گلی میں شیر ہوتا ہے۔''

''تو کچھ بھی کہہ لے۔'' وہ دیوار سے ہٹ کر دروازے کی طرف بڑھا اور میں کل تیرے جواب کا انتظار کروں گا۔ کانتا تو ہے بڑی گرم عورت ہے۔ میں تیرے بدن اور قرب کا لمس آج بھی رگوں میں حرارت بن کے دوڑتا محسوس کرتا ہوں۔'' دروازے

پر رک کے اور [illegible] کر نکل گیا۔ کانتا چپ چاپ پتھر بنی بیٹھی رہی۔ اس کے سینے میں سانسوں کا زیر و بم نہ ہوتا اس پر کسی دیوی کی مورتی کا گمان ہوتا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک تکیے کے نیچے تھا کہ اگر جانو کسی بھیڑیے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا تو اسے بلا تامل گولی مار دے۔ لیکن جانو اس پر حملہ اسی لیے نہیں کیا تھا کہ یہ پنچھی اس کے پنجرے میں مقید ہے اور اس نے پر کاٹ دیے ہیں۔ وہ رات کے اندھیرے میں آ کر اسے قابو میں کر لے گا۔

کانتا نے دانستہ ریوالور تکیے کے نیچے سے نہیں نکالا تھا۔ اندھی، بے حد سنسان اور بے رحم اور خونی رات اپنا سفر تیزی سے کرتی جا رہی تھی۔ اس کی نیند بھی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ وہ بہت کچھ سوچنا اور سمجھنا چاہتی تھی۔ پھر اس کا ذہن رفتہ رفتہ صورت حال کو سمجھنے لگا تھا۔ جانو کیا چاہتا ہے؟ کس لیے کیوں ایسی باتیں کر رہا تھا نہیں...... اس نے اپنے آپ کو دلاسا اور فریب دیا۔ یقین دلایا۔ ابھی میں زندہ ہوں مجھ میں شکتی ہے۔ اس رزیل، کمینے اور حرام زادے۔''

آخر مجھے کیا سمجھ لیا ہے؟ کیا میں رستے کا مال ہوں؟ اس کا یہ خیال ہے کہ میں کسی پکے پھل کی طرح اس کی جھولی میں ٹپک پڑوں گی۔ میں کسی بھی مرحلے پر اس سے شکست نہیں مانوں گی۔ جانو میری لاش تو لے جا سکتا ہے۔ مگر مجھے لے جا کر آلودہ نہیں کر سکتا ہے۔ اس رزیل نے میری بے ہوشی سے تنہائی بھی جو نامناسب حرکتیں کی ہیں وہ اس کا بدلہ لیے بغیر نہیں رہے گی۔ اگر اس کی عزت پر آنچ آئی تو وہ ریوالور نکال کر بھون دیتی۔ اسے اب تک میرے بارے میں کچھ اندازہ نہیں کہ میں کیسی عورت ہوں؟ میں کیا کچھ کر سکتی ہوں اپنی آبرو پر آنچ آنے کی صورت میں۔ اسے خود پر بڑا امان ہے۔ بڑی خوش فہمی ہے کہ وہ بڑا بہادر ہے۔ دلیر ہے وہ کیا ہے یہ تو وقت ہی بتائے گا۔

آدھی رات بیت جانے کے بعد وہ پھر بیلچہ لے کر نکلی اور میدان سے گزر کر جھاڑیوں کے پیچھے جا پہنچی جہاں اس نے ایک لاش کو دفن کیا تھا وہاں اسے ایک خالی گڑھا نظر آیا تھا۔ اس نے بہت کچھ سوچ لیا۔ جس حالت میں اس نے لاش کو دفن کیا تھا اس حالت میں جانو نے اسے دیکھ کر قابو میں کر کے بے بس کیوں نہیں کیا تھا۔ اگر وہ اسے دبوچ لیتا تو بے بس ہو جاتی۔ اس نے سوچا کہ منوہر مرا نہیں زندہ تھا جو کسی نہ کسی طرح گڑھے سے نکل کر بھاگ گیا اور اس نے کہیں پناہ لے لی؟ لیکن وہ کہاں پناہ لے سکتا ہے؟ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ جھاڑیوں میں پھر ایک جگنو سا چمکا۔ بیڑی پیتا اور مجھے لمبے کش لیتا جانو اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''مجھے لگا کہ رانی! تو آئے گی اور میرے دل نے بھی گواہی دی تھی۔ دیکھ میرا اندازہ اور میرے دل کا کہنا بھی سو فیصد درست نکلا۔'' وہ طنزیہ لہجے میں ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''تو نے میری باتوں سے اندازہ کر کے سوچا ہوگا میں نے وہ جگہ دیکھ لی ہے تو کیا ہوگا؟ لاش کہیں اور بھی لے جائے اور دبائی جا سکتی ہے۔ مگر یہی خیال مجھے بھی تو آیا تھا اس روز جب تم نے منوہر کی لاش گڑھے میں دبائی تھی۔''

''تمہیں یہ خیال آیا تھا......؟'' کانتا نے پوچھا۔ ''تم نے لاش کہاں گاڑی ہے اور کیا اس کا پتا چل سکتا ہے؟''

''نہیں۔'' جانو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بیڑی کا کش لیا۔ ''فرق صرف اتنا ہے کہ منوہر کی لاش کو میں بہت پہلے دوسری جگہ لے جا کے گاڑ چکا ہوں۔ میرے سوا اس جگہ کا علم میرے فرشتوں اور کسی کو بھی نہیں ہے۔ تجھے کیا تیرے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلے گا۔ سورج کے طلوع ہونے کے بعد میں تجھے دیکھنے کے لیے نکلا تھا۔ میرے علم میں اور منوہر سے تیری شادی کے بعد تم دونوں کو سہاگ راتیں مناتے چھپ کے دیکھتا رہتا تھا۔ کمرے کی چھت پر جو روشن دان تھا۔ تم دونوں روشنی میں حیوان بنے ہوئے تھے۔ ان جانے راستے سے گزرنے کے بعد نڈھال اور

تھکن سے چور ہو جاتے۔ کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی اتنی سکت ہوتی تھی کہ تن ہی ڈھانپ لیں۔ منوہر کے محاذ جنگ پر جانے کے بعد بھی تم کمرے میں روشنی کر کے سوتی تھیں تو تمہارے تن پر دھجی تک نہ ہوتی تھی۔ میں پو پھٹنے تک تمہارے حسن و شباب کی حشر سامانیاں دیکھتا رہتا۔ میں نے کئی بار کوشش کی کمرے کا دروازہ کھول کے اندر گھس جاؤں اور تمہاری آبرو پامال کر دوں۔ اس آبرو کو جو کل تک جس کی ملکیت کا میں مالک تھا۔ تم ایک زہریلی ناگن کی طرح بستر پر آڑھی، ترچھی اور تہری بستر پر ہوتی تھیں۔ نیند کی حالت میں کروٹیں اور زاویے بدلتی تھیں۔ تو مجھ پر جو قیامت گزرتی تھیں۔ اگر منوہر کی جگہ تم کسی اور کی پتنی ہو جاتیں تو اتنا دکھ اور غم نہ ہوتا۔ اس سے نفرت وحقارت اس لیے تھی کہ وہ پہلا درندہ تھا جس نے میری بہن کی دوشیزگی کو جب اس کی عمر بارہ برس کی تھی پامال کیا تھا۔ وہ بدچلن اور فاحشہ بن گئی۔ میں نے جب ایک دن ان دونوں کو غلاظت کے دلدل میں دھنسا دیکھا تو منوہر نے دیکھ لیا تھا اس کا کرتوت ظاہر ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی بدکاری پر پردہ ڈالنے کے لیے پھنسا دیا۔ پھر اس نے ایک دن تمہیں اپنے گھر کے پیچھے والے تالاب میں آزادی سے نہاتے دیکھ لیا تو اس کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ اس لیے میری سگائی توڑ کے تم سے شادی کر لی میں اس تاک میں تھا کہ منوہر کو قتل کر دوں۔ اس رات منوہر کے دوست کو منوہر سمجھ کے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ تم نے منوہر کو قتل کر کے میرے انتقام کی آگ سرد کر دی۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں اس روز تمہارے کمرے کی چھت پر پہنچا تو اجالا ہو چکا تھا۔ تم بڑی گہری اور مدہوشی کی نیند میں غرق تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ تم نے پرانی دیسی شراب پی ہوئی ہو۔ تمہارے کمرے کا دروازہ قدرے بھڑا ہوا تھا جس کا میری نظروں کو یقین نہیں آیا۔ ایسا لگا کہ مجھے آزادی مل گئی ہے پھر کیا تھا۔ اندھے کو دو آنکھیں پھر میں نے لحہ بھر کی تاخیر بھی نہیں کی۔ اس آزادی اور تنہائی سے فائدہ اٹھانے کے لیے فوراً تمہارے کمرے میں گھس گیا۔ اس تنہائی اور آزادی سے میرے ہونٹ اور بہکتے ہاتھ دل کے ارمان پورے کرتے رہے ...... مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی کہ تم بیدار کیوں نہیں ہو رہی ہو؟ چہرے پر اتنی تھکن کیوں ہے؟ اتنی نڈھال اور تھکن سے چور چور بے ہوشی کی نیند میں غرق کیوں ہو...... جب میں نے حد سے تجاوز کرنا چاہا تو دیکھا کہ تمہارے بدن میں حرکت ہو رہی ہے۔ کسی بھی لمحے بیدار ہو سکتی ہو۔ میں نے سوچا بلا سے ...... میں منزل مراد پائے بغیر نہیں جاؤں گا۔ پھر اک دم سے سروجنی بھابھی کا خیال آیا۔ تم نے شور مچا دیا تو وہ چڑیل آ جائے گی۔ پہلے تمہارے شور مچانے پر وہ کمینی آدھمکی تھی اور اس نے میرا ارمان خاک میں ملا دیا تھا۔ پھر میں فوراً باہر نکلا۔ معاً میں نے وہ لکیر دیکھ لی جو آنند پال کے گھر سے مجھے سیدھی یہاں تک لے آئی تھی۔ جہاں تازہ کھدی ہوئی زمین صاف نظر آتی تھی۔ اب میں جس وقت چاہوں پولیس کو اس مقام تک لے جا سکتا ہوں جہاں تیرے پتی کی لاش دفن ہے اور اب تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ میں نے تجھے جو چوبیس گھنٹے کی مہلت دی تھی وہ یاد ہے نا؟ میں یہاں اب اپنا جواب لینے آیا ہوں۔ تو نے کیا فیصلہ کیا میرے من کی رانی؟''

جانو کی آواز کانتا کے کانوں میں جیسے بہت دور سے آ رہی تھی۔ سنسنا رہی تھی۔ اس کے کانوں میں گرم گرم سیسے کی طرح پگھل رہی تھی یہ آواز آتے آتے سمٹ کر دور ہوتی چلی گئی ہے اس کے جسم میں خون برف کی طرح سرد ہو گیا ہے اور اسے اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کی سکت ہی نہیں رہی۔ لمحہ بھر بھی کھڑے رہنا دشوار سا ہو گیا تھا۔ باوجود کوشش اور جدوجہد کے وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ جانو کے قریب ہو کر سنبھلنے سے پہلے ہی خالی گڑھے میں گر گئی۔ داناؤں نے غلط نہیں کہا کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود اس میں گرتا ہے۔ جانو نے اپنے آپ سے کہا۔ جانو نے بے ہوش کانتا کو کندھے پر

ڈالا اور آبادی کی طرف چلنے لگا۔

کانتا ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح بے سروسامان گھر کی ویرانی میں تنہا بیٹھی تھی۔ یہ تنہائی اور بازی ہار جانے کا احساس اسے کسی زہریلی ناگن کی طرح ڈس رہا تھا۔ اس نے تو خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی بے داغ زندگی کو بدنصیبی کی نظر لگ جائے گی۔ اب یہ زندگی اس کے لیے کسی قابل نہیں رہی تھی کہ اس کی آرزو کی جائے۔ فرار کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ سوائے ایک راستے کے جو دنیا کے گناہوں کی غلاظت، احساس جرم، ندامت اور ضمیر خلش سے نجات دلا کر موت کی پرسکون آغوش میں پہنچا دے۔ تاریک راتوں کی سیاہی اس کے نامہ اعمال کی تحریر بن گئی تھی۔ اس نے شوہر کے خون کی قیمت جانو کو ادا کی تھی۔ جانو نے جیسے پائی پائی وصول کی تھی۔ کوئی رعایت نہیں کی تھی۔ اس نے سب کچھ معہ سود حاصل کر لیا تھا۔ اب وہ مستقل اس عذاب کو قبول نہیں کر سکتی تھی۔ جس میں صرف پچھتاوے ہوں۔ اور داغ ہی داغ ہوں۔ رسوائی کے داغ بے گناہوں کے داغ اور منوہر کے لہو کے داغ ......وہ ریوالور کو ہاتھ میں لے کر دیوار کو گھور رہی تھی جس پر اس کا تصور پرچھائیوں سے کھیل رہا تھا۔ اس کے ساتھ منوہر تھا۔

''تم نے دیکھا ہوگا کانتا! لہو کبھی رائگاں نہیں جاتا......میں نے سلیم بن کر نور جہاں کو قتل کیا اور تم نے کیا کیا؟ اپنے پتی شوہر کو مار دیا۔ جس کے ساتھ تم نے اگنی کے اطراف پھیرے کیے تھے۔ اب تمہیں امر لال کی گولی سے کوئی بچا نہیں سکتا.....اگر تم جینا چاہو تو جانو کی داشتہ بن کر ہی جی سکتی ہو۔ داشتہ بھی اتنی خود مختار تو ہو سکتی ہے کہ جب چاہے اپنے جسم کو زیادہ بولی لگانے والے کے سپرد کر دے۔ مگر جانو کے رحم وکرم پر ہو۔ وہ تمہیں بیچ سکتا ہے۔ خیرات کر سکتا ہے اور تحفے میں بھی دے سکتا ہے تم سب کی داشتہ بننے پر مجبور ہو، جانو کی اور اس کی دوستوں کی، اس کے نوکروں کی۔'' اور پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

ایک ایسی ہنسی جس میں زہر ہی زہر بھرا ہوا تھا۔

کانتا نے چونک کر دیکھا تو ہنسنے والا شوہر نہیں جانو تھا۔ ''ہاں میرے من کی رانی! اب تم میری مٹھی میں ہو۔ میری ملکیت ہی نہیں بلکہ میری محتاج ہو......میں تم سے کھلونے کی طرح کھیل سکتا ہوں۔ اپنا ہر ارمان اور خواہش پوری کر سکتا ہوں۔

کانتا نے ریوالور اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''کانتا جی! میں نے یہ ریوالور زندگی کی حفاظت کے لیے دیا تھا۔ اپنی عزیز ترین زندگی اپنے ہاتھوں سے ختم کرنے کے لیے نہیں۔'' اس نے دیکھا......امر لال کے ساتھ آنند پال بھی کھڑا ہوا تھا۔

''میں مجبور ہوں کانتا......! مگر تم تو مجبور نہیں ہو۔ اگر مرنا ہی ٹھہرا تو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ تو آنند پال کی بہن ج ہے تو پہلے اس پر گولی چلا جو تیرے میرے دکھوں کا ذمے دار ہے۔''

''کانتا نے ریوالور نیچے کر لیا اور سوچا......ہاں یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ پاپی شیطان مجھ سے سب کچھ چھین لے۔

پھر اس نے کمرے سے نکل گھر سے باہر آ کر گھر کے دروازے پر قفل ڈالا اور سدھو کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ کیوں کہ اس مشکل گھڑی میں وہی کام آ سکتا تھا۔''

کانتا کو اس کی تلاش میں بہت دور جانا نہ پڑا اور نہ ہی سدھو تلاش کرنے میں بہت زیادہ دیر بھی نہ لگی۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ اس وقت شاید وہ تانگے کے اڈے پر مل جائے گا۔ اس نے دور ہی سے سدھو کو دیکھ لیا تھا۔ وہ تانگے کے اڈے پر اپنے گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کا اپنی ہی طرح خیال رکھتا تھا۔

''دیدی......! تم؟'' اس نے کانتا کو دیکھ کر بڑی حیرانی سے کہا۔ ''تم کیوں آئیں؟ کسی کو بھیج کے بلا لیا ہوتا۔''

سدھو...... کانتا کو بڑی بہن کی طرح سمجھتا بھی نہیں تھا بلکہ اس بڑی عزت بھی کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے کانتا کے بارے میں جانے کیا اول فول بکا تو اس کی ایسی درگت بنائی کہ تین دن تک اسپتال میں زیر علاج رہا تھا۔

"سدھو......!" کانتا نے جبر و زیادتی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے پرتاب سے ملنے جانا ہے۔ تمہیں یاد ہے آج اس سے ملاقات کا دن طے ہوا تھا۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے دیدی! میرے سامنے تو بات ہوئی تھی۔" سدھو نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کے بھانپ لیا تھا وہ بہت پریشان اور متفکر دکھائی دے رہی ہے۔ "لیکن دیدی! ملاقات میں تو بہت دیر باقی ہے۔" اس نے کہا۔ "بات کچھ اور ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ بات کیا ہے مجھے بھی تو بتاؤ؟ کہیں کوئی تمہیں پریشان تو نہیں کر رہا ہے؟ میں اس کمینے کا سر پھاڑ دوں گا۔"

"ارے نہیں سدھو! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" تمہیں وہم ہو گیا ہے۔" وہ تنک کر بولی اور واپس ہو گئی۔

سدھو اسے اس وقت تک جاتا رہا جب تک وہ نظروں سی اوجھل نہیں ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ کانتا رات ایک پل کے لیے سوئی نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں نہ صرف سوجی ہوئی تھیں بلکہ اس طرح سرخ ہو رہی تھیں جیسے روتی رہی ہو اور پھر اس کی چال میں لغزش سی تھی جیسے بہت تھکی ہوئی ہو اور اس کے بدن کا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہو۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے زیرلب کہا۔

کوئی بات تو ہے دیدی......! تم زبان سے نہ کہو تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ تمہارا چہرہ اور آنکھیں چغلی کھا رہی ہیں۔"

دوپہر کے وقت سدھو تانگا لے کر اس کے ہاں پہنچا تو کانتا تیار تھی اور اس کی راہ تک رہی تھی۔ کچھ کہے بغیر وہ پیچھے بیٹھ گئی۔ تانگہ شہر جانے والے راستے پر ہولیا۔ گھوڑا اس راستے کو پہچانتا تھا۔ سدھو نے اسے سدھا رکھا تھا۔

"دیدی......!" سدھو نے ان کے درمیان جو خاموشی کی دیوار کھڑی تھی۔ اسے گراتے ہوئے کہا۔ "بڑا بھائی جیل میں ہے تو کیا ہوا؟ کیا چھوٹا بھائی کچھ نہیں کر سکتا؟ کوئی پریشانی کی بات ہو تو تم مجھ سے نہیں چھپانا؟ آخر میں کب کام آؤں گا؟"

کانتا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کتنا مخلص اور ہمدرد ہے۔ سگے بھائی کی طرح ہے اگر وہ اسے اعتماد میں لے کر بتا دیتی کہ جانو نے اسے ساری رات داغ دار کیا ہے تو وہ جانو کو قتل کر بیٹھتا۔

"سدھو......!" کانتا نے بڑے دروازے سے اندر جاتے ہوئے کہا۔ "تو کچھ خیال نہ کر تو باہر انتظار کر...... مجھے آنند سے تنہائی میں بات کرنا ضروری ہے۔ بعد میں تو بھی جا کے مل لینا۔

سدھو چلتے چلتے اک دم سے ٹھٹک کے رک گیا اور اس نے کانتا کو جس انداز سے اندر کی طرف غائب ہوتا دیکھا تو سوچ میں پڑ گیا کہ یہ دیدی کو کیا ہو گیا ہے؟ اس کا صرف رویہ پراسرار ہی نہیں بلکہ چال تک بدلی ہوئی تھی۔ وہ گھوڑے کی ایال سہلاتا رہا اور سوچتا رہا کافی دیر کے بعد اسے کانتا کی صورت نظر آئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کی طرف آ رہی تھی۔

"سدھو......!" کانتا اس کے قریب آ کر بولی۔ "جا تجھے آنند نے بلایا ہے۔ جلدی سے مل کر آ جا۔ سوا وقت بھی بہت کم رہ گیا ہے۔"

سدھو نے اثباتی انداز میں سر ہلا دیا ہے۔ پھر وہ ملاقاتیوں کے ساتھ جیل کے اندر گھس گیا جو ہفتے میں ایک بار گھنٹے بھر کے لیے اپنے پیاروں سے ملنے آتے تھے۔ لیکن اس ایک گھنٹے کے انتظار میں ان کا ایک ہفتہ ایک برس سے بھی زیادہ طویل ہو جاتا تھا جو بڑا اذیت ناک بن جاتا تھا وہ جس کرب سے گزرتے تھے یہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔ کانتا ایک گھنٹے سے پہلے

ہی لوٹ آئی تھی۔ آخر وہ بات کیا ہوسکتی ہے؟ جب کہ وہ کانتا کو اپنی سگی بہن سے بھی بڑھ کے سمجھتا اور عزت کرتا تھا۔ اس بات نے اسے سخت الجھن میں ڈال دیا تھا۔

گاڑی کی طرف واپس آتے ہوئے سدھو نے اسے دلاسا دیا۔

”دیدی......! تمہیں کسی بات چنتا کرنے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب سے نمٹ لوں گا۔“

کانتا اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنے سامنے دیکھتی رہی۔ سڑک دور دور تک خالی تھی۔ اس کی زندگی کی طرح جو ہر امید اور ہر جذبے سے یک سر خالی تھی اور اس پر ہر شام کے بڑھتے ہوئے وحشت زدہ سایوں کی نحوست کے سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ اسے سینے میں چٹان کا سا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔

کانتا کی خاموشی سنگین اور پراسرار تھی۔ وہ اپنا دکھ غم اور کرب کیسے بتاتی۔ سدھو جو ایک بھائی کی طرح تھا جب بات اور المیہ اینا تھا کہ اپنی ہمراز سہیلی کو بھی بتا نہیں سکتی تھی۔ جب وہ گڑھے میں گری تھی اور بے ہوش ہوگئی تھی اتنا ہی یاد تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو اپنے ہی گھر کے کمرے میں پایا تھا۔ چوں کہ وہ گڑھا کھودنے کے باعث ا قدر تھک گئی اور نڈھال ہو گئی تھی کہ سارا جسم کسی پھوڑے کی دکھ رہا تھا۔ اس میں اتنی سکت اور ہمت نہیں رہی تھی کہ مزاحمت اور دفاع کر سکے۔ بازو بری طرح شل ہو چکے تھے۔ اس کی حالت اس کشتی کی سی تھی جو سمندر کے طوفان کے تھپیڑوں کی زد میں ہوتی ہے۔ اس کے رحم و کرم پر تھا۔

جانو نے ایک مفرور اور سرکش شکاری کی طرح اس کے چہرے اور سراپا پر فاتحانہ نظر ڈالی اور اس کے پاس بیٹھ گیا تو اس نے جانو کو دھکا دینے کے لیے اپنا بے جان ہاتھ اٹھایا تو جانو اسے تھام کر گود میں رکھ لیا ا ور استہزائیہ لہجے میں بولا۔

”اب بولو میری جان......! آخر اب تم میرے بس اور قابو میں ہونا......تم کئی بار مجھے نامراد کر گئیں۔ لیکن اب تم مجھے نامراد نہیں کر سکتیں ......تمہاری سروجنی بھابھی اور پڑوسی اس وقت بھی لحافوں میں دبکے ہوں گے۔ تمہاری آواز بھی دم توڑ چکی ہے اب تم میری پتنی کی طرح ہو۔ میں یہ وقت سہاگ رات کی طرح مناؤں گا......اس وقت گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند ہیں۔ تمہاری آواز گونج کر رہ جائے گی۔“

جانو نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ کسی وحشی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اور جاتے جاتے کہہ گیا تھا کہ میں ہر رات آؤں گا۔ وہ اس کے جانے کے بعد بھی کتنی ہی دیر بلک بلک کر روتی رہی تھی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اس کا سینہ نفرت اور انتقام کی آگ سے بھڑکنے لگا تھا۔ اس نے دل میں کہا۔ جانو اس وقت تو یہ بھول گیا عورت کیسا انتقام لیتی ہے جو اس کی آبرو سے جبر و زیادتی سے اپنی پیاس بجھا کے جاتا ہے۔ عورت اس سے مر کے بھی انتقام لیتی ہے۔

سدھو نے کانتا کو اس کے گھر کے دروازے پر اتارا اور گھوڑے کی لگام پکڑ کرتا نگا موڑا۔ وہ اڈے کی طرف جاتے ہوئے اس طرح پیدل ہی چلتا گیا۔ اڈا خالی پڑا تھا۔ کیوں کہ دوسرے تانگے شام کو شہر پہنچنے والی گاڑی کی سواریاں لینے چلے گئے تھے۔ ہر روز وہ ریلوے اسٹیشن کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ اس کا تانگہ نہ صرف خوب صورت اور بہت صاف ستھرا اور عام تانگوں سے قدرے بڑا ہوتا تھا۔ جس میں بہت سارا سامان لادا جا سکتا تھا۔ سواری اس کا تانگا دیکھتے ہی لپکتے تھے۔ مگر آج کا وقت نکل چکا تھا۔ اگر وہ تیزی سے ہی تانگا دوڑاتا ہوا جاتا اور پہنچتا بھی تھا تو اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا لیکن اسے اس بات کا کوئی غم اور چنتا بھی نہ تھی۔

اس نے گھوڑے کو پیپل کے درخت کے تنے سے باندھا اور تانگا کھول دیا۔ گھوڑے کے سامنے دانہ رکھ کے وہ خود درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ

گیا۔ اس نے پیر زمین پر پھیلا کے اس نے کان پر سے سگریٹ اتاری اور جیب سے ماچس نکال کے جلائی اور ایک لمبا سا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑ دیا۔ وہ صرف اس وقت سگریٹ پیتا جب اسے کسی مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنا ہوتا تھا۔

سدھو جوان ہونے کے باوجود عام جوانوں سے یکسر مختلف تھا۔ اس کا مزاج سرد تھا۔ نرم خو بھی تھا۔ اس کے سوچنے کا انداز بھی مختلف ہوتا تھا۔ کسی بھی کام میں ہاتھ ڈالتا تو عجلت نہیں کرتا تھا بلکہ ہر پہلو پر اچھی طرح سوچتا اور جائزہ لیتا۔ اس عمر میں اس کی جو سوجھ بوجھ تھی وہ پچاس ستر برس کے آدمیوں میں بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر دشمن ہو تو اس سے مقابلہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ عقل ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے مقابلہ آسانی سے کیا جا سکتا اور دشمن کو زیر کیا جا سکتا ہے۔ اگر عقل کے بجائے لاٹھی سے کام لیا جائے تو اس سے بڑا احمق کوئی نہ ہوگا اور یہ اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوگا۔

اس کے لیے کسی بھی بہانے سے جانو کو الگ بلا کر اور کسی ویرانے میں لے جا کے اس کے سر پھاڑ دینا اور لاش کو میلوں تک پھیلے ہوئے جنگل کے کسی بھی چپے میں دبا دینا آسان تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ جانو کے اچانک اور پراسرار غائب ہو جانے سے اس کے سارے یار جو ایک نمبری بدمعاش ہیں گاؤں کے لیے ایک مصیبت کھڑی کر دیں گے اور ان کے اشتعال کا سب سے زیادہ نشانہ بے چاری کانتا کی ذات بنے گی۔ اس کی تذلیل بھی بہت کی جائے گی کہ اس کا بھائی جیل میں بند ہے اور جانو سے جو سگائی ہوئی تھی وہ ٹوٹ گئی۔ اس کی شادی کسی اور سے ہوگئی۔ کانتا نے جانو پر اپنی آبرو بچانے کے لیے گولی چلائی تھی اور کانتا پر یہ الزام ثابت نہ ہو سکا تھا لیکن اس بار یہ ہو سکتا ہے کہ پولیس اچانک چھاپہ مار کر وہ پستول برآمد کر لے۔ سدھو کے علم میں یہ بات تھی کہ جانو کے پاس کمانی والا چاقو تھا لیکن ریوالور نہیں...... وہ بار بار اسے چاقو دکھا کر دھمکی دیتا اور خوف زدہ کرتا تھا اور اس پر... بات پر الجھتا رہتا بھی تھا۔ یہ ایک ایسی بات تھی... صورت میں کسی سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر جانو کے پاس ریوالور یا پستول ہوتا اور اس کا ذکر کسی نہ کسی سے ہونا پاتا، یا پھر تھانے دار تین دن تک اس کھال میں بھس بھرنے کے بعد ریوالور ضرور برآمد کر لیتا۔ تھانے دار کے عقوبت خانے سے شیطان بھی پناہ مانگتا تھا۔

یوں تو گولی کی آواز سب نے سنی تھی اور اس میں شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ گولی کانتا ہی نے چلائی تھی مگر بعد میں وہ ریوالور کو چھپا کے معصوم بن گئی تھی۔ سدھو کی سمجھ میں یہ بات نہیں پہنچی تھی کہ کانتا کے پاس یہ خطرناک کھلونا کہاں سے آیا؟ اس کا پتی کیپٹن تھا۔ مگر وہ محاذ پر جاتے وقت ریوالور کے بغیر گیا تو نہیں ہوگا؟ کیا وہ فوجی افسر جو منوہر کی موت کی خبر لے کر آیا تھا اور کچھ روز کانتا کے گھر پر بیمار پڑا رہا۔ اسے کسی نے کسی بات پر اور کسی وجہ پر زخمی کر دیا تھا۔ آنند پال اور کانتا نے اس فوجی افسر کا بڑا خیال رکھا تھا اور تیمار داری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ منوہر کا ریوالور کانتا کو دے گیا ہو۔ کیا وہ منوہر کا ریوالور لایا ہوگا......؟

سدھو کو یہی بات تو بن قیاس لگتی تھی۔ کیوں کہ اس زمانے میں تو لائسنس والوں نے اپنا اپنا اسلحہ سرکاری اعلان پر فوراً ہی تھانوں میں جمع کرا دیا تھا اور کسی کے پاس شکاری بندوق تک نہیں رہی تھی۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی کہ اسلحہ وہ بھی جو لائسنس کے ہو اسے گھر میں چھپا کر رکھا جا سکے۔ مگر سدھو کو اس بات کا اطمینان تھا کہ کانتا کوئی بے وقوف عورت نہیں ہے اور نہ ہی بزدل بھی اس نے ایک طرح سے بہت اچھا کیا تھا جو منوہر کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ اس نے عقل سے کام لیا تھا اور جرأت سے بھی...... ہر عورت یہ دونوں باتیں اور خوبیاں نہیں ہوتی ہیں مگر تقدیر نے اس غریب کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

چناں چہ اب سارا مسئلہ یہ تھا کہ جانو کو اعتماد میں لے کر اس سے کیسے پوچھا جائے۔ کہ اس نے منوہر کی

لاش اس گڑھے سے نکال کے یہاں گاڑھ دی ہے جس میں کانتا نے دبا دی تھی۔ گاڑھ دی تھی۔ یہ بہ ظاہر ناممکن سی بات تھی کہ جانو اپنے دشمن کے سب سے قریبی ساتھی پر اعتماد کرے؟

سدھو نے ایک بار پھر دل ہی دل میں کانتا کی ذہانت، ہمت، اور تحمل وضبط کا اعتراف کیا جس نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا تھا۔ جب کہ وہ ایک زخمی عورت تھی۔ عورتیں زیادہ جذباتی اور بے صبری ہوتی ہیں ورنہ یہ بھی تو ہوسکتا تھا وہ واپسی میں ریوالور لے کر جانو کے ہاں جاتی اور اسے ٹھنڈا کر دیتی۔ یہ اس کے لیے کچھ مشکل بھی نہ تھا، لیکن اس سے گرفتاری، مقدمے اور بدنامی کا سلسلہ شروع ہو جاتا مگر کانتا کو معمولی سی سزا ہوتی۔ دو چار برس کی سزا...... دونوں بہن بھائی ایک ساتھ باہر آتے...... مگر مرد کے لیے جیل کیا ہے۔ صرف تھوڑی سی پابندی اور محنت جسے مرد بڑی آسانی سے جھیل لیتا ہے۔ مگر عورت کے لیے تو کلنک کا ٹیک ہے۔ ایک بدنما داغ جو کبھی نہیں مٹتا ہے۔ اس کی موجودگی میں شادی کا ٹیکہ نہیں لگ سکتا تھا۔ کانتا صرف ایک عورت ہی نہیں تھی خوب صورت بھی تھی۔ اس کا بدن ایسا بھڑکیلا تھا لباس میں اور بھی بھڑکتا رہتا تھا۔ ایک ایسی عمر کی عورت جیل کاٹنے کے لیے تو نہیں۔ کانتا نے اپنے آپ کو جیل جانے سے بچانے کے لیے بڑی دانائی کی۔

سدھو نے سگریٹ کے آخری حصے کو مٹی میں پیر سے بے دردی سے مسل کے دفن کر دیا اور پھر اس کی سوچ اصل مسئلے کی طرف آ گئی۔ جانو کے کسی دوست کو یہ راز معلوم ہوسکتا ہے۔ اس نے یقیناً یہ بات اس نے اپنے کسی دوست سے تک محدود نہیں رکھی ہوگی۔ وہ سب ایک حمام میں ننگے ہوتے ہیں۔ جب وہ کسی لڑکے، لڑکی اور عورت سے اجتماعی دست درازی کرتے ہیں تو ان کے درمیان کوئی پردہ، حجاب اور شرم نہیں ہوتی ہے۔ جن کی بیویاں تھیں وہ ان سے ہم بستری کی بات تک بتانے میں شرم محسوس نہیں کرتے ہوں گے۔ اسے یہ بات اچھی طرح سے معلوم تھی کہ کانتا کے پاس ریوالور تھا۔ وہ جانو کا قصہ پاک کر کے جانو سے نجات حاصل کرسکتی ہے۔ مگر جانو نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ اور بھی لوگ ہیں جو اس راز سے واقف ہیں اور اگر جانو مر گیا تو وہ بھی محفوظ نہیں رہے گی۔ اس سے اس کے دس بارہ دوست اجتماعی درندگی کر کے موت کی نیند سلا دیں گے شاید اس دھمکی کے باعث کانتا نے جانو کا قصہ تمام نہیں کیا۔ کانتا کے لیے دس بارہ بدمعاشوں کی درندگی کا سامنا کرنا بڑا لرزہ خیز تھا۔ روح فرسا تھا۔ اس سے مر جانا لاکھ درجے بہتر ہوگا۔ جانو جھوٹ نہیں بولتا ہے۔ یہ اس کی ایک خوبی ہے۔ یہ سچ ہی ہوگا اس کے راز سے اس کے بہت سارے لوگ بخوبی واقف ہوں گے اور شاید ہوں بھی۔

سدھو کے ذہن میں تین نام آئے تھے جو جانو کے سب سے قریبی ساتھی تھے لیکن سوال یہ تھا کہ ان سے بھی یہ بات کیسے معلوم کی جائے...... کیا تدبیر کی جا سکتی ہے؟ یہ معمہ کیسے حل ہو؟ اس کا حل ہونا نہایت ضروری بھی ہے۔ وہ بڑی فکر مندی سے جذباتی ہو کر سوچتا اور دماغ لڑاتا رہا...... یہاں تک کے شام کا سرمئی اجالا شب کی سیاہی میں ڈھل گیا لیکن اس نے سوچنا بند نہیں کیا تھا اور کسی نتیجے پر پہنچے بغیر اٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر بڑی دیر کی دماغ سوزی کے بعد آخر کار اس کی سمجھ میں ایک طریقہ کار آ گیا۔

پھر وہ اک دم سے کپڑے جھاڑ کے اس طرح سے کھڑا ہو گیا جیسے اسے کسی زہریلے بچھو نے زہریلا ڈنک مارا ہو۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور خوشی کا یہ احساس اس پر کسی عورت کی طرح غالب آ گیا تھا کہ آخر کار اسے ایک سراغ مل گیا ہے۔ پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چلنے لگا۔ گھر صرف ایک کمرے کا نام تھا جس میں اس نے جنم لیا تھا جہاں وہ بچپن سے جوانی تک ماں باپ کے ساتھ رہا تھا اور جو ایک ساتھ تھوڑے سے وقفے سے اسی سنسار چھوڑ کر پرلوک سدھار گئے تھے جہاں ایک نیا جنم شروع ہو جاتا تھا۔ وہاں صرف اور صرف آتمائیں ہوتی تھیں۔

چارپائی کے نیچے سے پرانا زنگ آلود صندوق کھینچ کے نکالا۔ اس کے ہاتھوں نے کپڑوں کی تہ میں نیچے چھپے ہوئے کاغذ کے پیکٹ کو کسی دشواری کے بغیر تلاش کرلیا۔ جو اس نے برسوں پہلے رکھ چھوڑا تھا۔ کاغذ میں پرانے وقتوں کے دو کنگن تھے جو خالص سونے کے تھے جن میں نہ تو ملاوٹ تھی اور کوئی کھوٹ تھی۔ وزن میں دو تولے سے کم نہیں تھے۔ اس کی ماں کا بڑا ارمان تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے یہ کنگن بہو کے ہاتھوں میں پہنائے لیکن وہ اس ارمان کو سینے میں لیے مرگئی تھی۔ بعض اوقات آدمی کیسے کیسے سپنے دیکھتا ہے۔ اس کی ماں کا یہ سپنا پورا نہیں ہوا تھا۔ پرانے وقتوں کی بڑی وضع دار عورت تھی جو واقعی یہ سمجھتی تھی کہ زندگی اور موت کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ وہ مجبور تھی اور ستی نہیں ہوسکتی تھی ورنہ وہ اپنے پتی سے دو مہینے پیچھے نہ رہتی۔ ان کنگنوں کو اس کی ماں کا چہرہ چشم تصور میں ابھر آیا تو اس کا دل تو اس کا دل بھر آیا تھا اور آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

سدھو نے دونوں کنگن جیب میں ڈال لیے۔ صندوق بند کر کے چارپائی کے نیچے دھکیل دیا۔ پھر وہ بڑے جذباتی لہجے میں بولا۔

''ماں......! مجھے شما کر دینا۔ تمہارے مرنے کے بعد میں تمہاری آرزو اور ارمان پورا نہ کرسکا۔''

وہ دروازہ بند کر کے باہر آ گیا اور سرسوتی کے گھر کی طرف چلنے لگا۔ وہ ماں کی آرزو کو ایک طوائف کے چرنوں میں بھینٹ کرنے جا رہا تھا۔ وہ ایک دوست اور ایسی عورت کے لیے مجبور ہوگیا تھا۔ جسے وہ سگی بہن سے بڑھ کر چاہتا تھا۔ یہ جذبے بھی کیسے عجیب اور انمول ہوتے ہیں جن کی کوئی قیمت ادا نہیں کرسکتا ہے اور نہ ہی خرید سکتا ہے لیکن اس کے دل اور ضمیر میں کوئی چبھن نہیں تھی، اسے یقین تھا کہ اگر آج اس کی ماں زندہ ہوتی تو کبھی خفا نہ ہوتی۔ کیوں کہ وہ بڑی فراخ دل اور فیاض قسم کی عورت تھی۔

سرسوتی کے دروازے پر رک کر اس نے گلی کا جائزہ لیا۔ پھر آگے پیچھے دیکھا جیسے وہ کسی جرم کی نیت سے آیا ہو۔ وہ ہر طرح سے اپنی تسلی اور اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ گلی کے نکڑ پر ایک گھر کے باہر بجری پڑی جہاں کوئی تعمیراتی کام ہو رہا تھا اس پر سات آٹھ برس کے دو بچے کشتی لڑ رہے تھے اور دہلیز پر ایک بوڑھا شخص بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ سرسوتی کے گھر سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ بیٹری کا یہ ریڈیو اس کے کسی چاہنے والے نے دیا تھا۔ دروازے کے نیچے سے روشنی کسی نوجوان لڑکی کی طرح جھانک رہی تھی۔ پھر اس نے دروازے سے کان لگا دیے۔ لیکن اندر سے کسی مرد کے ہنسنے بولنے کی آواز آ رہی تھی اور نہ ہی سرسوتی کی سرگوشیاں گونج رہی تھیں۔ اس وقت سرسوتی گھر میں اکیلی تھی۔ سدھو نے ہمت جمع کر کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

سرسوتی سرخ چولی پہن رکھی تھی جس کا گریبان خطرناک حد تک کھلا ہوا اس کی آستینیں بھی نہیں تھیں۔ چولی زیر جامہ لگ رہی تھی۔ اس نے گھاگھرا ناف سے نیچے باندھ رکھا تھا۔ تیل سے چمکتے ہوئے بالوں میں موتیے کے پھول اور آنکھوں میں کاجل لگائے وہ دروازہ کھولنے آئی تھی۔ سدھو نے دروازہ کھلتے ہی وہ اک دم سے اندر گھس گیا اور اس نے سرعت سے پلٹ کے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی جیسے وہ اس کے چہرے پر جھکنے کے لیے اسے دبوچ لینا چاہتا ہو۔

''کیا بات ہے......؟'' سرسوتی بڑے زور سے ہنسی اور شوخی سے بولی۔ ''کہیں تیرے پیچھے پولیس تو نہیں لگی ہوئی ہے؟''

''نہیں یہ بات نہیں۔'' سدھو اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرایا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ کوئی اور میرے پیچھے گھس آئے۔''

سرسوتی نے سدھو کو ایسی مدھ بھری نظروں سے دیکھا جن میں شوخی بھری ہوئی تھی۔ پھر ان نگاہوں میں دزدیدگی کی سرخی بھی گھل گئی تھی۔ کاجل کی لکیر آنکھوں کے گوشوں سے باہر تک پھیل گئی تھی۔ اس کا کام ہی مردوں کو لگاوٹ اور خود سپردگی سے

دیکھنا تاکہ شکار کی طرح جال میں پھنس جائے۔ وہ ایسی حالت اور چولی میں ملبوس ہوتی تھی کہ یہ سب کچھ آدمی اور اس کی جیب سے مشروط ہوتا تھا۔ اگر مرد اسے کسی بھی حالت میں دیکھ کر سودا طے نہ کرتا تو پھر اسے پانچ روپے منہ دکھائی دینا پڑتی تھی۔

''اچھا......!'' وہ دونوں ہاتھ مرمریں اور عریاں کمر کے خموں پر رکھ کے بڑے ناز و ادا سے بولی۔ ''سدھو......! یہ تجھے اچانک کیا ہو گیا ہے؟ پہلے تو کبھی بھی ادھر بھولے سے بھی یہاں نہیں آیا تھا اور نہ ہی گزرا تھا؟ کہیں تو نے پی تو نہیں رکھی ہے؟''

''کبھی نہ کبھی تو مجھے بھی یہاں آنا تھا۔'' عورت ایسی چیز ہے کہ آدمی اس سے دور رہ ہی نہیں سکتا ہے؟''

سدھو نے بڑی بے پروائی کے انداز میں جیب سے سونے کا ایک کنگن نکالا اور اسے تیزی سے انگلیوں پر گھمانے لگا اور پھر دوسرے لمحے غیر محسوس انداز سے کن انکھیوں سے سرسوتی کی طرف دیکھا۔ اس کی چال کامیاب رہی تھی۔ آخر کیوں نہ ہوتی۔ وہ عورتوں کی کمزوری سے خوب واقف ہوتا۔ سونے کا زیور جس کے حصول کے لیے وہ بہت آگے تک چلی جاتی تھیں۔

سرسوتی کی نظریں اس خوب صورت کنگن پر جم گئی تھیں اور اس کے چہرے پر ایک حیرت سی چھا گئی تھی۔

''ایسے دیکھ رہی ہو جیسے پہلے کبھی کوئی کنگن نہیں دیکھا؟'' سدھو نے کہا پھر وہ آگے بڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا پھر اس نے کنگن کو سرسوتی کی نظروں کے سامنے پنڈولم کی طرح لہرایا۔ ''پرانے وقتوں کا خالص سونا ہے۔ اس میں رتی ماشہ بھی کھوٹ نہیں ہے۔''

پھر اس نے کنگن سرسوتی کی طرف اس طرح بڑھا دیا جیسے وہ اسے دکھانے نہیں بلکہ دینے آیا ہو۔ سرسوتی نے بے یقینی کے ساتھ اس کے ہاتھوں سے کنگن لے لیا۔ سرسوتی منتظر تھی کہ سدھو کے کچھ کہنے کی نہیں صرف اشارے کی دیر تھی وہ تلوار کی طرح میان سے باہر آجاتی اور اس کے گلے میں اپنی مرمریں، سڈول اور عریاں بانہیں حمائل کر دیتی۔ مگر وہ تو بے وقوفوں کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اسے بات کا آغاز کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ کیوں کہ زندگی میں اسے پہلی بار ایک ایسی عورت کے پاس آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ جس کی زندگی میں ہر قسم اور ہر عمر کے نوجوان اور مرد دن رات آتے جاتے تھے۔ وہ ایک ہی نگاہ میں اپنے سودائی کو تاڑ لیتی تھی۔

سرسوتی کے ہاتھ چولی کی ڈوری کی طرف بڑھنے لگے تو سدھو نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

''یہ دو تولے کا کنگن ہے جس کی قیمت سے تم اچھی طرح واقف ہو گی؟ سونا کے بھاؤ کیا ہیں؟''

''ہاں...... ہاں مجھے اندازہ ہے۔'' سرسوتی کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے اشتیاق اور امید بھری مسکراہٹ سے کہا۔ ''تو کیا یہ کنگن تم مجھے دان کرنے کے لیے آئے ہو؟''

''ہاں...... تم یہی سمجھ لو لیکن وقت گزاری کے عوض نہیں......'' سدھو نے اقرار میں گردن ہلائی اور اس کا ہاتھ تھام لیا جو چولی کی ڈوری کھینچنے جا رہا تھا۔ کیوں کہ ہر مرد پہلے شیر خوار بن جاتا تھا۔ ''سرسوتی تم یہ مت سمجھنا کہ میں نشے میں ہوں۔ تم جو کچھ سمجھ رہی ہو وہ کام تو بیس سے پچاس روپے کے نوٹ سے بھی چل سکتا تھا۔ لیکن میرا کام کچھ اور ہے۔ میرے پاس اس جیسا دوسرا اتنے ہی وزن کا ایک کنگن اور بھی ہے اور یہ جوڑی تیری ہو سکتی ہے۔'' اس نے توقف کر کے دوسرا کنگن نکال کر دکھایا۔ ''اگر تو نے میرا کام کر دکھایا تو میں تجھے یہ دوسرا کنگن بھی دے دوں گا۔ ورنہ یہ واپس لے جاؤں گا۔''

''تو کیا مجھ سے کوئی بہت خطرناک کام لینا چاہتا ہے؟'' سرسوتی کا حسین چہرہ کسی انجانے خیال سے متغیر ہو گیا۔ ''دیکھ سدھو! تو بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ میں کوئی اچھی عورت نہیں ہوں مگر میں ایسا کوئی کام نہیں کر سکتی جس سے میری زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ میری عزت آبرو کوئی چیز نہیں مگر میں

اپنی زندگی کسی داؤ پر لگانا نہیں چاہتی۔ ہر ایک کو اپنی جان بہت پیاری اور قیمتی ہوتی ہے۔''

''نہیں تجھ پر کوئی آنچ نہیں آ پائے گی؟'' سدھو نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''تو جانو کے بھائی کو جانتی ہے نا؟ تجھے اس سے صرف ایک بات معلوم کرنی ہے۔ اگر وہ تجھے کچھ نہ بتائے تو اس کے یار وشوانا تھ سے یہی بات معلوم کرنا ہے۔ اس طرح سے کہ ان دونوں کو ذرہ برابر بھی شبہ نہ ہونے پائے۔ یہ بات تو بہت اچھی طرح جانتی ہے کہ ایک عورت ایک مرد سے کس وقت کیا معلوم کر سکتی ہے؟ میں تجھے دو راتوں کا معاوضہ دو کنگن دے رہا ہوں۔ یہ میری ماں نے اپنی ہونے والی بہو کے لیے بڑے ارمان سے پیٹ کاٹ کر پیسے جوڑ جوڑ کر بنائے تھے۔ لیکن مجبوری ایسی چیز ہے جس کے لیے بہت کچھ کرنا اور دان دینا پڑتا ہے۔ بہت بڑی مجبوری آ گئی ہے۔''

''لیکن جو کام تو مجھ سے لینا چاہتا ہے وہ ایسا کیا کام ہے جو اتنی قیمتی کنگن دے رہا ہے؟'' سرسوتی نے خوف سے پوچھا۔

سدھو نے سانس لینے کے لیے توقف کیا تو سرسوتی نے پھر سابقہ سوال دہرایا۔ وہ اب بھی خوف زدہ تھی۔

''صبر کر بتاتا ہوں۔'' سدھو نے اپنی بات جاری رکھی۔

اگر تو نے ہشیاری سے کام لیا تو کل صبح اس کے گھر سے لوٹتے وقت مجھ سے دوسرا کنگن بھی لیتے جانا...... ورنہ پرسوں صبح میں تیرا انتظار کر دوں گا۔ کہ تو نے وشوانا تھ سے کیا معلوم کیا؟ اب تو میری بات غور سے سن اور اتنا سمجھ لے کہ ایک مجبور عورت کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ یہ بات تیرے اور میرے سوا کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔''

سدھو نے پوری رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ ایک پل کے لیے بھی اس نے پلکیں جھپکائیں تھیں۔ اس نے ایک بڑا جوا کھیلا تھا۔ اتنا بڑا جوا کہ وہ زندگی بھی ہار سکتا تھا۔ پیسے پر بسر کرنے والی عورت بھروسے کے قابل کہاں ہوتی ہے۔ اگر سرسوتی نے بتا دیا کہ سدھو کنگن لے کر اس کے پاس کس نیت سے آیا تھا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ اسے یہ امید بھی تھی کہ دوسرا کنگن حاصل کرنے کا لالچ سرسوتی کو مجبور کر دے گا کہ وہ راز کو راز رکھے۔ اور وہ حربے آزما کر ازل سے ہر عورت کامیابی حاصل کرتی آئی تھی۔ مطلب کی بات پوچھ لے۔ ایک زندگی بچانے کے لیے وہ کنگن اس کے مقابلے میں کچھ بھی تو نہ تھے۔ اگر حاصل کچھ نہ ہوا تو یہ قربانی رائگاں جائے گی۔ ماں کے چھوڑے ہوئے کنگن کسی کی جان بچانے کے لیے بھینٹ تو کیے جا سکتے تھے مگر حرام کے مال کی طرح لٹائے نہیں جا سکتے تھے۔ اس کی ماں نے برسوں پیسہ جوڑ جوڑ کر بنائے تھے۔ یہ ماں بھی کیا چیز ہوتی ہے! اس کی ماں تاکتنی عظیم ہوتی ہے۔

سدھو جو کسی سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ یہ بات سرسوتی بھی بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اس نے سدھو کے اعتماد کو دھوکا دیا یا پھر جھوٹ بولا تو اس کا کیا حشر نشر ہو گا؟ صبح ہر روز کی طرح تانگا جوتنے کی بجائے وہ چارپائی پر لیٹا رہا اور خالی پیٹ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ دھواں اس کے پیٹ میں گولے کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ چاچا کی دکان پر جا کر ابلتی ہوئی گرم گرم بالائی والی چائے کے دو گلاس پی کر آئے۔ لیکن اسے ڈر تھا کہ اتنی دیر میں سرسوتی آ کر چلی نہ جائے۔ یہ رات تو اس نے صرف اور صرف سرسوتی کے انتظار میں انگاروں پر لوٹ کے کاٹی تھی۔

جب سگریٹ ختم ہو گئے تو اس نے باہر کا دروازہ کھول کے جھانکا۔ اب دن اتنا چڑھ گیا تھا کہ اب سرسوتی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے جسم کے گرد کمبل لپیٹا۔ بکھرے ہوئے بالوں میں ہاتھ سے کنگھی کی اور چاچا کے دکان کی طرف چلنے لگا۔ وہ تھکن کے علاوہ مایوسی کا شکار تھا اور دل پر پریشانی کا بوجھ سا محسوس کر رہا تھا۔ سرسوتی کی ایک رات کی کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ اس نے لکڑی

کی بینچ پر بیٹھ کر چائے کا گلاس سامنے رکھ لیا۔ اس میں بن کے ٹکڑے ڈبو کر کھانے لگا۔ جب چاچا نے اس سے دوسری بار پوچھا کہ آج اس نے تانگا کیوں نہیں جوتا تو وہ اک دم سے چونک پڑا۔

''تجھے کیا ہوگیا ہے رے سدھو بیٹے!'' چاچا نے دوسرا گلاس بھرتے ہوئے اس سے بڑے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔'' آج ٹھیک نہیں لگ رہا ہے؟''

''ہاں چاچا! کچھ سردی کا اثر ہے۔'' سدھو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔'' لگتا ہے بخار ہوگیا ہے۔ بدن بھی ٹوٹ رہا ہے۔''

''ایک پڑیا جوشاندہ کی مجھے بھی لادے۔'' چاچا نے اس کی کسی ماہر حکیم کی طرح نبض دیکھی۔'' میں ابال دوں گا۔ تو کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔'' سدھو سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کے ایک قدم چلا ہی تھا کہ ایک بچے نے اس کے کمبل کا کونا پکڑ کے کھینچا...... سدھو کو ذہن پر بہت زور دینے پر بھی اس بارہ برس کے بچے کا نام یاد نہ آیا جو بہت خوب صورت اور گول مٹول سا تھا۔

''سدھو چاچا......!'' لڑکے نے کہا۔'' تمہیں سرسوتی دیدی نے بلایا ہے اور کہا ہے کہ تم ابھی اور اسی وقت آ جاؤ۔ اب تم جلدی سے پہنچو۔''

سدھو کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو اس کے ہاتھ میں پچاس پیسے کا سکہ تھا۔ اس نے بچے کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر وہ برقی سرعت سے سرسوتی کے گھر کی طرف لپک گیا۔ سرسوتی دروازے کے پاس ہی کھڑی ہوئی تھی اور وہ کسی سنسناتے ہوئے تیر کی مانند گھس گیا۔ سرسوتی نے دروازہ بند کیا اور پلٹی تو وہ بولا۔

''سرسوتی! کیا خبر ہے؟ کچھ پتا چلا کہ نہ؟''

''ہاں...... پتا چل گیا ہے۔'' سرسوتی نے اقرار میں سر ہلا دیا۔'' کیسے پتا نہیں چلتا۔'' پھر اس نے سنجیدگی سے سدھو کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کیے چند ساعتوں کے بعد بولی۔'' سدھو! یہ تو بتا کہ چکر ہے؟''

''تجھے کنگن چاہیے نا؟'' سدھو نے بگڑ کے برہمی سے کہا۔'' فضول باتیں کیوں کرتی ہے۔ جلدی سے بتا کہ تو کیا معلوم کر کے آئی ہے؟''

سرسوتی نے چولی کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کنگن باہر نکال کے اس کے سامنے رکھ دیا۔ پھر وہ تیزی سے بولی۔'' جب تک تو مجھے پوری بات نہیں بتائے گا۔ میں بھی تجھے کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' پھر وہ اپنی چولی ٹھیک کرنے لگی۔'' تو اپنا کنگن واپس لے جا۔''

سدھو کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کے جی میں تو آیا تھا کہ وہ سرسوتی کے منہ پر ایسا زوردار تھپڑ رسید کر دے کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ لیکن اس نے اپنے اندر اٹھتے ہوئے غصے کی شدید لہر کو روک لیا اور پھر وہ بولا۔

''سرسوتی! جن باتوں سے تیرا کوئی کسی طرح سے بھی تعلق نہیں وہ معلوم کر کے کیا کرے گی؟ کیوں کہ کچھ باتیں ایسی ہی ہوتی ہیں معلوم نہ ہوں تو اچھا ہی ہوتا ہے ورنہ جو بات زبان سے نکل جاتی ہے وہ سارے زمانے کو معلوم ہو جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے تیری زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے۔ تو جانتی ہے اور میں تجھے بتا چکا ہوں کہ کنگن میری ماں کی نشانی ہیں مجھے کتنی عزیز ہیں۔ میں اس سے زیادہ تجھے اور کیا دے سکتا ہوں۔''

''مجھے کانتا سے بہت پیار ہے۔'' سرسوتی نے اچانک کہا۔'' اگر تو اس کی خاطر یہ سب کچھ کر رہا ہے تو اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتا۔ وہ بیوہ سہی لیکن جتنی حسین ہے اس سے کہیں جسمانی طور پر پرکشش بھی ہے۔''

نرم خو طبیعت کا سدھو اس اشتعال انگیز بات کو پی گیا۔ کوئی اور کہتا تو وہ اس کا منہ توڑ دیتا۔

''سرسوتی! وہ میری بہن ہے اور میں اسے دیدی کہتا ہوں۔ دیدی ماں کی جگہ ہوتی ہے کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کی زبان کھینچ لیتا مگر میں عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ تو...... تو صرف پیسے کو رشتہ سمجھتی ہے۔ یہ بات کبھی بھی تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔''

''تو نے مندر کے پیچھے برگد کا پرانا درخت

دیکھا ہے؟'' سرسوتی نے اپنے سامنے دیکھتے ہوئے کہا تو اس کا لہجہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ ''منوہر کی لاش اس درخت کے نیچے دفن ہے۔ دیوار کی طرف جا اپنی ماں کے یہ کنگن لے جا کمینے۔ جب تیری پتنی آ جائے تو میری طرف سے پہنا دینا۔ میں کوئی اچھی عورت نہیں ہوں مگر عورت ضرور ہوں۔ یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ ہوگی۔ تو بے فکر رہ۔'' سدھو ہاتھ میں کنگن لیے چند لمحوں تک بت بنا جامد اور بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر سرسوتی کا ہاتھ پکڑ کے چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ پھر اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''سرسوتی! میں بھی کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔ تو مجھ سے بیاہ کرے گی۔ بول؟ لے یہ دونوں کنگن پہن لے۔''

سرسوتی ہنسی۔ ''تو پاگل ہے سدھو......! مجھ جیسی عورت سے کبھی بیاہ نہ کرنا اور ہاں پھر کبھی بھولے سے بھی ادھر نہ آنا۔''

پھر اس نے سدھو کو باہر دھکیل کر دروازہ بند کر لیا اور دونوں ہاتھوں کے پیالے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ یہ پہلا مرد تھا جس نے اس سے شادی کے لیے کہا تھا۔

☆☆☆

اس رات گیارہ بجے سدھو نے اپنے گھوڑے کی پیٹھ کو تھپکی دی۔

''چل بیٹا! ہمیں بہت دور جانا ہے۔ ڈرنا نہیں مردے کسی کو کچھ نہیں کہتے۔''

اس نے کیپٹن منوہر کی گلی سڑی اور بدبودار لاش کو پلاسٹک کی تھیلی میں لپیٹ دیا تھا جو بارش میں تانگے پر ڈالتا تھا پلاسٹک کو اچھی طرح سے بند کر کے اس نے لاش ایک بوری میں ڈال دی تھی اور اب یہ بوری تانگے کی سیٹ کے نیچے پڑی تھی۔ گھوڑا ایک ویران سڑک پر سرپٹ دوڑنے لگا۔ جنگل میں بھوت پھر رہے تھے اور چڑیلیں چلا رہی تھیں مندر کے پیچھے منوہر کی دوسری قبر بھی خالی ہو گئی تھی لیکن زمین برابر تھی۔ اس کی شاید تیسری اور آخری قبر دس میل دور جنگل میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے نہانے کے بعد اپنے برہنہ تن کو خشک کیا اور اس نے ابھی ابھی گیلے اور پانی میں بھیگے بالوں کو اچھی طرح سے خشک کرنے کے بعد انہیں کنگھی سے سلجھا رہی تھی۔ ایک ہاتھ مسلسل حرکت سے بالوں کے ریشم کو ہموار کر رہا تھا۔ سدھو صبح دم سورج نکلنے سے ذرا دیر پہلے آیا تھا اور ذرا سی دیر کے لیے آ کر چلا گیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آدمی سے آدمی اتنا مختلف کیوں ہوتا ہے۔ وہ جو اتنا شریف نہیں ہے۔ دنیا کی نظر میں پاپی اور شیطان نہیں ہے۔ جو حالات کی ہر خرابی کو قبول کرتا جاتا ہے اور بدنامی کی سند، بے غیرتی کا الزام اور بدمعاش کہلانے کا اقرار حاصل کر لیتا ہے۔ اندر سے کتنا خوب صورت روپ دکھنے والا انسان ہوتا ہے۔ وہ کیچڑ میں پڑے ہوئے موتی کی طرح ہوتا ہے۔ جسے زمانہ کنکر سمجھتا ہے۔ اور ٹھوکروں میں رکھتا ہے۔ شریف جو منوہر جیسے معزز، معتبر اور محترم کہلاتے ہیں۔ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیے ہوتے ہیں۔ درندے جن کا نام منوہر ہو یا سلیم اپنی فطرت نہیں بدل سکتے۔ وہ کسی بھی کانتا یا نور جہاں کو ایک شکار سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ آنند پال اور جانو جیسے لوگ ان سے بہتر ہیں کہ اپنی اصلی صورت پر کوئی نقاب نہیں ڈالتے ہیں اور شرافت کا دھوکا نہیں دیتے ہیں۔

اسے امید تھی کہ جانو آج ضرور آئے گا وہ اس کی سواگت کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اس نے ماتھے پر بندیا سجا لی۔ بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں کاجل لگا کر اسے اتنا خوب صورت بنا لیا تھا کہ وہ قاتل لگ رہی تھیں اور اس میں جیسے اماوس کی اندھیری رات اتر آئی تھی۔ منوہر کی لائی ہوئی لپ اسٹک سے اس نے ہونٹوں کے گلابی رنگ کو نکھارا۔ چہرے کے گلابی رنگ پر ہلکا سا غازہ پھیلا کے اس نے ہاتھوں میں موتیا کے تازہ مہکتے گجرے پہن لیے تھے۔ شادی کا جوڑا پہن کر وہ دلہن بن گئی تھی اور اس کی مانگ میں ستارے پھر روشن ہو گئے تھے اور وہ سولہ سنگھار کرنے کے بعد جانو کا انتظار کرنے لگی۔

تھوڑی دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ خود نہ آیا تو اس نے پیغام بھیج کر اسے بلایا۔ وہ فوراً ہی سر کے بل چلا آیا اور دروازے میں قدم رکھتے ہی سحر زدہ سا ہو کر رک گیا۔ اس نے کانتا کو پہلے بھی جانے کتنی بار کس کس

حالت میں نہیں دیکھا تھا مگر وہ کانتا ایک عورت سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اسے چومتا، من مانیاں اور چیرہ دستیاں کرتا رہا تھا اور جو اس کی انا کے لیے ایک چیلنج بن گئی تھی۔ اس لیے وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا مگر اس کانتا کا اپنا آپ اتنا سندر تھا کہ انوکھا بن گیا تھا اور بھگوان کا روپ لگتا تھا۔ وہ رات کی رانی کی طرح مہک رہی تھی۔

''جانو......!'' وہ اسے پیاسی اور خود سپردگی کی نظروں سے دیکھتی ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولی۔ ''میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ تم نے اس رات مجھے ایسا سرشار کیا۔ مجھے اس بات کا افسوس اور ملال ہے کہ میں تم پر فیاضی سے مہربان نہ ہو سکی۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کی تلافی کر دوں۔''

''کانتا! میں نے اس رات جو تمہیں کھلونا بنا کر کھیلا تھا۔ کیا واقعی تم نے مجھے معاف کر دیا؟'' جانو بے یقینی سے کہا۔ ''میں نے تم سے ہر طرح سے دل بہلایا۔ کیوں میرے دل کی رانی! کیا میں بدل گیا ہوں۔ میں تمہارے من کو بھا گیا ہوں؟''

''نہیں جانو! تم بالکل بھی تو نہیں بدلے۔ البتہ میری نظر بدل گئی ہے۔ میں نے منوہر کو ہیرا سمجھ کر جیون ساتھی بنایا۔ چنا تھا۔ مگر وہ پتھر نکلا۔ میں اس کی محبت کا بھرم کب تک رکھوں اور رکھ سکتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے تمہاری ضد میں مجھ سے بیاہ کیا تھا۔ اس نے مجھے عورت نہیں حیوان سمجھا۔ اس کے ساتھ گزرے دن رات میرے لیے کس قدر کرب ناک اور اذیت انگیز ہیں میں بیان نہیں کر سکتی۔ بہرحال اب وہ مر گیا ہے تو اس کا کیا رونا؟ اس نے کون سی محبت دی تھی؟ تم جیسے بھی ہو میرے لیے تمہاری محبت میرے دل میں زندہ ہے۔ اب تمہارے سوا کون ہے اس سنسار میں ...... جسے میں اپنا جیون ساتھی بناؤں۔''

''کانتا......!'' جانو نے کہا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''مجھے نہ جانے کیوں یقین نہیں آ رہا کہ یہ بات تو کہہ رہی ہے؟ کہیں یہ تیری کوئی چال تو نہیں ہے؟ عورت ذات کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا ہے۔'' وہ مشکوک سا ہو رہا تھا۔

کانتا اطمینان سے بستر پر بیٹھ گئی۔ پھر وہ جذباتی لہجے میں کہنے لگی۔

''بات یہ ہے جانو! تیرا میرا یہاں گزارا نہیں ہو سکتا۔ میں نہ صرف لوگوں سے بلکہ بھائی آنند پال سے بھی ڈرتی ہوں۔ اس لیے کہ تو نے آنند پال پر جھوٹا الزام لگا کر جیل بھجوا دیا تھا۔

''ہاں۔'' جانو نے قدرے تذبذب کے بعد اثبات میں سر ہلا کے کہا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ وہ بس جو کالج لڑکیوں کو لے جا رہی تھی۔ اس میں آنند پال کا سایہ تو نام و نشان تک نہ تھا۔ میں اور میرے ساتھیوں کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ لڑکیاں کالج میں ناچ گانے کا پروگرام کرنے جا رہی ہیں۔ ان کی وضع قطع اور لباس ایسا تھا کہ وہ بے لباس سی لگ رہی تھیں۔ پھر ہم نے اس بس کو ویرانے میں رکوا لیا۔ کتنی لڑکیوں کی آبرو لوٹی تھی اور الزام تیرے بھائی اور اس کے بھائیوں پر تھوپ دیا تھا۔ بہرحال بات کچھ اور تھی۔ یہی میرے ساتھ بھی تو ہوا تھا۔''

''لیکن جانو......! اگر تیرے ساتھ زیادتی منوہر نے کی تھی تو بدلہ تم نے میرے بھائی کے ساتھ کیوں لیا؟'' وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

''منوہر مر چکا تھا۔ میں اور کیا کرتا؟'' جانو نے جواب دیا۔

کانتا اسے حیرت سے دیکھتی اور اس کی بات سنتی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔

''جانو......! تجھے کیسے معلوم ہوا کہ منوہر مر گیا ہے؟''

جانو اس طرح اچھلا جیسے اسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ یہ سوال اس کے لیے اچانک اور غیر متوقع تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے ایک خوب صورت کھلونے کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا مگر وہ بم تھا جو لگاتے ہی ایک زبردست دھماکے سے پھٹ گیا ہے۔ امرت پانی کا پیالہ اس کے لبوں تک آتے آتے زہر بن گیا تھا۔ وہ تو اس رات کانپا دیکھ رہا تھا جس میں اس نے کانتا کو داغ دار کیا اور ایک پھول کی مسلا اور بری طرح پامال کیا تھا۔

اس نے بڑی مشکل سے اپنی حالت سنبھالی۔

''کانتا ......! تو نے مجھے یہاں بے وقوف بنانے کے لیے بلایا ہے؟ تو نے یہ سوال کس مقصد کے تحت کیا؟''

''مقصد کیا جانو ......! میں تو یہ بات اس لیے پوچھ رہی تھی کہ جنگ میں جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کے قریبی وارث کو اطلاع ضرور دی جاتی ہے۔'' کانتا نے بڑی سادگی سے کہا۔ ''میں تو اس کی پتنی تھی لیکن مجھے اس کی خبر نہیں ملی؟ آخر کس لیے؟''

غصے سے جانو کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھوں میں انگارے بھر گئے وہ کرخت لہجے میں کہنے لگا۔

''حرام زادی! تو جانو سے مذاق کرتی ہے؟ اب تجھے اس وقت معلوم ہوگا جب پولیس منوہر کی لاش میری نشان دہی پر برآمد کرے گی۔ تب میں گواہی دوں گا کہ میں نے اس عورت کو اپنے پتی کی لاش گاڑتے دیکھا تھا۔''

کانتا نے بے اختیار ایک ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا۔

''ہائے رام ......! جانو کیا تو پاگل ہو گیا ہے؟ میرا پتی آنے والا ہے۔ اگر اس نے سن لیا تو وہ تجھے گولی مار دے گا۔''

''تیرا پتی؟'' جانو نے ہزیانی لہجے میں چیخ کر کہا۔ ''کیا تو نے بیاہ رچا لیا ہے؟ یہ سنگار کیا تو نے اس لیے کیا ہے؟ میں اس حرامی کو بھی قتل کر دوں گا اور ساتھ میں تجھے بھی ...... میں نے تجھے پھانسی کے پھندے تک نہیں پہنچایا تو میرا نام جانو نہیں۔ کتا رکھ دینا کانتا......!''

اگر کانتا کے ہاتھ میں وہ ریوالور نہ ہوتا جو اس دوران اس نے تکیے کے نیچے سے نکال لیا تھا وہ کانتا کی ہڈیاں توڑ ڈال دیتا۔ یہ عورت تو خطرناک ناگن تھی۔ اس کا سر لاٹھی سے کچلا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے حقارت سے فرش پر تھوکا۔ پھر پلٹا اور دروازے کو لات مار کر وہاں سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی ساتھ والے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ کیپٹن امرلال آ گیا۔ کانتا کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

''اگر تم بھی چلی جاتیں تو کوئی بھی تمہارے مقابلے کی اداکارہ نہ ہوتی۔'' امرلال مسکرایا۔ ''لیکن اب ذرا آخری سین اور کلائمکس کے لیے تیار ہو جاؤ۔ وہ یہاں پولیس کو لے کر ضرور آئے گا۔''

کانتا نے سر ہلا دیا اور ریوالور کو سامنے میز پر رکھ دیا۔

پھر وہ دونوں ہم آغوش ہو کر جذباتی ہو گئے۔ ایک دوسرے کو بے تحاشا چومتے رہے۔ محبت بھری باتوں میں ڈوب گئے۔

پون گھنٹے کے بعد باہر کا دروازہ ایک زور دار دھماکے سے کھلا۔ اور تھانے دار کے ساتھ جانو اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے کچھ اور لوگ بھی تھے جو جانو کے ساتھی اور تماشائی بھی تھے۔ اندر قدم رکھتے ہی تھانے دار ٹھٹک کے رک گیا اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر سلیوٹ کے لیے اٹھ گیا۔ کیپٹن کی وردی میں امرلال دونوں ہاتھ پیچھے باندھے بڑے وقار سے آگے بڑھا۔

''تھانے دار جی ......!'' اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''کیا تم لوگوں کے گھروں میں دستک دیے بغیر اس طرح گھس جاتے ہو؟''

''جی ......جی نہیں کپتان صاحب ......!'' تھانے دار نے تھوک نگل کر کہا۔ ''دراصل میں تلاشی لینے آیا تھا۔''

''کیا تلاش کے وارنٹ لائے ہو؟'' امرلال نے اپنا لہجہ سخت رکھا۔ ''کس کی تلاشی لینا ہے تمہیں اور کیوں ......؟''

تھانے دار کی حالت اب غیر ہونے لگی تھی اور جانو کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔

''کپتان صاحب! یہاں ایک عورت رہتی ہے۔ کانتا......اس کے پاس ناجائز اسلحہ ہے۔ اس پر یہ الزام ہے کہ اس نے اپنے پتی کیپٹن منوہر کو قتل کر دیا ہے۔'' امرلال چند لمحوں تک اس کی شکل دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''اس گھر میں صرف ایک کانتا ہے جو میری پتنی ہے۔ اس لیے جو بات بھی کہو خوب سوچ سمجھ کر...... اس گاؤں کے مندر میں کل شام ہمارا بیاہ ہوا ہے اور

ٹں اس لیے بہت سارے گواہ پیش کرسکتا ہوں۔"

"تھانے دار جی......!" جانو نے ہمت کر کے کہا۔ "ریوالور وہ سامنے رکھا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں نے پہلے بھی رپورٹ کی تھی کہ کانتا نے اس ریوالور سے مجھ پر گولی چلائی تھی۔"

امرلال آگے بڑھا اور اس نے میز پر رکھا ہوا ریوالور اٹھایا۔

"یہ تو میرا ریوالور ہے جو مجھے سرکاری طور پر ملا ہے۔" اس نے میگزین کھولا اور چھ کی چھ گولیاں نکال کر ہتھیلی پر رکھ لیں۔ "اس میں ایک گولی بھی کم نہیں ہے۔" پھر اس نے ایک ایک کر کے گولیاں میگزین میں ڈال دیں۔ "اور یہ میری پتنی پر منوہر کے قتل کا الزام لگانے والا کون ہے؟" تھانے دار نے قہر آلود نظروں سے جانو کی طرف دیکھا جس نے اسے ذلت اور مشکل میں ڈال دیا تھا گرفتار کرایا تھا۔ پھر اسے گردن سے پکڑ کے آگے کر دیا۔ "اطلاع دینے والا یہ شخص ہے کپتان صاحب! اس کا کہنا ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے کانتا آپ کی پتنی کو فطری حالت میں قبر کھودتے اور منوہر کی لاش کو گاڑتے دیکھا تھا۔ ایسے یہ بڑا حرامی بدمعاش ہے جناب! پہلے بھی اس نے جھوٹی رپورٹ لکھوائی تھی کہ کانتا دیوی نے اس پر گولی چلائی تھی۔"

"یہ جھوٹ نہیں ہے۔" جانو نے بے عزتی کے باوجود پراعتماد لہجے میں کہا۔ "میں قبر دکھا سکتا ہوں۔ وہاں سے لاش نکل آئی تو؟" کانتا سخت خوف زدہ سی امرلال کے پیچھے چھپی کھڑی ہوئی تھی۔ امرلال نے آہستہ سے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

"تمہارے پاس وہ خط ہے جس میں کیپٹن منوہر کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی؟"

کانتا نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور اندر چلی گئی۔

"کانتا پر قطعی الزام لگایا جا رہا ہے۔" امرلال نے بڑے سکون سے کہا۔ "کیپٹن منوہر اور میں ایک ہی رجمنٹ میں تھے۔ منوہر میدان جنگ میں مارا گیا تھا۔ اس کی شناخت میں نے بھی کی تھی۔ لیکن تم جانتے ہو کہ میدان جنگ میں آخری رسومات ادا کرنا ناممکن ہوتا ہے۔"

کانتا خاکی رنگ کا لفافہ لیے نمودار ہوئی جو اس نے امرلال کی طرف بڑھا دیا۔ امرلال نے اس میں سے ایک ٹائپ شدہ کاغذ نکالا اور تھانے دار کو تھما دیا۔ تھانے دار نے چند سطروں کے پیغام کو پڑھا اور پھر یہ خط واپس کر دیا۔

"یہ تو تمہارا فرض ہے کہ تم تفتیش کرو۔ کیا نام ہے ان کا؟ جانو اگر انہوں نے دیکھا ہے تو اور انہیں یقین ہے تو آپ ان کے ساتھ جائیں اور دیکھیں کہ لاش کس کی ہے اور اسے قتل کس نے کیا ہے؟ میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ لاش کیپٹن منوہر کی ہرگز نہیں ہو سکتی...... اگر یہ الزام غلط ہے تو پھر میری طرف سے رپورٹ درج کر لیں۔ میری پتنی پر ناجائز اسلحہ رکھنے، اپنے پتی اور ایک فوجی افسر کو قتل کرنے کا جھوٹا الزام لگانے پر...... یہ الزامات بہت سنگین ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں سر!" تھانے دار نے سلیوٹ کے بعد جانو کے منہ پر ایک ہاتھ رسید کیا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ فرش پر گر گیا۔ تھانے دار نے اس کی کمر پر ایک لات رسید کی اور کہا۔ "اس کتے کی اولاد سے میں نمٹ لوں گا۔" جانو اٹھ کھڑا ہوا تو تھانے دار نے اسے ایک طرف دھکا دیا۔ "چل دکھا مجھے اپنے باپ کی لاش تم بھی دفع ہو جاؤ سور کے بچے۔" اس نے بہت پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں کو قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ جب سور کے بچے چلے گئے اور جانو تھانے دار کے ساتھ جھوٹے اعتماد کے سہارے روانہ ہو گیا تو کانتا پر پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"مجھے کہتے ہو اداکارہ...... تم کیا کم ہو؟" کانتا بولی۔ "تھانے دار خط رکھ لیتا تو؟"

"اس بے چارے کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ اس میں اتنی ہمت کہاں تھی؟" امرلال ہنس دیا۔

امرلال نے جیب سے لائٹر نکالا اور وہ خط جلانے لگا جس میں کیپٹن منوہر کے بارے میں سرکاری طور پر اس کی بیوہ کو بڑے افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دی گئی تھی کہ اس کا پتی میدان جنگ میں بڑی بہادری سے دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔

☆☆

میرے خواب مٹھادو

تحسین انجم

عشق آگ ہے اور محبوب کے سوا ہر چیز کو جلادیتا ہے۔ اس نے نادانستگی میں اپنی ہی راہوں میں کانٹے بودیے اور جب اسے کوئی راستہ سجھائی نہ دیا تو بے رخی کا دیار اس کا مسکن بن گیا۔

ایک کم فہم کا المیہ، چراغ جاں کو جلانے میں اس نے اپنے کتنے ارمانوں کا خون کیا



سورج کی نرم نرم روپہلی کرنوں نے جیسے ہی اس کی آنکھوں کو چھوا اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں کھڑکی سے باہر نکھری ہوئی تازہ تازہ سبز دھوپ دیکھ کر اس کی آنکھیں خوب صورت خیال کے تحت شرارت سے جگمگا اٹھیں۔ لیکن فوراً ہی اچانک کر اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو گھڑی پورے آٹھ بجا رہی تھی۔

''اوہ خدایا......'' وہ اچھل کر بستر سے اترا، چپل پاؤں میں پھنسائے وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ سیٹی پہ شوخ سی دھن بجاتے ہوئے اس نے جلدی سے غسل کیا اور پھر کپڑے بدل کر دو چار کتابیں ہاتھ میں لیے تیزی سے باہر بھاگا۔

''شیری......'' وہ بھاگتا ہوا ایک دم رک گیا۔

''جی خالہ امی......'' اس نے گھبراہٹ سے گھڑی پہ نظر ڈالی۔

''سر احسان کی کلاس شروع ہونے والی ہوگی اور یہ خالہ بی۔'' وہ جھنجلایا۔

''انہیں بھی اسی وقت آواز دینا تھی۔''

''بیٹا چائے تو پی لو۔''

''ارے چھوڑیے خالہ امی!'' وہ بڑبڑایا۔ ''اتنا وقت ضائع کروادیا...... کم بخت چائے کی خاطر۔'' وہ فوراً نو دو گیارہ ہوگیا۔

''ہوں، اسی چائے کے لیے مرتا ہے اور آج یہ کم بخت ہوگئی۔'' خالہ امی کی بڑبڑاہٹ نے دور تک پیچھا کیا تو وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

ڈیپارٹمنٹ کے قریب پہنچا تو ساڑھے آٹھ ہو چکے تھے اس کی جان ہی نکل گئی۔

اتنا اہم لیکچر تھا۔ جانے سر احسان اندر جانے دیں یا نہیں۔ گھبراہٹ میں وہ اور تیز بھاگا تو سامنے آنے والے سے ٹکرا گیا۔ اسے دن میں تارے نظر آئے۔

''اچھی مصیبت ہے۔'' دیکھ کر چلنا تو گناہ سمجھا جاتا ہے چاہے کسی کا کتنا نقصان...... اس نے اوپر دیکھا۔

''اوہ۔'' تیزی سے چلتی زبان کو ایک دم بریک لگ گئے۔ ''آپ......؟''

سبز پرنٹڈ شرٹ اور سفید شلوار میں وہی گھبرایا گھبرایا چہرہ اس کے سامنے تھا جس نے چار روز اسے پریشان کر رکھا تھا۔

''معاف کیجیے گا۔'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''وہ سر احسان کی کلاس......''

''اوہ۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دلکشی سے مسکرایا۔

''تو آپ کے ساتھ بھی یہی پرابلم ہے؟''

''تو کیا آپ بھی......؟'' اس کی سادہ مگر پرکشش آنکھیں جگمگا اٹھیں۔

''جی ہاں، میں بھی اسی لیے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا لیکن اب تو......'' اس نے گھڑی دیکھی۔ ''پونے نو ہو چکے ہیں۔''

''کیا واقعی۔'' اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''جی ہاں۔'' شیری نے بڑے غور سے اس کی سیاہ آنکھوں کی طرف دیکھا۔

''کلاس تو مس ہو ہی گئی، آیئے کہیں بیٹھتے ہیں۔''

''جی، کیا مطلب؟'' اس کی آنکھوں میں حیرت سی بھر گئی۔ شیری نے ایک لمحے کو اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔

''کس بات کا مطلب پوچھ رہی ہیں آپ؟''

اس نے اتنی معصومیت سے کہا کہ لڑکی کے لبوں پہ ایک لمحے کو مسکراہٹ آئی۔ وہ دھیرے سے اچھا کہتی ہوئی اس کے ساتھ ہولی۔

نرم نرم گھاس پر بیٹھتے ہوئے شیری خوشی سے خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہا تھا۔

''میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔''

دور ڈیپارٹمنٹ کے آخری سرے پر نظریں جمائے وہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ ایک دم چونک گئی۔

''مجھے نادیہ کہتے ہیں۔''

وہ اور بھی بہت کچھ پوچھ لینا چاہتا تھا لیکن اسی وقت سر احسان کی کلاس ختم ہوگئی اور وہ معذرت کرتی ہوئی اٹھ گئی۔ وہ اتنی سنجیدہ ہوگئی تھی کہ شیری اسے روکنے کی جرأت نہ کرسکا۔ تب ہی آصف، عون، عادل اور فرخ کے شریر ٹولے نے اس پر ہلہ بول دیا۔

''غضب کیا یار۔'' آصف کتابیں گھاس پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ ''بڑا غضب کیا جو سر احسان کی کلاس مس کی۔'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ گم صم کیوں ہیں جناب۔'' عادل نے شرارت آمیز مسکراہٹ سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''تم سر احسان کی کلاس کا ذکر کر رہے تھے؟''

''ہاں یار۔'' عادل کو یکایک جیسے کچھ یاد آ گیا۔

''وہ کاشر ہے نا......! کاشر عزمی۔''

''کاشر عزمی۔''

''ہاں وہی۔'' پتا نہیں کیا بات تھی۔ بے چارہ بار بار مڑ کر کلاس روم کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سر احسان نے کچھ دیر تو صبر کیا لیکن جب کاشر نے پانچویں بار پھر اسی بے چینی سے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا تو سر احسان نے زور سے ڈائس پر مکا مارا۔

''پھر کیا ہوا؟'' شہریار بے تابی سے بولا۔

پھر سر احسان بڑے ڈرامائی انداز میں نارمل ہوگئے اور بڑے وقار سے کہا۔

''کاشر! اگر آپ کو بہت شدت سے کسی کا انتظار ہے تو آپ باہر جاسکتے ہیں۔''

''اچھا......؟'' شہریار حیرت سے بولا۔

اور مزے کی بات یہ ہے کہ شیری کہ کاشر واقعی اٹھ کر باہر چلا گیا۔

''واقعی؟'' شہریار اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ سر احسان کے سامنے اتنی بڑی جرأت۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''ارے سر احسان ادھر آ رہے ہیں۔'' سب نے بجلی کی سی تیزی سے ادھر دیکھا اور پھر اپنی کتابیں پکڑ کر غائب ہوگئے۔

یہ پانچوں شریر آصف، عون، فرخ، عادل اور شہریار میں دوستی کا ایسا بندھن بندھ گیا تھا کہ سب رشک کرتے تھے۔

ان کے دم سے یونیورسٹی کے اس ڈیپارٹمنٹ میں قہقہے بکھرتے۔ اپنی مدھر باتوں کا جادو جگاتے لیکن رات کو سب انہماک سے اسٹڈی میں مصروف ہوجاتے۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں انہوں نے سب کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہیں وہ پروفیسرز کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔

شہریار تو ہمیشہ اپنے مضمونوں میں ٹاپ کرتا تھا۔ سب کا پسندیدہ مضمون کیمسٹری تھا۔ لیکچر روم میں وہ بے حد سیریس ہوکر بیٹھتے۔ پریکٹیکل کرتے وقت یوں لگتا جیسے انہیں دنیا کی کوئی قوت اپنی جگہ سے نہیں ہلاسکتی لیکن جیسے ہی وہ باہر آتے۔ ان کی جیسے جون ہی بدل جاتی۔ یوں لگتا جیسے وہ اپنے خول سے باہر نکل آئے ہوں۔

یہی وجہ تھی کہ لڑکیاں اور لڑکے دونوں ان سے خائف رہتے۔

دراصل ان کو شو آف کرنے والے لڑکوں اور زیادہ بننے سنورنے اور منہ بنا کر بات کرنے والی لڑکیوں سے چڑ تھی اور وہ اکثر کا ناطقہ بند رکھتے تھے۔

☆☆☆

کراچی میں بارش کا سما اور اثرات دونوں ہی دوسرے شہروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس دن جو کئی ماہ کے بعد بادل ٹوٹ کر برسے تو سارا شہر سیلاب کی زد میں آ گیا۔ کراچی کے باسیوں کے لیے ذرا سی بارش بھی کوئی نہ کوئی پرابلم کھڑی کر دیتی ہے اور اب تو بارش مسلسل تین دن یوں ٹوٹ کر ہوئی تھی کہ سارا شہر متاثر ہوا تھا۔

آج بارش رکے تیسرا دن تھا۔ حالات قدرے بہتر تھے۔ شہریار مسلسل پانچ روز گھر رہ کر بور ہوگیا تھا۔ گھر میں دلچسپی ہی کیا تھا۔ خالہ امی سے تھوڑی بہت باتیں کرلیں۔ گیت سن لیے۔ اخبار پڑھ لیا۔ یا

پھر رات کوٹی وی دیکھ لیا۔ خالہ امی کافی امیر عورت تھیں۔ خالو سعودی عرب گئے ہوئے تھے، کوئی اولاد نہ تھی۔ گھر میں ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، فریج اور گاڑی سبھی کچھ موجود تھے اور جب سے شہریار یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا تھا۔ یہ سبھی چیزیں اسی کے تصرف میں تھیں۔ ویسے بھی خالہ فراخ دل تھیں۔ اسے کسی بات پر روک ٹوک نہ تھی۔ بستر پر لیٹے لیٹے جوں ہی اس نے بیزاری سے کروٹ بدلی، فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اخبار پرے کیا اور لیٹے لیٹے میز قریب کھسکالی۔

''ہیلو.....'' ریسیور کان سے لگا کر اس نے اپنی قمیص کے کھلے بٹن بند کرنے شروع کر دیے۔

''اوہ عادل۔'' اس کے بیزار چہرے پہ خوشی کی لہریں کھل پڑیں۔

دونوں چپکے چپکے کتنی دیر تک کچھ طے کرتے رہے اور پھر شہریار ریسیور رکھ کر چھلانگ مارنے کے انداز میں پلنگ سے اترا اور سیدھا خالہ امی کے پاس جا بیٹھا۔ وہ کچن میں مصروف تھیں۔

''خالہ امی۔'' اس نے کھلنڈرے بچوں کی طرح ان کے گلے میں بازو ڈال دیے۔ ''ایک کپ چائے جلدی سے۔''

آسیہ بیگم نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''اب کم بخت چائے کیوں مانگ رہے ہو؟''

''ارے خالہ امی۔'' وہ بچوں کی مانند بولا۔ ''بڑی بھولی ہیں آپ۔ آج کی چائے کم بخت کہاں......خوش بخت ہے۔ خوش بخت۔''

''چل ہٹ، تجھے تو شرارتوں کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔''

''آپ کا لاڈلا شیری جو ٹھہرا......''

سڑکوں کی حالت بہت ابتر تھی۔ وہ دھیرے دھیرے احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ہر بس اسٹاپ پر بے حد بھیڑ تھی، اتنے دونوں کے تعطل کے بعد لوگ آج خریداری کرنے نکلے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے گاڑی چلا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کی نظریں ہر چہرے پر پڑ رہی تھیں اور تب ہی اس کی آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی یہاں کوئی بس اسٹاپ بھی نہ تھا۔

لیکن وہ ٹراؤزر کے ساتھ سبز چیک دار شرٹ پہنے ربڑ بینڈ سے بال باندھے۔ کندھے پر بیگ لٹکائے کھڑی تھی۔ اور گردن موڑے مسلسل ایک ہی رخ پہ دیکھے جا رہی تھی۔ شہریار نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا، ہلکے سبز رنگ کی چھوٹی سی کار بھاگی جا رہی تھی۔ شہریار نے جب گاڑی اس کے بالکل پاس روکی تو وہ بری طرح اچھل کر پیچھے ہٹی اور پھر بے حد پریشان نظروں سے اسے دیکھا اور شہریار کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

اس کا چہرہ بے حد زرد ہو رہا تھا جس سے بہت زیادہ پریشانی ظاہر ہو رہی تھی اور خوب صورت سیاہ آنکھوں میں کتنے ہی آنسو بھرے تھے وہ بے چین ہو کر باہر نکل آیا۔

''نادیہ! آپ اس وقت یہاں۔'' جانے کتنی مشکل سے اس کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہوئے ورنہ اس کا دل تو نادیہ کے آنسوؤں کو دیکھ کر دھڑک دھڑک کر دیوانہ ہو رہا تھا۔

''نادیہ! آپ اس وقت یہاں۔'' آنکھیں برس پڑنے کو بے تاب نظر آئیں لیکن اس نے کمال ضبط سے ان آنسوؤں کو اندر ہی اندر پی لیا۔ اس کوشش میں زرد زرد چہرہ سرخ ہونے لگا۔

''میں دراصل شاپنگ کے لیے گئی تھی۔'' وہ بڑے ضبط سے مسکرائی۔

''لیکن کوئی بس نہ ملی تو پیدل ہی چل پڑی۔''

اتنے صاف جھوٹ پر شہریار کا چہرہ بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے بے حد گہری نظروں سے نادیہ کی طرف دیکھا نادیہ نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

جانے اسے کیا تکلیف ہے جانے وہ کن حالات سے دوچار ہے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''آیئے، آپ کو جہاں بھی جانا ہو پہنچا دوں۔''

نادیہ نے نہ انکار کیا اور نہ ہی اس کی طرف

دیکھا چپ چاپ دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔
شہریار بہت آہستہ گاڑی چلا رہا تھا لیکن اس کی ساری توجہ نادیہ کی طرف تھی جو بے حد گھبرائی نظروں سے چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ جیسے اپنے دیکھ لیے جانے کا ڈر ہو، کبھی کبھی چور نظروں سے شہریار کی سمت بھی دیکھ لیتی۔ اس وقت شہریار اپنے آپ کو لاپرواظاہر کرتا۔
اور جب نادیہ کی پریشانی میں کمی نہ آئی تو شہریار نے گاڑی روک لی۔
نادیہ یوں چونکی جیسے اچانک کوئی حادثہ رونما ہو گیا ہو۔
''آپ کچھ پریشان ہیں نادیہ؟''
''نہیں تو۔'' وہ جلدی سے بولی۔
''مجھے بتانا نہیں چاہتیں......؟'' اس نے بے حد گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ ایک لمحے کو وہ سٹپٹا گئی پھر نارمل ہو گئی۔ شہریار کی عمیق نظریں اسی کے چہرے پر جمی تھیں۔
نادیہ نے اسے دیکھا۔ ''مجھے بہت جلدی ہے۔''
''اوکے۔'' شہریار آزردگی سے مسکرایا اور گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر دی۔
''ذہنی پریشانیوں میں کسی ہمراز کو شامل کر لینے سے زندگی آسان ہو جاتی۔''
''اور بعض اوقات بہت مشکل بھی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ شہریار نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ چہرے کی زردی بدستور قائم تھی اور آنکھیں اسی طرح پریشان تھیں۔
''شاید آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔'' وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔
''دو ملاقاتوں میں اعتماد کیا ذکر۔'' وہ ابھی تک مسکرانے کے قابل نہ ہو سکی تھی لیکن شہریار کے چہرے پر بڑا دلفریب تبسم بکھر گیا۔
''آپ کا اعتماد بحال کرنے کے لیے مجھے کم از کم کتنی بار ملاقات کرنا ہو گی۔'' اس نے اس کی طرف جھک کر بڑے دلنشین انداز میں پوچھا۔ نادیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''شہریار...... آپ......'' وہ ششدر سی سے دیکھ رہی تھی۔
''مجھے شیری کہتے ہیں......'' وہ سڑک پر نظریں جمائے بڑے ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ تب ہی نادیہ کی منزل آ گئی۔ اس نے نیچے اتر کر پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔
''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''
نادیہ نے مڑ کر ایک سنجیدہ سی نظر اس پر ڈالی اور بنا کچھ کہے مڑ کر بھیڑ میں گم ہو گئی۔ شہریار جانے کتنی دیر یوں ہی بیٹھا رہا اور پھر مسلسل ہارن دینے کی آواز پہ چونک کر آگے بڑھ گیا سب دوست اس سے پہلے ہاسٹل پہنچ چکے تھے۔
اسے دیکھتے ہی اس کے پیچھے پڑ گئے۔
''اتنی دیر۔'' سب کے منہ پہ یہی سوال تھا۔
ایک لمحے کو اس کا دل چاہا اصل وجہ بتا کر سب کو مطمئن کر دے لیکن جانے کیوں!
اسے نادیہ کو یوں سب میں موضوع گفتگو بنانا اچھا نہ لگا۔ پھر اسے کتنے ہی بہانے بنانا پڑے۔
تب کہیں جا کر اس کا پیچھا چھوٹا۔

☆☆☆

آج یونیورسٹی میں خاصی چہل پہل تھی۔ کتنے دنوں کے بعد نکھری نکھری سنہری دھوپ نکلی تھی۔ شہریار نے اپنی گاڑی پارک کی اور جلدی سے اندر کی طرف قدم بڑھائے لیکن اس کے بڑھتے قدم ایک دم رک گئے۔ اس نے دیکھا نادیہ کاشر عزمی کی گاڑی سے اس کے ساتھ اتر رہی تھی۔
اور تب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اسے کل کا واقعہ یاد آ گیا جب وہ سڑک کے کنارے تنہا کھڑی دور تک سبز کار کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور چہرہ پریشانی سے زرد ہو رہا تھا۔ کاشر کی کار بھی ہلکے سبز رنگ کی تھی، اسے یوں محسوس ہوا جیسے یکایک دل پہ بہت بھاری بوجھ

آ گرا ہو۔ کاشر کے ساتھ وہ گاڑی میں کیوں بیٹھی تھی اور کل آخر کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ کاشر اگر اسے یہاں تک لایا تھا تو پھر راستے میں کیوں چھوڑ گیا۔ کیا ان میں جھگڑا ہوا تھا؟ لیکن شہریار کے لیے یہ بات پریشان کن نہ تھی کہ ان میں جھگڑا کیوں ہوا نہ ہی اسے اس بات سے الجھن تھی کہ کاشر اسے وہاں کیوں چھوڑ گیا؟

اس کا دل تو اس احساس سے بے کل تھا کہ کاشر اور نادیہ میں کوئی ایسا تعلق موجود ہے کہ جس کی بات پر ان میں کوئی جھگڑا ہو سکتا ہے اور وہ جھگڑا نادیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر سکتا ہے۔ جانے کیوں وہ ایک دم سے بے حد بے چین اور مضطرب ہو گیا اس کا دل چاہا واپس گھر چلا جائے لیکن تب ہی اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ شہریار نے مڑ کر دیکھا وہ عادل تھا۔

”یہاں کیوں کھڑے ہو؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

شہریار کا رنگ اڑا اڑا تھا۔

”شہریار......“ عادل نے بڑے خلوص سے پوچھا۔ ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”نہیں......“ اس کے لبوں پر بڑی مشکل سے جنبش ہوئی۔ ”کیا ہوا؟“

”پتا نہیں......“ شہریار نے بڑے زور سے اپنا سر دبایا۔ ”میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔“

”شیری......“ عادل نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اسے ہوسٹل میں لے آیا۔

”لیٹو یہاں......“ اس نے پلنگ پر دھکیل دیا۔

فرخ، عون اور آصف بھی آ گئے۔ سب گھبرا گئے تھے۔ ”تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔“

”نہیں۔“ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”اب میں ٹھیک ہوں۔“

”سچ کہو؟“ عادل نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم لوگ تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔“ اس نے مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر سجائی ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ صبح ناشتا نہیں کیا نا اس لیے شاید چکر آ گیا ہو۔“

عادل نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

ان سب نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا لیکن وہ کوئی نوٹس لیے بغیر باہر نکل آئے۔

☆☆☆

سوچوں سے کسی کا دامن بھی خالی نہیں ہوتا لیکن بعض سوچیں بڑی ظالم ہوتی ہیں، رات کا کوئی پہر ایسا نہ تھا جب شہریار کے تھکے ہوئے ذہن نے ان سوچوں سے چھٹکارا حاصل نہ کیا ہو۔ پلنگ پر چپ لیٹے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے وہ مسلسل چھت دیکھے جا رہا تھا اور جب وہ سوچتے سوچتے بالکل نڈھال ہو گیا تو ایک نئی سوچ نے اس کا دامن پکڑ لیا آخر میں کیوں نادیہ کے متعلق سوچے جا رہا ہوں؟

”یہ حق مجھے کس نے دیا ہے؟“

وہ جو کوئی بھی ہے جس قسم کے حالات سے دوچار ہے یہ اس کا اپنا مسئلہ ہے۔ پھر میں کس حیثیت سے اس مسئلے کو اپنی جان کا روگ بنا رہا ہوں۔

مگر نادیہ کو معلوم ہو جائے کہ میں اس کی خاطر اس کی وجہ سے اس [illegible] کا [illegible] اس کے کیا جذبات ہوں؟

شاید اسے غصہ [illegible] زیادہ غصہ کہ وہ برداشت ہی نہ کر سکے۔ سب کے سامنے ہی مجھے جھاڑ دے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے...... نادان دل نے پھر اسے فریب دیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک نرم نرم مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر جائے لیکن کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور اپنے بھاری سر کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ سر میں ناقابل برداشت درد ہو رہا تھا۔ جیسے دماغ کی ہر رگ میں الاؤ سا پک رہا ہو۔

وہ اٹھ کر سیدھا کچن میں گیا۔ خود ہی چائے بنائی گرم گرم تازہ خوشبودار چائے نے جیسے سر کی دکھتی ہوئی رگوں پر مرہم رکھ دیا۔ وہ قدرے پرسکون ہوا تو

پھر وہی کھیل شروع ہو گیا۔ امید و نا امیدی کا کھیل۔ وہ دونوں سے نمٹتا رہا اور اسی جد و جہد میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے بیمار ذہن کو سوچوں سے چھٹکارا ملا تو اسے بھی سکون نصیب ہوا اور پھر وہ خوب سویا گھوڑے بیچ کر سویا۔

صبح خالہ امی آئیں تو اسے سوتا دیکھ کر لوٹ آئیں۔ گیارہ بجے فون کی گھنٹی سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو سورج کی تیز کرنیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

جلدی سے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج رہے تھے۔

''اف میں اتنی دیر سویا رہا۔''

اور تب ہی رات کے واقعات بالترتیب اس کے ذہن میں آئے تو دل بڑے زور سے دھڑکا۔

☆☆☆

ڈیپارٹمنٹ میں عجیب سی اداسی کا دور دورہ لگ رہا تھا۔ کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ کوئی باہر نہ تھا۔

اس کا مطلب ہے کوئی کلاس ہو رہی ہے۔ وہ کتابیں گھاس پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ تازہ تازہ سنہری دھوپ میں سر کو بے حد آرام مل رہا تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں بند کر لیں۔

''شہریار۔''

اس نے بری طرح چونک کر آنکھیں کھولیں اور چند لمحے خاموشی گہری گہری سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ وہی ہے تو آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تشریف رکھیے۔'' اس نے بے حد شائستگی سے کہا۔

نادیہ نے بے قراری سے ہاتھ مسلے اور گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ شہریار خاموش نظروں سے اس کا جائزہ لیتا رہا لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہ بولا چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔

بعض لمحے بھی کتنے ظالم اور سفاک ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے دل پہلو سے نکل کر ہاتھوں میں آ گیا ہو۔ وقت کی رفتار اتنی سست ہو جاتی ہے کہ سانس حلق میں اٹکنے لگتا ہے یہی کیفیت اس وقت شہریار کی تھی۔

''کیا آپ بیٹھنا نہیں چاہتیں؟''

شہریار اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ اسے اس وقت نادیہ پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ یہ وہی تو تھی جس نے ساری رات اسے اذیت میں مبتلا رکھا تھا اور اب پھر اتنی سخت کارروائی کے بعد اس کا صبر آزمانے آ پہنچی تھی۔

نادیہ بغیر جواب دیے خاموش بیٹھ گئی۔

''مجھے کچھ نوٹس چاہئیں شہریار!''

شہریار نے والیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''سر احسان پرسوں ٹیسٹ لینا چاہتے تھے لیکن میرے پاس نوٹس نہیں ہیں۔''

''کیا آپ نوٹس تیار نہیں کرتیں؟'' شہریار نے پوچھا۔

''میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا۔'' وہ سنجیدہ تھی۔

''کیا مطلب؟''

''شہریار صاحب! میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ کچھ گھریلو ذمے داریاں ایسی ہیں کہ میں کلاس کے بعد لائبریری میں بیٹھ کر نوٹس تیار نہیں کر سکتی۔''

شہریار نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اسے دیکھا جانے ان نظروں میں کیا تھا کہ نادیہ نے نظریں جھکا لیں۔

''میں آپ سے آپ کی پریشانیاں پوچھنے کا حق نہیں رکھتا'' لیکن ...... اس نے ایک لمحے کے لیے بڑی عجیب سی نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ ''بہر حال نوٹس آپ کو مل جائیں گے۔''

اتنا کہنے کے بعد اس نے جلدی سے کتابیں اٹھائیں اور اسے تنہا چھوڑ کر کلاس کی طرف آ گیا۔ شاید چند لمحوں کی تاخیر اسے کسی اذیت میں مبتلا کر دیتی۔

دوسرے دن اس نے نہایت خاموشی سے لان میں تنہا بیٹھی نادیہ کے پاس رک کر اپنی فائل سے نوٹس نکالے اور اس کے پاس رکھ کر بنا کچھ کہے واپس آ گیا۔ نادیہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

عادل کسی صورت بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ شہریار کے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ شہریار نے ہر طریقے سے اسے ٹالنے یا مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن عادل کو غصہ آ گیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہاری جگہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟''

''جب تم خود ہی سمجھ گئے ہو تو......'' شہریار نے شرارت سے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''شیری کیا تم مجھے احمق سمجھتے ہو؟''

''میری کیا شامت آئی ہے جو ایسا سمجھوں۔''

اس نے مسخروں کی مانند کانوں کو ہاتھ لگایا۔ عادل نے گھور کر اسے دیکھا پھر بے حد سنجیدہ ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''مجھے ٹالنے کی کوشش مت کرو شیری۔ میں تمہیں تم سے زیادہ سمجھتا ہوں سمجھے؟''

''سمجھ گیا۔'' وہ اب بھی غیر سنجیدہ تھا۔

لیکن عادل بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ کسی طرح یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ شہریار قطعی نارمل ہے اور اس روز تو اس کے شکوک کو مزید تقویت مل گئی۔

پوری کلاس میں غیر معمولی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سر احسان کی کلاس میں تو یوں بھی کسی کو شرارت کرنے کی جرأت نہ ہوتی لیکن بعض شریر لڑکے ایسے میں پرچا بازی سے کام لیتے تھے اور یوں کئی داستانیں بیان ہو جایا کرتی تھیں لیکن اس روز سر احسان کا فولادی چہرہ دیکھ کر سب کو اندازہ ہو گیا کہ آج کوئی غیر معمولی بات ہے اور جب سر احسان نے شہریار کی طرف دیکھے بغیر اس کا نام لیا تو پوری کلاس کے طالب علموں کے جسم میں جیسے بجلیاں بھر گئیں۔ شہریار سر احسان کا چہیتا شاگرد تھا وہ اتنا ذہین تھا کہ سر احسان کو اس کی شرارتوں سے بھی کوئی شکایت پیدا نہ ہوتی تھی لیکن

اس روز جیسے ہی سر احسان نے اسے اپنے پاس بلایا وہ ایک لمحے کو بری طرح چونک گیا۔ چہرے کا رنگ ایک دم بہت سرخ اور پھر زرد ہو گیا لیکن اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا اور ان کے پاس آ گیا۔

''یس سر!'' اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

''ذرا ادھر دیکھو۔'' انہوں نے بے حد سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''آئی ایم سوری سر۔ آئی ایم ویری سوری۔''

شہریار اپنا سر اوپر نہ اٹھا سکا۔ ساری کلاس دم بخود تھی۔ خصوصاً عادل تو یوں بیٹھا تھا جیسے کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ سب حیران تھے کہ آخر شہریار سے کیا جرم سرزد ہو گیا ہے کہ سر احسان اس سے اتنی سنجیدہ گفتگو کر رہے ہیں اور وہ بھی سب کے سامنے۔

''ہوں۔'' سر احسان نے اپنی مسکراہٹ کو دبا دیا تو گویا تم جانتے ہو میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟''

''یس سر۔'' وہ ابھی شرمندہ تھا۔

تب سر احسان نے پوری کلاس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

''آپ سب حیران ہوں گے کہ کیا بات ہے مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ شہریار نے اپنا ریکارڈ توڑ ڈالا ہے۔ آج کے ٹیسٹ میں شہریار کی بجائے نادیہ نے ٹاپ کیا ہے اور یہ بات میرے لیے حیران کن ہے اور آپ میری صاف گوئی پر حیران ہوں گے اگر میں یہ کہوں کہ میں شہریار کو اس کی اصل جگہ پر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی انہوں نے شہریار کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کلاس چھوڑ دی۔

آفس میں سر احسان کے سامنے بیٹھتے ہوئے شہریار کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

''میں اس کی وجہ جاننا چاہتا ہوں شہریار۔''

وہ اب دوستانہ لہجے میں بات کر رہے تھے۔ شہریار کے لبوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ آ گئی۔

''آپ کی ڈانٹ سننا چاہتا تھا سر۔''

''وہ کیوں؟''

''سوچتا تھا اگر میٹھی گولیاں ایک دم تلخ ہو جائیں تو کیسا لگتا ہے۔''

تو کیسا لگا؟

''بہت اچھا۔ بڑا سنسنی خیز سر......'' وہ خوشی سے چہکا۔

''لیکن آئندہ میں اس تجربہ کو دہرانے کی اجازت ہرگز نہ دوں گا۔ سمجھ گئے۔''

او کے سر۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ہنستا ہوا آفس سے نکل آیا۔ دل ہی دل میں وہ مطمئن تھا کہ سر احسان نے اس کی وجہ کرید نے کی ضد نہیں کی ورنہ وہ کیا جواب دیتا۔

فرخ، عادل، آصف اور عون کہیں نظر نہ آئے تو وہ باغ میں مخصوص گوشے کی طرف چل دیا۔ قدموں کی چاپ پر اس نے شرارت سے آنکھیں بند کر لیں اور جانے کیا سوچ کر دھیرے دھیرے مسکراتا رہا۔

''شہریار۔''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

نادیہ چند کتابیں تھامے شرمندہ شرمندہ سی کھڑی تھی۔

شہریار نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھتے ہوئے اسے بیٹھنے کے لیے کہا لیکن وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکی۔

شہریار نے شوخی سے اسے دیکھا

''کیا اور نوٹس درکار ہیں؟''

''میں بہت شرمندہ ہوں شہریار۔'' وہ بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ ''آپ شاید مجھے خود غرض سمجھتے ہوں لیکن یقین کیجیے میں بہت مجبور تھی۔''

''آپ خواہ مخواہ ڈر رہی ہیں۔'' وہ جانے کیوں آج شوخ ہو رہا تھا۔

''ابھی تک میں نے آپ کو عدالت میں چیلنج تو نہیں کیا؟''

''پلیز شہریار......'' وہ خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ برا تو نہیں منا رہے تھے۔''

شہریار کو ایک دم غصہ آ گیا۔

''مس نادیہ۔''

''جی......'' اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہاں بیٹھیے۔'' اس نے حکم دیا۔

''سوری مسٹر شہریار۔''

''مس نادیہ شہریار بے حد متانت اور سنجیدگی سے کھڑا ہو گیا۔ کیا آپ کو کسی سے کسی قسم کا خطرہ لاحق ہے۔ یا پھر آپ مجھ سے ہی خوف کھاتی ہیں؟''

نادیہ نے تذبذب سے چند لمحے اس کی طرف دیکھا جیسے شہریار کے جذبات سمجھنا چاہتی ہو۔ پھر نظریں جھکا لیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔

''پھر آپ میرے پاس آنے کے بعد اتنی خوف زدہ کیوں ہوتی ہیں کہ مجھے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔''

''کیا مطلب......'' وہ پریشان ہو گئی۔

''مطلب؟'' شہریار مزید سنجیدہ ہو گیا۔ ''اپنے آپ کو نارمل رکھا کیجیے۔ خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ میں بھی ایک نارمل انسان ہوں ابھی تک آدم خور نہیں بنا۔ کیوں ٹھیک؟''

وہ پھر تھوڑا سا شوخ ہو گیا۔

اور اسی وقت نادیہ کو جانے کیا نظر آیا کہ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں پھر خوف کے سائے لہرا گئے اس نے ایک دم غیر ارادی طور پر شہریار کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

''جایئے۔'' شہریار گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''میری طرف سے اجازت ہے۔''

اور پھر نادیہ کا انتظار کیے بغیر وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

الجھنیں مزید بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ اس نے بڑی شدت سے اپنی کنپٹیوں کو دبایا اور بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا کینٹین میں چلا گیا۔ اس وقت گرم گرم چائے کی شدت سے طلب ہو رہی تھی اندر کوئی میز خالی نہ تھی۔ تب ہی اس نے دیکھا ایک میز پر عادل بیٹھا تھا بالکل تنہا ہاتھوں پہ اپنا سر رکھے سامنے چائے کا کپ رکھا تھا وہ لبوں پر مسکراہٹ لیے ادھر

آ گیا اور دل کا سارا غبار عادل کے سامنے نکال دیا۔
عادل بے حد پریشان تھا جب سے شہر یار کی الجھن سے باخبر ہوا تھا اس کے دو تین دن بے حد مصروف گزرے تھے۔ ان دنوں کتنے ہی چونکا دینے والے انکشافات ہوئے تھے اور عادل۔
وہ انکشاف کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔
وہ اپنے میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں قطعاً نہیں پا تا تھا بات ہی ایسی تھی ابھی تین دن پہلے بھی اس کے دل پر بوجھ تھا۔
لیکن آج جو بوجھ وہ دل پر اٹھائے ہوئے تھا وہ کس قدر مختلف تھا؟
پہلے تجسس تھا۔ کچھ جان لینے۔ پا لینے کی جستجو تھی لیکن جب کچھ جان لیا تھا۔ کچھ پا لیا تھا تو وہ ہمت ہار بیٹھا کہ شیری اس کا دوست تھا۔ بے حد پیارا۔ عزیز دوست اس کی پریشانی عادل کی پریشانی تھی۔
سائرہ حسن، نادیہ کی دوست تھی۔ عادل نے پہلا قدم اسی کی طرف بڑھایا لیکن سائرہ نے جو معلومات اسے فراہم کیں وہ عادل کے ہوش اڑا دینے کو کافی سے زیادہ تھیں۔ عادل نے تو اپنی طرف سے بڑی چالاکی کا مظاہرہ کیا تھا سائرہ حسن کو اصل وجہ معلوم نہ ہو لیکن اسے تو گویا سب سے پہلے ہی معلوم تھا۔
''جانے دیجیے عادل۔ وہ بڑی شوخی سے مسکرائی مجھے تو شہر یار کی نظر پہلے روز سے ہی معنی خیز لگی تھیں۔''
''اوہ......'' عادل خفیف سا مسکرایا۔ میرا خیال ہے آپ......
''جناب......'' اس نے بڑی خود اعتمادی سے بات کاٹی۔ ''میرا خیال قطعاً غلطی پر مبنی نہیں ہے۔''
''اور میرا خیال ہے...... وہ ایک لمحے کو رک گئی۔''
''فرمایے۔''
عادل شائستگی سے بولا۔
''نادیہ نے بھی ابھی تک اس جذبے کو نہیں پڑھا جو شہر یار کی آنکھوں سے چھلکتا ہے۔''
عادل نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔
''آپ شہر یار کے دوست ہیں نا!''
عادل نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔
بہتر ہے کہ آپ اسے ابتدا ہی میں روک دیجیے۔
''کیا مطلب؟'' عادل چونک گیا۔
مطلب یہ ہے کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔
''آپ کا مطلب ہے اس کی انگیجمنٹ......''
اس سے بھی زیادہ عادل۔
وہ متانت سے ہنسی۔ ''پلیز صاف صاف بتایے گا۔''
عادل بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ اور بے قراری اس کی نظروں سے چھلک رہی تھی۔
''اس کی شادی ہو چکی ہے۔''
''اوہ......!'' عادل کی گرفت کتابوں پر ہلکی پڑ گئی۔
''اس کے شوہر کے متعلق آپ جانتی ہیں۔''
سائرہ ایک لمحے کو چپ ہو گئی۔
''سوری مسٹر عادل...... اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہ نادیہ کا حکم ہے۔''
عادل ایک لمحے کو وہاں ٹھہرا اور پھر پلٹ آیا۔ اس کے قدم تھکے تھکے تھے۔ تھوڑا بہت ارتعاش اور ذرا سی لڑکھڑاہٹ لیے وہ لیکچر روم میں جانے کے بجائے سیدھا ہوسٹل آ گیا۔

☆☆☆

کتابیں چند قدم کے فاصلے پر گھاس پر پھینکے چت لیٹے دونوں بازو سر کے نیچے رکھے وہ دور افق پہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا، چند پرندے وہاں اڑ رہے تھے اس کی آنکھیں خالی خالی تھیں اور لبوں پر دنیا بھر کی سنجیدگی تھی اسے یہاں لیٹے آدھ گھنٹہ ہونے کو آیا تھا لیکن اس کے اس انداز میں ذرا بھی فرق نہ آیا تھا لمحہ بہ لمحہ قریب آتی قدموں کی چاپ پہ بھی وہ نہ چونکا۔

عادل قریب آ کر رکا۔ چند لمحے اسے دیکھا۔ پھر بیٹھ گیا۔

''چلو گے شیری......! آج مشاعرہ ہے......''

وہ چونکا۔ ایک لمحے کو اسے دیکھا اور پھر مسکراتا ہوا جلدی سے بیٹھ گیا۔

''تم جا رہے ہو!''

''ہاں۔ اگر تم چلو تو۔''

''ٹھیک ہے۔ چلتے ہیں۔''

وہ بے معنی سی ہنسی ہنس پڑا۔

دونوں ساتھ ساتھ آ[illegible]ے سے ہال میں طالب علموں نے ساری سیٹیں پر کر رکھی تھیں۔ عجب گہما گہمی کا عالم تھا۔ آصف اور عون نے ان کی سیٹیں رکھ چھوڑی تھیں۔ دونوں بیٹھے۔ بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ بہت سے ان لوگوں سے ملنے کو آگے بڑھے تبھی یاسر بھی آ گیا۔

''ہیلو شہریار......'' وہ مسکراتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''کیسے ہیں آپ......'' وہ بڑی محبت سے بول رہا تھا۔ ابھی دو ماہ پیشتر اس نے ڈیپارٹمنٹ میں ایڈمیشن لیا تھا۔

''سنا تھا آپ کی طبیعت خراب ہے۔''

''ہاں کچھ نزلہ زکام کی شکایت تھی۔''

وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا۔

''تو پھر آیئے میرے ساتھ چائے کا ایک کپ ہو جائے۔ میں بھی کینٹین جا رہا تھا اس وقت تو کوئی ساتھ جانے کو تیار نہیں اور چاہتا ہوں کسی کا ساتھ ہو جائے۔ آپ آ جایئے آپ کو تو نزلہ بھی ہے۔ ذرا گرم گرم چائے پییں گے تو طبیعت کو سکون ملے گا۔''

اتنی لمبی تقریر کے جواب میں اسے جانا پڑا۔

چائے کے دوران بھی وہ چہکتا رہا۔

''میں تو چائے کے بغیر زیادہ دیر تک گزارا نہیں کر سکتا شیری بھائی۔ گھر میں بھی امی، ابو، بھیا اور بھابھی مجھے منع کرتے ہیں لیکن اب آپ ہی سوچیے بھلا چائے بھی کوئی چھوڑنے والی چیز ہے۔ ایسی سوندھی خوشبو، ایسا دلفریب ذائقہ، ایسا دلنواز رنگ اور پھر جب گرم گرم گھونٹ حلق سے نیچے اترتے ہیں تو یقین مانیے شیری بھائی لطف آ جاتا ہے۔''

شیری کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ یاسر کچھ خفیف سا ہو گیا۔

''میں سچ کہتا ہوں شیری بھائی۔ مجھے چائے بے حد مرغوب ہے۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے پانی کے نل سے بھی گرم گرم چائے نکل آئے تو میں چھپ چھپ کر ہر ایک سے چوری کر کے پیتا رہوں خصوصاً بھابھی سے میری بھابھی جو ہیں نا وہ ویسے تو بے حد اچھی بڑی پیاری ہیں لیکن چائے کے معاملے میں میرا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتیں بلکہ امی، ابو کی حمایت کرتی ہیں۔''

وہ بالکل بچوں کی مانند باتیں کر رہا تھا اور حقیقتاً اس وقت اس کی باتیں شہریار کو سکون دے رہی تھیں۔

''لیجیے۔'' یاسر شرارت سے بولا۔ میرا کپ تو ختم ہو گیا کیوں نہ ایک ایک کپ اور پی لیں بڑی مزے کی چائے ہے اور یوں بھی......'' اس نے بڑی معصومیت سے گھڑی دیکھی ابھی مشاعرہ شروع ہونے میں دس منٹ اور ہیں؟'' اس سوالیہ نظروں سے شہریار کی طرف دیکھا تو اسے ہنسی آ گئی۔

یاسر خفت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چھوڑیے۔''

''نہیں یاسر۔ تم چاہو تو دو کپ اور پی سکتے ہو۔ میں انتظار کر لوں گا۔''

نہیں شیری بھائی۔ بس بہت ہو لیا۔ میں بھی جانے کیا کیا بکتا جا رہا ہوں۔ یاسر نے شرمندہ ہوتے ہوئے پینٹ کی جیب سے رومال نکالا۔ ساتھ ہی پاسپورٹ سائز کی تصویر فرش پر گر پڑی۔ شہریار۔ نے سرسری نظر اس پر ڈالی لیکن پھر بری طرح چونک گیا۔

نادیہ کی تصویر تھی۔

''یہ تصویر......'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''ارے دیکھیے گا۔ یہ میری بھابھی ہیں آپ کے ساتھ ہی پڑھتی ہیں۔''

شہریار نے لرزتے ہاتھوں سے تصویر تھامی۔

''آپ کے ساتھ ہی میرے بھیا پڑھتے ہیں نا کاشر عزمی...... یہ ان کی بیوی ہیں اور میں ہوں ان کا چھیتا دیور یاسر عزمی۔''

وہ شرارت سے سر کو ذرا سا خم دیتے ہوئے کھڑا ہوا اور پھر شوخی سے شہریار کی طرف دیکھ کر بولا۔

''آپ ہی کہیے بھلا کون خوب صورت ہے نادیہ عزمی یا پھر کاشر عزمی......''

لیکن شہریار نے اس کا سوال کہاں سنا تھا۔ اس کی نظروں میں تو وہ دن ایک دم سے سامنے آ گیا تھا جب اس نے نادیہ کو عین سڑک پر پریشان کھڑا دیکھا تھا جب اس کی بھری بھری آنکھیں سبز کار کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اور پھر وہ دن جب اس نے نادیہ کو ڈیپارٹمنٹ سے باہر کاشر عزمی کی سبز کار سے اترتے دیکھا تھا اور تب وہ پریشان ہو گیا تھا کہ آخر ان دونوں میں کیا تعلق ہے۔ تو نادیہ کاشر عزمی کی بیوی ہے لیکن آخر انہوں نے اپنے اس رشتے کو سب سے کیوں چھپایا ہوا ہے۔

وہ کیوں خود کو ظاہر نہیں کرتے اور اس روز کاشر عزمی اسے یوں سڑک کنارے حیران پریشان کیوں چھوڑ گیا تھا۔ کیا اس کی وجہ اس کے تعلقات ہیں جو کسی صورت ٹھیک دکھائی نہیں دیتے کیا ان میں کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ نادیہ ہمیشہ پریشان اور خوف زدہ کیوں رہتی ہے۔

اسے آخر کس بات کا ڈر ہے......!

''شیری بھائی......'' یاسر حیران تھا۔ چلیں گے نہیں ٹائم ہو گیا ہے۔

''اوہ چلو'' وہ ہوش میں آ گیا لیکن اس نے بڑی خوب صورتی سے اپنے قدموں کا ارتعاش یاسر سے چھپا لیا۔

☆☆☆

کچھ اپنی کچھ عادل کی کوششوں سے آخر شہریار خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ سب سے برا علاج جو اس نے خود کے لیے تلاش کیا وہ نادیہ سے دوستی تھی اس نے بڑے خلوص سے نادیہ سے دوستی کر لی تھی اور اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ نادیہ اس کے لیے شجر ممنوعہ ہے۔ تب وہ سنبھل گیا۔ نادیہ بے حد پر خلوص لڑکی تھی اس نے بھی شہریار کی دوستی کو پورے اعزاز سے قبول کیا۔ وہ بڑے پیارے انداز میں چھوٹی چھوٹی باتیں شہریار سے کرتی اپنی ہر بات ہر مسئلہ اس سے بیان کرتی اور شہریار بھی خلوص دل سے اس کا حل تلاش کرتا۔

نادیہ کی زبانی ہی اسے علم ہوا کہ کاشر عزمی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف نادیہ سے ہوئی تھی اور یہ بات کاشر نے شادی کی رات نادیہ کو بتا دی تھی اور نادیہ کو دکھ تو پہنچا تھا لیکن وہ بے حد خوددار لڑکی تھی۔ اس نے کاشر پر بالکل یہ ظاہر نہ کیا کہ اسے اس سے دکھ پہنچا ہے۔ اور نہ ہی کاشر سے توجہ اور پیار کی بھیک مانگی۔ کاشر بے حد شکی مزاج تھا۔ خود اپنی ساری داستان سنا دی لیکن یونیورسٹی میں بالکل برداشت نہ کرتا کہ نادیہ کسی سے بات کرے اور اگر وہ بدقسمتی سے کسی سے بات کرتے دیکھ لیتا تو کئی کئی دن اس کا بدلہ لیتا رہتا اس سے بات نہ کرتا۔

اور تب شہریار نے اس سے اس واقعے کے متعلق پوچھ ہی لیا جو عرصے سے اس کے ذہن میں سوالیہ نشان بن کر جم گیا تھا۔ جب وہ چھلکتی نظروں سے سبز کار کا تعاقب کر رہی تھی۔

نادیہ چند لمحے چپ ہی پھر جھجک کر بولی۔

''آپ برا نہ مانیں گے۔''

''نہیں۔''

''اس دن ہم شاپنگ کو جا رہے تھے راستے میں کاشر اپنی عادت سے مجبور ہو کر وہی موضوع لے بیٹھا۔''

شہریار نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''اس دن جب سر احسان کی کلاس مس ہو گئی تھی تو کاشر نے مجھے آپ کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔''

''اسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ میں نے جب اس کے شک کی تردید کی تو وہ غصے سے مجھے وہیں اتار کر

پہنا گیا۔''

وہ بڑی نادم نظر آ رہی تھی۔

''مجھے بے حد افسوس ہے نادیہ......'' شہریار دھیمے سے بولا۔

''میری وجہ سے تم لوگوں میں جھگڑا ہوا۔''

''اس میں آپ کا کیا قصور ہے۔''

وہ اداس لہجے میں بولی ''آپ کا دل تو صاف تھا۔''

اور تب شہریار کو بے حد شرمندگی ہوئی۔ وہ ان دنوں نادیہ کے متعلق جانے کیا کچھ سوچتا تھا اور نادیہ اتنی بے خبر تھی۔

پھر نادیہ کے بیٹا پیدا ہوا تو سب اسے مبارک باد دینے گئے اس دن سب پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا تھا کہ نادیہ اور کاشر عزمی میں کیا رشتہ ہے۔

شہریار کے ہاتھوں میں مٹھائی کا بڑا ڈبا تھا۔

یاسر نے بڑی گرم جوشی سے شہریار کو لپیٹا لیا۔

''ارے شیری بھائی۔ یہ کیا؟'' اس نے مسکراتے ہوئے مٹھائی کے ڈبے کی طرف دیکھا اصولاً تو مٹھائی ہمیں کھلانا تھی۔ لیکن آپ......؟''

''آپ کھلائیں یا ہم ایک ہی بات ہے کیوں؟'' شہریار خوش دلی سے مسکرایا۔

''کہتے تو آپ ٹھیک ہی ہیں......لیکن......

''چھوڑو یار، تم چائے جو پلا رہے ہو۔''

''شہریار نے شوخی سے کہا اور آج کے دن تو تمہاری بھابھی بھی تمہیں نہیں روکیں گی۔''

''ہاں ظاہر ہے آج تو ہم ایک عدد بھتیجے کے چچا بن گئے ہیں۔ ذرا روکیں تو سہی ہمارا بھتیجا بھی ہمارے حق میں بولنا شروع کر دے گا۔'' یاسر نے کہا تو سب نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ تب ہی کاشر عزمی ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا کر اندر آ گیا۔

''ہیلو فیلوز۔ وہ بڑا خوش لگ رہا تھا۔ چاکلیٹی پتلون اور ہلکی زرد بنیان میں وہ بڑا دلکش لگ رہا تھا۔ سب نے بڑے زور شور سے اسے مبارک باد دی اور وہ مسکرا مسکرا کر قبول کرتا رہا۔

اور تب کافی دیر بعد جب نادیہ عزمی۔ عدنان عزمی کو گود میں لیے پروقار انداز میں چلتی ڈرائنگ روم میں آئی تو ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی یوں لگا جیسے سب لوگ کے اس روپ کے سامنے احترام سے چپ ہو گئے ہوں۔

شہریار نظروں میں شوق کا اک جہاں بسائے اسے دیکھ رہا تھا۔ آسمانی شلوار سوٹ میں پروقار چہرہ اور ممتا کے سحر سے بھری آنکھوں کے ساتھ وہ اس دنیا سے الگ ...... بالکل ماورائی مخلوق لگ رہی تھی اور جانے اتنے دنوں کے بعد ایک بار پھر شہریار کو ایک خلش کا احساس ہوا۔ یار راکھ میں دبی چنگاری ایک دم شعلہ بن گئی۔

جانے کتنی بہاریں اپنے دامن میں خزاؤں کو لیے گزر گئیں۔ یونیورسٹی کی پرشکوہ عمارت وہی تھی لیکن علم حاصل کرنے والے بدل گئے تھے۔

شہریار جب اپنوں میں واپس آیا تو ان کو اس کی شادی کی فکر ہوئی...... عالیہ بڑی پیاری لڑکی تھی۔ شادی کے بعد چند دن تک تو شہریار بہلا رہا تھا لیکن پھر تقدیر نے اپنا وار چلایا۔

بات دراصل یہ تھی کہ شہریار کی ممانی نے شہریار کو بھڑکا دیا۔

دراصل عالیہ کے پھپھوزاد نعیم حسن اس سے شادی کرنا چاہتے تھے عالیہ کے دل میں ایسی کوئی بات نہ تھی اس کا اپنا ایک نظریہ تھا کہ جس کے ساتھ والدین رخصت کر دیں گے بس اسی کو اپنا سب کچھ مان لے گی اور ہوا بھی یہی اس نے شہریار کو اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ یوں بھی شہریار کی ممانی کو اپنی بیٹی صدف کو اس گھر جانے کی توقع تھی جو پوری نہ ہوئی تو انہوں نے شہریار کو بھڑکا دیا کہ عالیہ تو نعیم حسن کے عشق میں گرفتار تھی۔

شہریار تو پہلے ہی چوٹ کھایا ہوا تھا تھے۔ یہ سب سن کر آگ بگولا ہو گیا۔

عالیہ کچن میں کھانا تیار کر رہی تھی۔ تب وہ غصے میں بھرے ہوئے اس کے پاس آیا۔

عالیہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اس کا غصیلا انداز دیکھ کر حیرت زدہ رہ گی۔

"شیری کیا بات ہے؟"

لیکن شہریار کی آنکھوں میں آگ سی جل رہی تھی اور غصے کی زیادتی سے اس نے لبوں کو بھینچ رکھا تھا۔

وہ چولہا بند کر کے اس کے قریب آگئی اور اس کا بازو تھام لیا۔کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟

"تمہیں میری طبیعت سے کیا؟"

"شیری۔وہ حیرت سے پوری کی پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھتی رہ گئی۔"

"میرا مطلب ہے آ......آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں؟"

"تو اور کیا قہقہے لگاؤں؟" وہ جلے بھنے انداز میں بولا۔

"شیری۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"خدا کے لیے اتنے ناراض مت ہوں۔ مجھے بتاتے کیوں نہیں کیا بات ہے؟"

جواب میں وہ اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے بیڈ روم میں لے آیا اور اسے کرسی پر دھکیل دیا۔

"جو کچھ میں پوچھوں اس کا صحیح صحیح جواب دینا ہوگا تمہیں!" عالیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"یہ نعیم حسن کون ہیں!" وہ ترش لہجے میں بولے۔

"وہ میرے کزن ہیں۔"

"ہونہہ! کزن ہیں......"

وہ چبا چبا کر بولے۔"یہ تم سے شادی کرنا چاہتے تھے......؟"

"ہا......وہ ہکلائی "لیکن اس میں......"

"بس چپ رہو" وہ دہاڑے۔ میں تمہارے عشق کی ساری داستانیں سن چکا ہوں۔صفائی کی قطعاً ضرورت نہیں۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب تمہیں اس سے عشق تھا تو میرے ساتھ شادی کے لیے کیوں ہامی بھرلی تھی۔ بولو......جواب دو......

شہریار......وہ اذیت بھرے لہجے میں بولی۔

"اگر وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے تو اس میں میر اکیا قصور؟ اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ میں ان کے عشق میں گرفتار تھی۔"

وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اسے دیکھے جا رہی تھی حقیقتاً اسے اس وقت شہریار کی ذہنیت پر سخت افسوس ہو رہا تھا......

"میں کچھ سننا نہیں چاہتا......"

شہریار نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا اور پھر جانے کیا کیا کہتا رہا۔ اپنے دل کا سارا غبار نکال دیا تو ٹھوکر سے دروازہ کھولا۔ بند کیا اور باہر نکل گیا اور عالیہ ساکت بیٹھی رہ گئی۔

شہریار کا یہ روپ کتنا اذیت ناک تھا۔بالکل جاہل لوگوں کی طرح اس نے اس کے ساتھ برتاؤ کیا تھا۔جیسے وہ کچھ بھی نہ ہو۔اس کی کوئی حیثیت نہ ہو اور پھر تو یہ شہر یار کا معمول بن گیا۔ بات بات پر طنز کرنا اسے ذہنی اذیت دینے کا کوئی موقع بھی تو وہ ہاتھ سے چھوڑنا نہ چاہتا تھا اس کے ترکش کا کوئی تیر خالی نہ جاتا۔

سب کے سامنے وہ جان بہار قسم کے شہریار جیسے اس سے زیادہ محبت کرنے والا شوہر اس دنیا میں کوئی بھی نہ ہو لیکن جہاں تنہائی ہوتی وہ ہی پھول برسانے والی زبان کانٹوں کی طرح چبھنے لگتی اور عالیہ کوئی جرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بنی رہتی۔ اسے بغیر کسی قصور کے کانٹوں پر کھڑا ہونا پڑتا۔

بعض اوقات قسمت بھی اپنا کردار ادا کیے بغیر نہیں رہتی۔

نعیم حسن ایسے بیمار پڑے کہ ان کو اسپتال پہنچانا پڑا۔تب عالیہ کی تو جیسے شامت آگئی......شہریار نے ان دونوں اسے ایسی شدید ذہنی اذیت پہنچائی کہ وہ برسوں کی بیمار نظر آنے لگی۔وہ چپ ہوتی تو شہریار کہتا۔

"کیوں......؟ چپ کیوں ہوگئی ہو۔ کیا نعیم حسن کی فکر ہے۔"

کبھی کہتا۔

''چلی جاؤ نا اس کے پاس اسے تمہاری یاد نے بیمار کر دیا۔''

تبھی کہتا۔

''ڈاکٹر بھی خوب ہیں۔ بھلا وہ کیا علاج کریں گے اس کا جب کہ مسیحا تو کئی میل دور میرے گھر میں براجمان ہے۔''

اس کی باتیں سن سن کر اس کی آنکھیں بھر آتیں تو وہ بڑے چبھتے ہوئے لہجے میں کہتا۔

اچھا بہانہ مل گیا ہے نعیم حسن کے غم کو آنسوؤں میں اتارنے کا۔

کئی سال گزر گئے ان کے تین بچے بھی ہو گئے عامر، احمد اور نازیہ لیکن شہریار کے اس انداز میں کوئی فرق نہ آیا اور تب ایک دن ان کو عادل نظر آ گیا۔

دونوں دوست گرم جوشی سے لپٹ گئے شہریار اسے اپنے گھر لے آیا۔ عادل آج ہی ملازمت کے سلسلے میں آیا تھا۔ ہوٹل میں ٹھہرنے کا ارادہ تھا لیکن شہریار کو بے پناہ غصہ آ گیا۔

تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ میرے ہوتے ہوئے تم ہوٹل میں ٹھہرو گے۔ میں مر گیا ہوں کیا اور عادل مسکراتے ہوئے ساتھ ہولیا۔ گھر پہنچے تو بچے لان میں کھیل رہے تے انہیں دیکھتے ہی بھاگ آئے۔

''ابو۔'' عامر شوخی سے بولا۔ ''آج میں نے احمد کو ہرا دیا ہے۔''

''اچھا بیٹے۔'' شہریار نے حیران ہو کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ ''اسی خوشی میں ہم تمہیں تمہارے انکل سے ملاتے ہیں۔''

''کون سے انکل ابو!'' احمد بھی بھاگا آیا۔

''انہیں سلام کرو۔'' شہریار نے عادل کو آگے کیا۔ ''یہ تمہارے عادل انکل ہیں۔''

دونوں نے بڑے پیارے انداز میں سلام کیا۔

نازیہ جو ننھے ننھے قدم اٹھاتے ہوئے قریب آ رہی تھی عادل نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ شہریار اسے اندر لے آیا۔ تبھی عالیہ اندر آئی اسے عادل کی آمد کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔

''کھانا گرم کروں۔'' اس نے شہریار کی طرف دیکھا جیسے ہی عادل پہ نظر پڑی وہ ایک دم جھینپ گئی۔

''معاف کیجیے گا۔''

''معافی بالکل نہیں چلے گی بھابھی۔'' عادل شرارت سے مسکرایا۔ آپ نے ہمارے شہری کو بگاڑ کر رکھ دیا۔

''میں نے کیا کیا ہے؟''

عالیہ نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا لیکن اس کی آنکھوں میں پھیلی اداسی اور چہرے کا کرب عادل کو پریشان کر گیا۔

تب شہریار نے دونوں کا تعارف کروایا۔

چند دن بے حد مصروفیت میں گزرے۔ عادل کو نئی سروس جوائن کرنا تھی اس لیے وہ الجھا رہا اس عرصے میں عالیہ نے اس کا سارا سامان ایک کمرے میں سیٹ کر کے کمرے کو بڑی خوب صورتی سے سنوار دیا۔

عادل نے دیکھا تو خوش دلی سے تعریف کی۔

''آہا۔ آپ نے تو کمال کر دیا بھابھی۔ جی چاہتا ہے ان ہاتھوں کو چوم لوں۔''

''کیوں نئی مصیبت کھڑے کرتے ہیں۔''

اس نے جس لہجے میں کہا تھا جانے کیوں عادل کا دل دکھ گیا۔

اور پھر ایک دن اس نے شہریار کو پکڑ ہی لیا۔ شہریار نے ٹال مٹول سے کام لینا چاہا لیکن عادل بھلا کہاں چھوڑنے والا تھا۔ اس نے جب گھر چھوڑ کر ہوٹل میں جانے اور سارے رشتے توڑ لینے کی دھمکی دی تو شہریار نے آہستہ آہستہ سب کچھ بتا دیا اور آخر میں بولا۔

میں نے تو ابھی نادیہ عزمی کی طرف سے ملنے والی خلش کو بھی نہیں دبایا تھا عادل کہ یہ انکشاف کہ عالیہ بھی نعیم حسن کے عشق میں گرفتار ہے مجھے بالکل ہی مار گیا۔ میں کتنا بدنصیب ہوں عادل زندگی میں دو عورتیں آئیں لیکن دونوں ہی کسی کی یادوں میں گم۔ آخر میں بھی انسان ہوں عادل اور پھر ایک مرد...... یہ ایک کمزوری ہی سہی لیکن ہر مرد چاہتا ہے کہ اس کی بیوی کے دل میں شوہر کے علاوہ کوئی نہ بستا ہو۔ میں نے بہت چاہا کہ نعیم حسن

کے قصے کو بھول جاؤں لیکن یہ قصہ میں بالکل نہ بھلا سکا۔ ہاں نادیہ عزمی کی خلش نے اور بھی شدت سے سر ابھارا ہے۔ اب تک ان دونوں انتہائی کے درمیان پستا رہا ہوں آخر ہر بار ناکامی کا منہ مجھے ہی دیکھنا پڑا۔ میرا کیا قصور ہے؟''

''شیری۔'' عادل نے گہری سنجیدگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک سوال کا جواب دو۔

شہریار نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم نے بھابھی سے نعیم حسن والے اسکینڈل کی تصدیق یا تردید کروائی ہے۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟'' عادل نے کہا۔

''میں جب اس موضوع پر سوچتا ہوں مجھے اتنا غصہ آجاتا ہے کہ عالیہ پر غصہ اتارنے کے سوا کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔''

''اپنی ممانی کے علاوہ کسی اور سے تصدیق کی تھی۔''

''نہیں تو۔''

''کیوں؟ تصدیق کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ بھلا جھوٹ کیوں بولیں گی۔''

''کیوں؟ انہوں نے سچ بولنے کا ٹھیکا لیا ہوا ہے۔'' ''اچھا ایک بات اور ......'' عادل نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہاری ممانی کی کوئی بیٹی ہے۔''

''کیا وہ اس کی شادی تم سے نہیں کرنا چاہتی تھیں۔''

''ہاں لیکن جب میری شادی ہوگئی تو وہ خوش تھیں۔''

''مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آرہا شیری کہ یونیورسٹی کا ذہین ترین طالب علم جس کی ذہانت کی پروفیسر کو بھی خبر ہو۔ جو ہر امتحان میں ٹاپ کرتا ہو۔ اپنی زندگی کے امتحان میں اس بری طرح فیل ہوجائے اور وہ بھی محض مفروضات کی وجہ سے۔ کیا تمہارا دماغ جس کی روشنی پر کسی کو شک نہیں تھا وہ ان اتفاقات کو دیکھنے اور ان کی وجہ جاننے میں بالکل ہی ناکام رہا۔ آخر تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ تمہاری ممانی تمہاری شادی سے مطمئن ہوجائیں گی اور اس مسئلے کو یہیں چھوڑ دیں گی۔''

''لیکن......''

بندۂ خدا۔'' عادل نے اطمینان سے اس کی بات کاٹی۔ ''بعض عورتیں اپنی شکست کو تسلیم کر کے بیٹھنے پر رضامند نہیں ہوتیں اور پھر یہ کون کافر کہتا ہے کہ تم نعیم حسن کی ایک جائز خواہش کا بدلہ ساری عمر بھابھی سے لیتے رہو۔

''لیکن عادل......''

''تم چپ رہو۔ نعیم حسن ایک انسان ہے اگر اس نے بھابھی سے شادی کی خواہش کی تھی تو یہ اس کا جائز حق ہے لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ بھابھی بھی ایسے ہی خیالات رکھتی تھیں۔ بتاؤ......''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' شہریار نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''تم سمجھنا ہی کہاں چاہتے ہو۔ ورنہ یاد ہے کیمسٹری میں جو سوال ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا وہ تم ہمیں سمجھایا کرتے تھے اب یہ بتاؤ کہ اتنی گتھیاں سلجھانے والا دماغ یہاں آخر کیوں ناکام رہا یا پھر اس کی وجہ وہی پرانی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''نادیہ عزمی جس کے حصول میں تمہیں شکست کا سامان کرنا پڑا تو اس کا بدلہ تم نے بھابھی سے لیا۔''

''نہیں عادل۔ بخدا یہ بات نہیں ہے۔ میں خلوص دل سے اسے بھلا دیا تھا صرف اس آس پر کہ میری ساری وفائیں میری بیوی کے لیے ہوں گی۔''

''لیکن پھر وہی بات۔ عادل جھنجلا گیا۔'' اچھا یہ بتاؤ تم نادیہ عزمی کو چاہتے تھے نا۔''

''ہاں کسی زمانے میں۔''

''اور اس سے شادی بھی کرنا چاہتے تھے؟''

''یہی سمجھ لو۔''

''پھر اس میں نادیہ کا کوئی قصور نہ تھا یا پھر تھا؟''

''نہیں اس کا کیا قصور اسے تو میرے جذبات کی خبر بھی نہ تھی۔''

''ہاں'' عادل نے سر صوفے کی پشت سے ٹکایا

''اب اگر کاشر عزمی کو یہ علم ہو جاتا کہ تم نادیہ سے شادی کرنا چاہتے ہو اور اسی بات پر وہ نادیہ کا جینا حرام کر دیتا تو......؟''

''اوہ۔'' شہر یار شرمندگی سے عادل سے نظریں نہ ملا سکا۔

''اب تم ہی کہو دوست نعیم حسن کی اس خواہش کا بدلہ تم جس انداز سے بھابھی سے لے رہے ہو وہ کہاں تک درست ہے۔ تم نے آج تک بھابھی کی راہوں میں جتنے کانٹے بچھائے ہیں۔ کیا تمہیں خبر ہے کہ ان کے پاؤں کتنے زخمی ہوئے ہیں ان میں کتنے آبلے پڑے ہیں۔ یہ زخم اگر دل تک پہنچ گئے تو۔''

''نہیں۔ عادل......'' وہ بے قرار ہو کر چلایا۔ ''ایسا نہ کہو میں بے حد شرمندہ ہوں۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں یونیورسٹی کا ذہین ترین طالب علم تھا لیکن عملی زندگی میں سب سے زیادہ کند ذہن ثابت ہوا۔ تم سچ کہتے ہو۔ نادیہ عزمی کی طرف سے ناکامی نے میرے دل میں انگارے بھر دیے تھے اور ان کا انتقام میں انجانے میں عالیہ سے لیتا رہا اور آج تک میں یہی سمجھتا رہا کہ میں نادیہ کو بھول گیا ہوں۔ یہ غلط ہے اگر میں اس شکست کو بھول گیا ہوتا تو آج اپنے گھر میں فاتح کی حیثیت سے کھڑا اس جنت کو جسے میری بے مروتی نے جہنم میں بدل دیا تھا خلوص دل سے قبول کرتا لیکن میں بہت بدقسمت ہوں عادل۔''

''نہیں شہری، تم آج بھی خوش قسمت بن سکتے ہو۔ اگر تم اپنے پھیلائے ہوئے کانٹے اپنے ہاتھوں سے چن لو۔''

اور تب شہر یار کی آنکھوں سے عزم جھلکنے لگا۔

''بھابھی او بھابھی۔''

عادل نے کھڑے ہو کر بے صبری سے چلانا شروع کر دیا۔ عالیہ کچن سے بھاگتی اندر آئی۔

کمال ہے بھابھی، عادل چلایا۔

''ادھر آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور آپ ابھی تک انتظار کرائے جا رہی ہیں۔''

عالیہ نے اسے مسکرا کے دیکھا۔

''میرا خیال ہے۔''

''ارے ......خیال ویال چھوڑیے بھابھی۔'' عادل شوخی سے بولا۔ ادھر میرا یار بھی بھوک سے بے حال ہو رہا ہے لیکن کچن میں جاتے ہوئے ڈر رہا ہے۔''

عالیہ نے ایک نظر شہر یار کی طرف دیکھا اور پھر بنا کچھ بولے کچن میں چلی گئی۔

کھانے کے بعد شہر یار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عالیہ سے کیسے بات کرے وہ کبھی بیڈ روم میں جاتا اور کبھی باہر آ جاتا عالیہ کن انکھیوں سے سب دیکھ رہی تھی عادل کسی ضروری کام سے باہر آ گیا تھا۔ تب شہر یار نے عامر کو بلایا۔

''جی ابو'' وہ بھاگتا ہوا آیا۔

''ذرا اپنی امی سے کہیے فوراً تیار ہو جائیں۔'' وہ بھاگتا ہو گیا اور پھر واپس آ گیا۔

''ابو، امی کہہ رہی ہیں کیوں؟''

''ان سے کہو باہر جانا ہے۔''

وہ پھر بھاگتا ہوا گیا اور بھاگتا ہوا واپس آیا۔

''امی کہہ رہی ہیں کیوں؟''

''ان سے کہو سیر کے لیے......''

وہ پھر اسی طرح واپس آ گیا۔ ''امی کہہ رہی ہیں کیوں؟''

''ہوں۔''

شہر یار سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کچھ سوچتا ہوا بیڈ روم میں آ گیا۔ عالیہ وارڈروب کے پاس نازیہ کو کپڑے پہنانے میں مصروف تھی وہ اندر آ کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

''عالیہ......''

''فرمایے......''

وہ نازیہ کو گود میں اٹھا کر پیچھے مڑی۔

شہر یار نے ایک لمحے کو اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر شرمندہ ہو کر نظریں جھکا لیں۔ پھر اوپر دیکھا تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا عامر نے کچھ نہیں کہا......؟''

کہا ہے...... ''لیکن کیا عامر نے میرا جواب

نہیں پہنچایا؟''
''پہنچایا تو ہے لیکن وہ نامکمل سا ہے......''
عالیہ چپ ہوگئی پھر اداسی سے بولی۔
''ہم خود کب مکمل ہیں۔ ہماری ذات سے وابستہ ہر چیز نامکمل ہے۔'' عالیہ نے جلدی سے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
''میں بنا کہے ہی سب کچھ سمجھ رہی ہوں شہر یار۔ کچھ مت کہیے گا۔ کہیں الفاظ ان جذبات کو صحیح طرح ادا نہ کر سکے تو پھر جذبات کی توہین ہوگی۔''
تب ہی عادل کی آواز آئی۔
''ارے بھابھی میں تو سمجھا تھا کہ اس وقت بچوں سمیت تیار ہو چکی ہوں گی۔'' دیکھیے تو میں ٹکٹ بھی لے آیا ہوں۔ ویسے ......اس نے شرارت سے شہر یار کی طرف دیکھا۔''میں مداخلت کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن یقین جانیے مداخلت بے حد ضروری تھی۔''
''کیوں؟''
شہر یار پہلی بار خوش دلی سے ہنسا۔
''فلم کا ٹائم جو گزرتا جا رہا ہے۔''
عالیہ نے جھینپ کر عادل کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے باہر نکل گئی۔
''کیوں جناب؟''
عادل نے شہر یار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔''کیسی رہی؟''
اور جواب میں شہر یار نے بڑے جوش اور جذبات بلکہ پوری گرم جوشی کے ساتھ اسے لپٹا لیا۔
دوسری طرف عامر، احمد اور نازیہ خوش دلی سے تالیاں بجا رہے تھے۔
''عالیہ وہ بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے آگے بڑھا میں ......میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ......''
''آپ کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ متانت سے بولی۔ میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ اب آپ صرف اپنا فیصلہ بتا دیجیے۔''
''عالیہ......وہ حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے وہ ضبط وصبر کی پیکر بنی کھڑی تھی۔ شہر یار کی نظریں اٹھتیں اور پھر جھک جاتیں۔''
پھر وہ مضبوط قدموں سے اس کی طرف بڑھا۔ اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر اسے قریب کیا اور پھر بولا۔
''میری طرف دیکھو عالیہ۔''
عالیہ نے ایک لمحے کو نظریں اٹھائیں۔ حسین وجیہہ چہرے پر شرمندگی کے تاثرات لیے نادم سے شہر یار اس کے دل میں اتر گیا لیکن ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھر آئیں اس دلنشین ہستی اس دلفریب عکس نے دل میں رہتے ہوئے بھی اسے کتنی اذیتیں پہنچائی تھیں۔
''عالیہ کیا اب بھی تمہیں میرے فیصلے کا علم نہیں کیا میرے چہرے پر کچھ بھی نہیں لکھا۔''
''لکھا تو ہے شہر یار لیکن میں اپنی آنکھوں کیا کروں جو تحریر پڑھنے میں ہمیشہ غلطی کر جاتی ہیں۔''
''عالیہ......'' وہ بے قراری سے اس کی جانب جھکے۔''میں نے تمہیں بہت اذیتیں دی ہیں مجھے اس کا احساس ہے کہ خوشی نام کی کوئی چیز تم نے میری طرف سے نہیں پائی لیکن عالیہ جو اذیتیں میں نے تمہیں دی ہیں ان میں میرا بھی حصہ تھا۔ تمہیں غم دے کر میں خوش نہ بھی تو خوش نہ رہا تھا اور کیا میرے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے دل کی ویرانی کی عکاسی نہ کرتے تھے۔ مجھے پتا ہے کہ تمہارا غم میرے غم کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ لیکن پھر بھی کیا میں قابل معافی نہیں ہوں۔''
عالیہ نے ایک لمحے کو ان کی طرف دیکھا اور پھر جانے جذبات کا کون سا بند ٹوٹ گیا اور وہ وہیں بیٹھ کر بازوؤں میں منہ چھپا کر رو پڑی شہر یار کی حالت قابل دید تھی۔ جب جذبوں کو ٹھیس لگتی ہے تو دلاسے کے الفاظ بھی بہت بھاری گزرتے ہیں۔ عالیہ بھی ان ہی حالات کا شکار تھی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد شہر یار نے اسے اٹھا لیا۔ آج وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر وہ سب کچھ کہنے کے لیے تیار ہو گیا تھا جسے اب تک وہ کہہ نہیں پایا تھا۔

☆☆

تیرے سوا چاہا نہیں

مسز نگہت غفار

جس انسان کی ترجیحات جس قدر مادیت پر مبنی ہوں گی وہ اتنا ہی بڑا دھوکے باز ہوگا۔ وہ دوسرے سے اتنی بھی بڑی بے وفائی کرے گا۔
ایک کم فہم کا قصہ دولت کی کھنک اور محبت کی چمک میں وہ فرق محسوس نہیں کرسکا۔ وقت کی ٹھوکروں میں نئے زخموں کی دریافت اسی کا مقدر بنی تو وہ کراہ اٹھا

ایک صبح کے بھولے کی کہانی شام سے پہلے وہ اپنے گھر کی تلاش میں تھا



میرے راستے میں آنے کی کوشش مت کرنا شائستہ بیگم، ورنہ میں تمہارا حشر برا کردوں گا، میں تمہیں ایسے عذاب دوں گا کہ تمہاری زندگی برباد ہو جائے گی، نہ تم مرسکو گی نہ جی سکو گی کہیں چین نہیں ملے گا تمہیں، ہٹ جاؤ میرے راستے سے، طلاق نامے پر سیدھی طرح سے دستخط کردو...... ورنہ...... ورنہ میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔

مگر دوسری طرف مکمل خاموشی تھی، کسی قسم کا کوئی ردعمل نہیں تھا۔ شائستہ نہایت ہی اطمینان اور سکون سے شوہر کی زبان سے نکلتے ہوئے تیرونشتر اپنے وجود کی ہر نس میں اتار رہی تھی۔ کمال کا ضبط وتحمل تھا اس کی شخصیت میں۔ صفدر نے زندگی میں پہلی بار اپنا یہ روپ دکھایا تب بھی وہ نہ گھبرائی، تعجب سے اس کی طرف دیکھا نہ اپنے دفاع میں زبان سے ایک لفظ کہا۔ لگتا تھا جیسے وہ آج کے اس حملے کے لیے پہلے سے تیار تھی۔ صفدر کا غصے کے مارے برا حال تھا۔

''طلاق'' جیسا لفظ سن کر تو شریف اور نیک بیویاں سدبدھ کھودیتی ہیں مگر...... یہ...... یہ کس مٹی کی بنی ہوئی ہے، ان کی عقل دنگ تھی۔

صفدر نے آگے بڑھ کر شائستہ کو کندھوں سے پکڑا اپنے مقابل کرتے ہوئے قدرے زور سے کہا۔ ''کیا تم نے مجھے پاگل سمجھا ہے میں کتنی دیر سے تم سے مخاطب ہوں'' کیا تم گونگی اور بہری ہوگئی ہو...... بولو...... کچھ تو جواب دو......؟

''مسٹر صفدر حسین'' میں گونگی ہوئی ہوں نہ بہری الحمدللہ میری زبان بھی ہے اور کان بھی۔ اور ہاں زبان بہت کچھ بولنے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن تمیز اور ادب ولحاظ کے دائرے میں۔

''اور ہاں کان بھی بحکم خدا سنتے ہیں۔''

وہ مسکرائی، اسے مسکراتا دیکھ کر ایک بار پھر صفدر بھڑک اٹھے۔

''زہر لگ رہی ہو تم...... اور تمہاری یہ مسکراہٹ'' انہوں نے اسے جھنجوڑ کر دور کردیا نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے تمہیں اپنانے کا فیصلہ کیا، لعنت ہے ان لمحوں پر جب تم میری زندگی میں آئیں۔ لاحول بھیجتا ہوں ان گھڑیوں پر جب تم میرے نام سے منسوب ہوئیں۔ تم آخر کس پتھر کی بنی ہو، اگر سلمٰی نے طلاق کی شرط نہ رکھی ہوتی تو ...... تو میں آج سے بہت پہلے سلمٰی سے شادی کر چکا ہوتا۔''

وہ اصل بات زبان پر لے آئے۔

''صفدر صاحب! آپ اب بھی سلمٰی سے شادی کر سکتے ہیں، میری طرف سے آپ کو اجازت ہے۔'' اس نے یہ بات نہایت ہی اطمینان سے کہہ ڈالی۔

''مجھے تمہاری اجازت درکار نہیں ہے، مجھے تو صرف سلمٰی کو طلاق نامہ دکھانا ہے۔''

انہوں نے پھر ایک بار پیپرز شائستہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''صفدر صاحب! آپ یہ بھول رہے ہیں کہ قانون کی طرف سے یہ پابندی ہے کہ پہلی بیوی کی اجازت دوسری شادی کے لیے ضروری ہے۔ مگر آپ کی خوش قسمتی ہے کہ میں آپ کو اجازت دے رہی ہوں، کیونکہ میرا دل، میرا من، میرا ضمیر سب ہی پاک صاف اور مطمئن ہے، میرا رشتہ بہت مضبوط ہے، میرا بندھن پکا ہے...... مجھے کسی قسم کا ڈر یا خوف نہیں ہے۔ اس قسم کی شرطیں وہ لوگ رکھتے ہیں جو اندر سے کمزور اور ان کے ارادے متزلزل ہوتے ہیں، آپ بلاخوف وخطر بلا جھجک دوسری شادی کرسکتے ہیں، مگر میں ان پیپرز پر کبھی بھی دستخط نہیں کروں گی۔'' وہ ایک لمحے کو رکی پھر بولی۔ ''اب آپ میرا راستہ چھوڑیں مجھے نماز کے لیے دیر ہورہی ہے۔'' وہ ان کے آگے سے نکل کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

صفدر پاؤں پٹختے ہوئے گھر سے نکل گئے۔

میاں کے گھر سے نکلتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور اسی کے ساتھ پشت لگا کر بلک بلک کر رونے لگی۔ دیر سے رکا ہوا آنسوؤں کا سیلاب پلکوں کی باڑ توڑ کر زندگی کے میدان میں ماضی کے جنگل

سے منہ زور انداز میں بہنے لگا، ماضی کے جنگل سے سارے ہی خشت و خاشاک بہہ بہہ کر حال کے میدان میں جمع ہو رہے تھے۔

وہ کب تک روتی، کب تک آنسو بہاتی؟ اسے پتا تھا اب جو صفدر گھر سے نکلے رات گئے ہی لوٹیں گے۔

☆☆☆

سیشن کورٹ میں انسانوں کا جم غفیر تھا گرمی اس قدر شدید جیسے سورج سوا نیزے پر آ گیا ہو، شامیانے، لاؤڈ اسپیکرز کا شور، مرد حضرات، خواتین ٹیچرز، ڈاکٹرز وکلاء یا کسی بھی ادارے کا کوئی بھی ملازم اس الیکشن کی ڈیوٹی سے مستثنیٰ نہیں تھا۔

ہر نفس افراتفری کا شکار تھا۔

یہ کہا گیا تھا کہ ڈیوٹی ہے، کسی قسم کی حیل وحجت یا بہانہ نہیں چلے گا، دو دن بھی لگ سکتے ہیں اور تین دن بھی، حکم ایسا تھا کہ عدولی ممکن نہ تھی۔

وہ پرس گود میں رکھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

اس لمحے کسی نے اپنائیت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''شائستہ! ارے یار میں کب سے تمہیں تلاش کر رہی تھی۔''

''تم کب آئیں۔'' حسنہ نے کہا تو وہ پھٹ پڑی۔

''یار تم لوگ بھی کمال کرتے ہو، تین دن بعد آج شکل دکھائی تین دن سے روز کورٹ آ رہی ہوں وہ پریزائڈنگ مل کر ہی نہیں دے رہی ہے، پتا نہیں زمین کھا گئی، آسمان نگل گیا، سر بھی درد سے پھٹا جا رہا ہے، آج بھی صبح نو بجے سے یہاں ہوں۔''

وہ رو دینے کو تھی۔

''تم بھی عجیب احمق لڑکی ہو، کیا تک تھی کہ بھلا آٹھ گھنٹے سے یہاں بیٹھی ہو...... ابھی تین دن اور مصروف رہنا ہے ......اور تم ابھی سے اس قدر ڈسٹرب ہو گئی ہو، اچھا چلو ہمارا سارا اسٹاف ادھر بیٹھا ہے، پتا ہے تمہیں شام کے پانچ بج رہے ہیں، ابھی تو سینٹرز پر گاڑیاں جانا بھی شروع نہیں ہوئیں۔

اچھا آؤ ادھر چائے منگواتے ہیں۔ اس نے جھک کر شائستہ کا بیگ اٹھا لیا۔''

وہ جیسے ہی اپنے اسٹاف کے قریب پہنچی پھٹ پڑی۔ ''یار تم لوگ بہت ہی......!''

''بولو...... گاؤ دی ہو۔'' آمنہ نے شوشا چھوڑا۔

''بالکل......! کم از کم مجھے رنگ کر لیتیں کہ کتنے بجے یہاں پہنچنا ہے۔''

''ارے بابا اب غصہ ختم کرو، اچھا ہے تمہاری تفریح ہو گئی دیکھو کتنا مزا آ رہا ہے۔'' آمنہ نے شریر لہجے میں کہا تو وہ ہنس پڑی۔

''تجھے مزا آ رہا ہو گا کیوں کہ تیرا ظفر جو تیرے ساتھ ہے خوب موقع ملا ہے اسے ساتھ گھمانے کا۔''

''اچھا بتاؤ، آنٹی انکل نے کس طرح اجازت دی۔'' ارم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''وہ لوگ تو کبھی بھی اجازت نہ دیتے۔''

''ارے یار! کیسے نہیں دیتے، گورنمنٹ ملازم ہیں ہم لوگ جو آرڈر آ گیا ماننا ہے، ورنہ ...... نتیجہ ...... تم سمجھ سکتی ہو۔ والدین کو اولاد پر اتنا تو اعتماد ہونا چاہیے اور اولاد کو بھی چاہیے کہ ان کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائے۔'' رضیہ نے مسکرا کر آمنہ کی طرف دیکھا۔

''اے لڑکی تو کسے کہہ رہی ہے۔ شاید یہ بھول رہی ہو کہ ظفر میرا منگیتر ہے۔'' وہ بھی رضیہ کی بات سمجھ کر بولی تھی۔

سب ہنس پڑیں۔

لاؤڈ اسپیکر پر ان کے اسکول کا نام اناؤنس کیا جا رہا تھا سب لوگ تیزی سے اپنا اپنا سامان اٹھا کر آگے بڑھ گئے۔

الیکشن کی مصروفیات کے دوران صفدر کی ڈیوٹی اس اسٹاف کے ساتھ لگی تھی، جیسے تیسے کر کے رات گزاری، صبح ہوئی تو ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ووٹرز آنا شروع ہو گئے۔ شائستہ چائے بھی نہ پی سکی اور اپنی سیٹ سنبھال کر کام میں مصروف ہو گئی، شائستہ کے سر میں تو کل سے درد تھا جو اب اور بڑھ گیا تھا، اس پر ستم

صبح چائے نہیں پی تھی، ابھی وہ سر پکڑے سوچ ہی رہی تھی کہ ایک سے آواز پر وہ چونکی، پلٹ کر دیکھا تو وہ نہایت ہی ادب سے صاف ستھرے کپ میں چائے لیے کھڑا تھا۔

''جی فرمایئے۔'' اس نے اس کی طرف دیکھا، پتا نہیں کیوں اسے صفدر کا یوں بار بار دیکھنا اور اس طرح سے چائے پیش کرنا بالکل اچھا نہ لگا، مگر اس وقت چائے کی شدید خواہش ہو رہی تھی۔

''مس۔کل سے آپ کے سر میں درد ہے اور آج ناشتے میں آپ نے چائے بھی نہیں پی، لیں تکلف نہ کریں، ابھی بڑی لمبی لائن باقی ہے، شاید دوپہر میں کھانے کی فرصت بھی نہ ملے پلیز......!''

صفدر نے عاجزی سے کہا تو شائستہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے چائے لے لی۔

یہ پہلی پیش قدمی تھی صفدر کی، شائستہ نے چائے لے کر اس کی ہمت تھوڑی اور بڑھائی، پھر رات گئے تک مصروفیت ہی رہی، رات گئے تک ووٹوں کی گنتی جاری رہی، شائستہ بہت تھک گئی تھی، مسز پرویز نے صفدر سے شائستہ کی مدد کرنے کے لیے کہا تو وہ کھل اٹھا۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔''

جی ضرور ضرور......اگر یہ مناسب سمجھیں تو۔''

صفدر نے خیال ظاہر کیا تو شائستہ نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ گئی۔

''جی پلیز!......یہ......گنے ہوئے ووٹ ہیں، آپ ذرا ان کی گنتی کر لیں۔'' اس نے دوسرے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

''مس شائستہ! آپ کچھ دیر آرام کر لیں، باقی کام میں مکمل کر لوں گا۔''

صفدر کی یہ بات شائستہ کو اس وقت بہت اچھی لگی اور وہ اٹھ کر برابر والے کمرے میں آ کر لیٹ گئی اسے صفدر کی ہمدردی اور خلوص بھرا انداز بار بار یاد آ رہا تھا۔

اور پھر......الیکشن کا زور ٹوٹا سب اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہوئے، صفدر اور شائستہ نے بھی اپنی زندگی کے خوب صورت گنگناتے دور میں قدم رکھ دیا۔

وہ ملاقاتیں ایک دوسرے کو نزدیک سے نزدیک تر لانے کا بہانہ بن گئیں اور پھر دونوں خاندانوں کی سخت مخالفت کے باوجود ہمیشہ کے لیے دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے۔

شائستہ کے ہاں خاندان اور برادری سے باہر شادی کا رواج نہیں تھا۔

صفدر کی دو بہنیں بڑی بیٹھی تھیں، ان کی طرف سے یہ رکاوٹ تھی کہ پہلے بہنوں کی شادی ہو جائے تو پھر صفدر کی ہوگی، مگر اس نے بھی والدین سے مخالفت مول لی یوں زبردستی کے سودے میں کہیں تو گھاٹا ہوتا ہے، جتنی محبت اور والہانہ پن سے دونوں نے جلد بازی میں فیصلہ کیا تھا آج یہ رشتہ یوں اتنی جلدی متزلزل ہو رہا تھا۔

آج اس خوب صورت آشیانے کے تنکے نفرت اور عداوت کی تیز و تند ہوا سے لرز رہے تھے اتنی جلد صفدر کا دل شائستہ سے بھر گیا وہ محبت، خلوص اور چاہت، جینے اور مرنے کے وعدے، حسین شامیں، خوب صورت راتیں، گنگناتے لمحات۔

سب اتنی جلدی نفرت میں بدل گئے؟

کبھی صفدر شائستہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھنٹوں انتظار کرتا تھا اور آج وہ اسے کہہ رہا تھا کہ ''گم کرو اپنا چہرہ مجھے اس چہرے سے نفرت ہو گئی ہے۔''

کبھی شائستہ کی مسکراہٹ مونالیزا کی مسکراہٹ ہوا کرتی تھی، آج زہر لگ رہی تھی اس کی ہنسی۔

ایک بار جب شائستہ چاروں طرف سے مایوس ہو گئی تھی تب صفدر نے فون پر اسے کہا تھا کہ تمہارے بغیر میں جی نہیں پاؤں گا، اور آج محبت کے دعوے کرنے والا اس کی زندگی اجیرن بنا دینے کے لیے تل گیا تھا، شائستہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔

''صفدر! کبھی تمہیں میری زندگی سے پیار تھا آج تم میرے جیون کو اجیرن بنانے لگے ہو۔

صفدر......تم......بہت پچھتاؤ گے، میری ہی نہیں تمہاری اپنی زندگی عذاب ہو جائے گی، تم نہ مر سکو گے نہ جی سکو گے۔ کیوں کہ میری محبت سچی، پاکیزہ، بے لوث اور بے غرض ہے، مجھے اپنی محبت پر یقین ہے اور جب تم حالات سے لڑتے لڑتے تھک جاؤ گے تب شاید تمہیں اس بے لوث محبت کا احساس ہوگا۔''

وہ نہ جانے ابھی کتنی دیر اور خیالات میں الجھی رہتی کہ اچانک صفدر کمرے میں داخل ہوا۔

الماری کے پاس پہنچ کر وہ اپنے سارے کپڑے نکالنے لگا۔

شائستہ خاموش بیٹھی سب دیکھ رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد اپنا ضروری سامان اور چند جوڑے اکٹھا کر کے وہ اس کی طرف پلٹا۔

''میں جا رہا ہوں اس گھر سے۔ تم آرام سے یہاں رہو، یہ سزا ہے تمہاری اس ضد کی کہ تم نے......پیپرز سائن نہیں کیے، میری زندگی سے تو تم نہ نکلیں مگر......دل سے نکل گئی ہو......اور اگر تم نے میرے راستے میں آنے کی اور میری شادی میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

شائستہ نہایت ہی صبر اور استقلال سے اس کی دہاڑ سن رہی تھی۔

''صفدر! تمہیں پتا ہے کہ میں نے ساری برادری سے دشمنی لے کر تمہیں اپنایا تھا، تمہارے بعد میرا کوئی بھی نہیں ہوگا نہ ہمدردی کرنے والا نہ آنسو پونچھنے والا، تم مرد ہو با اختیار بھی تمہی ہو، مگر یاد رکھو! ایک ہستی ہمارے اوپر بھی ہے جس کا انصاف اور جس کی مدد ہر مظلوم کے ساتھ ہوتی ہے، تمہارا کیا خیال ہے کہ تم اس طرح کرو گے تو میں گڑگڑا کر تمہارے قدموں میں گر جاؤں گی، بھیک مانگوں گی، تم سے محبت کی، تحفظ کی، حصار کی......نہیں......جاؤ کہ تمہیں اختیار ہے، مگر یاد رکھو، ایک دن تمہیں لوٹ کر آنا ہے اس جگہ، میں تمہیں جی کر بتاؤں گی اکیلے، بالکل تنہا، اپنے پیار، اپنے خدا کے بھروسے پر......جاؤ......مگر مجھے یقین کامل ہے تم لوٹ کر آؤ گے۔'' اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا سرت سے نہیں، اس خوف سے کہ اس کی آنکھوں سے مچلتے آنسو گالوں پر نہ آ جائیں۔

وہ ظالم پاؤں پٹختا ہوا تیز تیز قدموں سے گھر سے نکل چکا تھا۔

کیسا ستم گر نکلا۔ جسے جان سے بھی زیادہ چاہا، جس کے لیے سارے جہان سے ٹکرلی وہی ساتھ چھوڑ کر چلتا بنا، شائستہ بالکل تنہا ہو گئی......شادی کو ابھی صرف چھ ماہ ہی تو گزرے تھے اور یہ ستم ٹوٹ پڑا وہ سوچنے لگی، میں نے تو اپنی محبت، اپنی وفا، اپنی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی......پھر کیا ہو گیا تمہیں صفدر؟ کیوں مجھے یادوں کے بھرے ہجوم میں دکھوں کی اتنی بڑی نگری میں، سوچوں کے اس عمیق کنویں میں دھکیل گئے......؟

بھلا ہو والدین کا کہ اس قابل تو کیا کہ آج چار پیسے کما رہی ہوں......ورنہ......میں کیا کرتی......؟ اس شخص نے تو مجھے اندھیرے غار میں ساری زندگی کے لیے بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں اپنی ڈائری کی غزل ناچنے لگی۔

جدا تو ہو رہے ہو مگر یہ سوچ لو ضرور تم
جدائی کے لمحے برداشت نہ کر پائے تو کیا کرو گے
ابھی تو ہے نئی منزلوں کو پانے کا شوق تمہیں
ان منزلوں کا راستہ ہی نہ ملا تو کیا کرو گے؟
ہو ابھی تم احساس خوشی سے چور لیکن
خوشی کے موسم ہی نہ بھائے تو کیا کرو گے؟
مانا ہو کہ بہت ہی شوخ و شریر اے دوست
غموں کے صحرا میں بھٹک گئے تو کیا کرو گے؟
ہے یقین کامل کہ لوٹ آؤ گے مگر
اگر اس بھرے جہاں میں ہم نہ ملے تو کیا کرو گے؟

یہ گنگناہٹ بہت دیر تک اس کے ساتھ رہی، اس نے سوچا یہ اداسی مجھے مار ڈالے گی، اس نے ایک

نئے عزم کا ارادہ کرلیا۔

اس نے رات دن کوشش کے بعد اپنا ٹرانسفر دوسرے شہر میں کروالیا یوں چپکے سے ایک دن اس نے یہ شہر ہی چھوڑ دیا، جہاں صفدر کی بہت سی یادیں تھیں، وہ باتیں، وہ لمحات، حسین دلفریب، دلنشین طمانیت سے پر ساعتیں، ان سے پیچھا چھڑانا ناممکن تھا۔

نیا شہر، نئے لوگ، نیا ماحول، نیا اسکول...... پرانی یادیں، پرانے دکھ مگر ایک ایسا حوصلہ کہ بس مجھے جینا ہے اور جینے کا یہی حوصلہ اسے زندگی کی طرف لے آیا۔

شائستہ کے مالک مکان بہت اچھے تھے، شائستہ نے ان لوگوں کو یہ بتایا تھا کہ اس کے شوہر پانچ سال کے کنٹریکٹ پر سعودیہ گئے ہوئے ہیں، یوں لوگوں کے سامنے وہ سرخ رو ہو کر زندگی گزار رہی تھی، مطمئن زندگی گزارنے کے لیے دنیا کو بھی مطمئن کرنا پڑتا ہے، شائستہ اندر سے کتنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی یہ وہی جانتی تھی۔

☆☆☆

صفدر سناٹے میں تھا، اس کی خوب رو مگر نئی نویلی دلہن اسے سنا رہی تھی۔

''صفدر ہوش میں آؤ، مت بھولو کہ یہ اسٹیٹس، یہ مقام، یہ شان و شوکت اور اس سوسائٹی میں تمہارا یہ مقام میں نے دیا ہے، میرے پاپا کے احسانات ہیں تم پر، صرف بیٹی کی ضد اور خواہش کو پورا کیا ہے انہوں نے ورنہ تم کیا تھے؟ کیا تھی تمہاری اوقات، ایک معمولی سی کمپنی میں ملازم، جہاں کوئی مستقبل نہ تھا، نہ ترقی...... اوقات میں رہ کر مجھ سے بات کیا کرو، سمجھے آئندہ اس لہجے میں مجھ سے بات کی نا...... تو...... جس طرح میں نے تمہیں زمین سے اٹھا کر آسمان پر لا کھڑا کیا ہے اسی طرح آسمان کی وسعتوں سے اٹھا کر زمین کی تہ میں پھینک سکتی ہوں۔''

سلمٰی کا یہ روپ...... یہ انداز...... یہ سوچ اور ایسی گفتگو۔ وہ سوچنے لگا شادی کو ابھی صرف ایک ہفتہ ہی تو ہوا ہے۔ صفدر نے اس کی بے راہ روی اور بے حیائی پر پابندی لگانے کی پہلی کوشش کی تھی تو اسے یہ سب کچھ سننے کو ملا، بھلا وہ آزاد خیال لڑکی یہ کیسے برداشت کرتی۔

''سلمٰی ! یہ مت بھولو کہ تم میری بیوی ہو...... مسلمان ہو...... اور......!''

''بس بس زیادہ وعظ جھاڑنے کی ضرورت نہیں، میرا ماحول یہی ہے تم کو پسند ہے تو ٹھیک ورنہ بالکل خاموشی کے ساتھ بے نام سی زندگی گزار دو، مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑتا......'' اس نے سگریٹ جلائی۔

''تم میرے سامنے سگریٹ نہیں پیو گی۔'' وہ آگے بڑھا۔ ''تم کو کیا ہو گیا ہے...... آج سے پہلے تو ایسی نہ تھیں، آج تمہیں۔''

''صفدر! یہ اگر مگر چھوٹے لوگوں میں ہوتا ہے۔'' بڑے لوگوں میں دوٹوک فیصلے لمحوں میں ہو جاتے ہیں۔ افہام و تفہیم میں بڑا وقت گزر جاتا ہے، تب کہیں جا کر رزلٹ سامنے آتا ہے، کبھی نیگٹو، تو کبھی پوزیٹو، میں شائستہ نہیں ہوں میں سلمٰی ہوں اب تم نے آج میرا یہ روپ دیکھ لیا ہے نا تو سمجھو میرا اصل روپ یہی ہے۔ بولو منظور ہے۔'' وہ ہنسی۔

صفدر کی عقل دنگ تھی، منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا، وہ سوچنے لگا کہ سلمٰی کے ساتھ زندگی سونے کا پنجرہ ہے جہاں صرف دولت کی جھنکار تو ہے لیکن عزت، پیار، محبت، خلوص کا گزر بھی نہیں، سلمٰی کے غیر اخلاقی فیشن، ماڈرن زندگی کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اسے شائستہ کا بھول پن اور شرافت یاد آنے لگی، اس کا بہت جی چاہتا کہ...... اپنے پرانے رشتوں، اپنے پرانے رستوں کی طرف لوٹ جائے مگر اسے اپنے رویے اور بد اخلاقی کے تمام ڈائیلاگ یاد تھے، صفدر سوچنے لگا۔

اب وہ مجھے قبول نہیں کرے گی، میں نے اسے کس حال میں چھوڑا تھا لمحوں میں میں نے سارے

واسطے، سارے رشتے، سارے بندھن توڑ ڈالے تھے......اور......وہ کتنی مستقل مزاجی سے مہر ہر وار...... ہر ستم مسکرا کر سہہ رہی تھی۔

مگر آج اس کا دل چاہا کہ وہی پرانے لباس استعمال کرے، وہ شرٹ پینٹ جو شائستہ کو بہت پسند تھے، اس نے بیگ کھولا تو سائستہ کی ڈائری پہلے کی طرح اب بھی اپنی مخصوص جگہ پہ رکھی اسے بلا رہی تھی، وہ بے اختیار ڈائری کی طرف لپکا، شائستہ کی رائٹنگ میں اس کے دل کی آواز تھی۔

جدا تو ہو رہے ہو مگر یہ سوچ لو ضرور تم
جدائی کے لمحے برداشت نہ کر پائے تو کیا کرو گے؟

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

اگلی صبح جب وہ بیدار ہوا تو اسے اس محل نما گھر سے بے دخلی کا پروانہ مل چکا تھا، سلمیٰ نے اسے دقیانوسی، تنگ نظر اور نفسیاتی مریض قرار دے کر طلاق نامے پر دستخط کروا کے اسے چلتا کیا۔ صفدر سوچنے لگا زندگی اگر خواب ہے تو کس قدر بھیانک اور زندگی اگر آہٹ ہے تو کس قدر سماعت خراش۔

سب کچھ لٹا کر وہ اپنی پرانی محبت بھری یادوں کی نگری میں پہنچا تو بھاری تالا دروازے پر جھولتا ہوا اس کا مذاق اڑا رہا تھا اس کے دل سے آہ نکل گئی، اسے یقین تھا کہ شائستہ اس کے زخم زخم وجود کو سمیٹ لے گی، اسے پتا تھا وہ محبت کی دیوی ہے، خلوص کا مجموعہ ہے، صبر کی علامت ہے، وہ ضرور اسے معاف کر دے گی مگر اس شہر میں کوئی ہوتا تو اس کے زخموں کا مداوا کرتا۔

وہ کئی دنوں تک مارا مارا پھرتا رہا۔ وقت کی ٹھوکروں میں نئے زخموں کی دریافت کا احساس بھی سزا بن کر اس کے وجود میں پلتا رہا، اور پھر ایک دن اس نے بھی شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا...... وہ فضائیں جن کی وسعتوں میں شائستہ کی چاہتیں تھیں اور وہ تپتا ہوا سورج جس میں سلمیٰ کی عیاشیاں اور تلخیاں تھیں ایک رات اس نے چھوڑ دیا۔

وہ کہاں سے سوار ہوا، کہاں پہنچا......؟ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔

نیا شہر، نئے لوگ، نئی صبح، نئی شام......! وہ زندگی کو تلاشتا رہا، چلتا رہا کہ اچانک اس کی نظر دیوار کی طویل باؤنڈری پر پڑی، کسی منچلے نے کوئلے سے لکھا تھا۔ ”اگر اس بھرے جہاں میں ہم نہ ملے تو کیا کرو گے۔“

صفدر نے اسی سایہ دیوار کو اپنی منزل بنا لیا، شاید یہ کسی اسکول کی دیوار تھی کیوں کہ اسے بچوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھی۔

اور پھر اسی دو پہر وہ جھلتی ہوئی دھوپ میں دیوار سے لگا دور خلاؤں میں تک رہا تھا کہ جیسے خلاؤں میں بھونچال آ گیا اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا ہو اس کی نگاہوں کے سامنے اس کی منزل، اس کی جان عزیز شائستہ کھڑی تھی، وہی تمکنت، وہی بانکپن......!

اس کی زبان گنگ ہوگئی، جیسے قفل پڑ گئے ہوں۔

شائستہ نے صفدر کو دیکھا......ایک لمحے کو دکھ کی لہر اس کے وجود میں سرایت کر گئی، وقت کی گرد نے صفدر کو بے رنگ کر دیا تھا، آنکھوں کے رت جگے بتا رہے تھے کہ خوشیاں اس سے روٹھ گئی ہیں۔ دونوں لبوں کو سیے دل کی آنکھ سے محو کلام تھے۔

گلے شکوے، شکایتیں، وضاحتیں، سبھی کچھ آنکھوں کی زبان سے ہو رہا تھا۔

اور پھر صفدر کی آنکھ سے وہ آنسو ٹپکے، شائستہ نے دیکھا ان آنسوؤں میں فتح مندی اور خوشی کی جھل مل کرتی کرنوں کی جگمگاہٹ تھی۔

شائستہ نے کچھ نہ کہا......مسکرائی ......اپنے آنسوؤں کو آنکھوں میں دفن کیا اور صفدر سے بولی۔

”آپ کی تلاش ختم ہوئی اور میرا انتظار! چلیے ماضی کے دریچے بند کریں۔ ایک نئے دن کا آغاز کرتے ہیں، جہاں زندگی گنگناتی اور چاہت مسکراتی ہو۔“

صفدر نے اس کا ہاتھ تھام لیا تو جیسے ہر طرف خوشیوں کے رنگ بکھر گئے!

☆☆

لاش کی بیداری

قانون والا

بین الاقوامی شہرت کی مالک اس سفاک مجرمہ کی سنسنی خیز داستان جس کی انٹرپول سے لے کر مختلف سیکرٹ سروسز میں دھوم تھی۔ جو ہانگ کانگ کی خطرناک مجرمہ ہے۔ اس پر کئی ملکوں میں بغاوت کرانے اور ان کے سرکاری راز چرانے کا الزام ہے۔ وہ بھیس بدلنے کے ساتھ آواز بدلنے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی اور کم از کم بیس زبانوں کی ماہر ہے۔

قدم قدم پر حیران اور پر لطف سنسنی خیز واقعات سے بھرپور کرنل زاہد کی خطرناک مہم





کیپٹن جاوید اِن شخصیتوں میں سے تھا جو وقت کے دھارے پر بھی اپنے لئے تفریحِ طبع کے سامان فراہم کرنے سے نہیں چوکتے۔ اِس کا اعصابی نظام ہی شاید اِس قسم کا تھا کہ نت نئی حرکتوں کے بغیر اسے کبھی ذہنی سکون نہیں ملا۔

اِن دِنوں اِس پر مختلف قسم کے کھانوں میں جدّت اور عجیب و غریب اختراعات کا دورہ پڑا تھا۔ مرغِ مسلّم سے بریانی تک، اور بینگن کے بھرتے سے مسور کی دال تک، ہر ڈش جدید تجربات کے مرحلے سے گزرنے کے بعد ہی کھانے کی میز تک پہنچ پاتی تھی۔

سیما ایک ہفتے کی رخصت لے کر اپنے محکمے کی ایک دوست کے ساتھ کشمیر گئی ہوئی تھی اور کرنل زاہد چار پانچ روز سے صبح نکلتا تو اِس کی واپسی رات گئے ہی ہوتی ایسے حالات میں راوی جاوید کے لئے چین ہی چین لکھتا تھا۔

اِس وقت بھی وہ اپنی کمر سے ایپرن باندھے نئے

قدم قدم پر حیران کن اور پُر لطف

لاش کی بیپاری

سنسنی خیز واقعات سے بھرپور

بین الاقوامی شہرت کی مالک اس سفاک مجرم کی سنسنی خیز داستان جس کی انٹرپول سے لیکر مختلف سیکرٹ سروسز میں دھوم تھی

کرنل زاہد کی خطرناک مہم



خانساماں فداعلی کے ساتھ داروغہ مطبخ کے فرائض انجام دینے میں مصروف تھا اور پرانا خانساماں لال محمد باورچی خانے کے فرش پر ادھر اُدھر پھیلے برتنوں کے ساتھ مسالے کے ڈبّوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ باورچی خانے پر فداعلی کی اجارہ داری اسے اندر ہی اندر کھولا رہی تھی۔

دراصل خانساماں کے طور پر فداعلی جاوید ہی کی دریافت تھا۔ ایک ہفتہ قبل ہی وہ خود ہی اسے نہ جانے کہاں سے پکڑ لایا تھا۔ پھر فداعلی نے باورچی خانے کا چارج سنبھالتے ہی جب لال محمد سے امریکن لہجے میں انگریزی بولنی شروع کی تو اُس نے اپنا منہ پیٹ لیا۔ اِدھر فداعلی کی کہانی بھی کچھ کم حیرت انگیز نہ تھی۔

فداعلی کے بقول وہ لکھنؤ کے ایک سیّد گھرانے کا چشم و چراغ تھے۔ لیکن حالات نے جب اِن کے گلے میں میٹرک کا سرٹیفکٹ باندھ دیا تو وہ گھبرا کر ایک دوغلے انگریز کے یہاں نوکر ہوگئے۔ یہیں سے اِن کے سنہری دنوں کی ابتداء ہوئی تھی۔ تین ماہ بعد جب انگریز لندن گیا تو فداعلی بھی یہ سوچ کر اِس کے ساتھ نتھی ہوگئے کہ لندن سے کچھ بن کر آئیں گے۔ مگر لندن پہنچ کر دوغلے فرنگی نے دھوکا دیا۔ اور فداعلی مختلف ہوٹلوں میں بٹلری کرتے کرتے خانساماں کے درجے تک پہنچ گئے۔

لندن میں سات آٹھ برس تک انگریزی کھانے تیار کرنے کا تجربہ حاصل کرکے وہ شاہی باورچی بننے کے خواب ہی دیکھ رہے تھے کہ ایک روز ہوٹل کے مالک نے موصوف کی پُشت پر ایک من کا سور لاد کر باورچی خانے میں لے جانے کا حکم صادر کر دیا۔ آدمی با اُصول تھے اِس لیے مالک کی سات پشتوں پر لعنت بھیج کر زار و قطار روتے فٹ پاتھ پر آگئے۔

کئی ہفتہ دھکّے کھانے کے بعد قسمت نے انہیں پھر پچپن برس کی ایک بوڑھی فرنگن کے کاسۂ ضرورت میں جا ڈالا فداعلی دوبارہ کسٹرڈ اور روسٹ چکن کے پھیر میں اُلجھ گئے۔ اُن کی مالکہ مقامی یونیورسٹی میں انگریزی پڑھانے کے ساتھ اپنے دو السیشین کتّوں کی رفاقت میں زندگی گزار رہی تھی مگر فداعلی ایسے سبز قدم نکلے کہ ایک ماہ میں ہی بڑھیا کے دونوں کتّوں کو کھا گئے۔ بڑھیا لاکھ انگریز سہی، لیکن لندن میں بھی توہم پرستی پر پابندی تو نہیں۔ دوسرے کتّے کے مرتے ہی اِس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ بڑھیا نے ایک اتوار کو اپنے کتّوں کی قبر پر پھول چڑھانے کے بعد فداعلی کی خدمت میں ساٹھ پونڈ کا چیک پیش کیا اور بڑی عاجزی سے عرض کیا کہ مسٹر بورر یا سنرگول کیجئے مجھے اِس عمر میں بھی اپنی زندگی بہت پیاری ہے۔

بڑھیا کے اِس برتاؤ نے لندن سے فداعلی کا دل ایسا اُچاٹ کیا کہ فوراً اپنے وطن کا رُخ اختیار کیا۔ اب یہ اِن کی خوش نصیبی ہی تھی کہ وطن آئے دو روز بھی نہیں گزرے تھے کہ انہیں کیپٹن جاوید کے سائے میں پناہ مل گئی۔ نتیجے میں وہ اِس وقت جاوید کے سامنے بیٹھے پیاز کتر رہے تھے۔

اچانک فداعلی چھُری ایک طرف ڈال کر کھڑا ہوگیا جاوید نے گیس کا چولہا بند کرتے ہوئے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ پھر اِس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی کو نظرانداز کرتے ہوئے تیز آواز میں پوچھا۔

"کیا ہوا۔"؟

"نہیں کٹتی۔"

"کیا۔"؟

"یہی۔" فداعلی نے پیاز کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

"کاٹنا پڑے گی۔" جاوید خونخوار لہجے میں بولا۔

"ہرگز نہیں کاٹوں گا۔"

"ابے چُپ۔"

"لنگویج پلیز۔" فداعلی نے احتجاج کیا۔ "مجھے اِس پر اعتراض ہے۔"

"کوئی بات نہیں، تیرا اعتراض نوٹ کر لیا گیا۔" جاوید دانت پر دانت جما کر بولا۔

"چل پیاز کاٹ۔"

"اونین کہیئے، آپ پیاز کہہ کر بے حُرمتی نہیں کرسکتے۔" فداعلی نے بُرا سا موہنہ بنایا۔

"کہتے ہوں گے، اُردو میں پیاز ہی کہتے ہیں۔"

"لیکن میں سات برس لندن میں رہا ہوں اور میٹرک پاس ہوں۔"

"غم نہ کر۔" جاوید مُسکرایا۔ "میں تیرا سرٹیفکٹ اُبال کر بریانی میں تیز پات کی جگہ استعمال کروں گا۔"

"آپ میری، یعنی سید فداعلی سابق خانساماں ڈائمنڈ ہوٹل لندن ریٹرن کی توہین کر رہے ہیں۔"

"ابھی میں تیری حجامت بھی کروں گا۔" جاوید دہاڑ کر بولا۔

"چلّایئے مت۔" فداعلی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ممکن ہے میرا پیشاب خطا ہو جائے۔"

"خطا کر کے دیکھ۔" جاوید نے آنکھیں نکالیں۔

"ہونے والا ہے۔"

"روک اسے، ورنہ مجھے اپنے پرانے خانساماں کے سامنے شرمندگی ہوگی۔" جاوید کے لہجے میں اچانک بیچارگی کا تاثر آگیا۔

"تو اپنا لہجہ درست کیجئے۔"

"کر لیا۔ اب گدھا پن ختم کر اور پیاز کاٹ۔"

"مجھے گدھے پن پر بھی اعتراض ہے۔"

"چل گدھا پن واپس لیا۔"

"تھینک یو۔" فدا علی نے اس طرح سر کو جھٹکا دیا جیسے ذہن سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ وہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے دوبارہ پیاز کترنے لگا۔ ایک منٹ بعد ہی اس کی آنکھوں سے پھر بے تحاشہ پانی بہنے لگا۔ اس بار اس نے جاوید کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے گلے پر چھری رکھ کر کہا۔

"۔۔۔ میں خودکشی کر لوں گا۔"

"کر کے دیکھ۔" جاوید گردن پھیر کر بولا۔ "دوپہر کا کھانا تیار ہونے سے قبل اگر تو نے ایسی کوئی حرکت کی تو تیرے شامی کباب بنا کر پورے محلے میں تقسیم کرا دوں گا۔"

"آپ کچھ بھی کریں، لیکن میں پیاز نہیں کاٹوں گا۔"

جاوید نے فدا علی کو گھور کر دیکھا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ پاس ہی کھڑا پرانا خانساماں لال محمد اسے رحم آلود نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

"میں پوچھتا ہوں، آخر آپ نے یہ سارا کھڑاک اپنے سر کیوں لے لیا۔"

جاوید نے سر اٹھا کر لال محمد کو دیکھا اور بولا۔

"اس لئے کہ تو نے قدیمی کھانے کھلا کھلا کر میرے پیٹ کو محکمہ آثار قدیمہ بنا دیا تھا۔"

"آخر کیا خرابی ہوتی تھی میرے کھانوں میں۔"

"ارے تو ہمیشہ بریانی میں لہسن اور سونف کا انبار لگا دیتا تھا۔"

"لیکن اس کے بغیر تو بریانی تیار نہیں ہو سکتی۔"

"ہو کیسے نہیں سکتی۔" جاوید جھلا کر کھڑا ہو گیا۔ اسی لمحہ اس کی نظر کچن کے دروازے پر کھڑے ڈاگا پر پڑی۔ ڈاگا کو دیکھتے ہی جیسے اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ "تم آؤ، بڑے موقعہ سے آئے۔ چلو جلدی سے یہ بتاؤ کہ لہسن اور سونف کے بغیر بریانی کیسے پکتی ہے؟"

"اس کا مطلب ہے تمہارے بھٹیار پن کا خبط ابھی جاری ہے۔" ڈاگا ہنس کر بولا۔

"تم اسے خبط کہتے ہو پیارے، ساری دنیا اس پاپی پیٹ کے لئے زندہ ہے۔" پھر اس نے فدا علی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"پیاز کاٹنا بند کر کے چارٹ نمبر سو کی مدد سے پنچ تیار کر لے۔ میں ڈائننگ ہال میں ڈاگا صاحب کو گوشت کے بغیر لپسندے پکانے کی ترکیب بتا رہا ہوں۔"

فدا علی نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ جاوید ڈاگا کا ہاتھ پکڑ کر کچن سے باہر نکل آیا۔

ڈائننگ ہال میں پہنچ کر ڈاگا جاوید کے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہنس کر بولا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم آئے دن نت نئے چکر کیوں چلاتے رہتے ہو۔؟"

"دراصل میں ایک جیسے کھانے کھاتے کھاتے اکتا گیا ہوں۔ معدہ چوپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔" جاوید نے کہا پھر اپنے لہجے میں مزید سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "یوں بھی جب زندگی کے ہر شعبہ میں اختراعات ہو رہی ہیں تو سالوں سے ایک ہی جیسے کھانوں کی قدامت کا طلسم کیوں نہ ٹوٹے مجھے فخر ہے کہ میں نے موجودہ کھانوں میں حیرت انگیز تبدیلیاں

کی ہیں۔"

"یعنی اب تم مجھے کھانا پکانے کے سلسلہ میں کوئی لیکچر دو گے؟" ڈاگا مسکرایا۔

"نہیں۔" جاوید ہنسا۔ "یہ ایک بین الاقوامی موضوع ہے مسٹر ڈاگا اور میں تم جیسے کوڑھ مغز کو اس قابل نہیں سمجھتا۔"

ڈاگا کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فدا علی کھانے کی ٹرے دھکیلتا ہوا ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔ اس نے بڑے سلیقے سے ٹرالی ڈائننگ ہال کے قریب روکی اور دو خالی پلیٹیں میز پر رکھتے ہوئے ایک بڑی قاب اٹھا کر جاوید کے سامنے رکھدی انداز ایسا ہی تھا جیسے ذراسی بے احتیاطی سے قاب چھلک پڑے گی۔

جاوید نے بڑی بےصبری سے قاب کا سرپوش ہٹایا لیکن خالی قاب پر نظر پڑتے ہی سوالیہ نظروں سے فدا علی کو گھورا۔ "یہ کیا ہے؟"

"سوری جناب۔"

"چارٹ نمبر تین کے لوازمات تیار کرنے میں کافی وقت لگتا ہے۔ میں نے چارٹ نمبر سات پر عمل کیا ہے۔"

"اوہ۔" جاوید بچوں کی طرح خوش ہو کر بولا۔ "میں جانتا تھا تو کافی سمجھدار ہے۔"

"ذرہ نوازی ہے آپ کی۔" فدا علی نے خادمانہ انداز میں دوہرا ہو کر کہا۔

جاوید نے سروس اسپون اٹھا کر خالی قاب میں ڈال کر گھمایا پھر اپنے ہاتھ کو اس طرح حرکت دینے لگا جیسے قاب سے کوئی چیز نکال کر پلیٹ میں ڈال رہا ہو۔ دو تین بار یہی عمل دوہرانے کے بعد اس نے قاب ڈاگا کی سمت سرکاتے ہوئے کہا۔ "لو شروع کرو۔ تمہارے چہرے سے ہی لگ رہا ہے کہ بہت بھوکے ہو۔"

ڈاگا پھٹی پھٹی آنکھوں سے جاوید کو مسلسل گھورے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے اسے جاوید کی صحیح الدماغی پر شک ہے۔

"شروع کرو بھئی۔ ٹھنڈا ہو گیا تو سارا مزا جاتا رہے گا۔" جاوید بولا۔

"مگر خیال رہے کہ اس میں زعفران کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ پیٹ سے کچھ کم ہی ٹھونسنا ورنہ پانی پیتے پیتے مر جاؤ گے۔"

"مگر یہ ہے کیا؟" ڈاگا نے چیخ کر کہا۔

جاوید نے بڑے اطمینان سے خالی منہ کو چلاتے ہوئے چٹخارہ لے کر کہا۔ "خیالی پلاؤ۔"

"میرا خیال ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

"میں جانتا تھا تم یہی کہو گے۔" جاوید یوں مسکرایا جیسے کسی ناسمجھ بچے کی بات پر ہنسا ہو۔ "دراصل میں نے پہلی بار اسے عملی شکل دی ہے۔ ورنہ ابتک اس کا ذکر اردو محاوروں میں ملتا تھا۔ ویسے اس کی سب سے بڑی افادیت یہ ہے کہ ایسے کھانے سے مہمان کے پیٹ اور میزبان کی جیب دونوں پر کسی قسم کا بار نہیں پڑتا۔"

"میرا خیال ہے ایسے آپ ہی نوش جان فرمایئے۔" ڈاگا نے قاب کو جاوید کی طرف کھسکاتے ہوئے ناگوار لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں، میں جانتا تھا گدھے زعفران نہیں کھاتے پھر اس نے ٹرالی سے دوسری قاب اٹھا کر ڈاگا کے سامنے رکھدی۔ "لو یہ کھاؤ۔"

ڈاگا نے کچھ کہے بغیر قاب کا سرپوش اٹھایا۔ قاب میں بھرے ہلدی کی رنگت کے پانی کی سطح پر مٹر جیسے دانوں والی کوئی چیز تیر رہی تھی۔ اس نے جاوید کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے طنز سے کہا۔

"اب اس ڈش کے بارے میں بھی کوئی انکشاف فرما دیجئے۔"

"اوہ یہ۔" جاوید ہنسا۔ "اسے عرف عام میں سویابین کہتے ہیں۔ تم نے سنا ہو گا کہ ایک چھٹانک سویابین میں ڈیڑھ کلو دودھ اور تین پاؤ گوشت جتنے پروٹین ہوتے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اسے کھانے کے بعد بڑی گہری نیند آتی ہے اور آدمی کسی استاد کے بغیر بین بجانا سیکھ سکتا ہے دراصل اس غذائی قوت کے تحت میں اسے تمام اجناس کی والدہ محترمہ کہتا ہوں۔"

ڈاگا چند لمحوں تک جاوید کو گھورتا رہا پھر ایک جھٹکے سے کھڑا ہو کر گڈ بائی کہتے ہوئے دروازے کی طرف گیا۔

"ارے سنو تو۔" جاوید زور سے چیخا۔ "اماں اس کے بعد کالی مرچوں کی کافی اور ہوا کے سگار باقی ہیں۔"

ڈاگا نے ایک لمحہ کے لئے پلٹ کر دیکھا اور دروازے سے اس طرح نکلا چلا گیا کہ اگر معمولی سی تاخیر بھی ہوئی تو اسے وہ زرد مشروب پینا پڑ جائے گا۔ پھر اس کے باہر نکلتے ہی جاوید کے حلق سے ایک بےساختہ قہقہہ بلند ہوا تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی اور فدا علی نے پاس ہی پڑی چھوٹی سی تپائی پر رکھے فون کا ریسیور اٹھا کر جاوید کی طرف بڑھا دیا۔

"ھیلو" جاوید نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا کر رہے ہو؟"

"برخوردار فدا علی کا تیار کردہ خیالی پلاؤ اور سوبا بن کا سُوپ نوش کر رہا ہوں" جاوید نے دوسری طرف سے بولنے والے کرنل زاہد کی آواز پہچان کر کہا۔

"خود کردہ را علاج نیست" زاہد نے ہنستے ہوئے کہا پھر ایک لمحہ خاموش رہ کر بولا۔

"کپڑے بدل کر بیس منٹ کے اندر کیفے سینورا پہنچو، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"کیوں خیریت ہے؟"

"تمہارے لئے تھوڑی سی تفریح مہیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"خدا مجھ پر رحم کرے۔"

"کیوں، نکل گیا دم؟"

"ظاہر ہے آپ کی مہیا کی گئیں تفریحات خالی از علت نہیں ہوتیں۔"

"فضول باتیں نہیں" زاہد بولا اور دوسری طرف سے گفتگو کا سلسلہ بند ہو گیا۔

•

کرنل زاہد گزشتہ پانچ روز سے اس مینڈک جیسی پھولی ناک والے پچکے رو شخص کے پیچھے لگا ہوا تھا اس وقت بھی وہ کیفے سینورا میں لگ بھگ ایک گھنٹہ سے اس بدہیئت شخص کے داھنی طرف والی دو میزیں چھوڑ کر تیسری پر جما ہوا تھا۔

گزشتہ پانچ روز میں زاہد اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم کر سکا تھا کہ وہ کلبر روڈ پر عظیما مینشن کے ایک فلیٹ میں جگل کشور کے نام سے قیام پذیر ہے اور فلیٹ اس نے بیس روز قبل ہی کرائے پر لیا ہے۔ لیکن زاہد کے خیال میں اگر جگل کشور کی مینڈک جیسی ناک کے نیچے پھیلی ہوئی بے ہنگم مونچھوں کی جھاڑیاں صاف کر دی جائیں تو پولیس ریکارڈ کے مطابق اس کا نام شنکر سامنتا ہوتا۔

کرنل زاہد کی معلومات کے مطابق شنکر سامنتا ایک ماہر نقب زن چالاک بلیک میلر، بے رحم قاتل اور بہترین جعل ساز تھا۔ کئی کیسوں میں ماخوذ ہونے کے علاوہ اس پر ایک فلم اسٹار کو بلیک میل کرنے اور اس کے شوہر کو قتل کرنے کا الزام بھی تھا۔ بمبئی کے علاوہ مختلف شہروں کی پولیس اسے گرفتار کرنے کے چکر میں تھی۔ لیکن سامنتا خطرے کی بو سونگھتے ہی کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتا۔

اگر زاہد چاہتا تو کسی وقت بھی اس پر ہاتھ ڈال سکتا تھا لیکن وہ اس شہر میں سامنتا کی موجودگی کا سبب جانے بغیر اسے چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

زاہد نے سامنتا کو پہلی بار ہارروک ریسٹورنٹ میں دیکھا تھا اور یہ اتفاق ہی تھا کہ اس روز وہ سامنتا کی عین پیچھے والی میز پر تھا۔ ممکن ہے وہ سامنتا کو نظر انداز ہی کر جاتا اگر اس کی میز کے قریب سے گزرنے والی ایک سفید فام لڑکی کو لڑکھڑانے کے بہانے سامنتا کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا۔

اخروٹ کی رنگت جیسے بالوں اور دلکش چہرے والی لڑکی بس ایک لمحہ کے لئے سامنتا کے قریب ٹھہری تھی اور دوسرے ہی لمحہ "سوری" کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ لڑکی کے ریسٹورنٹ سے باہر جاتے ہی سامنتا نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نیلے رنگ کا ایک چوکور کاغذ باہر نکالا اور اس کی مختصر تحریر پڑھتے ہوئے کاغذ کو دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔

پھر چند منٹ بعد جب سامنتا ہارروک سے باہر جانے کے لئے اٹھ رہا تھا تو زاہد اس کے قریب پہنچ کر اس طرح پھسلا کہ سامنتا سمیت فرش پر آ رہا دوسرے ہی لمحہ اس کی جیب میں پڑا ہوا کاغذ کا پرزہ زاہد کی جیب میں تھا اور وہ بے حد خجالت آمیز انداز میں سامنتا سے معذرت کر رہا تھا۔

پندرہ منٹ بعد ہی زاہد ایک گھٹیا سے چائے خانے کے کیبن میں بیٹھا سامنتا کی جیب سے برآمد ہونے والے کاغذ پر لکھی تحریر کو گھور رہا تھا۔ سرخ روشنائی سے انگریزی میں بس دو جملے لکھے تھے۔

"شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔ تم اپنا کام شروع کر سکتے ہو۔"

زاہد کی سمجھ میں اس عجیب و غریب پیغام کا مطلب تو نہیں آیا۔ لیکن سامنتا کی شخصیت اس کے لئے مزید پراسرار ہو گئی۔ آج بھی وہ سامنتا کے فلیٹ سے اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا اور اس وقت وہی غیر ملکی لڑکی سامنتا کے سامنے بیٹھی تھی۔ سرخ رنگ کی گہری

لپ اسٹک اور اسی رنگ کے اسکرٹ میں وہ بالکل شعلہ جوالہ لگ رہی تھی۔ جس وقت سامنتا کیفے سینورا پہنچا تو لڑکی پہلے سے وہاں موجود تھی اور اس وقت وہ دونوں نہایت دھیمی آواز میں کسی خاص مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ یہاں سے جلدی نہیں اٹھیں گے۔ چند منٹ پہلے ہی زاہد نے لڑکی کو اپنی ٹیبل سے متعلق ویٹر کو لنچ کا آرڈر دیتے دیکھا تھا۔

زاہد نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ جاوید کو فون کئے بیس منٹ ہو چکے تھے۔ اس نے اشارے سے ویٹر کو بلا کر اپنے لئے کھانے کا آرڈر نوٹ کرایا اور سو روپے کا نوٹ اس کی جیب میں ٹھونستے ہوئے بولا۔ "تم کھانا لگاؤ میں ابھی پانچ منٹ میں آیا اور ہاں خیال رہے کہ اس میز پر کوئی دوسرا نہ بیٹھے۔"

"آپ بے فکر رہیں جناب۔" ویٹر کسی قدر خم ہوتے ہوئے بولا۔ دوسرے ہی لمحہ کرنل زاہد لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر جانے والے گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔

پھر وہ جیسے ہی باہر نکلا اس کی نظر سینورا کے پارکنگ لاٹ میں کھڑی ٹیکسی سے اترتے کیپٹن جاوید پر پڑی۔ کریم کلر کے سوٹ اور گہری سرخ ٹائی میں وہ خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ ٹیکسی کا بل چکا کر جاوید اس کی طرف بڑھا۔

"فرمائیے۔ کس آگ میں جھونکنے کا ارادہ ہے؟"
جاوید زاہد کے قریب پہنچ کر بولا۔

"فی الحال تمہیں ایک حور شمائل حسینہ کا تعاقب کر کے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں۔"

"ذرا ایک بار پھر کہیئے، مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں رہا۔"

زاہد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اسے مختصر الفاظ میں گزشتہ پانچ روز کی مکمل سرگزشت سناتے ہوئے کہا۔ "اگر سامنتا اس لڑکی کے ساتھ نہیں گیا تو تم اس لڑکی کا تعاقب کرو گے۔"

"صرف تعاقب!" جاوید نے مایوس لہجے میں پوچھا۔
"نہیں، اگر لڑکی کے متعلقین راضی ہوں تو شادی بھی کر سکتے ہو۔"

"خدا آپ کا بھلا کرے۔"
زاہد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر داخلی دروازے پر پڑی۔ سامنتا اکیلا باہر نکل رہا تھا۔ "اوہ۔" اس نے چونک کر کہا۔
"لڑکی شاید اندر ہے۔ تم چلو۔ میں اسے دیکھتا ہوں۔"
پھر جاوید کے کچھ کہنے سے قبل ہی زاہد تیز قدمی سے چلتا اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گیا۔

•

کیپٹن جاوید جس وقت سینورا کے ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو سرخ اسکرٹ والی لڑکی کھانا ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ جاوید نے جان بوجھ کر لڑکی کے بالکل سامنے والی میز منتخب کی اور ویٹر کو بلا کر چکن سینڈوچ اور کافی کا آرڈر دینے لگا۔ ویٹر کے جاتے ہی اس نے لڑکی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ لیکن لڑکی ناگوار انداز میں سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

اچانک جاوید کے ذہن میں زاہد کے بتائے ہوئے اس پُراسرار پیغام کے جملے گونجے اور اس نے اونچی آواز میں کہا۔ "شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔ تم اپنا کام شروع کر سکتے ہو۔" لہجہ ایسا ہی تھا جیسے وہ کوئی شعر گنگنا رہا ہو۔ زبان انگریزی ہی تھی۔

دفعتاً جاوید نے لڑکی کو چونکتے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت تھی اور وہ جاوید کو اس طرح گھور رہی تھی جیسے اس نے جاوید کے سر پر سینگ اُگتے دیکھ لئے ہوں۔ اچانک لڑکی اپنی میز سے اٹھ کر جاوید کے سامنے والی نشست پر آکر بیٹھ گئی۔ اب اس کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔

"یہ ملک مجھے بہت پسند آیا۔" لڑکی دھیمی آواز میں بولی۔ "خصوصاً یہاں کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں۔"
"جی ہاں، خاص طور سے نیلی آنکھوں اور کتھئی بالوں والی لڑکیوں کے لئے۔"
"میرا خیال ہے تم نے ابھی چند سیکنڈ پہلے شادی سے متعلق کچھ کہا تھا۔"
"ہمارے یہاں کنوارے اس قسم کے جملے کہتے ہیں۔"
"کیا تم غیر شادی شدہ ہو؟"
"کئی جنموں سے۔"
"نہ جانے تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔"
"حالِ دل سنا رہا ہوں۔"
"میرا نام ایڈریلا ہے اور تمہارے ملک میں سیاحت کی غرض سے آئی ہوں۔"

"کیا تم فری نہ ہو۔"؟

"نہیں۔" ایڈریلا مسکرائی۔ "تم مجھے انگلوسوئس کہہ سکتے ہو۔"

"کوئی بات نہیں، ہر خوبصورت لڑکی بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے اور اسے کسی قوم سے منسلک کرنا مناسب نہیں۔"

"کیا تم ایک بار پھر وہی جملے دہرانا پسند کرو گے جو ابھی کچھ دیر قبل کہہ رہے تھے۔"

"مجھے یاد نہیں۔"

"مجھے یاد ہیں۔ تم نے کہا تھا، شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔ تم اپنا کام شروع کر سکتے ہو۔"

"ارے وہ۔" جاوید بے اختیار مسکرا دیا۔ "وہ تو ہماری زبان کی ایک فلم کے گانے کا مکھڑا تھا۔"

"کیا تم مجھے دیکھ کر مسکرائے نہیں تھے۔"؟

"ضرور مسکرایا ہوں گا۔ لڑکیوں کو دیکھ کر مسکرانا میری فطرت ہے۔"

"اس کا مطلب ہے میں تمہیں پسند ہوں۔"؟

"بیشک تم ہو ہی پسند آنے کی چیز۔"

"مجھ سے دوستی کرو گے۔"؟

"کیوں نہیں۔"

"تو آؤ۔ میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں۔"؟

"میرے ساتھ۔ میں ہوٹل امبر کے روم نمبر ۶۳ میں ٹھہری ہوں۔"

"ابھی نہیں۔"

"کیوں۔"؟

"میں نے سنا ہے خوبصورت لڑکیاں بڑھاپے کی ساتھی نہیں ہوتیں۔" جاوید افسردگی سے بولا۔ "میں تمہارے بوڑھے ہونے کا انتظار کروں گا۔"

"غم نہ کرو۔ میں تمہارے ہاتھ پیروں میں رعشہ آنے تک تمہارا ساتھ دوں گی۔"

"سچ!" جاوید خوش ہو کر بولا۔

"بالکل سچ۔"

"تو پھر چلو۔" جاوید کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

پانچ منٹ بعد ہی وہ دونوں سینورا سے باہر آ کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہے تھے۔ ایڈریلا نے ٹیکسی والے سے ہوٹل امبر چلنے کے لئے کہا اور پھر ٹیکسی اسٹارٹ ہوتے ہی ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"میں سوچ رہی ہوں کہیں تم مجھے دھوکا تو نہیں دو گے۔"؟

"کبھی کبھی کچھ لڑکیاں زندگی بھر یہی سوچتی رہ جاتی ہیں۔" جاوید فلسفیانہ لہجے میں بولا۔

"مجھے لگ رہا ہے کہ تمہارے اندر ہمارے یہاں کے نوجوانوں جیسی گرمجوشی نہیں۔"

"دراصل میں ذرا ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہوں۔"

"اگر تم واقعی ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہو تو میں خود کو احمق سمجھنے پر مجبور ہوں۔"

"کوئی حرج نہیں۔" جاوید مسکرا کر بولا۔ "جو لوگ خود کو احمق سمجھتے ہیں وہ دنیا کے برگزیدہ لوگ ہیں اور سب کے سب جنت میں جائیں گے۔"

"اچھا سچ سچ بتاؤ تم نے وہ شادی والا جملہ کیوں کہا تھا۔"

"شامت آئی تھی میری۔" جاوید جھنجھلا کر بولا۔

ٹیکسی اب ہوٹل امبر کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو رہی تھی پھر ٹیکسی کے رکتے ہی ایڈریلا دروازہ کھول کر اتری اور کرایہ ادا کرنے لگی۔ جاوید دوسری طرف کا دروازہ کھول کر پہلے ہی اتر پڑا تھا۔

ہوٹل امبر میں داخل ہو کر ایڈریلا نے ریسپشن ہال میں پڑے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ پھر جاوید نے دیکھا وہ کاؤنٹر پر پہنچ کر کسی کو فون کر رہی تھی۔

ایڈریلا کو فون کرتے ہوئے دیکھ کر جاوید نے سوچا کہ شائد اب چکر شروع ہو چکا ہے۔ تقریباً دو منٹ تک فون پر گفتگو کر کے وہ تیر کی طرح جاوید کی طرف آئی تھی۔

"آؤ چلیں۔" اس نے جاوید کا ہاتھ تھام کر بڑی لگاوٹ سے کہا۔

اور کوئی وقت ہوتا تو شائد وہ ایڈریلا کے اس شہد آگیں لہجے میں ڈوب جاتا۔ لیکن اس کی چھٹی حس بار بار کسی خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔ بہر حال چند منٹ بعد ہی وہ ایڈریلا کی رہنمائی میں روم نمبر ۶۳ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے جاوید کی طرف دیکھے بغیر ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے جاوید نے اس کی تقلید کی تھی۔

اندر سے کمرے کا دروازہ بولٹ کر کے ایڈریلا نے ایک

کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

وہ بیٹھنے کے لئے کرسی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ باتھ روم کا دروازہ کھلا۔ اور ایک ادھیڑ عمر کا طویل القامت شخص ریوالور ہاتھ میں لئے باہر آگیا۔ جاوید نے دیکھا کہ وہ کوئی دیسی آدمی نہیں تھا۔ لیکن اس کے چہرے کا بایاں حصہ بُری طرح جھلسا ہوا تھا۔ جگہ جگہ سے لٹکی کھال اور دائنی آنکھ کے نیچے گہرے زخم کے نشان نے اسے مزید بھیانک بنا دیا تھا۔ بھیانک چہرے والے کے ریوالور کا رُخ جاوید ہی کی طرف تھا۔

"میرے خیال میں یہ تمہارے بڑے بھائی ہیں؟"

جاوید نے ایڈریلا کی طرف دیکھا۔

"بکواس!" بھیانک چہرے والا اُسے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے پھنکارا۔

"کون ہو تم؟"

"اِن محترمہ سے پوچھو، مجھے یہی لے کر آئی ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔ یہ ریوالور بے آواز ہے۔"

"واقعی۔" جاوید مسرت بھرے لہجے میں اُس کی طرف بڑھا۔ "دکھانا ذرا میں نے آج تک ایسا ریوالور نہیں دیکھا۔"

"شٹ اپ۔ وہیں کھڑے رہو جہاں کھڑے ہو۔" بھیانک چہرے والا گرج کر بولا۔

"سچ سچ بتاؤ ایڈریلا کو دیکھ کر تم نے وہ جملے کیوں کہے تھے۔"

"ارے وہ ..." جاوید ہنس کر بولا۔ "وہ تو میں ایک فلمی گانا گنگنا رہا تھا۔"

بھیانک چہرے والے نے سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔ "میں سچ مچ تمہیں گولی مار دوں گا۔"

"یار تم یہ جملہ بار بار دہرا چکے ہو۔" جاوید اُسے غصہ دلانے والے لہجے میں بولا۔

"ویسے وہ یہ تو دیکھ ہی چکا تھا ریوالور بے آواز نہیں ہے۔ اور بھیانک چہرے والا جھوٹ بول رہا تھا۔

"میرا خیال ہے تم آسانی سے نہیں اُگلو گے۔" بھیانک چہرے والا غرّایا۔ پھر کچھ سوچ کر ریوالور اُس نے جیب میں ڈال کر کہا۔ "اب میں تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بناؤں گا۔"

"مگر کیوں؟" جاوید بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

"تاکہ تم سچی بات اُگل دو۔"

پھر جاوید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بھیانک چہرے والے نے اس پر چھلانگ لگا دی اور جھٹکے سے اپنے ہی زور میں فرش پر آرہا۔ دراصل جاوید تو اُس کے اُچھلتے ہی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا تھا۔

بھیانک چہرے والا بھی کچھ کم پھرتیلا نہیں تھا فرش سے اُٹھنے میں اُسے دو سیکنڈ سے زیادہ نہ لگے۔ مگر اس سے پہلے کہ بھیانک چہرے والا دوبارہ حملہ آور ہوتا۔ جاوید نے جست لگائی اور اُس پر جا پڑا۔ وہ دونوں ایک ساتھ فرش پر گر گئے تھے۔ جاوید نے بڑی پھرتی سے اُس کی دونوں کلائیاں تھام کر اپنا داہنا گھٹنہ اُس کی گردن پر رکھ دیا۔ عین اُسی لمحے اُسے لگا جیسے اُس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ شاید بھیانک چہرے والے کی ساتھی ایڈریلا نے کوئی وزنی چیز اُس کے سر پر دے ماری تھی۔ سنبھلتے سنبھلتے بھی اُس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

•

ہوٹل کیپسری کا شمار اُن مقبول ترین ہوٹلوں میں ہوتا تھا جو اپنے یہاں رقص کے بہترین پروگرام پیش کرنے کے لئے مشہور تھے۔ اِن دِنوں شہر کے منچلوں میں ایک بنگالی کیبرے ڈانسر رتنا کی بہت شہرت تھی۔ رتنا گزشتہ ایک ہفتے سے کیپسری میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی اور سات بجتے بجتے یہ حالت ہوتی کہ کیپسری کے ڈائننگ ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی۔

مگر کیا کرنل زاہد بھی اِن لوگوں میں سے تھا جو کیبرے ڈانس اور اِس قسم کے پروگراموں میں دلچسپی رکھتے ہوں! وہ تو کیفے سینورا سے نکل کر سامنتا کے پیچھے لگے لگے ہی یہاں تک پہنچا تھا۔ اور یہ اتفاق ہی تھا کہ کیپسری کا جونیئر مینیجر کرنل زاہد کا شناسا نکل آیا۔ ورنہ شاید اُسے ہال میں کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہ ملتی۔

مینیجر نے بڑے تپاک سے اُس کی پذیرائی کرتے ہوئے اُس کے لئے اسٹیج کے بالکل قریب ایک میز کا انتظام کر دیا تھا۔ سامنتا نے شاید پہلے سے اپنی میز مخصوص کرا رکھی تھی اس لئے اُسے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی۔

پروگرام شروع ہونے میں ابھی نصف گھنٹہ تھا لیکن ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ صرف وہی میزیں خالی تھیں جن پر ریزرویشن کی تختیاں نظر آ رہی تھیں۔

اسٹیج کے دوسری طرف رتنا اپنے مخصوص کمرے میں

میک اپ سے فارغ ہو کر آج کے ڈانسنگ ڈریس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ گندمی رنگت اور تیکھے نین نقش والی ایک تیئس چوبیس برس کی دلکش عورت تھی، لیکن اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور سانچے میں ڈھلا ہوا سڈول جسم کسی بھی مرد کو جذباتی ہیجان میں مبتلا کر سکتا تھا۔

اس وقت وہ ایک پھولدار ریشمی گون میں لپٹی ایک خوبرو نوجوان کی تصویر کو گھور رہی تھی "کیا سچ مچ پرکاش مجھے چاہتا ہے" وہ دھیمے لہجہ میں اپنے آپ سے بولی "اور اگر اسے میرے ماضی کے بارے میں علم ہو گیا تو"؟

اچانک اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے تصویر کو اپنے قریب رکھے پرس پر رکھا اور آنکھیں بند کر کے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اپنے بارے میں وہ خود بھی اتنا ہی جانتی تھی کہ آج سے اٹھارہ برس قبل اسے پرورش کرنے والے گھوش بابو نام کے ایک سماج سیوک نے ا۔۔۔ فٹ پاتھ سے اٹھایا تھا۔ پھر جب کینسر کے موذی مرض نے گھوش بابو کو موت کے دہانے پر کھڑا کر دیا تو انہوں نے اسے اپنے ایک دوست کی مدد سے اناتھ آشرم میں داخل کرا دیا تھا۔ زنسا کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس وقت وہ صرف بارہ سال کی تھی۔ اس نے اپنی تمام تعلیم اناتھ آشرم میں ہی مکمل کی۔ ان ہی دنوں جب وہ ایک بھرپور جوان لڑکی تھی تو اس کی زندگی میں وہ شخص آیا جس نے اسے آشرم سے نکال کر ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا جہاں ...،

دفعتاً دروازہ کھلنے کے ساتھ کسی کے قدموں کی چاپ سن کر زنسا کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس نے گردن موڑ کر دروازے کی سمت دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس کے سامنے تیس پینتیس برس کا ایک خوبرو شخص کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"ہیلو پرکاش۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

لیکن پرکاش نے وارفتگی کے عالم میں آگے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

"ارے ارے۔" وہ گھبرا کر بولی "میرا میک اپ بگاڑو گے کیا؟ شو میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔"

"میں کہتا ہوں تم یہ سب چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔ آخر اب ہماری شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔" پرکاش زنسا سے الگ ہوتے ہوئے بولا۔

"تم جانتے ہو کہ ہوٹل والوں سے کئے گئے معاہدے کے مطابق آج میرا آخری پروگرام ہے۔"

"سچ!" پرکاش نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"ہاں، اور آج کے بعد میں کبھی نہیں ناچوں گی۔"

"گڈ۔" وہ پھر سوچ کر بولا۔

"تمہارا پروگرام کس وقت ختم ہوگا"؟

"شاید ساڑھے نو بجے"

"ٹھیک ہے۔ میں دس بجے تمہیں لینے آؤں گا"

"کیوں"؟

"تم اب اس ہوٹل میں نہیں رہو گی۔"

"پھر کہاں رہوں گی"؟ زنسا کے لہجے میں شوخی تھی

"میری کوٹھی موہن پیلس میں" پرکاش مسکرایا "اور کل سے موہن پیلس کا نام زنسا پیلس ہوگا۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم مجھ پر بُری طرح مرتے ہو"؟ زنسا شرارت انگیز لہجے میں بولی۔

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے" پرکاش ہنسا۔

"لیکن شادی سے پہلے تمہارے یہاں جا کر رہنا اچھا نہیں لگتا۔"

"کیوں، وہاں میرے سوا اور ہے ہی کون؟"

"یہی تو خرابی ہے۔" زنسا ایک بار پھر شوخ لہجے میں بولی تھی۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔ ٹھیک دس بجے آؤں گا۔ تیار رہنا تم۔"

"کیوں، میرا شو نہیں دیکھو گے؟"

"نہیں۔" پرکاش دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "تم جانتی ہو میں تمہیں لوگوں کے سامنے ناچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔"

پرکاش نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

⁂

ٹھیک سات بجے زنسا اسٹیج پر آئی تو ایک آسمانی رنگ کے زرتار لبادے میں لپٹی ہوئی تھی۔ پھر موسیقی کی تیز لہروں کے ساتھ اس کے جسم کی حرکات بھی تیز تر ہوتی گئیں۔ یکایک موسیقی اپنے عروج پر پہنچ کر تھم گئی۔ زنسا کے تھرکتے ہوئے جسم کا ریشہ ریشہ لرز کر ساکت ہو گیا تھا۔ چند لمحوں تک لوگ بےحس و حرکت بیٹھے رہے۔ اچانک مائک پر زنسا کی آواز گونجی۔ وہ تماشائیوں کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ لوگوں کو

ایسا لگا جیسے وہ کسی خواب سے بیدار ہوئے ہوں اور پورا ہال تالیوں کے شور میں ڈوب گیا۔ پھر رتنا جیسے ہی اسٹیج کے عقبی دروازے کا پردہ ہٹا کر دوسری طرف گئی کہ زاہد نے سامنتا کو اپنی میز سے اٹھتے دیکھا۔ اس نے بس چند سیکنڈ کا توقف کیا اور سامنتا کے پیچھے چل پڑا۔

سامنتا میک اپ روم کے دروازے پر ایک سیکنڈ کے کھٹکا اور پھر دروازے کا ہینڈل گھما کر بے دھڑک اندر داخل ہوگا۔ میک اپ روم سے ملحقہ کمرے میں رتنا کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ سامنتا چند لمحوں تک میک اپ روم میں کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر دوسرے کمرے پر لٹکا پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔

کی ہول سے اندر جھانکتے زاہد نے سامنتا کے دوسرے کمرے میں جاتے ہی آہستگی سے میک اپ روم کا دروازہ کھولا اور بے آواز قدم اٹھاتا دوسرے کمرے کے دروازے سے چپک کر کھڑا ہوگیا۔

"کون ہو تم؟" اندر سے رتنا کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔ زاہد نے دروازے پر لٹکے بھاری پردے میں معمولی درز پیدا کرتے ہوئے اندر جھانکا۔ سامنتا اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ازلی جیمز میں نیم دراز رتنا کو گھورتے ہوئے بڑے شیطانی انداز میں گھور رہا تھا۔

"میرا نام جگل کشور ہے۔ ویسے کلکتہ بمبئی اور دوسرے کئی شہروں کی پولیس مجھے شنکر سامنتا کے نام سے بھی پہچانتی ہے۔"

"لیکن میں تمہیں نہیں جانتی۔"

"جان جاؤ گی، ابھی جلدی بھی کیا ہے۔" سامنتا اس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ویسے جو کچھ میں جانتا ہوں وہ سب جان کر تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔"

"کیا مطلب؟" رتنا کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"ایسا لگتا ہے جیسے تم پرکاش سے شادی کی خوشی میں راجن کو بالکل بھول گئی ہو۔"

رتنا کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں کسی راجن کو نہیں جانتی۔"

"دیکھو رتنا۔" سامنتا مسکرایا۔ "مسٹر گھوش سے اناتھ آشرم کی زندگی تک اور راجن سے شادی کے علاوہ آج تک، میرے پاس تمہاری زندگی کے ایک ایک پل کا حساب ہے۔ بلکہ میں بہت سی ایسی باتیں بھی جانتا ہوں جو تم بھی نہیں جانتیں۔"

وہ ایک لمحہ سانس لینے کو رکا، پھر بولا "آج سے آٹھ برس پہلے کیا تم نے راجن نام کے ایک پائلٹ سے شادی نہیں کی تھی۔ یاد کرو جن دنوں راجن کا پلین کریش ہوا تو تمہاری گود میں ڈیڑھ سال کی ایک ننھی سی بچی میگھنا تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا شوہر تمہیں اپنے اعلیٰ افسروں کی تفریح کا ذریعہ بنا کر ترقی کی منزلیں طے کرنا چاہتا تھا۔ کیا یہ سچ نہیں کہ راجن ایک دولت مند شخص کی طرح جینے کے خواب دیکھتا تھا۔ اور تم شادی کے ایک سال بعد ہی اس سے بے پناہ نفرت کرنے لگی تھیں۔ پھر جب راجن ہوائی حادثے کا شکار ہوا تو تم نے بڑے سکون کا سانس لیا تھا۔ ان ہی دنوں تم نے اپنی ایک سہیلی کے کہنے پر کیبرے ڈانسر بننا قبول کیا اور میگھنا کی پرورش کرنے لگیں۔ اچانک ایک رات تمہاری بیٹی اغوا کر لی گئی۔ تم نے میگھنا کو بہت تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملی۔ آخر تم نے یہ زخم بھی سہہ لیا اور اس شہر میں چلی آئیں۔ پھر تمہاری زندگی میں پرکاش آگیا۔ وہی پرکاش جس سے تم کل شادی کرنے والی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا ہونے والا شوہر ایک کروڑپتی شخص ہے۔ اس سے شادی کے بعد تم کروڑوں روپے کی مالک بن جاؤ گی۔ یہ بات تم بھی جانتی ہو کہ پرکاش کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ ایک بوڑھا باپ تھا لیکن وہ بھی چھ مہینے پہلے سورگ باش ہوگیا۔"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" رتنا اس کے خاموش ہوتے ہی بولی۔

"میں۔" سامنتا کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"ذرا سوچو، تمہارے بارے میں اتنی تفصیل جمع کرنے میں مجھے کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی؟"

"اوہ۔" رتنا کے ہونٹوں پر پہلی بار طنز آمیز مسکراہٹ ابھری۔ "شاید تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔"

"بلیک میل بہت چھوٹا لفظ ہے اور اسے گھٹیا قسم کے لوگ استعمال کرتے ہیں۔" سامنتا ہنسا۔ پھر ٹھہرے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔ "میں تم سے جو کچھ بھی چاہتا ہوں اسے تم میرا حق المحنت کہہ سکتی ہو۔"

"دیکھو مسٹر جگل کشور۔" رتنا اپنا گلا صاف کرتے ہوئے

بولی "۔اگر بات لاکھ پچاس ہزار کی رقم تک ہے تو اتنی رقم میں تمہیں اپنے اکاؤنٹ سے دے سکتی ہوں۔ اور اگر تمہاری نظر پرکاش کی دولت پر ہے تو کان کھول کر سن لو کہ میں اس سے ایک چھدام نہیں مانگوں گی۔ شاید تم بھی یہ بات نہیں جانتے کہ میں پرکاش سے سچ مچ پیار کرتی ہوں۔"

"تم پھر غلط سمجھیں" سامنتا مسکرایا۔ "میری نظر تمہاری یا پرکاش کی دولت پر نہیں۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہو؟"

"تمہیں میرا ایک چھوٹا سا کام کرنا ہوگا ایک ایسا کام جو صرف تم ہی کر سکتی ہو۔"

"کام کی نوعیت کیا ہوگی؟"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" سامنتا ہنس کر بولا۔

"پہلے تم شادی کر لو کام بھی بتا دیا جائے گا۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو؟"

"تم ایسا نہیں کر سکو گی۔" سامنتا زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

پھر اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر نکال کر رتنا کے سامنے ڈال دی۔ یہ چھ سات برس کی ایک خوبصورت لڑکی کا فوٹو گراف تھا جو کسی اسکول کی یونیفارم میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"کون ہے یہ لڑکی؟" رتنا نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

اس کی پیشانی پر لگی چوٹ کے نشان اور ٹھوڑی کے داہنی طرف والے تل کو غور سے دیکھو۔ یہ تمہاری سنگیتا ہے۔"

"نہیں۔" رتنا کے ہونٹوں سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ پھر وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔ "کمینے، سور، بتاؤ میری بیٹی کہاں ہے؟"

"وہ جہاں بھی ہے آرام سے ہے۔" سامنتا پرسکون لہجے میں بولا۔

"پرکاش سے شادی کے بعد اگر تم نے میرے کہنے پر عمل کیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں تمہاری بیٹی سے ملا دوں گا۔"

"میں تم سے کہاں مل سکتی ہوں؟"

"تمہاری شادی کے تیسرے روز میں تمہیں فون کروں گا۔" سامنتا کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "مگر خیال رہے کہ تم اپنی اور میری ملاقات کا ذکر کسی سے نہیں کرو گی۔"

دوسری طرف پردے کے پیچھے کھڑے زاہد نے اب وہاں رکے رہنا فضول سمجھا اور میک اپ روم کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

***

کرنل زاہد جس وقت گھر پہنچا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ خلاف توقع جاوید اسے ڈرائنگ روم میں مل گیا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ صوفے میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ زاہد کے قدموں کی آواز سنتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ زاہد نے اس کے سر پر بندھی ہوئی پٹی اور چہرے کی خراشیں دیکھتے ہوئے تشویش انگیز لہجے میں کہا۔

"ارے، یہ کیا ہوا؟"

"آپ کی مہیا کردہ تفریح کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔" جاوید نے زہرخند لہجے میں جواب دیا۔

"پوری بات بتاؤ۔"

"وہ قیامت جس ہوٹل کے کمرے میں لے گئی تھی وہاں اس کے آبا جان بھی تھے۔ اور آپ جانتے ہی ہیں اس دور کے آبا جان کسی فلمی ولن سے کم نہیں ہوتے۔"

"اس کا مطلب ہے پٹ کر آ رہے ہو؟"

"پٹ کے ساتھ کٹ کا لفظ بھی استعمال کر لیں تو مجھ سے ہمدردی کا زیادہ اظہار کر سکیں گے۔"

"آخر ہوا کیا۔؟"

جاوید نے جھلائے ہوئے انداز میں سینورا سے ہوٹل امبرنگ کی پوری روداد دہرا دی۔ زاہد نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس لڑکی سے مل بیٹھنے کے لیے کس گدھے نے کہا تھا۔"

"خوبصورت لڑکیوں کے دانت گننے کا مرض ہے مجھے اور ان کی قربت حاصل کیے بغیر یہ کام ناممکن ہے۔"

"اس کا مطلب ہے لڑکی اور اس کا ساتھی ہاتھ سے نکل گئے۔"

"بالکل۔ مجھے جس وقت ہوش آیا تو کمرہ خالی تھا کاؤنٹر پر آ کر معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ لوگ ڈیڑھ گھنٹہ قبل کمرے کا بل ادا کر کے چلے گئے۔"

کرنل زاہد کچھ دیر تک خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "کل تمہیں ایئرفورس ہیڈکوارٹر جا کر راجن نام کے ایک پائلٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں۔ چھ، سات برس

قبل یہ شخص ایک ایئر کریش میں ختم ہوگیا تھا۔"
"یعنی اب گڑے مُردے بھی اکھاڑنا پڑیں گے۔"
"پوری بات سنو۔" زاہد ہاتھ اٹھا کر بولا "ڈاگا کو فون کر کے ہدایت دو کہ اسے کلبر روڈ کی ہمامینشن کے نمبر ۲۳ فلیٹ میں رہنے والے ایک شخص جنگل کشور کی نگرانی کرنی ہے اسے یہ بھی بتا دینا کہ اگر وہ موسن ہیلپس میں کبھی ریٹا پرکاش سے ملنے کی کوشش کرے، ان کی گفتگو ٹیپ کرنا بہت ضروری ہے۔"
جاوید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی اور زاہد نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری جانب سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا گیا۔
"جنرل کیو اسپیکنگ۔"
"یس سر۔" کرنل زاہد نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "زاہد ہیئر۔"
"کبھی ٹریزی واکونا کا نام سنا ہے؟" جنرل کیو کی آواز آئی۔
زاہد چند سیکنڈز تک خاموش رہنے کے بعد بولا "میرا خیال ہے آپ کا اشارہ ہانگ کانگ کی اس خطرناک مجرمہ کی طرف ہے جس کی گرفتاری کے سلسلے میں انٹرپول، مختلف ممالک کی انٹیلی جنس اور سیکرٹ سروسز کو بار بار مطلع کرتی رہتی ہے۔"
"تم ٹھیک سمجھے۔" جنرل کیو نے دوسری جانب سے کہا۔ "لیکن ابھی تک کسی ملک کی پولیس ٹریزی پر ہاتھ نہیں ڈال سکی۔ شاید تمہیں علم نہ ہو کہ ٹریزی پر کئی ملکوں میں بغاوت کرانے اور ان کے سرکاری راز چرانے کا الزام ہے۔ وہ بھیس بدلنے کے ساتھ آواز بدلنے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی انٹرپول کے ایک ایجنٹ کی رپورٹ کے مطابق ٹریزی کم از کم بیس زبانوں میں گفتگو کر سکتی ہے۔ وہ نہایت سفاک اور بے رحم عورت ہے۔ اس وقت دس بارہ ممالک کی پولیس اس کے چکر میں ہے۔"
"آپ کی معلومات حیرت انگیز ہیں جناب۔" زاہد تعریفی لہجے میں بولا۔
"غور سے سنو۔" دوسری جانب سے کہا گیا۔ "ہانگ کانگ میں ہمارے ایجنٹ کی رپورٹ کے مطابق ٹریزی دو سال سے امریکہ کی بدنام ترین جماعت مافیا کے لئے کام کر رہی ہے اور انٹرپول کی تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ ٹریزی ان دنوں اسی شہر میں ہے۔"
"کیا ٹریزی کو اس شہر میں انٹرپول کے کسی ایجنٹ نے خود دیکھا تھا؟"
"ہاں، ایجنٹ بی تھری ون فور نے اسے آج شام کو ایک بھیانک شکل والے کے ساتھ ہوٹل امبر سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ اپنی اصل شکل میں تھی۔ صرف بالوں کی رنگت تبدیل کی گئی تھی۔ بی تھری ون فور نے اس کا تعاقب بھی کیا لیکن ایلیسی بار کے قریب وہ اسے ڈاج دے کر نکل گئی۔"
"کیا آپ مجھے ٹریزی کی ایک تصویر مہیا کر سکتے ہیں؟"
"کیوں نہیں، کل صبح تک اس کی تصویر اور مکمل تفصیل تم تک پہنچ جائے گی۔ لیکن خیال رہے کہ اس کی گرفتاری کے ساتھ اس ملک میں اس کی موجودگی کا مقصد جاننا بےحد ضروری ہے۔"
"آپ مطمئن رہیں۔ میں پوری کوشش کروں گا۔" زاہد نے کہا اور دوسری جانب سے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔
"کوئی دوسری مصیبت؟" جاوید نے زاہد کو ریسیور رکھتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔
"نئی بھی اور خطرناک بھی۔" زاہد مسکرا کر بولا۔ "شاید تم حیرت کرو کہ جولٹ کی تمہیں امبر ہوٹل سے گئی تھی وہ بین الاقوامی شہرت کی مالک ایک سفاک مجرم ٹریزی ہے۔"
"یا اللہ۔" جاوید سر پر لگی چوٹ سہلاتے ہوئے بولا۔
"میری ہونے والی بیوی اور نصف درجن بچوں کے مستقبل کی خیر ہو۔"

⁂

دوسرے دن صبح گیارہ بجے زاہد ہوٹل کیسپری میں داخل ہوا اور سیدھا جنرل مینجر کے خصوصی کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ یہ ایک لمبے قد کا بھاری بھرکم آدمی تھا عمر بھی پچاس سے کم نہ رہی ہوگی۔
"فرمائیے۔" مینجر نے زاہد کو اپنے سامنے والی نشست پر بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے دیکھ کر ناخوشگوار لہجے میں پوچھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے پھاڑ کھانے کا ارادہ رکھتا ہو۔
"میں بغیر اجازت اندر آنے کی معافی چاہتا ہوں۔"
زاہد نے اپنی جیب سے شناختی کارڈ نکال کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ دوسرے ہی لمحہ مینجر کے چہرے پر زردی چھاگئی اس کے کھنچے ہوئے جبڑے اور چہرے کے تنے عضلات ایک دم ڈھیلے پڑ گئے تھے۔
"کیا پیئں گے؟" وہ میز پر رکھی گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے گھگھیائے انداز میں بولا۔

"زحمت نہ کیجیے۔" زاہد اسے روکتے ہوئے بولا۔ "مجھے آپ کے یہاں کی کیبرے ڈانسر مس رتنا کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس سلسلے میں تعاون کریں گے۔"

"اوہ مس رتنا!" منیجر مسکرایا۔ "لیکن وہ تو رات ہی چلی گئیں۔ ہمارا اُن سے صرف دس روز کا کنٹریکٹ تھا۔"

"کنٹریکٹ کے دوران کیا اُن کا قیام آپ ہی کے ہوٹل میں تھا؟"

"جی ہاں، ہم اپنی آرٹسٹوں کو قیام و طعام کی سہولت بہم پہنچاتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ رتنا سے ملنے جلنے والوں کی تعداد اچھی خاصی رہی ہوگی؟"

منیجر ایک لمحہ کے لیے چپ رہا۔ "بیشک رتنا کے مداحوں کی تعداد اچھی خاصی تھی لیکن وہ ایک تنہائی پسند لڑکی تھی اور بہت کم لوگوں سے ملتی تھی۔"

"کیا آپ اس رتنا سے ملنے جلنے والے کچھ لوگوں کے بارے میں بتا سکیں گے؟"

"ایک تو اس شہر کے مقبول ترین جیولر مسٹر پرکاش ہی تھے اس کے علاوہ چند لوگ آتے رہتے تھے لیکن میرا خیال ہے مستقل آنے والوں میں پرکاش کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔"

"کیا کبھی کوئی عورت بھی اِن سے ملنے کے لیے آئی؟"

منیجر نے اس طرح اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "ہاں۔"

"ایک مرتبہ ایلیسی بار کی مالکہ ایلیسی آئی تھی۔ اُس کے ساتھ سرخ بالوں والی لڑکی بھی تھی شائد ایڈریلا نام تھا اُس کا۔ دراصل ایلیسی بھی رتنا سے اپنے بار میں ڈانس کرنے کا کنٹریکٹ کرنا چاہتی تھی۔ مگر رتنا نے انکار کر دیا۔"

زاہد نے اپنی کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک رنگین تصویر نکال کر منیجر کے سامنے ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ایلیسی کے ساتھ آنے والی لڑکی یہ تو نہ تھی؟"

منیجر نے تصویر اُٹھا کر غور سے دیکھا۔ "سو فیصدی یہی تھی۔"

"آپ کو یقین ہے؟"

"سو فیصدی۔" منیجر مسکرایا۔ "میں اس عمر میں بھی خوبصورت چہروں کو ذرا کم ہی بھولتا ہوں۔"

"تھینک یو۔" زاہد کھڑے ہو کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "خیال رکھیے گا میرے اور آپ کے درمیان ہوئی گفتگو کا علم کسی دوسرے کو نہ ہو۔"

"آپ مطمئن رہیں مسٹر زاہد۔ سرکاری آدمیوں کے ساتھ تعاون کرنا میرا فرض ہے۔" منیجر نے گرمجوشی سے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ اور دوسرے ہی لمحہ زاہد منیجر کے کمرے سے باہر آ گیا۔

ریسپشن کاؤنٹر کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی نظر دیوار گیر پبلک فون پر پڑی۔ اور اس کے قدم رُک گئے مطلوبہ نمبر ملا کر زاہد نے سلسلہ ملتے ہی سکہ ڈالا اور دوسری طرف سے جاوید کی آواز پہچان کر بولا۔ "زاہد ہیئر رپورٹ دو۔"

"آج سے چھ برس سات ماہ قبل راجن نام کے پائیلٹ کی ڈیوٹی غیر ملکی پروازوں پر تھی۔ عموماً وہ فرانس ہانگ کانگ اور دوبئی وغیرہ کی فلائٹ لے کر جاتا تھا۔ اپریل کی صبح ہانگ کانگ سے ایٹ زیرو ٹو کا ایک جمبو لاتے ہوئے دوران اس کے پلین کو حادثہ پیش آیا۔ انجن میں آگ لگ جانے کے سبب اس کا جہاز بے قابو ہو کر سمندر میں گر پڑا۔ تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق ایک فرد بھی زندہ نہیں بچا لیکن سمندر سے جو لاشیں نکالی گئیں اِن میں پائیلٹ راجن کی لاش نہیں تھی۔"

"اور کچھ۔"

"ایک اہم بات اور ہے" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "یہ حادثہ ہونے سے قبل کسٹم پولیس کی نظروں میں راجن کی شخصیت مشکوک تھی کسٹم والوں کو شک تھا کہ راجن بین الاقوامی اسمگلرز کے لیے کام کر رہا ہے۔ ایک بار اُس کی تلاشی بھی لی گئی لیکن کوئی واضح ثبوت نہ ملنے کی بنا پر اُس کے خلاف کوئی کاروائی نہ ہو سکی۔"

"گڈ۔" زاہد نے کہا۔

"اس کی کوئی تصویر ملی؟"

"میں نے متعلقہ ریکارڈ آفیسر سے کہہ دیا ہے تصویر شائد دو چار دن تک مل سکے گی۔"

"تم اس وقت کیا کر رہے ہو؟"

"ابھی نصف گھنٹہ قبل گھر پہنچا ہوں اور اس وقت برخوردار فدا علی کو گلہری کے کوفتے بنانے کی ترکیب بتا رہا ہوں۔"

"میرے پاس تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ دلچسپ تفریح کا پروگرام ہے۔" زاہد ہنس کر بولا۔

"یعنی محاورتی زبان آپ سچ مچ میرے چودہ طبق

روشن کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔" جاوید کی جھنجھلائی ہوئی آواز آئی۔

"گھبراؤ مت۔ اس بار تمہاری ٹوٹ پھوٹ کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔"

"سوچ لیجئے۔ میرا سر فی الحال کسی نئے زخم کو پالنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔"

"غم نہ کرو، میں تمہیں دوسرا سر بھی مہیا کر دوں گا۔"

"فرمائیے۔"

"نصف گھنٹے کے بعد ایلسی بار پہنچ جاؤ۔" زاہد نے کہا "سنا ہے بار کی مالکہ ایلسی شراب کے علاوہ ضرورت مند نوجوانوں کو شباب کی سہولت بھی بہم پہنچاتی ہے۔"

"لیکن وہاں پہنچ کر میرا طریقہ کار کیا ہوگا؟"

"اب یہ بھی میں بتاؤں گا؟"

"پھر بھی وہاں جانے کے مقصد کی وضاحت تو کیجئے۔"

تین، چار دن پہلے ایڈریلا عرف ٹریزی ایلسی کے ہمراہ امیریس رننا سے ملنے گئی تھی۔ زاہد دھیمے دھیمے لہجے میں بولا "تم براہِ راست ایلسی سے بھڑ سکتے ہو مگر ٹریزی کی موجودگی کے امکانات کو نظرانداز مت کرنا۔"

"آپ کا مطلب ہے ایلسی بار، ایڈریلا یا ٹریزی کی پناہ گاہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"اس کا قوی امکان ہے۔ ویسے تم ایلسی کے بارے میں کیا جانتے ہو۔"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔" دوسری طرف سے جاوید کے ہنسنے کی آواز ابھری۔ "میں شہر کی ہر خوبصورت عورت کا تھوڑا بہت کچا چٹھا حفظ رکھتا ہوں۔"

"یہ اچھی بات ہے۔ اس طرح آدمی مالیخولیا سے محفوظ رہتا ہے۔" زاہد نے مسکرا کر کہا اور ریسیور کریڈل میں پھنسا کر گفتگو کا سلسلہ بند کر دیا۔

* * *

ایلسی بار کافی صاف ستھری اور بارونق جگہ تھی۔ شوقین مزاج اور فرانسیسی ماحول میں شراب پینے والے لوگ اسے دوسرے باروں پر ترجیح دیتے تھے۔ بار کی مالکہ ایلسی پینتیس چالیس برس کی ہونے کے باوجود اپنے جسم اور چہرے کے اعتبار سے کافی پُرکشش تھی۔

کیپٹن جاوید جس وقت ہال میں داخل ہوا تو زاہد تاریک شیشوں کی عینک لگائے پہلے سے ایک میز پر موجود تھا۔ جاوید براؤن رنگ کی جیکٹ اور اُسی رنگ کی چست جین کے ساتھ گلے میں بندھے سرخ اسکارف میں خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ ہال میں بیٹھے لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر وہ بڑے جچے تلے قدم اُٹھاتا ہوا بار کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

ایلسی اپنے زیادہ تر گاہکوں کو بہت قریب سے جانتی تھی۔ اس نے کاؤنٹر پر کہنیاں ٹیک کر اپنی طرف گھورتے اس نئے چہرے کو حیرت سے دیکھا۔

"غالباً تم ہی ایلسی ہو؟"

"غالباً نہیں۔ یقیناً۔" ایلسی مسکرا کر بولی۔ "بولو کیا پیو گے۔ اسکاچ یا وہسکی۔"

"سوری۔ آجکل صرف خونِ دل پی رہا ہوں۔ اگر ہو تو ایک جگ کافی ہے۔"

"شاعری کر رہے ہو۔" وہ پھر مسکرائی۔

"تم شاعری سمجھتی ہو؟"

"کیوں نہیں؟"

"تو پھر کوئی سترہ، اٹھارہ شعر کی غزل سنا دو۔"

"سترہ، اٹھارہ کی۔"

"ہاں۔" جاوید آنکھ دبا کر بولا "تمہاری جیسی ہو تو بیس چالیس کی بھی چلے گی۔"

ایلسی اسے کافی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ جاوید نے محسوس کیا وہ جب مسکراتی تو اس کے گالوں میں بھنور سے پیدا ہو جاتے تھے اور آنکھیں اس طرح چمکنے لگتیں جیسے کوئی بھوکی بلی اپنے سامنے تندرست قسم کے چوہے کو دیکھ کر آسودہ ہو گئی ہو۔

"ایسا لگتا ہے کہ تم یہاں پہلی بار آئے ہو۔"؟

"تم ٹھیک سمجھیں۔" جاوید مسکرایا۔ "دراصل مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم وہ بھی کرتی ہو۔"

"کام کی بات کرو۔" ایلسی پہلی بار سخت لہجے میں بولی۔ "کون ہو تم۔"؟

"مصر یار خاں عاشق ورھنگوی۔" جاوید نے سہمنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے اگر تم چاہو تو صرف عاشق ہی کہہ سکتی ہو۔"

"تم عجیب آدمی لگتے ہو۔"

"لگتا ہوں نا۔" جاوید خوش ہو کر بولا۔ "ایک بار ٹریزی ڈارلنگ نے بھی یہی کہا تھا۔"

"ٹریزی واکوما ۔" ابلیسی کے مونہہ سے غیرارادی طور پر نکلا، پھر اس نے سختی سے اپنے ہونٹ بند کر دیئے۔

"وہی وہی ۔" جاوید ایک دم اُچھل کر بولا۔ "کیا قیامت تھی ظالم ۔"

"تم ٹریزی کو کیسے جانتے ہو؟"

"ارے واہ، تم کوئی ٹھیکے دار ہو اس کی۔" جاوید بُرا ماننے والے انداز میں بولا۔ "جاؤ نہیں بتاتا کہ وہ ہوٹل امبر کے روم نمبر ۶۳ میں میرا پارسل بنا کر بھاگ گئی تھی۔"

"بکومت، میں کسی ٹریزی کو نہیں جانتی۔"

"تو پھر ایڈریلا کو ضرور جانتی ہوگی۔"

"نہیں۔ اور اب تم فوراً دفعان ہو جاؤ۔"

"ایک منٹ ۔" جاوید مسکرا کر بولا۔ "ویسے تمہارے بار کاؤنٹر کے نیچے والے تہہ خانے میں اس وقت کتنے بیرل شراب ہے؟"

"تم کس تہہ خانے کی بات کر رہے ہو؟" ابلیسی حیرت سے پلکیں جھپکاتی ہوئی بولی۔ اب اس کے لہجے میں خوف کی آمیزش تھی۔

جاوید نے ایک بے ساختہ قسم کا قہقہہ لگایا اور بولا۔ "میں اس تہہ خانے کی بات کر رہا ہوں جہاں تم نے کئی درجن ناجائز شراب کے بیرل چھپا رکھے ہیں۔ اور اسی تہہ خانے کا علم تمہارے بارٹنڈر کے علاوہ مصر بار رماں عاشق درھنگوی یعنی خاکسار کو بھی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم میرے کاروباری حریف مائیکل کے آدمی ہو۔" ابلیسی نے کانپتی آواز میں کہا۔

"میں مائیکل سے موٹر سائیکل تک ہر ایک کا آدمی ہوں" جاوید اس کی حالت سے لطف لیتے ہوئے مسکرایا۔ پھر بولا۔

"دیکھو ابلیسی، میں تمہیں خوامخواہ نہیں ڈرا رہا ہوں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا ثبوت ہے میرے پاس۔ تمہیں شاید خبر نہیں کہ میں کئی ماہ سے تمہارے اس ناجائز کاروبار کے بارے میں جانتا ہوں۔ تم انگریزی شراب کی آڑ میں اعلیٰ قسم کی دیسی شراب فروخت کر کے اپنے گاہکوں کو لوٹ رہی ہو۔ میرے زبان کھولتے ہی تمہاری بار کا لائسنس ضبط ہو سکتا ہے۔ لیکن میں چھوٹے موٹے معاملات میں ٹانگ اڑانا پسند نہیں کرتا۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

ایڈریلا یا ٹریزی۔ تم اسے جس نام سے بھی جانتی ہو مجھے اس کا پتہ چاہیئے۔"

"گویا تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟"

"نہیں ۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔ "میں سرکاری آدمی ہوں اور اب بھی تم نے اگر قانون کی مدد نہیں کی تو ٹریزی سے پہلے تمہارے ہاتھ میں ہتھکڑیاں پڑ سکتی ہیں۔ ویسے تم قیامت تک اس بات سے انکار نہیں کر سکتیں کہ ٹریزی کونے کو تم کیبسری کے مینجر کی موجودگی میں کیبرے ڈانسر رتنا سے ملی تھیں۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تمہیں ٹریزی کے بارے میں بتانے کے بعد میں محفوظ رہوں گی۔" ابلیسی تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ "تمہارے غیر محفوظ ہونے کی وجہ؟"

"اگر تم ٹریزی سے واقف ہو تو یہ بھی جانتے ہوگے کہ وہ کس قدر سفاک عورت ہے۔" ابلیسی نے کپکپاتی آواز آواز میں کہا۔ "ٹریزی کی موجودہ پناہ گاہ سے میرے سوا کوئی واقف نہیں۔ تمہیں اس کا پتہ بتانے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے ہاتھوں اپنی گردن رگید ڈالوں۔"

"میں تمہاری حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہوں۔"

"اور تم خود کیا ہو؟"

"قانون کا ایک ادنیٰ محافظ۔" جاوید سخت لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے، میں بتاتی ..."

ابلیسی نے ابھی اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ کمرے کا عقبی دروازہ کھلا اور سانولے رنگ کی ایک دراز قد عورت اندر آ گئی۔ سرخ رنگ کی شلوار قمیض اور کھلے سیاہ بالوں کی وجہ سے اس کا سانولا رنگ کچھ زیادہ ہی گہرا ہو گیا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی ابلیسی کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا۔

سانولی عورت نے ابلیسی کے قریب پہنچ کر بڑی شائستہ اُردو میں کہا۔

"ارے تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔" پھر وہ جاوید کو نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے ابلیسی کو آنکھ مار کر بولی۔ "یہ لڑکا کون ہے؟"

"اے محترمہ"، جاوید جلدی سے بولا۔ "زبان سنبھال کر۔"

"اچانک ہال کی طرف کھلنے والے دروازے کا پردہ ہٹا کر کرنل زاہد بھی اندر آ گیا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں اعشاریہ ۳۸ کا ریوالور تھا اور اس کی نال سانولی عورت کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دروازے کو اندر سے بولٹ کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ "میں تمہاری آمد ہی کا منتظر تھا، ٹریزی واکوما۔"

سانولی عورت زور سے ہنس پڑی۔ "میرا خیال ہے

آپ کو میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں ٹریزی واکوما نہیں۔ ابلیسی کی دوست صفیہ خانم ہوں۔" پھر اس نے ابلیسی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "کیوں ابلیسی؟"

جاوید نے دیکھا کہ ابلیسی اپنے چہرے کے بگڑتے زاویوں پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ خود جاوید بھی ٹریزی کے اس قدر عمدہ میک اپ اور اتنی شاندار اُردو بولنے پر حیران تھا۔

کرنل زاہد نے اپنے ریوالور کا رُخ سانولی عورت کی طرف کئے کئے ہی کہا۔

"ٹریزی، میں جانتا ہوں کہ تم میک اپ کرنے کے علاوہ کم از کم بیس زبانیں اپنی مادری زبان کی طرح بول سکتی ہو۔ لیکن ذہین سے ذہین شخص بھی کہیں دھوکا کھا جاتا ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" سانولی عورت بیچارگی کے ساتھ بولی۔

جاوید نے دیکھا کہ زاہد کے ہونٹوں پر ایک زہر آلود مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ اس نے سانولی عورت کے گلے میں پڑے سبز نگوں والے لاکٹ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"صفیہ خانم کا میک اپ کرتے ہوئے شاید تم یہ لاکٹ اُتارنا بھول گئی تھیں جو تم نے ایڈریلا کا رول کرتے ہوئے سینورا میں پہن رکھا تھا۔"

جاوید نے گھبرا کر سانولی عورت کے گلے میں پڑے لاکٹ کو دیکھا۔ اور اس کے ذہن میں ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ سچ مچ اس وقت اپنے آپ کو دُنیا کا احمق ترین شخص تصوّر کر رہا تھا۔ اسی دوران کمرے میں ٹریزی کی پُرسکون آواز گونجی۔

"میں تمہاری ذہانت کی معترف ہوں کرنل زاہد لیکن دُنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنا مشن پورا کرنے سے نہیں روک سکتی۔"

"فی الحال تو تم اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا لو۔" زاہد نے بیحد سفاک لہجہ میں کہا۔

دفعتاً ٹریزی نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے قریب کھڑی ابلیسی کے کولہوں پر ایک زوردار لات رسید کی اور ابلیسی ڈگمگاتی ہوئی کرنل زاہد پر آ گری۔ اس کے ساتھ ہی سائلنسر لگے پستول کی ٹز کے ساتھ ابلیسی کی دلخراش چیخ اُبھری۔ پھر جب تک زاہد اور جاوید سنبھلتے ٹریزی کسی جنگلی ہرنی کی طرح زقند مار کر عقبی دروازے کے خلا میں ڈوب گئی۔

وہ دونوں ہی فرش سے اُٹھ کر دروازے کی طرف لپکے تھے۔ لیکن جب تک وہ ابلیسی بار کے پچھلے حصّے کو پار کر کے کھلے آسمان کے نیچے آتے ٹریزی اس طرح غائب ہو گئی جیسے زمین نگل گئی ہو۔

"کمبخت غضب کی چھپکلی ہے۔" زاہد نے ابلیسی بار کی عقبی سڑک کے دونوں جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ ٹریزی کی تعریف کر رہے ہیں یا اپنی شکست کا اعتراف؟" جاوید طنزیہ انداز میں بولا۔

"جاوید صاحب میں کوئی فلمی ہیرو یا سُپرمین نہیں ہوں کہ ہر مرحلہ پر کامیابی ہو۔"

"کیا یہ کرنل زاہد بول رہے ہیں؟"

"بیشک۔ اور میرا ایمان ہے غیر متوقع شکست نہ ہو تو آدمی فرعون بن جائے۔" زاہد سنجیدگی سے بولا۔

"ویسے بہت دن بعد کسی ایسے مجرم سے پالا پڑا ہے کہ مہینوں کی ذہنی تھکن دُور ہو گئی۔"

"مجرم نہیں مجرمہ کہیئے۔"

"کوئی بات نہیں۔ اگر تمہاری عورت پرستی کے جذبے کو تسکین ملتی ہے تو مجرمہ ہی سہی۔" زاہد نے ہنس کر کہا اور جاوید کا ہاتھ تھام کر اس طرف بڑھ گیا جہاں اس نے اپنی کار پارک کی تھی۔ پھر ایک جگہ گاڑی روک کر اس نے پبلک ٹیلیفون سے مقامی تھانے کو ابلیسی بار میں اس کی مالکہ کو ابلیسی کے قتل کی اطلاع دی اور اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ اب اس کی کار کا رُخ اپنی کوٹھی کی طرف تھا۔

جاوید کا خیال تھا کہ اس پورے فساد کی جڑ زنتا کو ٹٹولنا ضروری ہے۔ لیکن زاہد ابھی زنتا کو چھیڑنے کے حق میں نہ تھا۔ تقریباً نصف گھنٹے سے وہ دونوں اسی بحث میں اُلجھے تھے۔ آخر جاوید نے جھنجھلا کر کہا۔

"جو دل میں آئے کیجئے۔ ویسے آپ زنتا کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

"اسے نظر انداز کرنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے وہ میری لسٹ پر ہے لیکن اسے چھیڑنے کا مطلب ہے کہ مجرم ہوشیار ہو جاتے۔"

"اگر آپ کہیں تو میں اُسے ٹٹول کر دیکھوں۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ ٹریزی یا اس کے آدمیوں کی نظر میں

نہیں ہو۔" زاہد بولا۔

"جاوید صاحب ٹریزی کوئی معمولی عورت نہیں ہے۔ ایلیسی والے واقعہ کے بعد بھی اگر تم اس کی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتے تو یہ تمہاری حماقت ہے۔"

جاوید نے اس طرح منہ بگاڑا جیسے اپنے حلق سے کوئی کڑوی چیز اتار رہا ہو۔ اُسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور زاہد نے ریسیور اُٹھایا۔

"ہیلو زاہد بول رہا ہوں۔"

"زاہد صاحب میں ڈاگا بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"کیا خبر ہے۔"؟

"کل سامنتا گیارہ بجے اپنے فلیٹ سے نکلا تھا۔ گھر سے نکل کر اس نے پارک ویو ہوٹل میں ایک کمرہ بک کرانے کے بعد زنیا کو فون کیا کہ وہ دو بجے اُسے ہوٹل کے روم نمبر ۱۳ میں ملے اور زنیا ٹھیک ڈیڑھ بجے پارک ویو پہنچ گئی تھی۔"

"تم نے اُن دونوں کی بات چیت سُنی۔"

"سُنی ہی نہیں ٹیپ بھی کر لی۔"

"کس طرح۔"؟

"کمرہ بک کرانے کے بعد جب سامنتا کھانا کھانے کے لئے ڈائننگ ہال میں آیا تو میں نے اُس کے کمرے میں گھس کر ڈکٹا فون فٹ کر دیا تھا۔"

"کیا تم اس کے کمرے کے قریب ہی کسی کمرے میں ٹھہرے" زاہد نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ اس کے کمرے کے برابر والا کمرہ خالی تھا۔" ڈاگا دوسری طرف سے بولا۔

"پارک ویو کا مینجر میرا شناسا ہے اس نے مجھے کمرہ حاصل کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔"

"ان دونوں کے درمیان کس قسم کی گفتگو ہوئی۔" زاہد نے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ بلیک میلنگ کا ہی چکر ہے لیکن سامنتا کوئی رقم طلب کرنے کے بجائے زنیا کو اپنا آلہ کار بنانا چاہتا ہے۔"

"تفصیل سے بتاؤ۔"

"میں نے سامنتا کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ زنیا پرکاش سے پہلے راجن نام کے پائلیٹ کی بیوی تھی۔ لیکن اس کا پہلا شوہر کسی حادثے میں مرگیا۔ سامنتا کے بقول زنیا کی ایک لڑکی بھی ہے جو فی الحال سامنتا کے قبضے میں ہے۔"

"سامنتا زنیا سے کیا چاہتا ہے۔" زاہد نے پوچھا۔

"اس نے زنیا سے کہا ہے کہ وہ موہن پیلس میں کسی تہہ خانے کے خفیہ راستے کی تلاش میں اس کی مدد کرے وہ زنیا سے کسی اسٹیل بکس کے بارے میں بھی پوچھ رہا تھا اس نے زنیا کو دھمکی دی ہے کہ اگر اس نے سامنتا کی مدد نہیں کی تو اس کی بیٹی کی جان لی جا سکتی ہے۔"

"زنیا کا جواب بتاؤ۔"؟

"اس نے سامنتا سے ایک روز کی مہلت مانگی ہے۔ اور سامنتا نے اُسے اپنے فلیٹ کا فون نمبر دینے کے بعد کہا تھا کہ وہ کل شام کو اُس کے جواب کا انتظار کرے گا۔ لیکن ایک بات مجھے اُلجھن میں ڈالے ہوئے ہے۔"

"کیا۔"؟

"سامنتا ہوٹل چھوڑ کر ٹھیک چار بجے اپنے فلیٹ پہنچ گیا تھا۔ پانچ بج کر دس منٹ پر میں نے اس کے فلیٹ میں ایک طویل قامت نیگرو کو داخل ہوتے دیکھا۔ اب رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں لیکن نیگرو باہر نہیں نکلا حیرت یہ ہے کہ سامنتا کے فلیٹ میں ابھی تک روشنی ہے۔"

"اوہ۔" زاہد فکر مند لہجے میں بولا۔ "تم وہاں سے ہلنا مت میں بہت جلد وہاں پہنچ رہا ہوں۔"

پھر زاہد ریسیور رکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ جاوید نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "خیریت۔"؟

"فوراً تیار ہو جاؤ۔ ہم کلیر روڈ چل رہے ہیں۔"

جاوید کچھ کہے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

دس منٹ بعد ہی اُن کی جیپ کلیر روڈ کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔ زاہد کے چہرے کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے جاوید نے اُس سے کوئی سوال نہیں کیا۔

لگ بھگ بیس منٹ بعد وہ دونوں سامنتا کے فلیٹ پر دستک دے رہے تھے۔ دو تین بار دستک دینے پر بھی جب دروازہ نہیں کھلا تو جاوید نے معنی خیز نظروں سے زاہد کی طرف دیکھا۔ دروازے کے برابر والی کھڑکی کے شیشوں سے روشنی باہر آرہی تھی۔ زاہد نے آخری بار دستک دینے کے ساتھ ہی دروازہ کو آہستہ سے اندر کی طرف دھکیلا۔

دروازہ کسی آواز کے بغیر کھلتا چلا گیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے نشست کا کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے قدم اُٹھاتے اندرونی کمرے کی طرف بڑھے۔ جاوید

نے اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔

اچانک اِن دونوں کی نظر سامنے بچھے بستر پر پڑی۔ زاہد جھپٹ کر بستر کے قریب پہنچا تھا۔ اور جاوید حیرت بھری نظروں سے بستر پر پڑی سامنتا کی لاش کو گھور رہا تھا۔

زاہد نے سامنتا کے سینے میں دستے تک گڑے خنجر کو دیکھا تھا۔ وار بڑی چابک دستی سے عین دل کے قریب کیا گیا تھا۔ پورا بستر خون سے بھرا تھا۔ ظاہر تھا کہ قتل کئے ہوئے کئی گھنٹے گذر چکے ہیں۔ زاہد نے لاش کے سینے پر رکھا ہوا ایک کھلا خط اٹھایا اور پڑھنے کے بعد جاوید کی طرف بڑھا دیا۔

خط انگریزی میں تھا لیکن تحریر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ لکھنے والا بہت جلدی میں تھا۔ جاوید نے جلدی جلدی خط کی عبارت پڑھنا شروع کی۔ لکھا تھا۔

ٹریزی

اس ملک میں سامنتا کی لاش میری طرف سے تمہارے لئے پہلا تحفہ ہے۔ ہانگ کانگ سے تمہارے غائب ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ تم ادھر کا رخ کرو گی۔ لیکن تمہیں افسوس ہوگا کہ میری طرح پرکاش بھی تنظیم کے موجودہ رویے سے متنفر ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سامنتا کے ذریعے اب تم رتنا کو بلیک میل کر کے پرکاش سے وہ کاغذات حاصل نہ کر سکو گی اگر ممکن ہو تو اپنی تنظیم کے ٹروبنک میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ آٹھ برس تک تنظیم کا وفادار رہنے کے بعد میں صرف اس لئے تنظیم سے دستبردار ہو رہا ہوں کہ مجھے تم جیسی گھٹیا عورت کی بالادستی منظور نہ تھی۔ شائد تمہیں یہ جان کر ذہنی صدمہ پہنچے کہ سلور آئی لینڈ پر اب تمہارا ایک بھی وفادار نہیں۔ اگر اپنی سلامتی چاہتی ہو تو میرے راستے میں نہ آؤ۔"

خیر اندیش ولیم کرسٹوفر

خط پڑھ کر جاوید نے زاہد کی طرف دیکھا جو بائیں طرف رکھی الماری کھول کر اس کے خفیہ خانے سے سیاہ چرمی جلد والی ڈائری نکال کر پڑھ رہا تھا۔ اچانک کمرے کے سناٹے میں تیز سیٹی کی آواز گونجی۔ زاہد اور جاوید کی آنکھیں لاش کے سرہانے چھوٹی سی تپائی پر رکھی ایک تانبے کی مورتی پر جم گئیں۔ یہ سات آٹھ انچ لمبی کسی برہنہ عورت کی مورتی تھی سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی مورتی کی دونوں آنکھیں روشن ہو گئی تھیں اور اُس کے کھلے ہوئے منہ سے بار بار بیپ بیپ کی آواز ابھر رہی تھی۔

زاہد لپک کر مورتی کے قریب پہنچ گیا۔ اب مورتی کے حلق سے اشارے نشر ہو رہے تھے۔ زاہد تیزی سے میز پر پڑی پنسل اور کاغذ اٹھا کر کچھ لکھنے لگا۔ پھر پورا پیغام نوٹ کر کے وہ اسے ڈی کوڈ کرنے لگا۔ دفعتاً اس کی آنکھیں انجانے جذبے سے چمکنے لگیں۔ کاغذ کے پرزے کو جیب میں رکھتے ہوئے اس نے جاوید کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"چلو۔ ممکن ہے یہ کھیل آج ہی ختم ہو جائے۔"

"کوئی خاص بات؟" جاوید نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔" زاہد مسکرایا۔ پھر اس نے تپائی پر رکھی تانبے کی مورتی کو دیکھا اب مورتی کی آنکھیں تاریک ہو چکی تھیں۔ اس کے منہ سے کسی قسم کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ زاہد نے مورتی کو اٹھا کر اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈالا اور جاوید کو لے کر فلیٹ سے باہر آ گیا۔

٭ ● ٭

سامنتا کے فلیٹ سے باہر آ کر جیسے ہی وہ دونوں اپنی گاڑی کے قریب پہنچے کہ ایک سایہ گاڑی کے عقب سے نکل کر ان کے سامنے آتے ہوئے ہاتھ پھیلا کر بولا۔

"بھگوان بھلا کرے بابا کوئی دھیلا کوڑی، دمڑی، چھدام دیتے جانا۔"

زاہد نے ڈاکا کی آواز پہچان کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب یہاں سے دفعان ہو جاؤ اور جب تک میں فون نہ کروں اپنے فلیٹ پر ہی رہنا۔"

"ایک پانچ کا نوٹ ہی دیدے بابا۔ بانجو کے بائیسکوپ سمپورن رامائن لگی ہے۔"

"اب جاتا ہے کہ دوں ایک۔" جاوید نے مسکراتے ہوئے گھونسہ تانا اور ڈاکا سہم کر ایک طرف چل دیا۔

پھر چند سیکنڈ بعد ہی جاوید ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا انجن اسٹارٹ کر رہا تھا۔ جاوید کا خیال تھا کہ اب وہ سیدھے گھر کی طرف جائیں گے۔ لیکن زاہد گاڑی اسٹارٹ کر کے ایسے طوفانی انداز میں سڑک پر لایا جیسے ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی کسی بڑی مصیبت کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔

لیکن جب اس نے دیکھا کہ جیپ مخالف سمت میں جا رہی ہے تو بولا۔ "آخر آپ جا کہاں رہے ہیں؟"

"دیکھتے جاؤ۔"

"یعنی پوری رات آنکھوں میں گزرے گی۔"

"آخر کام کا وقت آتے ہی تمہارا دم کیوں نکلنے لگتا ہے" زاہد نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کم از کم کام کی نوعیت کا تو پتہ لگے۔" جاوید بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "آپ کی پرانی عادت ہے کہ ہمیشہ اندھیرے میں چھلانگ لگاتے ہیں۔"

"کیا جاننا چاہتے ہو"؟

"وہ موسیقی اور اس سے خارج ہونے والے بے ہنگم اشارے کیا تھے"؟

"یہ تو تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ وہ موسیقی نہیں ایک محدود دائرہ عمل میں کام کرنے والا طاقتور ٹرانسمیٹر ہے اور وہ بے ہنگم اشارے نہیں۔ بلکہ مخصوص کوڈ میں سامنتا کے لئے ایک پیغام تھا۔"

"میں اس پیغام کے بارے میں ہی جاننا چاہتا ہوں۔"

"تھوڑی دیر انتظار کرو، ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔" زاہد مسکرایا۔

اس کے بعد جیپ مختلف سنسان سڑکوں سے گزرتی رہی۔ جاوید اس طرح منہ بنائے بیٹھا تھا جیسے تمام عمر زاہد سے بات نہیں کرے گا۔ پھر ایک جگہ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔

"بتا سکتے ہو یہ کونسی سڑک ہے۔"؟

"ظفر روڈ۔"

"ٹھیک ہے۔" زاہد نے کہا اور یوٹرن سے گاڑی کو بائیں جانب والی گلی میں لے گیا۔ پھر ایک بلڈنگ کے عقب میں گاڑی روکتے ہی بولا۔ "اُترئیے۔"

جاوید کچھ کہے بغیر چُپ چاپ نیچے اُتر آیا۔ زاہد اس سے پہلے ہی اُتر چکا تھا۔ "ریوالور ہے تمہارے پاس۔" زاھد نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" جاوید نے بیزاری سے جواب دیا۔

"چلو آؤ۔" زاہد مسکرا کر بولا۔ "شائد تمہیں اپنی جھنجھلاہٹ دور کرنے کا موقع مل سکے۔"

وہ دونوں گلی سے نکل کر دوبارہ سڑک پر آ گئے۔ چاروں طرف سناٹے کی حکومت تھی۔ دفعتاً کسی قریبی عمارت سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ جاوید محسوس کر رہا تھا کہ زاہد کسی خاص عمارت کی تلاش میں ہے آخر وہ بائیں جانب والی ایک عمارت کے قریب رُک گیا۔ پھر اپنے سر کو معنی خیز انداز میں جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "اُدھر سے جیپ کو یہاں لا کر بائیں طرف والی سڑک کے کنارے لگا دو۔ بالکل اسی عمارت کے سامنے۔"

جاوید کچھ کہے بغیر اُس طرف چل پڑا جہاں جیپ کھڑی کی گئی تھی۔ واپسی پر اُس نے بتائی ہوئی جگہ پر جیپ کھڑی کی۔ لیکن اُسے زاہد کہیں دکھائی نہیں دیا۔ لاپرواہی سے اپنے شانے اُچکا کر وہ دوبارہ جیپ میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن دس منٹ گزر جانے کے بعد بھی جب زاہد نہیں آیا تو اُسے تشویش ہونے لگی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اُسے نیچے اُتر کر تلاش کیا جائے۔ اسی دوران اس کا ذہن موسیقی نما ٹرانسمیٹر سے سُنے گئے اس عجیب و غریب پیغام کے بارے میں اُلجھ گیا۔ دفعتاً اُس کے دماغ میں کوئی خیال اُبھرا اور وہ چونک گیا۔ اوہ۔ کیا یہ ساری بھاگ دوڑ اسی پیغام کے سلسلے میں تھی اور پیغام سے پہلے ٹی ون ٹی ون کا مطلب ٹریزری تو نہیں تھا۔ جاوید کو یاد آیا کہ پیغام کو ڈی کوڈ کرنے کے بعد ہی زاہد اس طرف دوڑ آیا تھا۔

آخر اس نے ایک طویل سانس لے کر اپنا سر سیٹ کی پُشت گاہ سے ٹکا لیا۔ کچھ دیر بعد زاہد سامنے والی گلی سے برآمد ہوا اور تیز قدموں سے چلتا اس کے قریب آ کر بولا۔ "چلو میرے ساتھ۔"

جاوید گاڑی سے اُتر کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ گلی پار کر کے وہ اسی عمارت کی پُشت پر پہنچ گئے جہاں اُنہوں نے سب سے پہلے گاڑی کھڑی کی تھی۔ زاہد نے اس عمارت کی پُشت پر ایک پائپ لائن کے قریب رُکتے ہوئے کہا۔

"اس پائپ کے سہارے اُوپر چڑھنا ہے۔"

جاوید نے خاموشی سے جُوتے اُتار کر پتلون کی جیبوں میں ٹھونس لئے۔ اسی لمحہ اس نے زاہد کو سرکس میں کام کرنے والے کسی ماہر نٹ کی طرح پھرتی سے پائپ کے سہارے اُوپر چڑھتے دیکھا۔ جاوید نے بھی اس کی تقلید کی۔ لیکن ابھی وہ درمیان میں ہی تھا کہ زاہد کسی پھرتیلے بندر کی طرح اوپر پہنچ کر ایک کھلی ہوئی کھڑکی میں داخل ہو گیا۔

پائپ میں غالباً کسی جگہ سوراخ ہونے کے سبب بہتے پانی نے اسے چکنا کر دیا تھا۔ جاوید کو اُوپر چڑھنے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔ کائی لگے پائپ پر پیر جمانا مشکل ہو رہا تھا پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح اُوپر پہنچ گیا۔

اُوپر پہنچ کر وہ سوچ رہا تھا ہم لوگ بھی قسمت کے سکندر ہی ہیں

ورنہ یہ ضروری تو نہیں کہ عمارت کے عقبی حصّے میں پائپ لائن ہوتی اور وہ بھی اس طرح کہ کھڑکی کے قریب سے گزرتی۔ بہرحال کمرے میں اُترنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اندر اندھیرا تھا۔ اسی لمحہ زاہد نے اس کا ہاتھ تھام کر جاوید کی رہنمائی کی اور اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ چند منٹ بعد ایک طویل کوری ڈور سے گزرتے ہوئے وہ نیچے جانے والے زینوں کے قریب آ گئے۔ نیچے پہنچ کر اندازہ ہوا کہ یہاں بھی بیداری کے آثار نہیں تھے۔ کچھ دیر میں ہی اُنہوں نے پوری عمارت چھان ڈالی۔ لیکن کہیں بھی کسی فرد کی موجودگی کے آثار نہیں تھے۔

"لگتا ہے عمارت میں کوئی نہیں ہے۔" زاہد نے دھیمی آواز میں کہا۔

"وہ تو ہے۔"

"لیکن اب یہاں آنے کا مقصد بتا دیجئے۔"

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" زاہد اپنی ریڈیم والی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہمیں کوئی ایسی جگہ منتخب کرنی چاہیئے جہاں کچھ دیر روپوش رہ سکیں۔"

"اور اس روپوشی کی مدت کیا ہوگی۔؟"

"کیوں۔؟" زاہد نے کہا۔

"اس لئے کہ اگر یہ روپوشی دو چار گھنٹے کی ہو تو میں خواب خرگوش کے مزے لے لوں۔" جاوید بولا۔

زاہد اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بائیں طرف مڑ گیا۔ پھر اس نے چھپنے کے لئے کچن منتخب کیا اور اندر سے دروازہ بند کر کے پنسل ٹارچ نکال لی۔ روشنی کی ایک پتلی سی دھار گرد و پیش کی اشیاء پر رینگنے لگی۔ جاوید نے اندازہ لگایا کہ کچن خاصا کشادہ تھا۔ اس نے سامنے رکھے ریفریجریٹر کو کھولا۔ اندر کھانے پینے کی چیزیں، پھل اور مختلف مشروبات کی بوتلیں رکھی تھیں۔ اس نے پائن ایپل جوس کی ایک بوتل اور سیبوں کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ زاہد نے اس کا ہاتھ جھٹک کر فرج بند کر دیا۔

"پاگل ہو گئے ہو، اگر آنے والے بھوکے ہوئے اور اُنہوں نے سیدھا کچن کا رُخ کیا تو...؟"

"مگر آنے والے ہوں گے کون؟"

اچانک زاہد کے جواب دینے سے قبل ہی باہر کئی قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ زاہد نے اپنی جیب سے رومال نکالتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ اپنا رومال نکال کر چہرے پر اس طرح باندھ لو کہ بس آنکھیں کھلی رہیں پھر جاوید کا ہاتھ پکڑ کر وہ فوراً دم ریفریجریٹر کے پیچھے ہو گیا۔

قدموں کی آہٹوں سے ظاہر تھا کہ باہر کئی شخص ہیں۔ پھر کسی نے ٹھیک کچن کے دروازے پر آ کر کہا "تم لوگ بڑے کمرے میں چلو، میں پینے کے لئے کچھ لاتا ہوں۔"

زاہد نے اندازہ لگایا کہ بولنے والا کوئی غیر ملکی ہی تھا۔ دروازہ کھلا تو وہ دونوں فرج کے پیچھے کچھ اور سمٹ گئے۔ آنے والا کمرے میں روشنی کے بغیر اندازے سے بائیں طرف رکھے آئس بکس کی طرف بڑھا اور بوتلیں نکالنے لگا۔ پھر وہ چلا بھی گیا مگر وہ دونوں سانس روکے کھڑے رہے۔ انہوں نے دروازہ بند ہونے کی صاف آواز سنی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ منٹ بعد زاہد، جاوید کے ساتھ ریفریجریٹر کے پیچھے سے نکلا اور دروازے کے قریب پہنچ کر قفل کے سوراخ سے باہر جھانکنے لگا۔ روشنی کچن کے سامنے والے کمرے میں ہی ہو رہی تھی۔

"چلو، مگر بہت احتیاط سے باہر نکلنا۔" زاہد نے دروازے کو آہستگی سے کھولتے ہوئے کہا۔

جاوید کچھ کہے بغیر باہر نکلا اور سامنے والے کمرے میں عمارت کے مکین اُونچی آواز سے باتیں کر رہے تھے۔ لیکن اتنے فاصلے سے ان کی گفتگو واضح طور پر نہیں سنی جا سکتی تھی۔

روشن کمرے کے دروازے پر سیاہ رنگ کا بھاری پردہ لٹک رہا تھا۔ وہ دونوں بڑی احتیاط سے بے آواز چلتے ہوئے دروازے کے قریب جا کر دیوار سے چپک گئے۔ اب اندر سے کسی عورت کے بولنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"مادام یہاں نہیں آ سکیں، لیکن تمہارے لئے پیغام ہے کہ پہلی فرصت میں ولیم کی کمین گاہ کا پتہ لگاؤ۔"

لہجے کے ساتھ زبان بھی انگریزی ہی تھی۔ مگر یہ ٹریزی کی آواز ہرگز نہیں تھی۔ عورت کا جملہ ختم ہوتے ہی کسی نے کہا "سوال یہ ہے کہ ولیم نے جزیرے والی کالونی پر قبضہ کس طرح کر لیا۔؟"

"کچھ لوگ تنظیم سے غداری کر کے اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔" عورت بولی "لیکن سلور آئی لینڈ ابھی پوری طرح اس کے قبضہ میں نہیں۔"

"مگر وہ یہاں کیوں آیا ہے۔؟" کسی نے پوچھا۔

"یہاں ہمارا ایک مقامی ایجنٹ بھی ولیم سے مل گیا ہے اس کے پاس کچھ اہم ترین کاغذات ہیں جن کا تنظیم تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ لیکن وہ ایجنٹ کاغذ پا کر بیٹھ گیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے وہ ایجنٹ کاغذات کو ولیم کے حوالے کرسکتا ہے۔"

"بیشک۔" عورت نے کہا۔ "ولیم اسی چکر میں یہاں آیا ہے اور شاید نہیں جیتے، ہوکہ تنظیم کو ان کاغذات کے نہ ملنے سے لاکھوں کا خسارہ ہوسکتا ہے۔"

زاہد اور جاوید نے پردے کو ذرا سا ہٹا کر اندر جھانکا۔ اور دو سفید فام غیر ملکی اور ایک یوریشین لڑکی کے علاوہ چوتھا شخص کوئی مقامی ہی تھا۔ لیکن اس کا نصف جلا ہوا چہرہ دیکھتے ہی جاوید بُری طرح چونکا۔ اس نے زاہد کے کان میں دھیرے سے کہا۔ "یہ تو وہی بھیانک چہرے والا ہے جو مجھے ہوٹل امبر میں ایڈریلا کے ساتھ بیہوش کر کے فرار ہوگیا تھا۔"

"ہوں۔" زاہد نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔

"تم یہیں ٹھہرو میں اندر جارہا ہوں پھر جاوید کے کچھ کہنے سے قبل ہی اس نے پردہ ہٹایا اور اندر داخل ہوگیا۔ اس کے چہرے پر سفید رنگ کا رومال بندھا ہوا تھا اور صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں اُسے دیکھتے ہی وہ تینوں ایک دم کھڑے ہوگئے زاہد کی نظریں انہی پر تھیں اور اس کا ریوالور اُن کی طرف اُٹھا ہوا تھا۔

"مداخلت کے لئے شرمندہ ہوں۔" زاہد خالص یورپین لہجے میں بولا۔

"تم ہو کون۔؟" ان میں سے سب سے زیادہ طویل قد شخص نے غرا کر پوچھا۔ زاہد نے دیکھا کہ اس قدر طویل قد ہونے کے باوجود اس کے جسم پر گوشت نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے ہڈیوں کے ڈھانچے پر کھال منڈھ دی گئی ہو۔ سوکھے جسم کے ساتھ اس کی درازقامتی بیحد مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔

زاہد نے بیحد نرم لہجے میں کہا۔ "بلا ملامت، ورنہ میں ریوالور کی گولیوں سے بولتی تصویروں کو خاموشی کا سبق پڑھانے میں ماہر ہوں۔"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" یوریشین لڑکی سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔" زاہد آنکھ دبا کر بولا۔

"میں فرانس کے مقبول مصور وان گاف کے اسٹائل میں تمہاری ایک تصویر بنا کر تم سے ماڈرن آرٹ میں اپنی تجربہ بھی کراؤں گا۔"

"یہ نہیں ہوسکتا۔" سوکھے چرخ غیرملکی نے چیخ کر کہا۔ "تم میری موجودگی میں اس لڑکی کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔"

"اچھا۔" زاہد نے اس کا مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا۔

پھر اس نے دروازے کی سمت دیکھ کر زور سے کہا۔

"نکسلائٹ بلسارا اندر آجاؤ۔"

جاوید اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب سے ریشمی ڈوری کا ایک لچھا برآمد کرتے ہوئے لڑکی کی طرف بڑھا۔ وہ بہت خوفزدہ انداز میں زاہد کے ریوالور کو گھور رہی تھی۔ دو منٹ کے اندر جاوید نے لڑکی کی مشکیں کس دیں۔ اچانک بھیانک چہرے والے نے جاوید پر چھلانگ لگائی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ جاوید تک پہنچتا زاہد کا ہاتھ گھوما اور اس کے ریوالور کا دستہ پوری قوت سے بھیانک چہرے والے کے سر پر پڑا۔ وہ کسی قسم کی آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہوگیا۔

"مسٹر بلسارا تم ان محترمہ کو لے کر دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔"

جاوید نے ریوالور کی نال سے لڑکی کو دروازے کی سمت دھکیلا ہی تھا کہ دوسرے غیرملکی نے زاہد پر چھلانگ لگائی۔ زاہد غافل تو نہ تھا لیکن سنبھلتے سنبھلتے بھی ریوالور اُس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اچانک سوکھے جسم والے نے دروازے کی طرف زقند بھری اور جاوید نے بے دریغ فائر کردیا لیکن سوکھا دُبلا ہونے کے باوجود اُس میں غضب کی پھرتی تھی جاوید اُس کے پیچھے دوڑا چلا گیا۔

اُدھر زاہد اپنے مقابل کو بُری طرح رگید رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے حریف کے منہ سے نکلتا گالیوں کا طوفان کراہوں میں بدل گیا۔ زاہد نے اسے اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا اور بالکل ایسا لگ رہا تھا، جیسے اس نے ہاتھ استعمال نہ کرنے کا عہد کرلیا ہو۔ قوی الجثہ غیرملکی بیدم ہوکر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ زاہد نے بڑے اطمینان سے اپنی ٹائی کھولی اور نیم بیہوش غیرملکی کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دیئے۔

لڑکی ابھی تک دیوار سے لگی سہمی ہوئی نظروں سے یہ جنگ دیکھ رہی تھی۔ اسی لمحہ جاوید اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "نکل گیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" زاہد نے لاپرواہی سے کہا اور لڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "شاید اب تمہیں ہمارے ساتھ چلنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

"واقعی۔" زاہد مسکرایا اور اس نے جھپٹ کر لڑکی کی

گردن تھام لی۔ وہ بُری طرح زاہد کی گرفت میں مچل رہی تھی۔ جاوید نے دیکھا کہ زاہد لڑکی کا سر تھام کر اس کی کنپٹیاں دبا رہا تھا۔ لڑکی نے زاہد کی گرفت سے نکلنے کے لیے پورا زور لگایا۔ پھر اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کی آواز گھُٹ کر رہ گئی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی زاہد کے ہاتھوں میں جھول کر رہ گئی۔

زاہد نے لڑکی کو جاوید کی سمت دھکیلتے ہوئے کہا۔ "تم اسے سنبھالو اور میں اس بھینسے کو اٹھاتا ہوں۔" پھر وہ جاوید کے کچھ کہنے سے قبل ہی فرش پر پڑے غیر ملکی پر جھک گیا۔

جاوید نے بیہوش لڑکی کو اپنی پشت پر لادتے ہوئے بیہوش پڑے بھیانک چہرے والے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس کا کیا ہوگا؟"

"اسے یہیں پڑا رہنے دو۔ آج کی رات بس دو ہی کافی ہیں۔" زاہد ہنس کر بولا۔ اور بھاری جسم والے غیر ملکی کو لاد کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ دیر بعد ان کی جیپ سنسان سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ یوریشین لڑکی اور قوی الجثہ غیر ملکی پچھلی سیٹوں پر بندھے پڑے تھے۔ جاوید نے کھڑکی سے گردن نکال کر باہر دیکھا۔ یوں تو سہ پہر ہی سے مطلع ابر آلود تھا۔ لیکن اب آسمان پر گہرے سیاہ بادلوں میں بجلی بھی چمک رہی تھی۔ ابھی وہ میل ڈیڑھ میل ہی نکلے ہوں گے کہ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ زاہد نے ونڈ اسکرین کے وائپر چلاتے ہوئے رفتار کسی قدر کم کردی۔ دفعتاً عقبی سمت سے آتی ہوئی کسی دوسری گاڑی کی روشنیوں سے بھیگی ہوئی سیاہ سڑک روشن ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی جیپ کے نیچے دھماکا ہوا۔ جیپ لہرا کر سڑک کے بائیں طرف اُترتی چلی گئی۔ زاہد نے بڑی پھرتی سے بریک لگائے تھے۔ اس کے باوجود وہ جھٹکا ایسا ہی تھا کہ جیپ اُلٹتے اُلٹتے بچی۔

جاوید اور زاہد ابھی پوری طرح سنبھلے بھی نہ تھے کہ عقب سے آنے والی گاڑی جیپ کے پاس آکر رُکی بلکہ اُس کی کھُلی ہوئی کھڑکی سے ایک اسٹین گن کی نال بھی جھانکنے لگی۔

"اگر کسی نے اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کی تو بے دریغ بھون ڈالا جائے گا۔"

موسلا دھار بارش کے شور میں دوسری گاڑی سے چیخ کر کہا گیا۔ بارش اتنی تیز اور طوفانی تھی کہ اس پانچ گز کے فاصلہ کی چیزیں بھی دُھندلی نظر آرہی تھیں۔ برابر والی گاڑی سے دو آدمی اُترے۔ ان میں سے ایک نے اسٹین گن سنبھال رکھی تھی جیپ کے پچھلے حصے سے ایک آدمی نے بھاری بھر کم جسم والے کو گھسیٹ کر نیچے کھینچ لیا۔

"بھائی اس پارسل کی رسید ڈاک سے بھیج دی گئی ہے۔" جاوید نے ہانک لگائی۔

اسٹین گن والے نے جاوید کے قریب آکر اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر نیچے کھینچتے ہوئے کہا۔ "چلو باہر۔"

ابھی اس کا جملہ ادھورا ہی تھا کہ زاہد نے بھاری بھر کم آدمی کو اٹھا کر گاڑی کی طرف بڑھنے والے پر چھلانگ لگا دی ادھر جاوید بھی اسٹین گن والے کے منہ پر گھونسے رسید کرکے نیچے کود گیا تھا۔ اسٹین گن والا نیچے گرتے گرتے سنبھلا اور گولیوں کی بوچھار جاوید کے سر پر سے گزر گئی۔ جاوید پھرتی سے جیپ کے نیچے رینگ گیا۔ اسٹین گن والے نے گھوم کر اپنے ساتھی سے گتھے۔ زاہد پر دوسرا برسٹ مارا۔ لیکن زاہد کے ستارے بھی عروج پر تھے۔ کہ گولیوں کی زد میں آنے سے قبل اس کے مقابل نے اسے دوسری طرف اُچھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں دو چیخیں گونجیں اسٹین گن والے کا ساتھی اور بھاری بھر کم غیر ملکی گولیوں سے چھلنی ہوکر رہ گئے تھے۔ زاہد نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اسٹین گن والے کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔ سڑک پر دھپ سے گرنے کی آواز دور تک گئی۔ حملہ اتنا اچانک تھا کہ اسٹین گن والا چاروں شانے چت گرا۔ اب وہ زاہد کے نیچے دبا مچل رہا تھا اور اسٹین گن زاہد کے ہاتھ میں تھی۔

عین اسی لمحہ جیپ کی پچھلی نشست سے ایک چیخ کے ساتھ یوریشین لڑکی پھسل کر کیچڑ پر گری۔ اس دوران شاید وہ ہوش میں آچکی تھی۔ جاوید پھرتی سے اُس کی طرف لپکا اور وہ دونوں لڑکھڑا کر زاہد پر آگرے۔

"اب یہ دونوں گاڑیاں بھی اُٹھا کر مجھ پر لاد دو۔" زاہد چلّا کر چیخا۔ پھر وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس ڈھیر سے نکال پایا اس کے نیچے دبے ہوئے اسٹین گن والے کا سر اتنے زور سے پختہ سڑک سے ٹکرایا تھا کہ چاروں طرف خون کا ایک تالاب سا بن گیا تھا۔ جاوید نے بُری طرح مچلتی لڑکی کی گردن میں اپنے پیروں کی قینچی ڈال رکھی تھی۔

زاہد اسٹین گن اُٹھائے حملہ آوروں کی گاڑی کے قریب پہنچ کر چیخا۔ "اندر جو بھی ہے باہر آجاؤ۔" لیکن سناٹے میں اُسے اپنی آواز کی بازگشت ہی سُنائی دی۔ دوسرے ہی لمحہ زاہد کو معلوم ہوگیا کہ حملہ آوروں کی گاڑی میں ایک لاش کے سوا کچھ نہیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا یہ شخص بھی شاید اپنے اسٹین گن والے ساتھی کی اندھا دھند فائرنگ کا شکار ہوگیا تھا۔

زاہد دوسری گاڑی کی اگلی نشست کا دروازہ بند کرتے ہوئے جاوید کی طرف پلٹ آیا۔ پھر اس نے لڑکی کے بال پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔ "بس اب یہ غل مچانا ختم کرو۔"

لڑکی نے اس کے ہاتھ میں اسٹین گن دیکھتے ہی ہاتھ پیر ڈال دیئے۔ زاہد نے لڑکی کا بازو تھامتے ہوئے جاوید کی طرف دیکھا۔ "میرے خیال میں ہمارے پاس اسپیئر وہیل موجود ہے۔"

"جی ہاں۔" جاوید جھنجھلا کر بولا۔ "مگر وہیل آپ ہی بدلیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" زاہد نے کہا۔ "تم ان لاشوں کو اٹھا کر دوسری گاڑی میں ڈال دو۔"

"ہرگز نہیں۔"

"تو پھر اس لڑکی اور اسٹین گن کو سنبھالو۔"

"لڑکی اور اسٹین گن سر آنکھوں پر، مگر میں مردے ہرگز نہیں ڈھوؤں گا۔"

زاہد نے اسٹین گن اسے دیتے ہوئے لڑکی کو بھی اس کی طرف دھکیل دیا۔ پھر حملہ آوروں اور بھاری بھرکم جسم والے کی لاشیں اٹھا کر دوسری گاڑی میں ڈالنے کے بعد اپنی جیپ کا وہیل بدلنے لگا۔ دس منٹ کے اندر اس کام سے فارغ ہو کر وہ جاوید کی طرف پلٹا۔ اس دوران بارش کا زور بھی ٹوٹ چکا تھا۔ زاہد نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے لڑکی کو گھور کر دیکھا۔ اچانک اس کی کھڑی ہتھیلی لڑکی کی پشت سے ذرا نیچے گدی پر پڑی اور وہ ایک بار پھر بیہوش ہو گئی۔ جاوید نے اسے اٹھا کر اس بار اگلی نشست پر اس طرح رکھ دیا کہ وہ بیٹھی ہوئی لگ رہی تھی۔ زاہد نے جاوید کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے گیئر میں ڈال کر سڑک پر لیتا چلا گیا۔

اس بار جیپ کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تیز تھی۔ بیس منٹ بعد جب زاہد نے گاڑی کو ایک سہ منزلہ عمارت کے کمپاؤنڈ میں موڑ کر روکا تو جاوید چونک پڑا۔ یہ سیکرٹ سروس کی وہ عمارت تھی جہاں خطرناک قسم کے بین الاقوامی مجرموں کو خصوصی حالات میں لایا جاتا تھا۔ عمارت کا ہر کمرہ ساؤنڈ پروف ہونے کے علاوہ کچھ کمرے ایسے بھی تھے جنہیں جدید قسم کی حوالات کہا جا سکتا تھا۔ ان کمروں کے دروازے اسٹیل کی چادروں سے بنے ہوئے تھے جن میں ہر وقت برقی رو دوڑتی رہتی تھی۔

زاہد نے گاڑی سے اتر کر بیہوش لڑکی کو اپنے بازوؤں پر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو، میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔" پھر وہ جاوید کے کچھ کہنے سے پہلے ہی عمارت کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ زاہد کے جاتے ہی جاوید نے گھڑی دیکھی صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں سوئیاں چبھ رہی تھیں۔

سات آٹھ منٹ بعد زاہد واپس آیا تو وہ بے خبر سو رہا تھا۔ پھر انجن اسٹارٹ کر کے زاہد نے گاڑی کمپاؤنڈ سے باہر نکالی تو پھر اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

"لگتا ہے بہت تھک گئے ہو۔" زاہد نے گیئر بدل کر رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

لیکن جاوید نے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

***

زاہد نے جیپ کو پورچ میں روکتے ہوئے وہاں پہلے سے موجود پولیس کی جیپ اور ایک لمبی اسٹیشن ویگن کو حیرت سے دیکھا پھر اس کی نظر میں وہ تین چار باوردی کانسٹیبل بھی آ گئے جو اسٹیشن ویگن کے دوسری طرف کھڑے تھے۔ جاوید کو جھنجھوڑ کر بیدار کرتے ہوئے وہ کانسٹیبلوں کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا معاملہ ہے۔؟" اس نے ایک کانسٹیبل سے پوچھا۔

"پتہ نہیں صاحب۔" کانسٹیبل جو شاید اسے پہچانتا تھا سیلوٹ کر کے بولا۔ "کسی نے فون کیا تھا کہ آپ کی کوٹھی میں بم پھٹا ہے۔ ایس پی صاحب اور ایس او اندر ہیں۔"

بم پھٹنے کی بات سن کر جاوید کی آنکھوں سے بھی نیند غائب ہو گئی۔ زاہد تقریباً دوڑتا ہوا برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ اسی لمحہ اس کی نظر سیما پر پڑی جو برآمدے میں کھڑی ایک ملازم کو کافی بنا کر لانے کی ہدایت دے رہی تھی۔

"کیا ہوا۔؟ تم کب آئیں؟" زاہد نے سیما کو دیکھتے ہی پوچھا۔

زاہد پر نظر پڑتے ہی سیما چونکی پھر اس کا ہاتھ تھام کر تیزی سے برابر والے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ زاہد کمرے میں پہنچ کر اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولا۔ "آخر بات کیا ہے؟"

"مجھے خود نہیں معلوم، میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ قبل ہی واپس آئی ہوں۔"

"دھماکہ کہاں ہوا۔"؟

"آپ کے بیڈ روم نہیں کمرے کی نصف چھت اور بائیں بازو کی سمت والی عقبی دیوار صاف ہو گئی۔"

"اوہ" زاہد تشویش کُن انداز میں سر ہلاتا ہوا بولا۔

"دھماکہ تمہاری موجودگی میں ہوا تھا۔؟"

"ہاں۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں لباس تبدیل کر رہی تھی۔" سیما بولی۔

"ایسی دل دہلا دینے والی آواز تھی کہ دوسرے کمروں کی دیواریں تک لرز گئیں۔"

"تم نے پولیس والوں کو بیان دیا۔"

"ابھی نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ویسے بیان دینے کی نوبت آئے تو طرح طرح سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرنا۔" زاہد نے کہا۔ اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں ایس پی اور مقامی پولیس اسٹیشن کا انچارج اس کا منتظر تھا۔

زاہد نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایس پی رانا کو پہچان لیا۔ وہ بھی زاہد سے واقف تھا۔ اُسے دیکھتے ہی رانا کھڑا ہو گیا۔ زاہد ایس پی رانا اور ایس او سے ہاتھ ملانے کے بعد اِن کے مقابل والی نشست پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"آپ لوگوں نے موقع کا معائنہ تو کر لیا ہوگا۔"

"بالکل" رانا نے جواب دیا۔ "لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنا طاقتور بم آپ کے بیڈ روم میں آیا کیسے۔"؟

"میرا خیال ہے۔ یہ میرے کسی دشمن کی سازش ہے۔"

"آپ کو کسی پر شک ہے۔"؟

"میں یقین سے کسی کا نام نہیں لے سکتا۔"

"ٹھیک ہے آپ بیان دے دیجئے۔ ہم اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔" ایس پی رانا معنی خیز لہجے میں بولا۔

"او کے" زاہد نے مسکرا کر کہا۔

پھر لگ بھگ نصف گھنٹے تک کاغذی کاروائی ہوتی رہی۔ پولیس والوں کے رخصت ہوتے ہی زاہد جاوید اور سیما کے ساتھ اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے کا نصف حصہ کھنڈر ہو چکا تھا۔ چاروں طرف ملبے کا ڈھیر اور جلے ہوئے فرنیچر کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ز... مسمار شدہ دیوار اور نصف سے زیادہ اُڑی ہوئی چھت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کافی طاقتور بم رہا ہوگا۔"

سیما کچھ کہنے ہی والی تھی کہ برابر والے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ زاہد مسمار شدہ کمرے سے نکل کر باہر آ گیا۔ پھر ریسیور اُٹھا کر کان سے لگاتے ہی اُس نے فون پر ایک اجنبی آواز سُنی تھی۔

"غالباً میں کرنل زاہد سے مخاطب ہوں" دوسری طرف سے انگریزی میں کہا گیا۔ لہجہ سو فیصد غیر ملکی تھا۔

"یس میں زاہد بول رہا ہوں۔"

"اپنی خوابگاہ کی تباہی دیکھ لی۔"

"شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس تباہی کے ذمّہ دار تم ہو۔" زاہد بولا۔

"ٹھیک سمجھے" دوسری طرف بولنے والے کا قہقہہ سنائی دیا۔ پھر اس نے کہا "یہ میرے اپنے تیار کردہ ایک چھوٹے سے بم کا کمال ہے۔ میں اگر چاہتا تو یہ بم تمہاری موجودگی میں بھی پھٹ سکتا تھا۔"

"گویا تم میری غیر موجودگی سے واقف تھے۔"؟

"بلاشبہ۔"

"لیکن میں اس مہربانی کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب صرف اتنا ہے کہ میرے اور ٹریزی واکوما کے درمیان مت آؤ۔ ورنہ اس بار تمہاری موجودگی میں پوری کوٹھی کھنڈر بن سکتی ہے۔"

"کافی اچھا خیال ہے۔" زاہد ہنسا اور پھر بولا "مجھے تمہارے اور ٹریزی کے درمیان تنازعہ سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن اپنے ملک کے مفادات کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔"

"سوچ لو کرنل۔ تم اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو۔" دوسری جانب سے دھمکی آمیز لہجے میں کہا گیا۔

"میں بزدلوں کی طرح دھمکیاں نہیں دیتا مگر تم نے جو خون خرابا کیا ہے اس کا نتیجہ تو تمہیں بھگتنا ہی پڑے گا۔" زاہد نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"خون خرابے سے تمہاری کیا مُراد ہے۔"؟

"کیا تم نے سامنتا کو قتل نہیں کیا۔"؟

"تمہارے قانون کی رُو سے وہ بد ترین مجرم تھا۔"؟

"لیکن تمہیں قانون ہاتھ میں لینے کی سند کس نے دی۔"

زاہد سرد آواز میں بولا۔ اور کہا "ابھی چند گھنٹے قبل تمہارے آدمیوں نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کر کے اس لڑکی کو اغواء کرنے کی کوشش کی

تھی۔ جیسے میں جیکب اسٹریٹ والی ایک عمارت سے نکل کر آ رہا تھا۔"

"تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ میرے آدمی اپنی مہم میں ناکام رہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"تمہارے دونوں آدمی اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں سے مارے گئے۔ اس کے علاوہ تمہارے تیسرے آدمی نے اس لڑکی کے ایک ساتھی کو قتل کر دیا۔" زاہد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مسٹر زاہد۔" دوسری طرف سے بولنے والا دہاڑا "تم نہیں جانتے کہ تم انجانے میں کس سے ٹکرا گئے ہو۔"

"کیا تم ولیم کرسٹوفر نہیں ہو۔" فون پر زاہد کی آواز گونجی۔

"اس کا مطلب ہے تم نے مجھے پہچان لیا۔"

"کہو تو تمہاری ہسٹری بھی دُہرا دوں۔" زاہد طنزیہ لہجے میں بولا۔ "کیا تم وہی کرسٹوفر نہیں جس نے چند لاکھ ڈالر کے لئے اپنے ہی ملک کے سائنسی راز ایک طاقتور ملک کے ہاتھ فروخت کر دیئے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ آج بھی تمہارے مُلک کو ولیم کرسٹوفر نام کے اس چور سائنسدان کی تلاش ہے جو ٹیکنالوجی کا چیف تھا اور کیا یہ غلط ہے کہ تم گزشتہ کئی برس سے مافیا جیسی خطرناک تنظیم کے لئے کام کر رہے تھے۔؟"

زاہد کی بات ختم ہوتے ہی دوسری طرف سے ولیم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میرے بارے میں تمہاری معلومات واقعی شاندار ہیں لیکن ولیم اپنی ہسٹری یاد رکھنے والوں کو کبھی زندہ نہیں چھوڑتا" اس کے ساتھ ہی اُس نے فون بند کر دیا۔

زاہد ایک لمحہ تک ریسیور کان سے لگائے رہا۔ پھر اس نے جیسے ہی ریسیور کریڈل پر رکھا کہ فون کی گھنٹی دوبارہ بجی اور اس نے ریسیور اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو۔"

"جنرل کیو ہیئر۔"

"یس سر، زاہد اسپیکنگ۔"

"کیا تمہاری کوٹھی میں بم پھٹنے والی خبر سچ ہے؟"

"یعنی آپ کو بھی پتہ لگ گیا۔"

"پوری بات بتاؤ۔ میں اپنے آدمیوں کی طرف سے غافل نہیں رہتا۔"

"آپ کو ٹھیک اطلاع ملی ہے جناب، میرے بیڈروم کی نصف چھت اور ایک دیوار اُڑ گئی۔"

"یہ سب کیسے ہوا؟"

زاہد نے مختصر الفاظ میں ٹریزی داکوما اور ولیم کرسٹوفر سے لے کر اپنے اُوپر کئے گئے حملے سے بم پھٹنے تک کی تمام روداد مختصر الفاظ میں دہرا دی۔ چند لمحوں تک دوسری طرف خاموشی رہی۔ پھر فون پر جنرل کیو کی آواز اُبھری۔ "جس لڑکی کو تم نے سیکرٹ ہاؤس میں نظر بند کیا ہے وہ کون ہے؟"

"فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ طے ہے کہ اس کا تعلق ٹریزی سے ہے۔"

"معاملہ بہت سنگین ہوتا جا رہا ہے کرنل۔" جنرل کیو دوسری طرف سے فکرمند لہجے میں بولا۔ "دو دن سے وزارت خارجہ کا ایک ڈپٹی سیکرٹری راجیشور دیال غائب ہے۔ اور یہ بات میرے اور وزیر خارجہ کے علاوہ تمہیں بتائی جا رہی ہے کہ گرین روم کے آئرن سیف سے یورینیم والے خفیہ معاہدے کی فائل جی آر ٹو بھی غائب ہے۔"

"اور آئرن سیف راجیشور دیال کی نگرانی میں رہتی ہوگی۔" زاہد نے اُدھر سے پوچھا۔

"تم ٹھیک سمجھے۔ وزیر خارجہ کے علاوہ آئرن سیف کی ایک چابی راجیشور دیال کے پاس رہتی تھی۔" جنرل کیو بولا "ویسے کچھ ماہ سے راجیشور دیال کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا رہی تھی۔"

"راجیشور دیال پر شک کرنے کی کوئی خاص وجہ بھی رہی ہوگی"

"ہاں۔ ویجیلینس والوں کو ایک خفیہ رپورٹ کے مطابق گزشتہ ایک برس میں راجیشور دیال نے یہاں کی کئی کمپنیوں کے شیئرز خریدے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے دو تین غیر ملکی بنکوں میں بھی اکاؤنٹ کھول رکھے ہیں۔"

"آپ سے ایک گزارش ہے۔"

"کہو۔"

"راجیشور دیال کے لاپتہ ہونے کے ساتھ میری کوٹھی میں بم پھٹنے کی خبر پریس تک نہ پہنچے۔" زاہد نے کہا۔ "اس کے ساتھ ہی ایس پی رانا کو اُوپر سے فون کرا دیں کہ بم والے معاملے کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ مزید کسی قسم کی انکوائری ضروری نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" جنرل کیو بولا۔ "ویسے تم رتنا پرکاش سے بھی ملے۔"

"نہیں۔ میں ابھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

"شائد تمہیں علم نہیں کہ اُس نے کل صبح اپنے شوہر پرکاش دوبے کے اغوا کئے جانے کی رپورٹ درج کرائی ہے۔"

"اوہ۔" زاہد چونک کر بولا۔ "گویا پرکاش دوبے بھی گیا۔"

"یہ سب تم جانو۔" جنرل کیو نے بھاری لہجے میں کہا۔

"مگر فائل کی واپسی بہت ضروری ہے۔ تم جانتے ہو اگر یورینیم والے معاہدے کا راز کھل گیا اور وہ کاغذات کسی مخالف ملک کے ہاتھ لگ گئے تو کئی دوست ممالک ہمارے دشمن ہو جائیں گے۔"

"آپ جانتے ہیں میں اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتا۔"

"اسی لئے مجھے تم پر اعتماد ہے۔" جنرل کیپو بولا۔ "ہو سکے تو مجھے فون پر رپورٹ دیتے رہا کرو۔" اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے فون ڈسکنکٹ ہو گیا۔

ریسیور رکھ کر زاہد دوسرے کمرے میں آیا اور جاوید کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر تم چاہو تو چند گھنٹے آرام کر سکتے ہو۔ اس کے بعد ٹھیک دس بجے ہمیں موہن پیلس پہنچنا ہے۔"

"کیوں خیریت؟"

"تمہیں مسز پرکاش سے ملنے کا بہت ارمان تھا نا؟" زاہد مسکرایا۔ "پرسوں رات کسی نے اس کے شوہر کو اغوا کر لیا۔"

"ضرور کسی کیبرے ڈانسر کی حرکت ہو گی۔" جاوید بولا۔ "آج کل آسانی سے انگلیوں پر ناچنے والے ملتے کب ہیں۔"

"جو کچھ بھی ہو۔" زاہد ہنسا۔ "تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ پرکاش کا اغوا کن حالات میں ہوا؟"

"اور اگر مسز زینا نے مجھے اغوا کر لیا۔"

"تو کیا ہوا۔" سیما ہنس کر بولی۔ "اس صورت میں بھی تم گھاٹے میں نہیں رہو گے۔"

جاوید کوئی جلا کٹا جواب دینے ہی والا تھا کہ زاہد نے سیما کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم ناشتہ لگواؤ۔ میں غسل سے فارغ ہو کر ابھی آیا۔ اس کے بعد تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"اوکے۔" سیما نے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

زاہد نے باتھ روم کی طرف بڑھتے بڑھتے پلٹ کر جاوید سے کہا۔ "تم زینا سے مل کر سیدھے ادھر آ جاؤ گے۔ میں کہیں سے بھی یہاں فون کر کے رپورٹ لے لوں گا۔"

"بہتر ہے۔" جاوید نے کہا اور وہیں صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

* • *

تقریباً ساڑھے دس بجے وہ دونوں سیکرٹ ہاؤس جانے کے لئے نکلے۔ زاہد نے جیپ کے بجائے اس وقت سیما کی کار کو ترجیح دی تھی۔ اسٹیرنگ بھی سیما نے ہی سنبھال رکھا تھا۔

کوٹھی سے سیکرٹ ہاؤس کی عمارت تک درمیانی فاصلہ خاموشی سے ہی طے ہوا۔ پھر کار کو کمپاؤنڈ میں کھڑی کر کے وہ دونوں عمارت کے برآمدے میں آ گئے۔ لفٹ سے وہ دونوں سیدھے تیسری منزل پر جا رکے۔

زاہد نے متعلقہ انچارج کو اپنا شناختی کارڈ اور کوڈ نمبر بتانے کے بعد روم نمبر گیارہ کی چابی لی اور سیما کے ساتھ ایک طویل راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ ایک کمرے کے دروازے پر رک کر اس نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

"اندر کمرے میں ایک لڑکی ہے تمہیں اس کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنی ہیں۔"

"کیوں۔؟ کیا آپ اندر نہیں چل رہے۔" سیما نے کہا۔

"تم جاؤ تو۔ میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔ ویسے یہ یاد رہے کہ وہ بیہوشی کی حالت میں یہاں لائی گئی تھی۔" زاہد نے جواب دیا۔

سیما آگے بڑھنے لگی تو زاہد نے کی ہول میں چابی پھنسا کر گھمانے سے پہلے دروازے میں لگا ایک سوئچ آف کیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "دروازہ کھولنے سے پہلے وہ اوپر والا بٹن دبا دینا۔"

سیما نے اثبات میں سر ہلایا اور سرخ بٹن دبانے کے بعد دروازے کا ہینڈل گھما کر اندر چلی گئی۔ کمرے میں گھستے ہی اس کی نظر ایک یوریشین لڑکی پر پڑی۔ وہ ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ سیما پر نظر پڑتے ہی لڑکی کھڑی ہونے لگی۔ تو اس نے اسے ہاتھ ہلا کر بیٹھے رہنا کا اشارہ کیا۔

لڑکی بیٹھ تو گئی لیکن اس کی آنکھوں سے جھنجھلاہٹ اور ناگواری کے اثرات صاف ظاہر تھے۔ سیما بھی اسے لگاتار گھور رہی تھی۔ آخر لڑکی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیا میں اپنے آپ کو قیدی سمجھوں۔"

"یہ تم سے کس نے کہا۔؟"

"پھر مجھے یہاں کس نے اور کیوں بند کیا ہے۔"؟

سیما کوئی جواب دینے ہی والی تھی کہ دیوار گیر کلاک سے آواز ابھری۔ "ٹی ون ٹی ون۔ زیرو کالنگ۔" سیما نے دیکھا کہ لڑکی تیر کی طرح کرسی سے اٹھ کر اس میز کی طرف جھپٹی جہاں لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا تھا۔ دیوار گیر کلاک کے اوپر سوراخ سے اب عجیب قسم کے اشارے گونج رہے تھے۔ لڑکی نے میز پر سے ایک سادہ کاغذ اٹھایا اور پنسل سے کچھ لکھنے لگی۔ کمرے میں مسلسل ٹک ٹک ٹاک ٹاک۔ چوں رگن۔ ٹرپ جام۔ ٹاک ٹاپ ٹرپ جیسی آوازیں گونج رہی تھیں۔ کاغذ پر لڑکی کی پنسل تیزی سے رواں تھی۔ وہ اس قدر کھو گئی تھی کہ اسے اپنے عقب میں سیما کے

کھڑے ہونے کا علم بھی نہ ہوا۔

سیما کی نظر اس تحریر پر تھی جو لڑکی لکھتی جارہی تھی اور وہ پڑھ رہی تھی۔ کچھ عجیب سا پیغام تھا۔۔۔

گزشتہ رات تم کارلوس اور راجن کے ساتھ پی کاک بلڈنگ میں جس آدمی سے ملیں وہ کرسٹوفر کا آدمی ہے اور راستے میں بھی کرسٹوفر کے لوگوں نے تمہیں اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن تمہیں جن آدمیوں نے بچایا وہ تنظیم کے مقامی وفادار ہیں۔ یہ تم سے جو کچھ معلوم کریں اس کا جواب دینا۔ ولیم کرسٹوفر نے تنظیم کے کئی پرانے لوگوں کو ورغلایا ہے۔ اب ہمیں نئے لوگوں پر بھی بھروسہ کرنا ہوگا۔ ممکن ہے ان کی بعض باتیں تمہیں حیرت میں ڈال دیں۔ مگر گھبرانا مت۔۔۔۔اوور اینڈ آل ۔"

سیما نے دیکھا کہ لڑکی کا ہاتھ رک گیا۔ دیوار گیر کلاک سے ٹک ٹک ٹاپ کی آواز بھی بند ہوگئی تھی۔ سیما اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ لڑکی نے پنسل کو میز پر ڈال کر ہاتھ میں کاغذ لئے اپنی کرسی کی طرف بڑھ رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک نقاب پوش اندر داخل ہوا۔ لیکن سیما کو زاہد کے لباس کی وجہ سے اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

زاہد نے ہاتھ اٹھا کر بے حد نرم لہجے میں کہا۔ "بیٹھو بیٹھو۔" وہ لڑکی ایک جھٹکے سے بیٹھ گئی۔ سیما نے اس کے بیٹھتے ہی پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے"؟

"مارتھا گراہم ۔" لڑکی نے بھاری آواز میں جواب دیا۔

"تمہیں بار بار ہدایت کی جاتی رہی کہ ولیم کرسٹوفر سے محتاط رہو، اس کے باوجود ۔۔۔" سیما نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

لڑکی نیچی نظریں کئے بیٹھی رہی ۔ زاہد نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہارا جواب دینا ضروری ہے ۔"

"جو کچھ مجھ سے کہا گیا میں نے کیا۔ اور مجھ سے جواب طلب کرنے کا حق صرف ٹی ون کو ہے ۔"

"ٹی ون سے تمہاری مراد جزیری واکو ماہے ۔"

"ہاں ۔ وہی اس آپریشن کی انچارج ہے ۔"

"ٹی ون اس وقت کہاں ہے"؟ زاہد نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم ۔" لڑکی نے چونک کر جواب دیا۔

"رات تم پی کاک بلڈنگ میں کیوں گئی تھیں ۔" سیما نے سوال کیا۔

"مجھے ٹی ون کی طرف سے ہدایت ملی تھی۔"

"کیا تم جانتی ہو کہ کرسٹوفر نے تنظیم کے جس جزیرے پر تسلط جمایا ہے۔ وہ کہاں ہے"؟ زاہد نے پوچھا۔

اس سوال کے ساتھ ہی مارتھا کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ پرسکون ہو کر بولی ۔ "نہیں ۔"

"تنظیم کے بڑوں کو شک ہے کہ تم بھی ولیم کرسٹوفر سے مل گئی ہو"؟ سیما بولی ۔

"یہ غلط ہے ۔" لڑکی تیکھے لہجے میں بولی۔

"ہوش میں آؤ لڑکی ۔" زاہد سخت لہجے میں بولا۔ "تم بڑوں کے سامنے جواب دہی سے نہیں بچ سکتیں ۔"

"کیسی جواب دہی"؟ مارتھا کپکپاتی آواز میں بولی۔

"مجھ پر شک کرنا زیادتی ہے ۔ میں جانتی ہوں کہ تنظیم سے غداری کا مطلب صرف موت ہے ۔ مگر پہلے میری غداری کا ثبوت پیش کیا جائے گا ۔"

"اگر تمہارا ضمیر صاف ہے تو تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں" زاہد مسکرا کر بولا۔ "میں تمہارے لئے ناشتے کا انتظام کرنے جارہا ہوں۔ اس دوران تم فیروزہ سے باتیں کرو۔"

سیما نے سوالیہ نظروں سے زاہد کی طرف دیکھا ہی تھا کہ وہ اپنے چہرے پر چڑھی نقاب کو درست کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

زاہد کے باہر نکلتے ہی خودکار دروازہ مقفل ہوگیا۔ مارتھا نے سیما کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا نام فیروزہ ہے"؟

"ہاں ۔"

"مقامی ہو ۔"

"نہیں، میرے اجداد افغانستان سے آئے تھے۔"

"مقامی ورکرز میں تمہارا کیا مقام ہے "؟

"امتیازی ۔" سیما نے جواب دیا۔ پھر ایک لمحہ رک کر بولی "تم یہاں کس طرح پہنچیں ؟"

"مجھے وہ نقاب پوش اور اس کا ایک ساتھی لے کر آئے تھے"

اچانک سیما کا رنگ بدل گیا۔ اس نے مارتھا کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا۔ مارتھا اسے ہونٹ چباتے دیکھ کر اس طرح مسکرانے لگی جیسے اسے بہت کم تر سمجھ رہی ہو۔ سیما کو نہ جانے کیوں زاہد پر غصہ آنے لگا تھا۔

چند منٹ بعد زاہد خود ہی ناشتے کی ٹرے لئے اندر آیا۔ نقاب بدستور اس کے چہرے پر تھی۔ اس نے ٹرے کو لڑکی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "لو شروع ہو جاؤ۔"

"کیا میں خود کو ایک قیدی تصور کروں"؟ مارتھا نے ناشتے کی ٹرے اپنی طرف کھسکاتے ہوئے پوچھا۔

"جب تک تمہاری پوزیشن صاف نہیں ہو جاتی، تمہیں اسی کمرے میں رہنا ہو گا۔"

سیما بڑی گہری نظروں سے مارتھا کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے یہ بات کھٹک رہی تھی کہ زاہد اسے آدھی رات کو اپنے بازوؤں پر اٹھا کر یہاں تک لایا تھا۔

مارتھا سکے ہوئے توسٹوں پر مکھن لگانے کے بعد پیالے میں چائے انڈیل رہی تھی۔ پھر ناشتے سے فارغ ہو کر وہ زاہد کی طرف دیکھنے لگی۔ زاہد نے بہت نرمی سے کہا۔

"کچھ اور لو، کیا تم ابلے انڈے بالکل پسند نہیں کرتیں؟"

مارتھا نے زاہد کی بات کا جواب نہیں دیا۔ لیکن سیما زاہد کے لہجے کی لگاوٹ کو محسوس کر کے اپنے دانت پیسنے لگی۔ اچانک اس نے زاہد کی طرف دیکھ کر کہا "آپ اس پر خنجر ڈاگر کیوں نہیں آزماتے؟"

مارتھا نے چونک کر سیما کو دیکھا۔

زاہد نے سیما کا ہاتھ تھاما اور اسے کمرے سے باہر لے گیا۔

"تم نے اب تک کی تمام محنت برباد کر دی؟" زاہد افسردہ لہجے میں بولا "اب وہ یقیناً یہ سمجھ رہی ہو گی کہ ہم ڈاکٹر کے ہی آدمی ہیں اور اسے ڈبل کراس کر رہے تھے؟"

"آپ اس کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں جتا رہے تھے؟" سیما روہانسی آواز میں بولی۔

"بیوقوف ہو تم؟" زاہد اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے بولا "خیر اب تم یہاں سے سیدھی ڈاگا کے فلیٹ پر جاؤ گی؟"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تمہارے سوا اس لڑکی نے کسی کی اصل شکل نہیں دیکھی۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" سیما بولی "وہ ہماری قید میں ہے۔"

شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ... ہمارا واسطہ ڈریگ جیسی چالاک اور ولیم جیسے خطرناک مجرموں سے ہے اور میں اپنے ... کو کسی حالت میں کمتر نہیں سمجھتا۔

ٹھیک ہے۔ سیما نے کہا اور چلی گئی۔

●

شامی منٹر کا شمار شہر کے خوبصورت ترین علاقوں میں ... شہر کے متمول لوگوں پر مشتمل تھی اور مین ... خوبصورت ... عمارتیں

میں سے ایک تھی۔

جاوید نے اپنی جیپ پھاٹک پر روکی اور دربان کو اشارے سے پھاٹک کھولنے کے لئے کہا۔ ایک لمحہ تک دربان کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے شاید جاوید کی شخصیت سے مرعوب ہو کر ہی پھاٹک کھول دیا۔

پھاٹک کھلتے ہی جاوید گاڑی کو اندر لیتا چلا گیا۔ پورچ میں گاڑی روک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور نیچے اتر کر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اچانک ایک سریلی آواز نے اسے مخاطب کیا "سنیئے کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

جاوید نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک بڑی بڑی آنکھوں اور گداز جسم والی سانولی عورت برآمدے کے آخری سرے پر کھڑی تھی۔

"مجھے مسز رتنا پرکاش سے ملنا ہے۔" وہ بے حد سلیقے سے بولا۔

"فرمائیے۔" عورت اس کے نزدیک آ کر بولی "میں ہی رتنا ہوں۔"

"اوہ۔" جاوید اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بولا "مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"مجھ سے؟" رتنا کی آنکھوں سے حیرت کے آثار ابھرے "لیکن میں آپ کو نہیں جانتی۔"

"میں نے بھی صرف آپ کا نام ہی سنا ہے۔" جاوید مسکرایا "مگر فی الحال ہم دونوں ایک دوسرے کو جان لیں تو بہتر ہو گا۔"

"تشریف لایئے۔" وہ ایک اندرونی کمرے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

جاوید نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ قیمتی فرنیچر سے آراستہ یہ ایک خوبصورت ڈرائنگ روم تھا اور رتنا اس کے مقابل بیٹھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"دراصل میں آپ کے شوہر کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" جاوید نے کہا۔

"اس سلسلے میں پولیس میرا بیان لے چکی ہے ویسے آپ نے ... کچھ نہیں بتایا۔"

جاوید کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔

"میں سامنتا کا آدمی ہوں۔"

"کون سامنتا، میں کسی سامنتا کو نہیں جانتی۔" رتنا حیرت

سے بولی۔
"وہی سامنتا جو کلبرٹ روڈ کھامبنشن کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ اور جس سے آپ کی آخری ملاقات پارک ویو ہوٹل کے ایک کمرے میں ہوئی تھی۔"
زنسا نے چونک کر جاوید کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی تیز نظروں سے نظریں بچا کر دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی "پارک ویو ہوٹل میں میری ملاقات جگل کشور سے ہوئی تھی۔"
"جگل کشور اور سامنتا ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں"
جاوید نے کہا۔ "پولیس ریکارڈ میں اس کا نام سامنتا ہی ہے۔"
"آپ پرکاش کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں؟" زنسا نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"اس کے اغوا کی تفصیل۔"
زنسا چند لمحے تک کچھ سوچتی رہی پھر بولی "جس شام انہیں اغوا کیا گیا۔ میں گھر پر نہیں تھی۔ جس وقت میں واپس آئی تو یہاں بالکل سناٹا تھا۔ میں سیدھی پرکاش کی خوابگاہ گئی تو وہاں کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کمرے کی ہر چیز الٹی پڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پورے کمرے میں زلزلہ آ گیا ہو اور کئی آدمیوں کے درمیان خاصی ہاتھا پائی ہوئی ہو۔ بیڈ روم کی عقبی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور پرکاش کے بستر پر خون کے دو تین گہرے داغ تھے۔ بعد میں پولیس کو تفتیش کے دوران کھڑکی کی چوکھٹ پر بھی خون کے دھبے ملے۔"
"پولیس کو فون کس نے کیا تھا؟"
"میں نے۔"
"یہ کیسے معلوم ہوا کہ پرکاش کو اغوا ہی کیا گیا؟"
"کمرے کی حالت دیکھ کر پولیس والوں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔"
"جس وقت یہ حادثہ ہوا اس وقت ملازمین کہاں تھے؟"
"سنیچر کے دن پرکاش تمام نوکروں کو چھٹی دے دیتے ہیں۔ کچھ ملازمین سرونٹ کوارٹرز میں رہتے ہیں اور اگر کوئی خاص ضرورت پڑے تو انہیں بلا لیا جاتا ہے۔"
"سنیچر کی اس شام آپ کہاں تھیں؟"
"میں پرکاش سے پوچھ کر شاپنگ کے لئے گئی تھی۔"
"شاپنگ کے لئے یا سامنتا سے ملنے کے لئے۔"
زنسا نے کوئی جواب دینے کے بجائے اقرار میں سر ہلا کر نظریں جھکا لیں۔ جاوید نے زنسا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے جس روز آپ سامنتا سے ملیں اسی رات کسی نے اسے اس کے فلیٹ میں قتل کر دیا۔"
"نہیں۔" زنسا اچھل کر بولی۔
"یہ سچ ہے۔ اور اس کی ڈائری میں آپ کے ایڈریس کے علاوہ آپ کے بارے میں کافی تفصیل درج ہے اور وہ ڈائری اگر پولیس کو مل جائے تو آپ حراست میں لی جا سکتی ہیں۔"
"آخر تم چاہتے کیا ہو؟" وہ لرزتی آواز میں بولی۔
"سامنتا کے بارے میں تمام تر تفصیل، وہ تم سے کیا چاہتا تھا۔"
زنسا اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے سنبھل کر بولی۔ "وہ مجھے بلیک میل کر رہا تھا۔"
جاوید نے محسوس کیا کہ زنسا کا چہرہ کسی یرقان زدہ مریض کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ اس نے رک رک کر چند منٹ میں شروع سے آخر تک اپنی پوری کہانی دہرا دی۔ پھر اس نے سامنتا سے اپنی ملاقاتوں کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔
"میں نہیں جانتی کہ اسے کس نے قتل کیا؟"
"کیا آپ نے سامنتا کے کہنے پر موہن پیلس کے اس خفیہ تہہ خانے کا پتہ لگانے کی کوشش کی جس کا ذکر مقتول نے کیا تھا؟"
"نہیں، مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔
"آپ کو حیرت ہو گی کہ مجھ سے بے پناہ محبت کرنے کے باوجود پرکاش نے میری خواب گاہ کے لئے جو کمرہ منتخب کیا وہ دوسری منزل پر تھا۔"
"آپ نے سامنتا کے بارے میں کچھ پولیس کو بتایا۔"
"بالکل نہیں۔"
"سامنتا نے آپ سے آپ کی جس بیٹی کے بارے میں ذکر کیا تھا۔ وہ کہاں ہے؟"
"میں نہیں جانتی، اس نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ کسی انگریزی اسکول کے بورڈنگ میں ہے۔" زنسا نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔
جاوید اسے دلاسا دینے والے انداز میں بولا۔ "دیکھو مسز زنسا اگر تم نے میری اور اپنی اس ملاقات کا ذکر کسی سے نہیں کیا تو مجھے ہمدرد پاؤ گی۔ ممکن ہے تمہاری کھوئی ہوئی بیٹی میگھنا بھی تمہیں مل جائے۔"
"آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔" جاوید کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"ہمدردوں کے نام نہیں ہوتے" پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر کوئی خاص بات ہوئی تو میں تمہیں فون کر دوں گا۔"

زرینا نے کچھ کہنے کے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

زاہد کی ہدایت کے مطابق جاوید موہن پیلس سے نکل کر سیدھا گھر پہنچا۔

وہ اس وقت ڈائننگ روم میں کھانے کی میز پر بیٹھا اپنے سامنے رکھی ڈاب کو گھور رہا تھا اور نیا خانساماں فدا علی سینے پر دونوں ہاتھ باندھے اس کے سامنے بڑے ادب سے کھڑا تھا۔

جاوید نے گدلے گدلے گرم پانی سے لبریز ڈاب میں چمچہ ڈال کر ایک کوفتہ نما گول سی چیز باہر نکالتے ہوئے فدا علی کو گھورا۔ "کیا ہے یہ؟"

"لڑھکواں۔" فدا علی نے معصومیت سے مختصر جواب دیا۔

"لڑھکواں!" جاوید نے اسے حیرت سے دیکھا پھر اس گول چیز کو موہنہ میں ڈال کر چباتے ہوئے بولا۔ "ابے یہ بنی کیسے ہے؟"

"بیسن اور سنگھر بوٹی سے تیار کئے گئے کوفتے۔"

"سنگھر بوٹی کیا ہوتی ہے؟" جاوید نے منہ چلاتے ہوئے کہا تھا۔

"بھنگ کے سبز پتے۔"

جاوید بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ "کمبخت تھوڑی سی چرس بھی ڈال دی ہوتی۔"

"ملی نہیں۔" فدا علی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"خدا غارت کرے۔" جاوید دہاڑ کر بولا۔ "ابے تو مجھے بھنگڑی بنائے گا۔"

"سوکھی بھی نہیں ملی اسی لئے بھنگ کے پتے استعمال کئے تھے۔"

"تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔"

"بالکل نہیں، میں نے خود چار عدد کھا کر ایک ڈاب شوربہ پیا ہے۔" فدا علی مسکرایا۔ "ذرا کھا کر دیکھئے جھومنے لگیں گے۔"

"لعنت ہے تجھ پر۔" جاوید اسے مارنے کے لئے دوڑا۔

فدا علی پہلے ہی چھلانگ لگا کر باہر بھاگ چکا تھا۔ جاوید دروازے کی طرف لپکا ہی تھا کہ اندر آتے ہوئے زاہد سے ٹکرا گیا۔

"کیا حماقت ہے یہ۔" زاہد نے برا سا موہنہ بنایا۔

"حماقت!" جاوید برا سا موہنہ بنا کر بولا۔ "کمبخت نے بیسن اور بھنگ کے پتے ملا کر کھلا دیئے۔"

"یہ سب تمہاری حماقتوں کا نتیجہ ہے۔" زاہد ہنستا ہوا بولا۔ "چلو اندر چلو۔"

جاوید کچھ کہے بغیر زاہد کے ساتھ واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا، زرینا سے ملے تھے؟"

"جی ہاں۔" جاوید نے جواب دیا، اور پھر پوری رپورٹ دہرا دی۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ولیم اور ٹریزی کو جن کاغذات کی تلاش ہے وہ موہن پیلس والے کسی خفیہ تہہ خانے میں ہی ہو سکتے ہیں۔"

"اور اس تہہ خانے کا راستہ شاید ہری پرکاش کی کھوپڑی سے جاتا ہوگا۔ اسی لئے اسے اغوا کر لیا گیا۔" جاوید چہک کر بولا۔

"برخوردار، شاید تم پی کاک بلڈنگ میں ہونے والی گفتگو بھول گئے۔ مارتھا نے صاف طور پر کچھ اہم کاغذات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ٹریزی کے نام کرسٹوفر کے خط میں کھلے طور پر اس بات کا ذکر تھا کہ پرکاش تنظیم کا مقامی ایجنٹ ہے۔" زاہد نے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو پرکاش کو اغوا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تم پھر غلطی کر رہے ہو۔" زاہد بولا۔ "اب تک کے حالات کی روشنی میں یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ پرکاش تنظیم سے دستبردار ہو چکا تھا۔ لیکن اپنی غداری کے باوجود شاید وہ اس لئے زندہ ہے کہ اس کے قبضہ میں کوئی اہم چیز ہے اور یہ اہم چیز جی آر تھری ٹو والی فائل بھی ہو سکتی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ پرکاش کو ٹریزی یا کرسٹوفر نے اغوا کیا ہے؟"

"بیشک۔"

"اور مارتھا کو کس خانے میں فٹ کریں گے۔" جاوید نے پوچھا۔

"میں اس کے سلسلہ میں ابھی تک کوئی واضح رائے قائم نہیں کر سکا۔ مجھے شک ہے کہ وہ ..."

ابھی زاہد کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یس۔" پھر شاید دوسری طرف سے بولنے والے نے کوئی ایسی ہی بات کہی تھی کہ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ جاوید نے محسوس کیا کہ زاہد کی آنکھوں میں گہری تشویش کے

آثار تھے۔

گفتگو کا سلسلہ ختم ہوتے ہی ریسیور رکھتے ہوئے زاہد نے جاوید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم فوراً ڈاگا کے فلیٹ پر پہنچو۔ وہاں تمہیں ہما سے دور رہ کر اس کی نگرانی کرنی ہے۔"

"لیکن ہما کیا کر رہی ہے....؟"

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔" زاہد فکرمند لہجے میں بولا۔ "اور ہاں خیال رہے کہ تم ہما سے ملنے یا فلیٹ میں جانے کی حماقت نہیں کرو گے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ آپ کچھ پریشان ہیں۔" جاوید نے سنجیدگی سے کہا۔

"تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مارتھا سیکرٹ ہاؤس سے فرار ہو گئی۔"

"فرار ہو گئی!" جاوید کے انداز میں حیرت تھی "مگر یہ کیسے ممکن ہے....؟"

"اگر ٹریزی واکو ما سے سابقہ پڑا ہو تو سب کچھ ممکن ہے جاوید...." زاہد بولا۔ "چلو کھڑے ہو جاؤ۔ میں تمہیں ڈاگا کے فلیٹ کے قریب چھوڑ کر سیکرٹ ہاؤس نکل جاؤں گا۔"

جاوید کچھ کہنے کے بجائے کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور وہ دونوں ڈائننگ روم سے باہر آ گئے۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد زاہد سیکرٹ ہاؤس کے تھرڈ فلور پر اس کمرے کے سامنے کھڑا تھا جہاں مارتھا قید تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت تھی اور ذہن منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔

کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور خودکار لاک کی جگہ لگ بھگ دس انچ کے قطر میں ایک گول سوراخ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ زاہد کو ایسا لگا جیسے خودکار لاک سمیت اسٹیل کے دروازے کا یہ حصہ کسی طاقتور برقی رو سے پگھلا دیا گیا ہو۔ لیکن نہ تو آس پاس کہیں پگھلے ہوئے لوہے کے آثار دکھائی دیئے اور نہ کوئی ایسی علامت جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ یہ کام باہر سے کیا گیا ہوگا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے دروازے کا یہ گول حصہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

اس نے پلٹ کر اپنے عقب میں کھڑے ڈیوٹی انچارج اور ایک جونیئر سیکورٹی افسر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ سب کیسے ہو گیا۔"

"حیرت انگیز جناب۔" جونیئر سیکورٹی افسر بولا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سوا بارہ بجے تک دروازہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ لیکن ایک بجے کے قریب میں ادھر سے گزرا تو موجودہ صورتحال دیکھ کر حیران رہ گیا۔"

"کسی نے کمرے سے لڑکی کو جاتے دیکھا؟" زاہد نے پوچھا۔

"نہیں۔" ڈیوٹی انچارج نے جواب دیا۔ پھر ایک لمحہ رک کر بولا۔ "نیچے گراؤنڈ فلور پر موجود ایک سنتری کا بیان ہے کہ اس نے ساڑھے بارہ کے قریب ایک غیر ملکی لڑکی کو لفٹ سے نکل کر باہر جاتے دیکھا تھا۔"

"سنتری نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی؟"

"کی تھی، لیکن لڑکی نے اسے بُری طرح ڈانٹتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اوپر والوں سے اس کی شکایت کر کے اسے معطل کرا دے گی اور وہ سہم کر خاموش ہو گیا۔"

"بیوقوف۔" زاہد غصہ میں دانت پیستے ہوئے بولا۔ "خدا جانے ہم ان گوری چمڑی والوں سے مرعوب ہونا کب چھوڑیں گے۔"

ڈیوٹی انچارج نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا۔ زاہد چند لمحوں تک پرتشویش نظروں سے دروازے کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر کسی بھی قسم کی ابتری کے آثار نہیں تھے۔ کچھ دیر تک وہ کمرے کی ہر چیز کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر باہر نکل آیا۔ ڈیوٹی انچارج اور سیکورٹی افسر ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔

زاہد نے نیچے جانے والی لفٹ کی طرف بڑھتے ہوئے ڈیوٹی انچارج سے کہا۔ "جنرل کو اس حادثے کی اطلاع دے دو۔"

"بہتر ہے۔" ڈیوٹی انچارج مؤدب انداز میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولا۔ اور زاہد خاموشی سے لفٹ میں داخل ہو گیا تھا۔

نیچے آ کر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے سڑک پر لے آیا۔ پھر دس منٹ بعد ہی اس نے اپنی گاڑی ڈاگا کے فلیٹ والی بلڈنگ کے سامنے روکی تھی۔

ہما فلیٹ میں ہی تھی۔ لیکن زاہد پر نظر پڑتے ہی اس کا منہ پھول گیا۔ "فرمایئے اب کہاں قید کرنے کا ارادہ ہے؟" وہ جلے کٹے انداز میں بولی تھی۔

"تم یہاں قید نہیں ہو۔" زاہد نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ قدم میں نے تمہاری حفاظت کے لئے اٹھایا ہے۔ تم جانتی ہو کہ مارتھا کی نظروں میں آنے کے بعد ٹریزی تم تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرے گی۔"

"ور مارتھا سو میں ڈر جائے گی ور ٹریزی کو میرا حلیہ بتا دے گی۔" ہما کا لہجہ اب بھی ٹھیک نہ تھا۔

"تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ماریتھا سیکریٹ ہاؤس سے فرار ہوگئی۔" زاہد نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ماریتھا فرار ہوگئی!" سیما نے استعجابیہ لہجے میں کہا۔ "مگر کیسے؟"

زاہد نے اسے تفصیل بتادی۔ پھر وہ اُٹھتا ہوا بولا "تم فلیٹ تک ہی محدود رہوگی۔"

سیما نے کسی سعادت مند بچی کی طرح سر ہلایا اور زاہد دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ٹریزی اپنی پشت پر ہاتھ باندھے بے چینی سے ایک ہال نما کشادہ کمرے میں ٹہل رہی تھی۔

فرنیچر کے نام پر پورے کمرے میں بس ایک کرسی تھی اور اس کرسی پر لگ بھگ چالیس پینتالیس برس کا ایک شخص ریشم کی مضبوط ڈوریوں سے جکڑا ہوا تھا۔ کھچڑی بالوں اور صحت مند چہرے والے اس شخص کی آنکھوں میں بے پناہ خوف کی جھلکیاں تھیں۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ آدمی مقامی ہی تھا۔ لیکن اپنے قیمتی لباس اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں بڑی ہیرے کی انگوٹھی سے دولتمند طبقے کا فرد نظر آرہا تھا۔ اس کی پشت پر کھڑے دراز قد شخص کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اس نے برسوں سے کچھ نہ کھایا ہو۔ اس کے سوکھے چمرخ جیسے جسم سے اگر اس کی کھال اُتار لی جائے تو وہ سرجری شاپ کے شوروم میں رکھا ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آنے لگتا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی استخوانی ڈھانچے پر زردی کھال منڈھ دی گئی ہو۔ اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں کسی شکاری چیتے جیسی چمک تھی۔ پہلی نظر میں اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اس کے وجود کی تمام تر قوت اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی ہو۔

دفعتاً ٹریزی کسی جلے پاؤں کی بلی کی طرح ٹہلتے ٹہلتے رُک گئی اس نے کرسی سے بندھے شخص کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔ "تو تمہارا نام راجیشور دیال ہی ہے نا؟"

کرسی سے بندھے شخص نے کچھ کہنے کے بجائے اقرار میں سر ہلادیا۔

"پرکاش کے لئے کب سے کام کررہے ہو؟"

"دو برس سے۔" راجیشور دیال نے جواب دیا۔

"تمہاری دی ہوئی رپورٹیں پرکاش تک کس طرح پہنچتی ہیں؟"

"براہِ راست۔"

ٹریزی کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ "پچھلے دنوں جس ملک سے تمہاری حکومت نے یورینیم خریدنے کا معاہدہ کیا اس معاہدے کے کاغذات تم نے پرکاش کو کب دیئے تھے؟"

"ڈیڑھ ماہ قبل۔"

"اصل معاہدے کی فائل تو ہرگز نہ دی ہوگی!"

"اس بار ہی حماقت ہوئی تھی۔" دیال نے کہا۔ "ورنہ طریقۂ کار یہ تھا کہ میں موقع ملتے ہی اوریجنل کاغذات فائل سے نکال کر پرکاش کو مطلع کردیتا تھا۔ اسی رات میں اور پرکاش موہن پیلیس کے خفیہ تہہ خانے میں اصل کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ تیار کرتے تھے۔ اور بعد میں اصل کاغذات دوبارہ سرکاری فائل میں پہنچ جاتے تھے۔"

"گڈ۔" ٹریزی ہنس کر بولی۔ "لیکن پچھلے تین ماہ سے پرکاش نے خاموشی اختیار کررکھی ہے۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہ یورینیم والے خفیہ معاہدے کی فروخت کے لئے کسی دوسرے ملک کے ایجنٹ سے بات کررہا ہے۔"

"بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"پرکاش تمہیں اس کام کا کتنا معاوضہ دیتا تھا؟"

"ہر بار معاوضہ کی رقم کام کی نوعیت اور کاغذات کی اہمیت کو سامنے رکھ کر طے ہوتی تھی۔"

ٹریزی چند سیکنڈ تک کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ "شاید تمہیں علم نہیں کہ پرکاش گزشتہ کئی برس سے ہمارے لئے کام کررہا تھا مگر اب تنظیم سے اس کی غداری ثابت ہوچکی ہے اس لئے تم براہِ راست ہمارے لئے کام کروگے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" راجیشور دیال نے کہا۔

ٹریزی نے سوکھے جسم والے کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔ "کارلوس مسٹر دیال کی بندشیں کھول دو۔"

دوسرے ہی لمحہ کارلوس، راجیشور دیال کی رسیاں کھولنے لگا۔ بندشیں کھلنے کے بعد راجیشور دیال نے کھڑے ہوکر ایک انگڑائی لی اور بولا۔ "آج کے بعد مجھے کس شخص کو اطلاعات دینی ہوں گی؟"

"دو چار دن میں کارلوس تمہیں ہمارے مقامی ایجنٹ سے ملادے گا۔" ٹریزی کارلوس کی طرف اشارہ کرکے بولی۔ "مگر خیال رہے کہ تمہاری اطلاعات اس ملک کے اہم ترین خارجی امور سے متعلق ہونا ضروری ہیں۔"

"آپ مطمئن رہیں۔" دیال پہلی بار مسکرایا۔ "اتنی عقل تو میں بھی رکھتا ہوں کہ آپ کے لئے کس قسم کے راز اہمیت رکھتے ہیں۔"

"سمجھدار آدمی ہو۔" ٹریزی مسکراتے ہوئے بولی۔ "ویسے کیا تم بتا سکتے ہو کہ مزین پیلس کے خفیہ تہہ خانے کا راستہ کون سے کمرے سے ہے۔"

"بالکل نہیں۔" راجیشور دیال نے کہا۔

"کیوں۔"؟ ٹریزی کی تیوریوں میں بل پڑ گئے۔ اور کاروس ایک دم تن کر کھڑا ہو گیا۔

"شاید آپ نہیں جانتیں کہ پرکاش بیحد چالاک شخص ہے وہ مجھے تہہ خانے میں لے جانے سے پہلے ہمیشہ میری آنکھوں پر پٹی لگا کر پٹی باندھ دیتا تھا۔"

"وہ تمہیں تہہ خانے میں لے کر ہی کیوں جاتا تھا۔"؟

"اس کی دو وجہ تھیں۔" راجیشور دیال بولا۔ "پہلی وجہ تو یہ کہ وہ کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ یا مائیکرو فلم بنانے کے فن سے ناواقف تھا دوسرے میرا اس کا معاہدہ تھا کہ میں اصل کاغذات ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے سپرد نہیں کروں گا۔"

"ہوں۔" ٹریزی کسی گہری فکر میں ڈوب گئی۔ کچھ لمحہ بعد وہ سر اٹھا کر بولی۔ "کم از کم تم اتنا تو بتا سکتے ہو کہ آنکھوں پر پٹی بندھنے کے بعد کتنی دیر میں تہہ خانے تک پہنچ جاتے تھے۔"؟

"لگ بھگ تین منٹ کے بعد۔"

"پٹی باندھنے کا کام کس کمرے میں ہوتا تھا۔"؟

"پرکاش کی خواب گاہ میں۔"

"او کے، اب تم جا سکتے ہو۔ تمہاری گاڑی باہر کھڑی ہے لیکن خیال رہے کہ اگر کسی کو ہمارے تمہارے درمیان ہوئے نئے معاہدے کی بھنک بھی مل گئی تو زندگی سے تمہارا رشتہ ختم ہونے میں دیر نہ لگے گی۔"

راجیشور دیال نے اقرار میں سر ہلایا اور کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ٹریزی کاروس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "جاؤ اسے بھی لے آؤ اور جی ون سے کہنا کہ دروازے کے قریب ہی موجود رہے۔"

کاروس نے سر کو خم کیا اور اتنی تیزی سے دروازے کی ط... ف ھا جیسے ہوا میں تیر رہا ہو۔ دو منٹ بعد ہی وہ پرکاش کو دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

کاش کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور جسم پر لباس ... کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا جگہ جگہ سے سوجا ہوا چہرہ اور ننگے سینے پر چوٹ کے گہرے نیل اس بات کی علامت تھے کہ یہاں لانے سے قبل اسے کافی زدوکوب کیا گیا ہے۔ پرکاش کی لڑکھڑاتی چال اور آنکھوں سے جھانکتا کرب بتا رہا تھا کہ وہ شدید قسم کی ذہنی اور جسمانی اذیت میں مبتلا رہا ہے۔

"شادی مبارک ہو مسٹر پرکاش۔" ٹریزی نے اسے دیکھ کر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

پرکاش نے ٹریزی کو نفرت بھری نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "میں نہیں سمجھ سکتا کہ مجھے اس طرح پکڑ کر لانے اور مار پیٹ کرنے کا مقصد کیا ہے۔"

"تمہاری اطلاع کے لئے بتا دوں کہ ایم فور کو تمہارے ملک سے واپس بلا لیا گیا ہے اور میرا کوڈ ٹی ون ہے۔" ٹریزی سنجیدہ لہجے میں بولی۔ "امید ہے کہ تمہیں تنظیم کے بڑوں کی جانب سے دو ماہ قبل ہی میرے چارج سنبھالنے کی اطلاع مل چکی ہوگی۔"

پرکاش نے چونک کر ٹریزی کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ ٹریزی دو قدم آگے بڑھ کر بولی۔ "پچھلے تین ماہ سے تم نے اپنی کارگزاریوں کے بارے میں ہائی کمان کو رپورٹ نہیں دی۔ آخر کیوں؟"

"پرکاش چند سیکنڈ خاموش رہ کر دھیمی آواز میں بولا۔ "سابقہ چیف ایم فور کی چند حماقتوں کے سبب یہاں کی انٹیلی جنس کو مجھ پر شک ہو گیا ہے۔ اور ان دنوں میں نے اپنی تمام ایکٹیویٹیز بند کر دی ہیں۔"

"جھوٹ۔" ٹریزی چیخ کر بولی اور اس کے داہنے کی دو انگلیاں پرکاش کی بائیں کوکھ میں گڑ گئیں۔ دوسرے ہی لمحہ پرکاش کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکلی اور وہ فرش پر گر کر اس طرح تڑپنے لگا جیسے کسی مچھلی کو پانی سے نکال کر اچانک تپتی ہوئی ریت پر ڈال دیا گیا ہو۔

"اسے اٹھا کر کرسی سے باندھ دو۔" ٹریزی نے کاروس کو حکم دیا۔

دو منٹ کے اندر کاروس نے اسے فرش سے اٹھا کر کرسی میں جکڑ دیا۔ پرکاش کے ہونٹوں سے اب بھی گھٹی گھٹی کراہیں نکل رہی تھیں اور اس کے چہرے پر پھیلے شدید کرب کے تاثرات کو کاروس بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

ٹریزی نے پرکاش کے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ وہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑتی ہوئی کسی ناگن کی طرح پھنکاری۔ "نیشنل اٹامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کے لئے کیے۔ یورنیم کے معاہدے کی فائل کہاں ہے۔"؟
پرکاش نے کوئی جواب دینے کے بجائے نظریں جھکا لیں
ٹریزی نے دوبارہ سخت لہجے میں پوچھا۔

"پائیلٹ راجن نے اپینیج کی جو گڑیا تمہارے سپرد کی تھی وہ کہاں گئی۔"؟

"مجھے راجن نے کوئی گڑیا نہیں دی اور اپنی رپورٹ کے ساتھ تمام کاغذات میں نے راجن کی معرفت ایم فور کو بھیج دیئے تھے۔"

ٹریزی کے لبوں پر عجیب مسکراہٹ ابھر آئی۔ "کل تم اپنے وکیل کے پاس کیوں گئے تھے۔"؟

"میں نے اپنی تمام جائیداد بینک بیلنس اور فیکٹری رتنا کے نام کر دی ہے۔"

"رتنا کون، وہی تمہاری نئی بیوی۔"؟

"ہاں۔"

"سچے عاشق معلوم ہوتے ہو۔" ٹریزی طنز بھرے لہجے میں بولی۔

"جانتے ہو رتنا کون ہے۔"؟

"میں اس کے سوا کچھ نہیں جاننا چاہتا کہ وہ اب میری بیوی ہے۔"

"شائد تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے مذہبی قانون کے مطابق اگر کسی عورت کا پہلا شوہر زندہ ہو تو وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی۔" ٹریزی کا لہجہ بہت تیکھا تھا۔

"یہ غلط ہے۔" پرکاش ہذیانی انداز میں چلایا۔

"یہ سچ ہے۔ اور تمہیں یہ جان کر دکھ ہوگا کہ پائیلٹ راجن اس کا پہلا شوہر ہے۔" ٹریزی ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہتی رہی۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ چھ سات برس پہلے جب راجن کا پلین تباہ ہوا تو وہ شادی شدہ تھا۔ تم یہ بھی جانتے ہو، صرف راجن وہ واحد شخص تھا جو اس حادثے میں بچ گیا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ سرکاری طور پر جب اسے مردہ تسلیم کر لیا گیا تب بھی وہ تنظیم کے وفادار کی حیثیت سے اس ملک میں تمہارے ساتھ کام کرتا رہا۔ پھر سات، آٹھ ماہ پہلے تم نے اپنے کرائے کے آدمیوں کی مدد سے راجن کے فلیٹ میں آگ لگوا دی۔ اس رات راجن اپنی اکلوتی بیٹی سے ملنے کے لئے روپ نگر گیا ہوا تھا اور اس کے فلیٹ میں راجن کا دوست شیری تھا۔ دوسرے دن شیری کی جلی ہوئی لاش دیکھ کر تم مطمئن ہو گئے۔ تنظیم کو اسی روز سے تم پر شک ہو گیا تھا۔ ادھر تم نے ایم فور کو الٹی سیدھی اطلاعات دے کر غلط راہ پر ڈال دیا۔ لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ جس کیبرے ڈانسر پر مر مٹے وہ راجن کی بیوی ہے۔"

"میں ہرگز یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ رتنا راجن کی بیوی ہے یا اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔"

"اس نے تمہیں دھوکا نہیں دیا۔" ٹریزی بولی۔ "وہ خود نہیں جانتی کہ راجن زندہ ہے۔ ہاں اس نے تمہیں اپنی پہلی شادی والی بات سے ضرور بے خبر رکھا۔"

پرکاش کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر بری طرح ٹوٹ چکا ہے۔ پھر بھی اس نے بڑے حوصلے سے کہا۔

"اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ رتنا راجن کی بیوی ہے۔"

ٹریزی نے دروازے کی سمت دیکھ کر اونچی آواز میں کہا۔ "راجن اندر آ جاؤ۔"

اسی وقت دروازہ کھول کر ایک کسرتی جسم والا شخص اندر داخل ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اس کے داہنی طرف کا چہرہ بری طرح جھلسا ہوا نہ ہوتا تو اسے ایک قبول صورت شخص کہا جا سکتا تھا۔ بائیں طرف سے دیکھنے والوں کے لئے اب بھی اس کے چہرے میں کافی کشش تھی۔ پرکاش راجن کو اپنے سامنے دیکھ کر بری طرح چونکا۔ راجن کے چہرے پر بے حد زہریلی مسکراہٹ تھی اور وہ کینہ توز نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

"پرکاش تمہاری اور رتنا کی شادی کا ثبوت دیکھنا چاہتا ہے۔" ٹریزی نے ہنس کر کہا۔

راجن نے اپنی جیکٹ کی جیب سے پوسٹ کارڈ سائز کی چند تصاویر نکال کر پرکاش کے منہ پر مارتے ہوئے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ "دیکھو یہ اس وقت کی تصاویر ہیں جب اناتھ آشرم میں اس کی اور میری شادی ہوئی۔ اس کے علاوہ رجسٹرار آفس سے ملا ہوا شادی کا سرٹیفکٹ بھی ہے میرے پاس۔"

پرکاش نے اپنی گود اور پیروں کے پاس فرش پر بکھری تصویروں کو دیکھتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سر جھکا لیا۔ ٹریزی نے راجن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"پرکاش کا کہنا ہے کہ اس نے کاغذات اور اپینیج کی گڑیا تمہاری معرفت ایم فور کو بھیج دی تھی۔"

"جھوٹ بکتا ہے حرام زادہ۔" راجن نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ "مادام اس کمینے کی نیت بدل گئی ہے۔"

"اب تم کیا کہتے ہو؟" ٹریزی نے پرکاش سے پوچھا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" پرکاش نے مختصر جواب دیا۔

ٹریزی چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہی۔ پھر بولی "دیکھو پرکاش اگر تم اسٹینج کی گڑیا اور کاغذات واپس کردو تو تمہاری تمام غلطیاں نظر انداز کی جاسکتی ہیں۔"

"میڈم ٹریزی۔" پرکاش نے گردن اُٹھا کر کہا۔ "اب اگر تم مجھے قتل بھی کردو تو میری زبان نہیں کھلے گی۔ بس اب اپنے وطن سے مزید غدّاری نہیں کرسکتا۔" اس بار اس کے لہجے میں غضب کی خوداعتمادی تھی۔

"ویلڈن لوائے۔" ٹریزی کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ آگئی۔ پھر وہ کارلوس کی طرف دیکھ کر بولی "کارلوس ڈیئر، تنظیم کے غدّار اور اپنے ملک کے اس عظیم وفادار کو شاباشی دو۔"

دفعتاً کمرے میں کارلوس کے چاقو کھولنے کی کرکراہٹ سنائی دی۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے پرکاش کا بایاں کان پکڑا اور چاقو کی معمولی سی جنبش کے ساتھ اسے ایک جھٹکے سے الگ کردیا۔ پرکاش کے ہونٹوں سے کرب انگیز چیخ نکلی اور کنپٹی سے بہتا گاڑھا خون اس کے شانے پر بہنے لگا۔

"دوسرا کان۔" ٹریزی سرد لہجے میں بولی۔ پھر ٹریزی کا جملہ ختم ہونے ہونے کارلوس نے پرکاش کا دوسرا کان بھی صاف کردیا۔ لیکن اس بار پرکاش کے ہونٹوں سے معمولی سی آواز بھی نہیں نکلی۔ وہ دانت پر دانت جمائے ٹریزی کو گھور رہا تھا۔ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں اور آنکھیں ساکت ہوگئی تھیں۔

"اگر اس کی زبان نہیں کھلے تو اس کے جسم کا ایک ایک ریشہ الگ کردو۔" ٹریزی بڑے بے رحم انداز میں چیخ کر بولی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ پاگل ہوگئی ہو۔

کارلوس نے اپنی آنکھیں سکوڑ کر پرکاش کو گھورا۔ اس کے نیلے نیلے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ تھی۔ اور سفید نوکیلے دانت کسی درندے کی طرح نیچے کے ہونٹ کو کچل رہے تھے۔

پھر ایسا لگا جیسے کارلوس پر دیوانگی کا دورہ پڑا ہو۔ چند لمحوں میں ہی پرکاش کے سینے کا گوشت چھوٹے بڑے پارچوں کی شکل میں فرش پر پڑا تھا۔ اور کئی جگہ سے چھاتی کی ہڈیاں نظر آرہی تھیں لیکن پرکاش تو جیسے پتھر ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہونٹ بھینچ لیے تھے اور آنکھوں میں قبرستان جیسی ویرانی تھی۔

کارلوس اس کے بازو میں چاقو اُتارتے ہوئے ہذیانی انداز میں غرّایا۔ "چیخو حرامزادے چیخو۔"

پرکاش ٹریزی حقارت سے مسکرایا اور اس نے کارلوس کے منہ پر تھوک دیا۔ اچانک کارلوس نے غصّے میں اپنا چاقو دستے تک پرکاش کے سینے میں اُتار دیا۔ پرکاش نے آخری بار ایک ہچکی لی اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی لیکن کارلوس تو سچ مچ پاگل ہوگیا تھا۔ وہ لگاتار پرکاش کے مردہ جسم پر وار کررہا تھا۔

"ٹھہرو۔" دفعتاً ٹریزی چیخی۔ اور مشینی انداز میں چلتا کارلوس کا چاقو والا ہاتھ رُک گیا۔

"تم واقعی گدھے ہو۔" وہ کارلوس کو ناگوار انداز میں دیکھتے ہوئے بولی "آخر اُسے قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

کارلوس کی آنکھوں میں ٹریزی کے بدلے ہوئے لہجے کی وجہ سے حیرت کے آثار نظر آئے۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا، "اس نے میری بے عزّتی کی تھی مادام، میرے منہ پر تھوکا تھا۔"

"بیوقوف، وہ تمہیں غصّہ دلا کر اپنے انجام کو پہنچنا چاہتا تھا۔" ٹریزی جھلّا کر بولی "اور تنظیم کے مفاد کے لیے تم جیسے حقیر کیڑے کی عزّت کیا معنی رکھتی ہے؟"

کارلوس کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ وہ بدقت اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "شاید مادام بھول گئیں کہ میرا نام کارلوس ہے۔ وہ کارلوس جو اِس جیسے سمیت ایک سو بیالیس آدمیوں کو قتل کرچکا ہے۔"

ٹریزی نے کارلوس کی اکڑی ہوئی گردن اور جسم کے تناؤ کو حیرت سے دیکھا "کیا تم نافرمانی پر آمادہ ہو؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ شیطانی انداز میں مسکرایا۔ "لیکن مجھ سے گفتگو کرتے وقت مادام یہ نہ بھولیں کہ وہ ایرٹ کارلوس سے مخاطب ہیں۔"

"تم۔" ٹریزی دانت پیستے ہوئے بولی "ذلیل کتّے، مت بھولو کہ میں اس مشن کی چیف ہوں اور میری ہتک تنظیم کی ہتک ہے۔"

"اگر تنظیم کی نظر میں اس کے وفاداروں کی حیثیت کسی حقیر کیڑے سے بھی بدتر ہے تو میں تنظیم سے اسی وقت دستبردار ہوتا ہوں۔"

اسی لمحہ راجن کو ریوالور نکالتے دیکھ کر ٹریزی اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتی ہوئی بولی "تم کچھ نہیں کروگے راجن، میں خود اس دوغلے سور کو ٹریزی داکوملا سے بات کرنے کا سلیقہ سکھاؤں گی۔"

راجن نے کچھ سوچ کر ریوالور جیب میں ڈال لیا۔ اور کارلوس ٹریزی کو چڑانے والے انداز میں بولا "ٹریزی واکوما، پوں۔ یہ کیسی کُتیا کا نام بھی ہو سکتا ہے۔"

اچانک راجن کو ایسا لگا جیسے ٹریزی ہوا میں اُڑتی ہوئی کارلوس پر جا پڑی ہو، لیکن کارلوس بھی غافل نہ تھا۔ اس نے بڑی پھُرتی سے زمین پر گر کر لوٹ لگائی اور ٹریزی کو دونوں پیروں پر روکتے ہوئے دوسری طرف اُچھال دیا۔ پھر وہ دونوں ایک ساتھ اسپرنگ لگے کھلونوں کی طرح اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کینہ توز نظروں سے ایک دوسرے کو گھُور رہے تھے۔

پھر کمرے میں کئی بار چیٹ چیٹ کی آوازیں گونجیں۔

کارلوس ٹریزی کے ہر وار کو خالی دے رہا تھا۔ چند منٹ بعد ہی ٹریزی کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا مقابل پوری طرح مارشل آرٹ سے واقف ہے۔ دفعتاً کارلوس نے ٹریزی کی بائیں پسلی پر ضرب لگائی وہ ایک کراہ کے ساتھ دوہری ہو گئی۔ کارلوس نے لپک کر اس کا ہاتھ موڑتے ہوئے دوسرا ہاتھ اس کی کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ لمحہ بہ لمحہ ٹریزی کی کمر کے گرد اس کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔

ٹریزی نے اپنے داہنے پیر کی ایڑی کارلوس کے گھٹنے پر ماری۔ اور دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے فرش پر آ رہے لیکن ٹریزی کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی طاقتور آکٹوپس کے شکنجے میں پھنس گئی ہو۔ کارلوس کی ہڈیاں اس کے بدن میں گھُسی جا رہی تھیں۔ اس نے سوچا کہ اگر کارلوس کی ٹانگیں اسی طرح چند منٹ اور اس کی گردن سے لپٹی رہیں تو اس کی سانس رُک جائے گی۔ دم گھٹنے کی ناقابلِ برداشت تکلیف کے سبب بار بار وہ اپنے سر کو پٹک رہی تھی۔ اُدھر کارلوس نے اس کی کمر اور کولہوں کے جوڑ پر اپنے انگوٹھے کا دباؤ ڈالا تو ٹریزی کو ایسا لگا جیسے اس کا پورا بدن کسی برقی جھٹکے سے جھنجھنا اٹھا ہو۔ کارلوس کی ہڈیاں کسی بجلی دار فولادی جال کے مانند دھیرے دھیرے اس کے نرم گوشت میں پیوست ہوتی جا رہی تھیں۔

دفعتاً وہ اپنے پورے جسم کی قوت کو مجتمع کر کے تڑپی۔ چند سیکنڈ کے لئے کارلوس کی گرفت اس کے جسم پر کم ہوئی تھی۔ عین اسی لمحہ اپنے آپ کو کمان کی طرح دوہرا کرتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ کارلوس کی ٹانگوں کے درمیان پھنسا کر کھینچ لیا اور وہ لڑکھڑا کر دوسری طرف الٹ گیا۔ ٹریزی نے موقع ملتے ہی سب سے پہلے اپنے داہنے ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی سے کارلوس کے نازک مقامات پر ضرب لگاتے ہوئے بائیں ہاتھ کی تین انگلیوں کو ۔۔ کر اس کی آنکھوں میں مار دیں۔ کمرے میں کارلوس کی بھیانک چیخ کے ساتھ اس کے حلق اور ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ ٹریزی کھڑے ہو کر اپنے جسم کو سمیٹتے ہوئے چھ سات فٹ اُوپر کی طرف اُچھلی۔ پھر جب اس کے دونوں پیر ایک ساتھ کارلوس کی چھاتی پر پڑے تو اس کی پسلیاں چیخ کر پھیپھڑوں میں دھنس گئیں اور فرش پر دُور تک خون کے چھینٹے پھیل گئے۔

راجن جو اس خونی منظر کا واحد تماشائی تھا کارلوس کی آخری اور دل دہلا دینے والی چیخ کے ساتھ کانپ کر رہ گیا۔ ٹریزی کارلوس کے خون میں نہائی اس طرح جھُوم رہی تھی جیسے ایک ساتھ کئی بوتلیں چڑھا گئی ہو۔

ڈاگا نے زاہد کو ابھی چند منٹ پہلے فون کیا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی سیاہ فام عورت چھ سات برس کی چھوٹی سی لڑکی کے ساتھ موہن پیلس میں داخل ہوئی ہے ادھر جاوید کی اطلاع کے مطابق گزشتہ ۲۶ گھنٹوں میں ڈاگا کے فلیٹ کے آس پاس کوئی ایسی مشتبہ شخصیت نہیں پائی گئی تھی جس پر شک کیا جا سکتا۔ اس دوران سیما ایک منٹ کے لئے بھی فلیٹ سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اس کے باوجود اس نے جاوید کو ہدایت کی تھی کہ وہ بدستور ڈاگا کے فلیٹ کی نگرانی کرتا رہے۔

جاوید سے بات کرنے کے بعد وہ لباس تبدیل کر کے نکلنے ہی والا تھا کہ تیسری بار فون کا بزر گنگنا اُٹھا۔ ریسیور اُٹھا کر کان سے لگاتے ہی اس نے دوسری طرف سے بولنے والے جنرل کیو کی آواز پہچان لی۔

"یس سر، میں زاہد بول رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"تمہارے لئے دو اہم اطلاعات ہیں۔"

"آپ پرکاش دوبے کے قتل اور راجیشور دیال والے حادثے کے بارے میں تو نہیں کہہ رہے؟"

"ہاں۔" جنرل کیو نے دوسری طرف سے کہا "شاید تم نے کل کے اخبار میں یہ دونوں خبریں دیکھ لی ہوں گی۔"

"جی ہاں۔" زاہد بولا۔

"میں نے ایس پی ڈی سوزا کو اس سلسلہ میں فون بھی کیا تھا۔"

"کوئی خاص بات پتہ چلی۔"

"صرف اتنا کہ پرکاش دوبے کی لاش پرسوں رات کیلاش نگر کے ایک کچرا گھر سے برآمد ہوئی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اسے کسی تیز دھار والے ہتھیار سے ہلاک کیا گیا ہے۔ اور راجیشور دیال جب دو دن بعد اپنی کوٹھی پر پہنچا تو

پورچ میں گاڑی پارک کرتے وقت اس کی کار ایک دھماکے سے اُڑ گئی۔ پولیس کی تحقیقات کے مطابق راجیشور دیال کی گاڑی کے انجن میں کسی دشمن نے طاقتور قسم کا ٹائم بم رکھ دیا تھا۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ راجیشور دیال آج صبح نیشنل ہاسپٹل میں کوئی بیان دیئے بغیر مر گیا۔" دوسری جانب سے کہا گیا۔

"جی نہیں۔" زاہد بولا۔ "ویسے بھی راجیشور دیال کوئی بیان دیتا تو اس کی اہمیت نہیں تھی۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"سامنے کی بات ہے جناب، وہ شخص مجرموں کے ہاتھوں بِکا ہوا تھا۔"

"کل صبح دس بجے پرکاش دوبے کی لاش اس کی بیوی رتنا کے حوالے کر دی گئی ہے۔" جنرل کیو بولا۔

"کیا تم ابھی تک رتنا سے نہیں ملے؟"

"میں آپ کا فون آنے سے قبل اسی طرف جا رہا تھا۔" زاہد بولا۔

"ویسے میرے آدمی نے کچھ دیر پہلے اطلاع دی تھی کہ چند سادہ لباس والے رتنا کی نگرانی کر رہے ہیں۔"

"ممکن ہے سول پولیس یا سی آئی ڈی والے اس پر شک کر رہے ہوں۔"

"لیکن یہ بات ہمارے حق میں نہیں جاتی۔" زاہد نے فوراً کہا۔ پھر ایک لمحہ خاموش رہ کر وہ دوبارہ بولا۔

"پرکاش دوبے اور راجیشور دیال کو مجرموں نے صرف اس لئے ختم کر دیا کہ وہ ہماری نظر میں آ چکے تھے۔ اب اگر انہیں یہ علم ہو گیا کہ رتنا کی نگرانی ہو رہی ہے تو اس کی بھی خیر نہیں ہے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"کسی بھی طرح موہن پیلس سے اُن سادہ لباس والوں کو ہٹوا دیں جو رتنا کی نگرانی پر معمور ہیں۔"

زاہد چند سیکنڈ تک ریسیور کان سے لگائے رہا مگر جب دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو ریسیور رکھ کر باہر نکل آیا۔ دو منٹ بعد ہی اس کی گاڑی موہن پیلس کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔

• • •

پرکاش کی آخری رسوم کے بعد رتنا پچھلے بائیس گھنٹے سے اپنے کمرے میں بند تھی۔ اس دوران مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ آخر شام ہوتے ہوتے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب تک کے تمام حالات سے پولیس کو مطلع کر دے گی۔

ٹھیک پانچ بجے وہ لباس تبدیل کر کے باہر نکلی تو ملازم نے اطلاع دی کہ ڈرائنگ روم میں کوئی عورت ایک چھوٹی سی لڑکی کے ہمراہ اس کی منتظر ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے چھوٹی سی لڑکی کے حوالے پر اُلجھن میں پڑ گئی لیکن ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی اسے ایسا لگا جیسے وہ بھٹک کی

ہوگئی ہو،

سامنے والے صوفے پر ایک ادھیڑ عمر کی سیاہ فام عورت کے پاس بیٹھی ہوئی، سات برس کی خوبصورت لڑکی رتنا کو ایک ٹک گھور رہی تھی۔ رتنا کے ذہن میں وہ تصویر گھوم گئی جو سامنتا نے اسے ہوٹل کیپیسری کے میک اپ روم میں دکھائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اپنی کئی برس پہلے کی ننھی منی میگھنا کا معصوم چہرہ پھر گیا۔ وہ کسی سحر زدہ عورت کی طرح بڑبڑائی "میگھنا"

دوسرے ہی لمحہ وہ دیوانگی کے عالم میں دوڑتی ہوئی لڑکی کے پاس پہنچی اور اسے اپنی آغوش میں بھینچ کر بے تحاشہ چومنے لگی۔ لڑکی شاید اس اچانک افتاد کے لئے تیار نہ تھی اس نے کسمسا کر خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ادھیڑ عمر عورت کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"گھبراؤ مت بے بی" ادھیڑ عمر عورت بولی "یہ تمہاری ممی ہیں"

لڑکی نے حیرت سے رتنا کے چہرے کو دیکھا اور اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ادھیڑ عمر عورت کا جملہ سن کر رتنا جیسے ہوش میں آ گئی۔ اس نے سیاہ فام عورت کو گھورتے ہوئے پوچھا "کون ہو تم"؟

"سرسوتی" ادھیڑ عمر عورت مسکراتے ہوئے بولی۔

"اور یہ آپ کی بیٹی میگھنا ہے"

"یہ تمہیں کہاں ملی"؟

عورت نے کچھ کہنے کے بجائے اس کی طرف ایک لفافہ بڑھا دیا۔ رتنا نے بڑی بے صبری سے لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر پڑھنے لگی۔ ہلکے آسمانی رنگ کے کاغذ پر بے حد ستھری تحریر میں لکھا تھا۔

"رتنا ڈارلنگ!

تمہاری امانت میگھنا کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ تم نہیں جانتیں میگھنا کو بحفاظت تم تک پہنچانے کے لئے مجھے کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس شخص نے میگھنا کو اغواء کیا تھا وہ قانون کی نظروں میں ایک خطرناک مجرم تھا۔ اپنی تمام زندگی کی کمائی اسے سونپ کر میں نے میگھنا کو حاصل کیا تھا۔ میں نے کئی بار چاہا کہ تم سے ملوں۔ مگر ہوائی حادثے کے بعد میرا چہرہ اس قابل نہ رہا تھا کہ میں تمہارا سامنا کر سکتا۔ دوسری طرف اگر میں خود کو، بحیثیت راجن ظاہر بھی کر دیتا تو میرے لاکھ صفائی کرنے پر قانون مجھے نہیں چھوڑتا۔ پچھلے دنوں میں نے بہت ہمت کر کے تم سے ملنے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ تم پرکاش دوبے نام کے ایک دولت مند شخص کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کر چکی ہو۔ میں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ میں جن حالات میں جی رہا ہوں ان حالات میں تمہیں پریشانیوں کے سوا دے بھی کیا سکتا تھا۔ اسی دوران مجھے معلوم ہوا کہ میگھنا کو اغواء کرنے والا سامنتا تمہارے چکر میں پڑ گیا ہے۔

رتنا میں نے تمہیں کوئی سکھ نہیں دیا لیکن سامنتا کو تمہارے راستے سے ہٹا کر میں نے سوچا تھا کہ اب تم ایک پرسکون زندگی گزار سکو گی۔ لیکن افسوس میں نے کل ہی اخبار میں پرکاش دوبے کے قتل کی خبر پڑھی۔ خیر بھگوان کو جو منظور تھا وہ ہوا۔ سنا ہے تم اب ایک کروڑپتی بیوہ ہو۔ مجھے کبھی کبھی ہنسی آ جاتی ہے کہ اپنے پہلے شوہر یعنی میرے ہوتے ہوئے تم بیوہ ہو۔ بہرحال مجھے تمہاری دولت سے کچھ نہیں لینا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے سائے میں میگھنا کی زندگی سنور جائے۔ سرسوتی نے میگھنا کو چار سال اپنی بیٹی کی طرح پالا ہے اس عرصے میں مجھ سے جو کچھ بن پڑا میں نے اس عورت کو میگھنا کی پرورش کے لئے دیا۔ اب اگر ہو سکے تو اس عورت کا خیال رکھنا۔ یہ تمہاری میگھنا کی آیا ہے۔ ہاں ایک بات اور میری خواہش ہے کہ تمہارا شہر چھوڑنے سے پہلے آخری بار تمہیں قریب سے دیکھوں۔ کیا میری یہ خواہش پوری کرو گی۔

میں کل رات ایک بجے تمہارے بیڈروم کے دروازے پر تین بار دستک دوں گا اگر تم نے دروازہ کھول دیا تو میں سمجھوں گا کہ تم نے میری التجا قبول کر لی۔ ورنہ میں واپس چلا جاؤں گا۔"

بدنصیب۔ راجن

بولی۔

''اور یہ آپ کی بیٹی میگھنا ہے۔''

''یہ تمہیں کہاں ملی؟''

عورت نے کچھ کہنے کے بجائے اس کی طرف ایک لفافہ بڑھادیا۔ رتنا نے بڑی بے صبری سے لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر پڑھنے لگی۔ ہلکے آسمانی رنگ کے کاغذ پر بے حد ستھری تحریر میں لکھا تھا۔

''رتنا ڈارلنگ!

تمہاری امانت میگھنا کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ تم نہیں جانتیں میگھنا کو بحفاظت تم تک پہنچانے کے لیے مجھے کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس شخص نے میگھنا کو اغوا کیا تھا وہ قانون کی نظروں میں ایک خطرناک مجرم تھا۔ اپنی تمام زندگی کی کمائی اسے سونپ کر میں نے میگھنا کو حاصل کیا تھا میں نے کئی بار چاہا کہ تم سے ملوں۔ مگر ہوائی حادثے کے بعد میرا چہرہ اس قابل نہ رہا تھا کہ میں تمہارا سامنا کرسکتا۔ دوسری طرف اگر میں خود کو، بحیثیت راجن ظاہر بھی کردیتا تو میرے لاکھ صفائی کرنے پر قانون مجھے نہیں چھوڑتا۔ پچھلے دنوں میں نے بہت ہمت کر کے تم سے ملنے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ تم پرکاش دوبے نام کے ایک دولت مند شخص کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کرچکی ہو۔ میں نے یہ سوچ کر صبر کرلیا کہ میں جن حالات میں جی رہا ہوں ان حالات میں تمہیں پریشانیوں کے سوا دے بھی کیا سکتا تھا۔ اسی دوران مجھے معلوم ہوا کہ میگھنا کو اغوا کرنے والا سانتا تمہارے چکر میں پڑ گیا ہے۔''

رتنا میں نے تمہیں کوئی سکھ نہیں دیا لیکن سانتا کو تمہارے راستے سے ہٹا کر میں نے سوچا تھا کہ اب تم ایک پرسکون زندگی گزار سکوگی۔ لیکن افسوس میں نے کل ہی اخبار میں پرکاش دوبے کے قتل کی خبر پڑھی۔ خیر بھگوان کو جو منظور تھا وہ ہوا۔ سنا ہے تم اب ایک کروڑ پتی بیوہ ہو، مجھے کبھی کبھی ہنسی آجاتی ہے کہ اپنے پہلے شوہر یعنی میرے ہوتے ہوئے تم بیوہ ہو۔ بہر حال مجھے تمہاری دولت سے کچھ نہیں لینا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے سائے میں میگھنا کی زندگی سنور جائے۔ سرسوتی نے میگھنا کو چار سال اپنی بیٹی کی طرح پالا ہے اس عرصے میں مجھ سے جو کچھ بن پڑا میں نے اس عورت کو میگھنا کی پرورش کے لیے دیا اب اگر ہو سکے تو اس عورت کا خیال رکھنا۔ یہ تمہاری میگھنا کی آیا ہے۔ ہاں ایک بات اور میری خواہش ہے کہ تمہارا شہر چھوڑنے سے پہلے آخری بار تمہیں قریب سے دیکھوں۔ کیا میری یہ خواہش پوری کروگی۔

میں کل رات ایک بجے تمہارے بیڈ روم کے دروازے پر تین بار دستک دوں گا اگر تم نے دروازہ کھول دیا تو میں سمجھوں گا کہ تم نے میری التجا قبول کرلی۔ ورنہ میں واپس چلا جاؤں گا۔''

بدنصیب۔ راجن

رتنا نے خط پڑھ کر سرسوتی کی طرف دیکھا۔

''کیا تم میگھنا کے ساتھ یہیں رہنا پسند کروگی۔''

''جیسے آپ کی اچھا'' سرسوتی سر جھکا کر بولی۔

''یوں بھی اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔''

رتنا نے میگھنا کو ایک بار پھر اپنے گلے سے لگا کر پیار کیا۔ پھر کچھ دیر تک سرسوتی سے اس کے بارے میں باتیں کرنے کے بعد ایک ملازم کو بلا کر کہا۔

''دیکھو ویر سنگھ یہ سرسوتی بہن ہیں انہیں اوپر والے کمرے میں لے جاؤ۔ آج سے یہ اپنی بے بی کے ساتھ یہیں رہیں گی۔''

ویر سنگھ نے کچھ کہے بغیر سر ہلایا اور سرسوتی میگھنا کا ہاتھ تھام کر نوکر کے ساتھ اوپر جانے والے زینوں کی طرف بڑھ گئی۔

سرسوتی کے جاتے ہی رتنا ایک بار پھر کسی گہری فکر میں غرق ہوگئی۔ اچانک ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلنے کی آہٹ پر وہ چونکی۔ ایک تندرست اور خوب صورت شخص کوٹھی کے دوسرے ملازم کے ہمراہ اندر داخل ہو رہا تھا۔

آنے والا شخص بہترین قسم کے سرمئی سوٹ اور ہلکے زرد رنگ کی ٹائی میں بے حد پروقار لگ رہا تھا۔ رتنا کو دیکھتے ہی وہ بڑے سلیقے سے تھوڑا خم ہوتے

ہوئے پرسکون لہجے میں بولا۔

''وقت لیے بغیر اس طرح اچانک آنے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔'' پھر اس نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا۔ ''شاید آپ ہی مسز رتنا ہیں۔''

''تشریف رکھیے۔'' رتنا اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میں ہی رتنا ہوں۔''

نووارد نے ایک طویل سانس لی اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر رتنا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں کرنل زاہد ہوں۔''

رتنا نے زاہد کے ہاتھ سے کارڈ لیتے لیتے اسے چونک کر دیکھا۔ پھر چند سیکنڈ تک کارڈ کو دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔

''کہیئے۔ میں کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

''دیکھیے مسز رتنا۔'' زاہد دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں یہاں مسٹر پرکاش کے قتل سے متعلق چند ضروری باتیں معلوم کرنے آیا ہوں۔ اور آپ جانتی ہیں کہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی ایسے کمرے میں چل کر بات کریں جہاں کسی تیسرے شخص کی آمد کا احتمال نہ ہو۔''

''آیئے۔'' رتنا بولی۔

پھر کچھ دیر بعد زاہد اس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ رتنا نے زاہد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''پرکاش کے سلسلے میں پولیس والے میرا بیان لے چکے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کچھ معلوم کرنا چاہتے ہوں وہ بھی پوچھ لیجیے ویسے میں......''

''ایک منٹ۔'' زاہد نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تو آپ یہ سمجھ لیجیے کہ میں جو کچھ معلوم کروں گا اس سے میرا مقصد آپ کو دکھ پہنچانا یا آپ پر شک کرنا نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں آپ کے مسٹر پرکاش کے اور مسٹر راجن کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ خصوصاً کچھ ایسی باتیں ہیں جو آپ کے علم میں نہیں۔ میری درخواست ہے کہ آپ مجھے اپنا ہمدرد سمجھ کر ہر بات کا صحیح جواب دیں۔''

''جب آپ سب کچھ جانتے ہیں تو مجھ سے کیا پوچھیں گے۔'' رتنا الجھے ہوئے انداز میں بولی۔

''آپ سے چند باتوں کی تصدیق کرنی ہے اور کچھ نئی باتیں معلوم کرنی ہیں۔''

''پوچھیئے۔'' رتنا نے کہا۔

''میرے خیال میں آپ اس بات سے انکار نہیں کریں گی کہ مسٹر پرکاش سے پہلے آپ راجن نام کے ایک پائلٹ کی بیوی تھیں۔''

''یہ سچ ہے کہ میری شادی پہلے راجن سے ہوئی تھی اور اس سے ایک لڑکی بھی تھی جسے راجن کی موت کے بعد اغواء کر لیا گیا تھا۔''

''کیا آپ اغواء کرنے والوں کو جانتی تھیں۔'' زاہد نے پوچھا۔

رتنا ایک لمحے کے لیے کچھ نروس سی دکھائی دی۔ پھر اس نے کہا۔

''پہلے نہیں جانتی تھی۔''

''پہلے سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''میرا مطلب ہے جب میگھنا غائب ہوئی تو میرے علم میں نہ تھا کہ اسے اٹھانے والا کون ہے؟ آپ جانتی ہیں وہ کون تھا؟''

''جی ہاں۔'' رتنا نے جواب دیا۔ ''اسے جنگل کشور یا سانتنا نام کے ایک شخص نے غائب کیا تھا۔''

زاہد کے ہونٹوں پر عجیب سی پراسرار مسکراہٹ دوڑ گئی اس نے رتنا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ وہی سانتنا تو نہیں، جو آپ کو کسی خفیہ تہہ خانے کا راستہ معلوم کرنے کے سلسلے میں بلیک میل کر رہا تھا اور چند روز پہلے کلیر روڈ کی ہامینشن کے فلیٹ میں قتل کر دیا گیا۔''

رتنا نے چونک کر زاہد کو دیکھا اور کانپتی آواز میں بولی ''یہ سچ ہے۔''

''مسز رتنا۔'' زاہد بولا۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ اس کی ڈائری میں آپ کا نام، پتا اور آپ کے بارے میں کچھ ایسی تفصیلات درج تھیں کہ اگر وہ ڈائری پولیس تک پہنچ جائے تو آپ حراست میں لی جا سکتی ہیں۔''

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

بہت روشن سویرا ہے

سمیرا رؤف

کبھی دریا کا پانی بھی واپس آیا ہے پانی تو بس آگے بہتا ہے۔ پانی کب الٹا چلتا ہے۔
وہ دوشیزہ جو دل کی بستی کے اک کوچے میں اپنی محبت وارنے آئی تھی یہ خیال اس کے لیے کسی سوچ کا محور بن گیا۔

گھر کی دہلیز پر کھڑی ایک کنواری کا قصہ، ضبط کے جبر نے اسے آلودہ ہونے سے بچالیا تھا

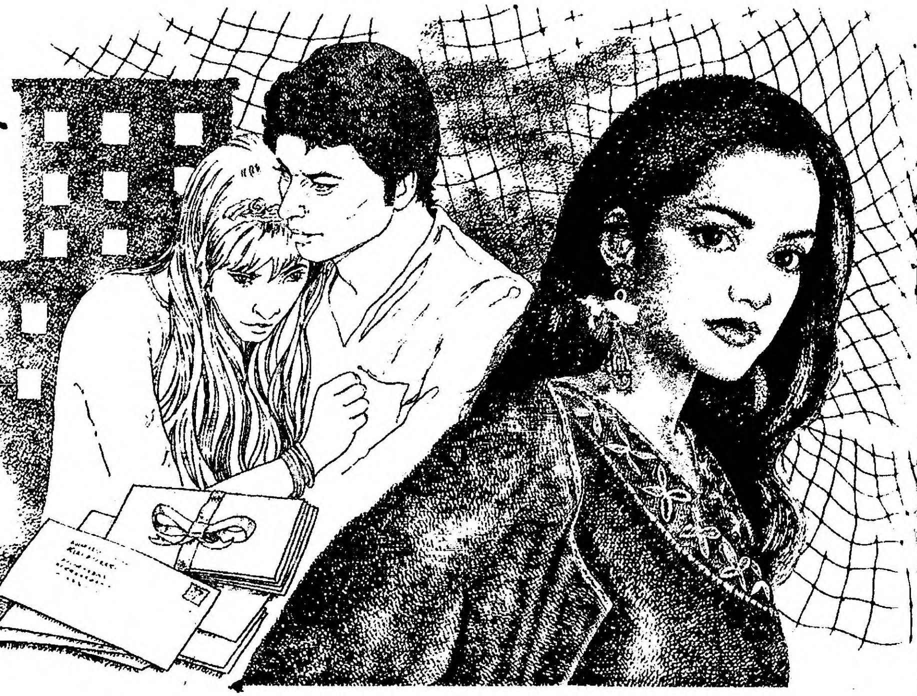
اپنے کمرے سے گیٹ تک کا فاصلہ مجھے چند قدموں اور ایک گھنٹے میں طے کرنا تھا لیکن یہ چند قدم اور ایک گھنٹہ میری زندگی کا سب سے اہم اور سب سے تکلیف دہ سفر تھا۔ ایک گھنٹے بعد میرے کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والے پیپل کے درخت تلے شیراز کو اپنی بائیک پر آکر کھڑے ہونا تھا اور تین مرتبہ ایک بائیک کی ہیڈ لائٹ جلا بجھا کر مجھے نیچے آنے کا اشارہ دینا تھا اور اب میرے لیے اس تک پہنچنا محض چند قدموں اور ایک گھنٹے کی بات تھی۔

امی اور ابو اپنے کمرے میں آرام سے سوئے ہوئے تھے۔ امی نے آج بہت مصروف دن گزارا تھا۔ اس لیے تھک ہار کر اب وہ بہت گہری نیند سو رہی تھیں۔ اور ابو کی عادت تھی گہری نیند سونے کی۔ کوئی سیر پر کھڑا ہو کر ڈھول بھی بجائے ابو کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ اب بھی ان کے خراٹوں کی آواز میرے کمرے تک آرہی تھی۔ بھائی کے کمرے کی لائٹ رات ساڑھے بارہ بجے بند ہوئی تھی ان کی بھی عادت تھی کہ تکیے پر سر رکھتے ہی سو جاتے تھے یعنی ہر طرف سے لائن کلیئر تھی۔

شیراز سے میری ملاقات بھی بہت دلچسپ انداز میں ہوئی تھی۔ شاید کسی اور کو اس میں کوئی دلچسپی نظر نہ آئے لیکن میرے لیے اس پہلی ملاقات میں بہت کشش تھی اور وہ میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھا۔

شیراز رخسانہ کا بھائی تھا اور رخسانہ میری کلاس فیلو تھی۔ گو کہ کالج میں ہم پہلے سے لے کر تیسرے سال تک اکٹھے ہی تھے لیکن اس سے میری دوستی کی شدت میں اضافہ تھرڈ ایئر میں آکر ہی ہوا تھا۔ اس سے قبل ایف ایس سی میں تو کورس سے ہٹ کر بات کرنے کا بھی خیال نہیں آیا تھا۔ پھر تبھی تمام تر محنت کے باوجود جب مجھے اور رخسانہ کو میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ملا اور ہم تھرڈ ایئر میں اکٹھے ہوئے تو میڈیکل کالجوں، ایجوکیشن سسٹم اور نہ جانے کس کس کو مل کر گالیاں دیتے ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ اور تب ہی ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا شروع ہوا۔

ایک عرصے تک میں نے شیراز کا صرف نام سن رکھا تھا۔ کبھی رخسانہ کے گھر جاتی تو پتا چلتا کہ آج سب دوستوں کا کمبائن اسٹڈی کا پروگرام ہے۔ کبھی



پتا چلتا کہ وہ آج دیر تک اسپتال میں رہے گا اور کبھی معلوم ہوتا کہ ہے تو اپنے کمرے میں لیکن پڑھائی میں مصروف ہے۔

"تمہارا بھائی تو مجھے کتابوں کا کیڑا لگنے لگا ہے۔" ایک دن میں اس کے گھر گئی تو کہنے سے نہ رہ سکی۔

"ارے نہیں وہ تو بہت زندہ دل ہے اور زندگی کو خوب انجوائے کرنے کے قائل ہے لیکن اس نے ہر کام کا ایک وقت مقرر کیا ہوا ہے۔ پڑھائی کے وقت پڑھائی اور سوشل لائف کے وقت سوشل لائف اور اس اصول پر وہ بہت سختی سے عمل کرتا ہے۔"

"پھر تو مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے تمہارے بھائی پر۔ دیکھو کتنا اچھا ہو رہا ہے موسم۔" میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔

کتنی ہی بارش ہو چکی تھی پھر بھی آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یوں تو مون سون میں بہت حبس ہو جاتا ہے لیکن اس دن خلاف معمول درختوں کے دھلے دھلائے پتے آہستہ روی سے لیکن مسلسل حرکت میں تھے۔

"چلو باہر لان میں ککلی ڈالتے ہیں۔" رخسانہ کو اچانک خیال آیا۔ اسے ہمیشہ اچانک ہی بہت دلچسپ کام سوجھ جاتے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں لان میں ہم دونوں ککلی ڈال رہے تھے۔

"ککلی کلیر دی، پگ میرے ویر دی
دوپٹا میرے بھائی دا، فٹے منہ جوائی دا"

ہم خوب زور شور سے گا رہے تھے۔ پھر تھوڑی

ہی دیر میں ہم دونوں بے دم ہو گئے۔
"ویسے ایک بات ہے رخی۔" میں گیلی گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "بھائی کا دوپٹا کیسے ہو سکتا ہے؟"
"ہاں سوچنے والی بات ہے۔" وہ میرے برابر میں بیٹھ گئی۔ "بھائی کا سہرا ہوتو کوئی بات بھی تھی۔"
"خیر ہمیں کیا۔ وہ دوپٹا یا سہرا باندھے جمہوری دور ہے۔"
"میرے خیال میں یہ وہ دوپٹا ہے جس کے تلے بھائی کو مہندی کے لیے لاتے ہیں۔" رخی نے خیال ظاہر کیا۔
"ہوگا۔"
"کیا خیال ہے پارو، آنکھ مچولی نہ کھیلیں؟" رخسانہ کو پھر خیال سوجھا۔
"دو بندے کیا آنکھ مچولی کھیلیں گے۔"
"تو میں سب بچوں کو جمع کر لیتی ہوں۔"
"کن بچوں کو......؟"
"بھئی اردگرد بچے بھرے پڑے ہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی صرف اشتہاروں میں ہے۔"
تھوڑی دیر میں لان میں ڈھیر سارے بچے بھرے ہوئے تھے۔ کھیل شروع ہوا۔ رخسانہ نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور پھر مجھے گھما کر تالی بجادی۔ ہر طرف تالیاں بج رہی تھی۔ قہقہے لگ رہے تھے اور میں کبھی ستون کو پکڑتی اور کبھی درخت سے لپٹ جاتی۔
"افوہ! کیا مصیبت ہے۔ مجھ سے نہیں پکڑا جاتا۔" میرے ہاتھ آنکھوں پر بندھی پٹی کی طرف بڑھے۔
"پٹی نہیں اتارنی......" رخسانہ چلائی۔ "تم نے ٹاس ہارا تھا۔"
"میں ایک مرتبہ پھر آواز کی سمت لپکی اور بالآخر ایک بازو کو سختی سے تھام لیا۔
"پکڑ لیا ناں میں نے آخر۔" میں بھی چلائی اور جلدی سے پٹی کھول دی۔
کتنی دیر سے سیاہ پٹی میں جکڑی ہوئی آنکھوں نے جب روشنی کا سامنا کیا تو میری آنکھیں ایک بار پھر خود ہی بند ہو گئیں۔ میرے اردگرد قہقہے بکھر رہے تھے اور ان میں سب سے نمایاں قہقہہ رخسانہ کا تھا۔ میری آنکھیں جب کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی، جسے میں نے پکڑ رکھا تھا وہ نہ تو رخسانہ تھی نہ کھیل میں حصہ لینے والا کوئی بچہ۔ وہ بہت وجیہہ نوجوان تھا جو شرارت آمیز انداز میں میری جانب دیکھ رہا تھا میں نے جلدی سے اس کا بازو چھوڑ دیا۔
"کبھی پیر کریوں بھی چھوڑتے ہیں۔" وہ شرارت سے ہنسا۔ "اور وہ بھی میرے جیسا ہینڈسم نوجوان کہ جسے پکڑنا اتنا آسان نہیں ہے۔"
"جی؟" میں نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔
"میں اتنی مشکل اردو تو نہیں بولتا۔"
"مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ مجھے تنگ کر کے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اس لیے میں بھی برابر کی چوٹ دینے کے لیے میدان میں اتر آئی۔
"لگتا ہے بہت خوش فہمی ہے اپنے بارے میں آپ کو۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔
"خوش فہمی تو خود بخود ہو جائے گی جب کوئی لڑکی میرا بازو پکڑنے کے بعد اتنی خوشی سے پکڑ لیا کا شور مچائے گی۔
"گویا آپ کی خوش فہمی کی بنیاد پر میری غلط فہمی پر ہے۔ میں تین مرتبہ سرو کے درخت کو بھی پکڑ کے یہی بات کہہ چکی ہوں۔"
"تین مرتبہ سرو اور چوتھی مرتبہ سرو قد، بالآخر آپ صحیح جگہ پہنچ ہی گئیں۔"
رخسانہ ہنستے ہوئے ان کے درمیان آ گئی۔
"غلط فہمی تھی یا خوش فہمی۔ اب جنگ بند کرو۔" پھر وہ بچوں سے مخاطب ہوئی۔ "چلو بچوں کھیل ختم ہو گیا۔ اب بھاگ جاؤ یہاں سے۔"
"یہ شیراز ہے۔" بچوں کے جانے کے بعد رخسانہ نے تعارف کروایا۔ "اور رازی یہ میری بہت

اچھی سہیلی پارہ ہے۔"
بس تعارف کی دیر تھی اور ہم دونوں یوں بے تکلف ہوگئے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ گیلی گیلی گھاس پر بیٹھ کر ہم نے دنیا جہان کی باتیں کرڈالیں۔ رازی بہت دلچسپ شخص ثابت ہوا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی پڑھائی کا کیڑا اتنی دلچسپ باتیں بھی کرسکتا ہے۔
رازی کی شخصیت بہت مقناطیسی تھی۔ وہ اپنی وجاہت اور ذہانت سے ہر محفل میں فوراً ہی نمایاں ہوجاتا تھا۔ یہ اس کی شخصیت کا ہی کمال تھا کہ میں روز بروز اس کی جانب کھنچی جارہی تھی۔ رخسانہ کا اور میرا ایک دوسرے کے گھر بہت آنا جانا تھا۔ جب میں اس کے گھر جاتی تو رازی اپنی پڑھائی چھوڑ کر ہمارے پاس آجاتا اور اس کے بعد ہم کتنی دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ پکوڑے اور چپس کھاتے اور ان ڈور گیمز کھیلتے۔
ایسے ہی ایک دن جب ہم کیرم کھیل رہے تھے اور رازی نے ایک ہی بازی میں آدھے سے زیادہ بورڈ کا صفایا کردیا تھا۔ رخسانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"میں اور پکوڑے لے آؤں۔ میرے آنے تک باری نہیں کرنی۔"
"آلو والے لانا۔" میں نے پیچھے سے آواز لگائی۔ "پیاز والے نہ لانا۔"
"تم آلو پیاز چھوڑ کر ذرا میری طرف متوجہ ہوسکتی ہو؟" شیراز نے اسٹرئیکر بورڈ پر رکھ دیا۔
"ہوگئی متوجہ کہو کیا کہنا ہے۔"
"مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔" اس نے بہت اطمینان سے کہا۔
"کیا؟" میں حیرت سے چلائی۔
"شی۔" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔
"کیا؟" اب کے میں نے بہت آہستگی سے کہا۔
"تمہیں سنائی نہیں دیتا کیا؟ اظہار محبت سے پہلے مجھے تمہیں کسی اچھے سے ای این ٹی (E.N.T) اسپیشلسٹ کو دکھانا پڑے گا۔"
"سنائی تو دے رہا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آرہا۔ کیا تم واقعی وہی کہہ رہے ہو جو میں سن رہی ہوں؟"
"اگر تمہارے کان ٹھیک ہیں تو سو فیصد وہی کہہ رہا ہوں جو تم سن رہی ہو۔"
"کیا تم یہ بات بقائمی ہوش وحواس کہہ رہے ہو؟"
"ہاں، یہ حماقت مجھ سے بقائمی ہوش وحواس ہی سرزد ہورہی ہے۔"
"بعد میں مکر و گے تو نہیں؟"
"ارادہ تو نہیں ہے۔ Let's Hope So"
"سچی، رازی میں بھی یہی محسوس کررہی ہوں۔"
"کیا......؟"
"کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔"
"یہ حادثہ تمہارے ساتھ کب سرزد ہوا تھا؟"
"جس دن میں نے تمہیں پکڑ لیا تھا۔" میں بولی۔ "اور تم سے یہ حماقت کب سرزد ہوئی؟"
"جب کِکلی کلیر دی گاتے ہوئے کِکلی ڈال رہی تھیں۔"
"لیکن تب تو تم پڑھ رہے تھے۔ تم نے مجھے کہاں دیکھا تھا۔" میں نے جرح شروع کی۔
"میں اس وقت پڑھ رہا تھا جب یہ بے ہنگم شور میرے کانوں میں پڑا تھا۔ سخت غصے میں جب میں تم لوگوں کو ڈانٹنے کے لیے اٹھا تو تم کِکلی ڈال رہی تھیں۔ اس موسم میں تمہارا آتشی گلابی سوٹ اور کھلے ہوئے بال، ایسا غضب ڈھا رہے تھے کہ میں تو دیکھتا ہی رہ گیا۔"
"اس دن میں نے آتشی گلابی کپڑے پہنے ہوئے تھے؟" میں نے ذہن پر زور دیا۔
"تم بھول سکتی ہو لیکن میں نہیں بھول سکتا۔" وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔
"تو پھر اظہار میں اتنی دیر کیوں لگائی؟" میں

نے شکایتی لہجے میں کہا۔
"میں نے سوچا تھا کہ جب تک مجھے یقین نہیں ہو جاتا کہ یہ کوئی وقتی جذبہ نہیں ہے تب تک میں اظہار نہیں کروں گا۔ میں ساتھ نباہنے کا قائل ہوں وقت گزاری کا نہیں۔"
"اور اب یقین آ گیا کہ یہ وقتی جذبہ نہیں ہے۔"
"ہاں اب پورا یقین آ گیا ہے۔" وہ مسکرایا۔ "اور جب تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی تھی تو تم نے اب تک مجھے کیوں نہیں بتایا تھا؟"
"میں کیسے کہہ سکتی تھی۔" میں ہنسی۔ "اچھی لڑکیاں ایسا نہیں کرتیں۔"
"چلو ابھی اتنی دیر تو نہیں ہوئی۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔
اچانک دروازے کی جانب سے رخسانہ کے کھنکار کی آواز آئی۔ میں جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بالوں میں پھیرنے لگی۔ شیراز بھی ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا۔
"یہ آ گئے پکوڑے آلو والے۔" گو کہ رخسانہ نے ہمیں دیکھ لیا تھا لیکن اس نے یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔
"تھینک یو۔" میں نے خاصا اٹکتا ہوا کانپتا ہوا شکریہ ادا کیا۔
"چلو رازی، وہیں سے کھیل شروع کرو۔" اس نے پلیٹ قالین پر رکھ کر کہا۔
لیکن اس کے بعد کھیل بورڈ پر کم اور ہماری آنکھوں کے درمیان زیادہ ہوا۔ رخسانہ نے یہ سب کچھ محسوس کیا لیکن جان بوجھ کر انجان بنی رہی۔
گھر آ کر میں کتنی دیر سوچتی رہی۔ رخسانہ کے رویے نے مجھے شش و پنج میں مبتلا کر دیا تھا۔ معلوم نہیں اسے یہ بات اچھی لگی تھی یا بری۔ وہ خوشی کا اظہار کرتی یا غصے سے پھٹ پڑتی۔ میرا ذہن دونوں صورت حال کو آسانی سے قبول کر لیتا۔ لیکن اس کا یہ رویہ جس میں لاتعلقی، بے نیازی اور غیر جانبداری تھی، اس نے مجھے عجیب مخمصے میں ڈالا ہوا تھا۔
اور پھر شیراز کا لمس تھا جو بہت انوکھا اور سنسنی خیز تھا، اس کی باتیں تھیں۔ وہ بے حد وجیہہ شخص مجھ سے محبت کرنے لگا تھا۔ کتنا خوش گوار احساس تھا کہ جسے میں چاہتی تھی، دل ہی دل میں جس کے متعلق سوچتی تھی وہ بھی مجھے چاہتا تھا۔ اس نے بھی میری محبت ایک عرصے سے اپنے دل میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ بھی میرے متعلق سوچتا تھا۔
"ٹرن ٹرن" ٹیلی فون کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی مجھے سوچ کے دائرے سے باہر کھینچ لائی۔
"ہیلو۔" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔
"رازی بول رہا ہوں پارو۔"
"رازی۔" میں نے زیر لب کہا اور اپنے اردگرد کا جائزہ لیا لیکن کوئی بھی میری جانب متوجہ نہیں تھا۔
"ہاں کیسی ہو؟"
"ٹھیک ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔
"کیا کر رہی تھیں......؟"
"تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی......" میں نے کہا۔ "اور یہ بھی کہ......"
"کہ کیا......؟"
"کہ رخی کا رویہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ اس نے کوئی ردعمل نہیں دیا کچھ تو کہا ہوتا۔ میں بہت الجھن میں ہوں۔"
وہ زور سے ہنس پڑا۔
"میں نے تمہیں یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ وہ بہت سخت قسم کی جرح کر کے نکلی ہے ابھی کمرے سے۔"
"کیسی جرح؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔
"مجھ سے پوچھا جا رہا تھا کہ میں سچ مچ تم سے محبت کرتا ہوں؟ اگر کرتا ہوں تو کہیں تمہیں درمیان میں تو نہیں چھوڑ جاؤں گا وغیرہ۔"
"پھر کیا کہا تم نے؟"

”میں نے کہا کہ پارو کو چھوڑنے کا سوال ہی نہیں ہے مجھے اسے بھگانا پڑا تو یہ بھی کر گزروں گا۔“

”کچھ خدا کا خوف کرو۔“ میں نے جھرجھری لی۔ میرے لیے یہ بات ناقابل قبول اور ناممکن سی تھی۔

لیکن آج ناممکن، ممکن میں بدل رہا تھا۔ آج رات، ڈھائی بجے میں شیراز کے ساتھ اس کے بھروسے پر یہ گھر چھوڑ رہی تھی میں نے گھڑی کی سمت دیکھا۔ فاصلہ ہولے ہولے سمٹ رہا تھا چند قدم اور فقط پینتالیس منٹ۔

میں وقت گزاری کے لیے اپنے تاریک کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوگئی۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے کچھ کچے مکان نما جھونپڑے تھے۔ یہاں رہنے والے مرد مزدوری کرتے تھے یا پھر چارپائیوں پر پڑ کر سگریٹ کے کش لگاتے رہتے تھے۔ اور یہاں کی عورتیں محلے کے گھروں میں کام کرتی تھیں۔ یہ چند گھر میرے اوپر کی منزل پر واقع کمرے سے بالکل واضح طور پر دکھائی دیتے تھے۔ نہ صرف دکھائی دیتے تھے بلکہ وہاں کی جانب امی کی سرگوشی تک صاف سنائی دیتی تھی۔ کبھی ہماری کام والی کو تاخیر ہوجاتی تو امی میرے کمرے کی کھڑکی سے آواز دے کر بلا لیتیں۔

کھڑکی سے دور تک نظر آتے کچے پکے سب گھروں میں تاریکی اور نیند کا خمار تھا۔ فقط دو گھروں میں چہل پہل تھی۔ ہماری جمعدارنی جسے ہم ماسی کہتے تھے اور گھر کے دیگر کام کاج کرنے والی چھیماں، ان دونوں کے گھروں میں رت جگا تھا۔

ماسی بان کی چارپائی پر پڑی کھانس رہی تھی اور اس کی بیٹی رانی پریشانی کے عالم میں بے کواڑ کے کمرے کے اندر باہر ہورہی تھی۔ کبھی ماں کے پاس اندر جاتی اور کبھی باہر صحن میں نکل آتی۔ کمرے میں ماسی کے سر کے عین اوپر زرد روشنی پھیلاتا ایک بلب لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے کمرے کے اندر تک کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”رانی!“ ماسی نے آواز دی۔

اور رانی جو صحن میں کھڑی ہوئی تھی جلدی سے اندر کی جانب لپکی۔

”کیا ہوا اماں؟“

”بار بار حلق خشک ہورہا ہے، ذرا پانی تو پلانا۔“

رانی نے گھڑے سے پانی نکال کر ماسی کو تھمادیا۔

”میری تو پسلیاں بھی دکھ گئی ہیں کھانستے کھانستے۔“ اس نے پانی پی کر خالی گلاس رانی کی طرف بڑھادیا۔

”اماں، اب سونے کی کوشش کرو۔“

”کوشش تو کررہی ہوں مگر کمبخت نیند بالکل ہی آنکھوں سے غائب ہے۔“ تمہارے ابا کی فکر لگی ہوئی ہے، نیند کہاں آئے گی۔“

”ابا کی فکر کی ضرورت نہیں۔ وکیل صاحب نے کہا تو ہے کہ ان کا کوئی قصور نہیں کل تک وہ ابا کو لے آئیں گے۔“

”کوئی قصور بھی تو نہیں تھا ان کا خواہ مخواہ دھرلیا پولیس والوں نے۔ جھگڑا تھا کسی اور کا اور پولیس پکڑ کر لے گئی راہگیروں کو۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں اماں کہ کل تک ابا گھر واپس آجائے گا۔ ابا کا قصور ہوتا تو پولیس چھوڑتی بھلا۔ انہیں بند کرکے کیا کرنا ہے پولیس کو۔ تم بس سونے کی کوشش کرو۔“

ماں کو تسلی دے کر وہ صحن میں نکل آئی۔ بیرونی دروازے کی کنڈی کھول کر باہر جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے بند کرکے کنڈی لگالی اور واپس آگئی۔

”کیا اسے بھی کسی کا انتظار ہے؟“ میں نے سوچا۔

وہ مضطرب انداز میں پہلے کی طرح کمرے اور صحن کے درمیان ٹہلنے لگی۔

رانی کی طرف سے میری توجہ چھیماں کے

رونے کی آواز نے ہٹائی۔ اس کا دو مہینے کا بیٹا بیمار تھا۔ آج صبح ہی اس نے امی سے ذکر کیا تھا اور اسی۔لیے تھوڑی ہی دیر میں واپس چلی گئی تھی۔

''میرا منا میرا سب کچھ ہے۔'' وہ رو رہی تھی۔

''اسے کچھ ہو گیا تو منے کے ابا تم مجھ مری کا منہ دیکھو گے۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو۔'' اس کا میاں تڑپ کر بولا۔ ''اسے کچھ ہوگا نہ تمہیں۔''

''تو یہاں کیوں بیٹھے ہو، دوا دارو کیوں نہیں کرتے؟''

''گیا تو تھا تمہارے سامنے ہی لیکن اتنی رات کو ڈاکٹر مل ہی نہیں رہا۔ کوئی مل جائے تو یہاں آنے پر تیار نہیں ہوتا۔''

''تو میں ساتھ چلتی ہوں تمہارے، کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی خدا ترس ڈاکٹر مل ہی جائے گا۔''

''میرے پاس صرف بیس روپے ہیں۔'' چھیماں کے میاں نے جیسے اعتراف جرم کیا۔

''ہائے یہ غریبی۔'' چھیماں کی آواز بلند ہوگئی۔ ''میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو میں ان سب محل نما کوٹھیوں کو آگ لگا دوں گی۔ سب کو ختم کر دوں گی۔'' وہ دیوانہ وار اپنے بیٹے کو چومنے لگی۔ پھر سر اٹھا کر بولی۔ ''چلو منے کے ابا۔ باہر نکلیں گے تو شاید کچھ سبب بن جائے۔ گھر میں تو ساری رات روتے پیٹتے ہی گزر جائے گی۔''

اس نے بیٹے کو گود میں اٹھایا اور چپل پہن کر اپنے میاں کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئی۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ماں باپ کی محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ امی بتایا کرتی تھیں کہ بچپن میں ایک مرتبہ آدھی رات کو میرے کان میں شدید درد ہو گیا۔ پہلے تو امی نے چند گھریلو نسخے آزمائے، لیکن جب میرے رونے کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا تو امی ابو ٹیکسی پکڑ کر پورے شہر میں ڈاکٹر کی تلاش میں مارا ماری کرتے رہے۔ ابو کو مجھ سے اتنی محبت تھی کہ جب میرا رونا کسی طرح نہ تھما تو وہ بھی رونے لگے۔

اور پھر ایک مرتبہ میں نے اسکول کے ڈرامے میں حصہ لیا۔ ڈرامے کے آخر میں مجھے مرجانا تھا۔ میں اپنے کمرے ریہرسل کر رہی تھی۔ ڈائیلاگ بولتے ہوئے جب میں پٹ سے نیچے گری تو اتفاق سے اسی وقت کمرے کے باہر سے امی گزر رہی تھیں۔ مجھے گرتے دیکھ کر بھاگی بھاگی کمرے میں آئیں۔

''پارو! کیا ہوا ہے؟'' انہوں نے پریشان کن انداز میں پوچھا۔

''کچھ امی کو تنگ کرنے کی خاطر اور کچھ اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا امتحان کے لیے میں نے اپنے حلق سے چند بے معنی قسم کی آوازیں نکالیں جیسے نزع کے عالم میں ہوں اور پھر سر کو ایک جانب گرا دیا۔''

''ہائے میری پارو کو کیا ہو گیا۔'' امی پچھاڑیں کھانے لگیں۔ سارا گھر جمع ہو گیا۔

اس گھبراہٹ اور پریشانی میں کسی کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ میری نبض دیکھ لے۔ بھائی نے جلدی سے کار باہر نکالی تاکہ مجھے اسپتال لے جایا جا سکے۔ جب میں نے دیکھا کہ اب سب کی پریشانی عروج پر پہنچ چکی ہے اور امی بے ہوش ہونے والی ہیں تو ڈرامہ ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''امی! میں پھر سے زندہ ہو سکتی ہوں۔ اگر آپ مجھے مزیدار سی کھیر کھلانے کا وعدہ کریں تو۔'' میں نے ایک آنکھ کھول کر کہا۔ میری چہکتی ہوئی آواز سن کر ایک لمحے کے لیے تو خاموشی چھا گئی اور پھر......

''میں سوچتے سوچتے ہنس پڑی۔

''امی نے ایک کالا بکرا منگوا کر میرے نام کا صدقہ دیا تھا اور بہت سختی سے یہ احکام بھی صادر کر دیے تھے کہ میں نے آئندہ ایسی بے ہودہ حرکت کی تو میری خیر نہیں۔ اور ڈرامہ! ایسے ڈرامے میں حصہ لینے کا تو سوال ہی نہیں تھا جس کے آخر میں مجھے مرنے کا سین ادا کرنا ہوگا۔

بعد میں بھی میں کبھی کبھار ہنستی تھی۔ ''اگر میں سچ مچ مر گئی ہوتی تو آپ اسی طرح روتیں اور جواب میں مجھے ڈھیروں جھڑکیاں سننا پڑتی تھیں۔

پھر پتا نہیں اب کیا ہوا تھا انہیں۔

جب سے ڈاکٹر اسد کا رشتہ آیا تھا امی ابو میری کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں تھے۔ میں نے کتنی مرتبہ ان سے بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پہلے تو ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا میری بات سننے کے لیے۔ صبح کالج جانے سے پہلے ابو کو پکڑا لیکن اس دن انہیں آفس سے دیر ہو رہی تھی۔ شام کو امی سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کچن میں پسینے سے تربتر پہلے ہی بیزار کھڑی تھیں۔

''کوئی وقت تو دیکھ لیا کرو پارو۔'' وہ پسینہ پونچھ کر پریشر ککر میں چمچ چلانے لگیں۔ ''اتنی گرمی میں کیوں سر پر سوار ہو گئی ہو۔''

''امی! مجھے بہت ضروری بات کرنا ہے۔''

''مجھے بھی بہت ضروری کھانا پکانا ہے آج ڈاکٹر اسد کے گھر والے ڈنر پر آرہے ہیں۔''

''لیکن امی مجھے نہیں کرنا شادی۔''

''اچھا اس وقت تو میرے سر سے اترو، بعد میں دیکھ لیں گے کہ شادی کرنا ہے یا نہیں۔''

''میں مایوس ہو کر بھائی کے پاس گئی۔ وہی امید کی آخری کرن تھے لیکن ان کے کمرے میں ان کے تین دوست بیٹھے ہوئے تھے۔

رات کو ڈاکٹر اسد کی امی ابو اور بہنیں آئیں لیکن میری ان سے بہت سرسری سی ملاقات ہوئی۔ اس چار پانچ منٹ کی ملاقات میں، میں نے بہت سرد مہری کا مظاہرہ کیا لیکن اسے انہوں نے میری شرم و حیا سمجھا۔ میں انہیں پسند آئی تھی۔ امی یہ خبر سنانے کے لیے میرے پاس آئیں۔

''اب جلد ہی تمہاری منگنی کر دیں گے۔''

''لیکن امی میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے...... شادی نہیں کرنا۔''

''الٹی سیدھی باتیں کرنے میں تو تمہارا جواب نہیں ہے پارو، مجھے تمہاری یہ حرکتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔''

''یہ آپ کو الٹی سیدھی بات لگتی ہے؟''

''کیوں نہیں کرنا تم کو شادی۔''

''مجھے آپ کا وہ ڈاکٹر اسد بالکل پسند نہیں۔''

''کیا ہے اسے، کیوں پسند نہیں ہے وہ؟ کیا اس کے سینگ ہیں یا ہاتھی جتنے لمبے کان ہیں۔'' امی نے غصے سے ڈپٹا۔ ''ہم نے انہیں ہاں کہہ دی ہے۔''

''مجھ سے پوچھے بغیر آپ کو یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا ناں۔''

''یعنی اب کوئی کام کرنے سے پہلے مجھے آپ سے اجازت لینا ہوگی۔''

''میں یہ تو نہیں کہہ رہی امی۔'' میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''لیکن میری اپنی شادی کے سلسلے میں آپ کو مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا ناں۔''

''مجھے معلوم ہے پارو کہ تمہارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔ اور میں تمہارے بارے میں جو بھی فیصلہ کروں گی تمہاری بہتری اور بھلائی سامنے رکھتے ہوئے ہی کروں گی۔''

''امی! اگر آپ کو میری بھلائی کا خیال ہے تو کیا مجھے خود اپنی بھلائی کا خیال نہیں ہوگا؟'' میں نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ ''میں بھی اپنے بارے میں سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کروں گی۔''

''کیا چاہتی ہو تم، میں انہیں انکار کر دوں۔ اپنی زبان سے پھر جاؤں۔ شریفوں کے گھروں میں ایسا نہیں ہوا کرتا۔'' امی کا انداز فیصلہ کن تھا۔

''ایسا نہیں ہوتا لیکن ایسا تو ہوتا ہے کہ بیٹیوں سے ان کی شادی کے سلسلے میں پوچھ لیا جائے۔'' میں چڑ گئی تھی۔ شیراز سے جدائی کا تصور ہی میرے لیے روح فرسا تھا۔

''تمہارے انکار کی کوئی ٹھوس وجہ بھی ہے یا یوں ہی نخرے کر رہی ہو بس۔''

''اب وقت آ گیا تھا کہ میں امی کو شیراز کے متعلق بتا دیتی۔

''جی۔'' میں ناخنوں سے نیل پالش کھرچنے لگی۔

''سیدھی بات کرو تمہارے، ''جی'' سے میں کیا

سمجھوں۔"

"امی، میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔"

امی کے لیے میرا یہ انکشاف کسی بم کے دھماکے سے کم نہیں تھا۔

"کیا؟ کیا کہہ رہی ہو؟" انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

"جی امی، میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔ اس لیے یہاں شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"تمہیں پتا ہے پارو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" وہ بے یقینی سے بولیں۔

"جی۔"

"کون ہے وہ؟" امی کے لہجے میں سختی تھی۔

"شیراز۔" میں نے مختصراً کہا۔

"کون شیراز؟ وہی رخسانہ کا بھائی؟"

"جی امی۔"

"گھر میں...... سب کے لیے یہ خبر بم دھماکا ثابت ہوئی تھی۔ امی اور ابو ایک دم شیراز کے خلاف ہوگئے تھے جو ان کی بھولی بھالی پارو سے ناٹک کررہا تھا۔ میں نے شیراز کی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا بھی کچھ فائدہ نہیں ہوا بلکہ اس پر آیا ہوا تمام غصہ بھی انہوں نے مجھ پر نکالا۔

دو دن تک میں اپنے کمرے میں بند روتی رہی۔ امی، ابو اور بھائی نے پوری کوشش کرلی کہ میں کچھ کھا پی لوں لیکن شیراز سے جدائی کا تصور کرتے ہی میری ساری بھوک پیاس اڑ چکی تھی۔ ان دونوں ایک بھائی ہی تھے جو مجھے سے پیار سے سمجھاتے لیکن امی ابو نے پیار سے لے کر ڈانٹ ڈپٹ تک ہر حربہ آزما ڈالا۔

"کیوں ڈانٹتے ہیں آپ لوگ اسے؟" بھائی کی دبی دبی سی آواز مجھے کمرے کے باہر سے سنائی دی تھی۔

"اس کے سر پر شیراز کا جو بھوت سوار ہے وہ ایسے نہیں اترے گا۔" امی کی غصے میں بھری آواز آئی۔

"امی! آپ لوگوں کا طریقہ کار غلط ہے۔ پہلے ہی ہم سے ایک غلطی ہوچکی ہے کہ ہم نے شادی کے سلسلے میں پارو سے پوچھا تک نہیں۔" بھائی نے کہا۔ "اس طرح وہ ضد پکڑ لے گی اور بات مزید بگڑے گی۔"

"تم اسے اور شہ مت دو میں تو اسے سمجھاتے سمجھاتے پاگل ہوگئی ہوں لیکن وہ تو کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کس زبان میں سمجھے گی۔ اب ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے کہ جلد از جلد اس کی منگنی اور پھر شادی کردی جائے۔"

"لو یہ الزام بھی میرے سر۔" میں نے غصے سے سوچا۔ "کسی نے میری بات سمجھنے کی تو کجا سننے کی بھی زحمت نہیں کی۔ شیراز کا نام میرے ہونٹوں پہ آتا ہی ہے کہ سب بپھر جاتے ہیں میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب میری بات کس زبان میں سنیں گے۔"

اور پھر اس دن تو حد ہی ہوگئی۔ شیراز کو خبر ہوئی تو اس نے اپنے امی ابو کو ساری بات بتا کر میرے لیے پروپوزل لے جانے پر آمادہ کیا۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا اس کی امی نے ہمارے گھر آنے کے لیے ٹائم سیٹ کرنے کی غرض سے فون کیا لیکن امی نے خاصی رکھائی اور سرد مہری سے انہیں گھر آنے سے منع کردیا۔

"اب آپ کو یقین آجانا چاہیے تھا کہ شیراز ناٹک نہیں کررہا بلکہ سنجیدہ ہے۔" میں آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

"اب تمہاری زبان پر اس لڑکے کا نام آیا تو میں تمہاری زبان کاٹ دوں گی۔ اور کان کھول کر سن لو۔ اس مہینے کی پہلی تاریخ کو تمہاری منگنی ہے اس سے۔" وہ غصے سے پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

اب اس کے علاوہ کیا چارۂ کار تھا کہ میں اور شیراز کورٹ میرج کرلیں۔ یہ پروگرام ہم نے رات دو بجے فون پر طے کیا تھا جب اٹھائیس کی رات کو شیراز نے کہا تھا۔ "یہ کنفرم ہے۔"

"ہاں۔" میں بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

اس طرح گھر کی دہلیز عبور کرنا میرے لیے

بہت تکلیف دہ تھا۔ امی ابو اور بھائی کو یوں چھوڑ کر جانا میرے دل کو کاٹ رہا تھا لیکن کیا کرتی، وہ تو میری کوئی بات سننے تک پر تیار نہیں تھے۔

اور آج اٹھائیس کی رات تھی شیراز کے آنے میں صرف پچیس منٹ باقی تھے اور گھڑی کی سوئی ہر سیکنڈ کے حساب سے آگے بڑھ رہی تھی۔

وقت گزاری کے لیے میں نے ماسی کے جھونپڑے نما کچے مکان کی طرف دیکھا۔ لگتا تھا کہ ماسی سو چکی ہے۔ رانی بہت احتیاط سے کمرے سے باہر نکلی اور صحن کے تاریک کونے کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ روشنی میں آئی تو اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی پوٹلی تھی۔ ابھی وہ دبے قدموں بیرونی دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی کہ ماسی کو ایک مرتبہ پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔

''رانی۔'' اندر سے ماسی کی آواز آئی۔

رانی نے پوٹلی وہیں دروازے کے قریب تاریکی میں رکھا اور اندر کمرے کی جانب بڑھی۔

''پانی'' ماسی کے حلق سے کراہ کی صورت میں نکلا۔

رانی نے گھڑے سے گلاس میں پانی نکال اور ماسی کو پلانے لگی۔

''اماں، اب سو جاؤ ناں۔''

''سونے کی کوشش تو کر رہی ہوں لیکن دل بہت بے چین ہے۔'' ماسی بولی۔ ''دعا کر آج رات خیریت سے گزر جائے۔''

''کیوں نہیں اماں، تم سو جاؤ گی تو پتا بھی نہیں چلے گا کہ کب رات شروع ہوئی اور کب ختم۔''

''ماسی نے رانی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر نیچے کیا اور پھر اسے ماتھے پر پیار کر کے بولی۔'' میری وجہ سے تجھے بھی آرام نہیں۔ آج رات تو نہ ہوتی تو مجھے پانی کون پلاتا۔ میں تو مر گئی ہوتی کب کی۔ اسی دن کے لیے لوگ اولاد کی دعا کرتے ہیں۔ رانی میں نے آج رات تجھے بہت تنگ کیا ہے لیکن کیا کروں مجھے لگ رہا ہے جیسے کوئی میرے کلیجے پر چھریاں چلا رہا ہو۔ بس آج رات خیریت سے گزر جائے۔''

''اماں! تم سونے کی کوشش کرو۔''

''اچانک سائیکل کی گھنٹی بجنے لگی۔

''ٹن ٹن، ٹن ٹن۔''

رات کے سناٹے میں یہ آواز بہت واضح تھی۔

میری نگاہ آواز کی سمت چلی گئی۔ لیمپ پوسٹ کے نیچے ایک نوجوان سائیکل لیے کھڑا تھا۔

''ہوں۔'' رانی کی بے چینی کا سبب اب میری سمجھ میں آیا تھا۔ وہ بھی اسی کشتی میں سوار ہونے جا رہی تھی جس کشتی میں مجھے سوار ہونا تھا۔

''اماں! آنکھیں بند کرو گی تو خود ہی نیند آ جائے گی۔'' رانی اسے ویسے ہی تھپکنے لگی جیسے کسی چھوٹے بچے کو تھپکا جاتا ہے۔ وہ ماں کو تھپک کر سلانے کی کوشش کرتی رہی اور لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑا نوجوان اس کا انتظار کرتا رہا۔

اسی وقت چھیماں اور اس کا میاں لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑے نوجوان کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنے پکے گھر میں داخل ہوئے۔

''شکر ہے مولا۔ میں ساری زندگی اس ڈاکٹر کو دعائیں دوں گی جس نے میرے منے کو نئی زندگی دی ہے۔'' وہ صحن میں رکھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ''دیکھو اب تاپ کچھ کم لگ رہا ہے۔''

''ہاں۔'' اس کے میاں نے بھی اس کا ماتھا چھو کر اقرار میں سر ہلایا۔ پھر وہ قدرے توقف سے بولا۔ ''چھیماں''

''کیا ہے؟''

''جب ہم بوڑھے ہو جائیں گے اور ہمارا منا جوان ہو جائے گا تب کیا وہ بھی ہمارے بیمار ہونے پر ایسے ہی راتیں جاگ کر گزارے گا؟ ہم سے ایسے ہی محبت کرے گا جیسے ہم اس سے کرتے ہیں۔''

چھیماں ہولے سے ہنس پڑی۔ ''منے کے ابا تم بھی کمال باتیں کرتے ہو۔ کبھی ندی کا پانی بھی واپس آیا ہے۔ پانی تو بس آگے بہتا ہے۔ جیسے ہم اس سے محبت کرتے ہیں ویسے یہ اپنے بیٹے سے کرے گا اور

اس کا بیٹا اپنے بیٹے سے۔ ماں باپ کا کام محبت دینا ہے وہ دیتے ہیں۔ اولاد کا کام محبت لینا ہے وہ لیتی ہے۔ منا بھی اپنے حصے کی محبت ہم سے لے کر اپنی اولاد میں بانٹے گا۔ ہم یوں ہی خالی رہ جائیں گے۔ کبھی پانی بھی الٹا چلا ہے۔''

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ اب ہر طرف سناٹا تھا لیکن یہ سناٹا کتنا متکلم تھا۔

''آج رات تو نہ ہوتی تو مجھے پانی کون پلاتا؟''

ماسی کی آواز سناٹے کو چیر رہی تھی۔

اسی دن کے لیے لوگ اولاد کی دعا کرتے ہیں۔''

چھیماں کی آواز بازگشت بن کر سناٹے سے ٹکرا رہی تھی۔

''ہم یوں ہی خالی رہ جائیں گے۔ کبھی پانی بھی الٹا چلا ہے۔''

ماسی کو کچھ آرام ہوا تو رانی ایک مرتبہ پھر دروازے کی طرف لپکی۔ دروازے کی کنڈی کھول کر وہ باہر نکلنا چاہتی تھی کہ ماسی نے آواز دی۔

''رانی......!''

رانی وہیں ٹھٹک گئی۔

''رانی کنڈی کس کے لیے کھولی ہے کیا ابا آیا ہے؟'' وہ چپکی کھڑی رہی۔

''رانی......'' ماسی چلائی۔ ''رانی......''

''رانی نے ایک نظر مڑ کر کمرے کے اندر لیٹی ہوئی ماں کو دیکھا اور پھر دروازے سے باہر نکل گئی۔

ماسی مسلسل رانی کو پکار رہی تھی لیکن رات کی تاریکی نے اس کی رانی کو نگل لیا تھا۔ رانی کو پکارتے ماسی کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

''پانی۔'' وہ کراہی۔ ''رانی کہاں چلی گئی۔ کوئی ہے؟ پانی۔''

''لیکن اس ایک کمرے کے کچے سے گھر میں اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ رانی کے چلے جانے سے وہ ایک دم کتنی تنہا ہو گئی تھی۔ اسے پانی پلانے والا بھی کوئی نہیں تھا اور وہ مسلسل کھانس رہی تھی۔

''ہم یوں ہی خالی رہ جائیں گے۔ کبھی پانی بھی الٹا چلا ہے۔'' چھیماں کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

ماسی کی کھانسی اور پانی پانی کی صدا سے میری توجہ اس وقت ہٹی جب شیراز کی بائیک سڑک پر مڑی۔ تھوڑی دیر میں اس کی بائیک پیپل کے درخت کے نیچے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ وہیں بائیک پر بیٹھا ہوا لیمپ پوسٹ میں لگے بلب سے نکلنے والی دھندلی روشنی میں کسی ہیولے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس نے تین مرتبہ ہیڈ لائٹ جلا بجھا کر مجھے نیچے آنے کا اشارہ دیا۔

میں نے ایک نظر کمرے کے در و دیوار پر ڈالی۔ میرا دل بھر آگیا۔ اس کمرے سے میری کتنی یادیں وابستہ تھیں۔ جہاں میں نے اپنے بچپن کے معصوم دن ہنستے روتے، شرارتیں کرتے گزارے تھے۔ میٹرک کے امتحان کی تیاری اسی کرسی پر بیٹھ کر کی تھی اور ایف، ایس سی کے دو سال بھی اس کرسی پر اور کبھی بستر میں دبک کر پڑھتے ہوئے گزارے تھے۔ یہیں ڈرامے کی ریہرسل کرتے ہوئے میں نے امی کو ڈرایا تھا اور امی میری خاطر دھاڑیں مار مار کر روئی تھیں۔ یہیں میں نے شیراز کے لیے خواب دیکھنا شروع کیے تھے اور یہیں اس کے لیے کتنے دن روتے ہوئے گزارے تھے۔

میں نے ایک اور الوداعی نگاہ اپنے کمرے کے در و دیوار پر ڈالی اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔ سیڑھیاں اتر کر میں نے جلدی سے صدر دروازے کی کنڈی کھولی ہی تھی کہ ماسی کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔

''آج رات تو نہ ہوتی تو مجھے پانی کون پلاتا۔ میں تو کب کی مر گئی ہوتی۔ اسی دن کے لیے تو لوگ اولاد کی دعا کرتے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے کوئی میرے کلیجے پر چھریاں چلا رہا ہے بس آج رات خیریت سے گزر جائے۔''

اور پھر ٹن ٹن کرتی گھنٹی نے اسی سے اس کی ساری کائنات چھین لی تھی۔ ماسی کی کھانسی، اس کی کراہیں، بیٹی کے لیے اس کی پکار، سب کچھ بے معنی ہوگیا تھا۔ وہ پیاسی تھی اور شاید ''ہم یوں ہی خالی رہ جائیں گے۔ کبھی پانی بھی الٹا چلا ہے۔'' چھیماں کی مدھم سی ہنسی کی بازگشت مجھے سنائی دی۔

''نہیں۔'' میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے اپنے کان بند کرلیے لیکن یہ سب آوازیں میرا تعاقب کررہی تھیں ان آوازوں کے درمیان سائیکل کی گھنٹی ٹن ٹنا رہی تھی۔ بائیک کی ہیڈ لائٹس جل بجھ رہی تھیں۔

''پارو کو چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ مجھے اسے بھگانا پڑا ناں تو یہ بھی کر گزروں گا۔'' شیراز مجھ سے کہہ رہا تھا۔

''آجاؤ، آجاؤ۔'' سائیکل کی گھنٹی ٹن ٹن کررہی تھی۔ جلتی بجھتی ہیڈ لائٹس مجھے اپنے جانب بلارہی تھیں۔

میں نے قدم آگے بڑھایا۔

''ہاں، ہم یوں ہی خالی رہ جائیں گے۔ پانی بھی کبھی الٹا چلا ہے۔''

میں سراسیمہ ہوگئی۔ یہ مایوسی چھیماں کی آواز کی نہیں اماں کی آواز کی تھی۔ میری ماں کی آواز کی، رانی کی ماں کی آواز کی منے کی ماں کی آواز کی، کائنات کی سب ماؤں کی آواز کی۔

میرا بڑھتا قدم پیچھے ہٹ گیا۔ آنسو بھری آنکھوں سے میں نے کھلے دروازے سے دکھائی دیتے شیراز کی جانب دیکھا جو میرا انتظار کررہا تھا اور پھر دروازہ بند کرکے کنڈی لگالی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے لیمپ جلایا۔ میز کی دراز سے کاغذ نکالا اور جلدی جلدی لکھنے لگی۔

''سیدھے راستے سے دن کی روشنی میں آؤ۔''

''پارو میری جان۔'' امی کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں ان کی پائنتی پر سر ٹکائے سوئی ہوئی تھی۔ ان کے پاؤں پر سر رکھ کر روتے روتے پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹالیا۔

''امی! میں رو پڑی۔

''نہیں، روتے نہیں ہیں۔'' انہوں نے مجھے چمکارا۔

''امی! رانی ماسی کو اکیلا چھوڑ کر اس سائیکل والے کے ساتھ چلی گئیں۔''

''ہاں مجھے ابھی ہی پتا چلا ہے لیکن تم مت رو۔'' امی نے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''ماسی نے اسے کتنی آوازیں دیں۔ کتنا پکارا لیکن وہ پانی پلانے کے لیے بھی نہیں رکی۔'' میں جنون کے عالم میں روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اگر کل رات میں بھی شیراز کے ساتھ چلی جاتی تو شاید پھر کبھی اس گھر کو نہ دیکھ سکتی۔ کبھی آپ کو پانی نہ پلاسکتی۔ کبھی راتوں کو آپ کے لیے نہ جاگ سکتی جیسے آپ میری خاطر جاگی تھیں۔''

''پارو......!'' امی گنگ ہوکر میری صورت دیکھنے لگی۔

''شکر ہے میں نے یہ حماقت نہیں کی امی۔ میں ایسے کیسے جاسکتی تھی۔'' میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور روئے گئی۔

''امی!'' میرے قریب ہی بھائی کی آواز آئی جنہیں میں نے اب تک وہاں کھڑے دیکھا ہی نہیں تھا۔ ''اس کا دماغ درست ہوگیا ہے، اب آپ لوگ بھی ضد چھوڑ دیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسد برا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ آپ شیراز سے مل تو لیں۔ شادی تو ہمیں پارو کی کرنا ہی ہے، کیا یہ بہت نہیں کہ اگر شیراز اچھا ہو تو ہم اس کی شادی اسی کردیں۔ رانی ماسی کو چھوڑ کر چلی گئی لیکن اس نے اس گھر کی عزت رکھی ہے۔ آپ بھی اس کا مان رکھ لیں۔

امی کچھ دیر تک مجھے دیکھتی رہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ مجھے خود سے لپٹالیا۔ میرے دل میں اندر تک سکون اتر گیا۔

☆☆

میرے خواب لے گیا

رعنا فاروقی

مرد فطرتاً ہرجائی ہوتا ہے۔ پہلے وہ کسی ایک عورت پر لفظوں کا جال پھینکتا ہے۔ جب وہ حاصل ہوجاتی ہے تو پھر وہ نئے جہاں تسخیر کرنے نکل جاتا ہے۔ قربتوں اور فاصلوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہوگئی تھی۔

صبح وصال کے ماروں کا فسانہ، برق جس آشیانے پر گری اسے بنانے میں ایک زمانہ لگا تھا

فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد میرے میاں اپنے آبائی پیشے زمینداری کی طرف مائل ہوگئے۔ کچھ زمینیں انھیں انہیں اپنے والد سے ترکے میں ملی تھیں اور کچھ انہوں نے خود خریدیں۔ جفاکش وہ شروع ہی سے تھے۔ جلد اس پیشے میں مہارت حاصل کرلی وہ مصر تھے کہ ہم سب دیہات میں اپنی رہائش گاہ بنائیں۔ لیکن میرا جی گاؤں میں نہیں لگتا تھا۔ چھ بچے تھے، چار لڑکیاں اور دو لڑکے سب ماشاء اللہ کالجوں میں زیر تعلیم تھے انہیں ہوٹلوں میں داخل کر کے خود دیہات کی کسی حویلی میں قید ہوجانا مجھے پسند نہیں تھا۔

میرا احمر (شوہر) سے کبھی شدید اختلاف نہیں ہوا۔ چھوٹے موٹے اختلافات تو ازدواجی زندگی میں ناگزیر ہیں لیکن جہاں تک میری اور احمر کی ذہنی ہم آہنگی کا تعلق تھا مجھے فخر رہا کہ جو وہ سوچتے تھے میں خود بخود سمجھ جاتی تھی۔ ان سے مجھے محبت تھی لہذا خدمت میں بھی مزا آتا تھا۔ احمر بھی مجھے بے پناہ چاہتے تھے۔ شادی سے پہلے ہم دونوں کا چھوٹا موٹا رومانس بھی چلا تھا۔ میں ان کے والد کے دوست کی بیٹی تھی۔ دور کی رشتے داری بھی تھی۔ گھر پاس پاس تھے۔ احمر، علی گڑھ میں پڑھتے تھے اس زمانے میں جو لڑکا علی گڑھ میں پڑھتا تھا وہ گھر بیٹھی لڑکیوں کا آئیڈیل ہوتا تھا۔ وہ چھٹیاں گزارنے گھر آتے اور میں انہیں مزے مزے کی چیزیں بنا کر بھیجا کرتی۔ جواب میں وہ دو چار کتابیں مجاز یا شکیل کے تازہ اشعار بھیج دیا کرتے۔ سالوں ہم دونوں اس آتش عشق میں سلگتے رہے تب ہم دونوں کے والدین کو خبر ہوئی۔ دونوں شرفا کے گھرانے تھے کسی بدمزگی کے بغیر ہماری شادی کی بات طے ہوگئی۔ احمر کو فوج میں کمیشن مل گیا۔ جانے سے پہلے ہماری شادی ہوگئی۔ اپنے بیاہ کا پس منظر مختصراً اس لیے بتا رہی ہوں کہ آپ ہماری خوشگوار ازدواجی زندگی کا پورا تصور ذہن میں محفوظ کرلیں، میں انہیں جی جان سے چاہتی تھی اور وہ مجھے ہر ممکن طور پر خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ہم لوگ کراچی منتقل ہوگئے۔ میرے سسرال والے پنجاب میں رہائش پذیر ہوئے کیوں کہ وہ زمینداری سے تعلق رکھتے تھے۔ ملازمت کے دوران میں مختلف جگہوں پر اپنے شوہر کے ساتھ رہی لیکن گھر کراچی میں ہی بنوایا



تھا۔ جو کرائے پر چڑھا رہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے خیر پور میں زمینیں خریدیں اور مصر تھے کہ ہم بھی زمینوں پر رہیں۔ اس معاملے پر میرا ان سے پہلی بار اختلاف ہوگیا۔ میرے پانچوں بچوں کی خواہش تھی کہ ہم کراچی رہیں گے۔ کچھ دن میرے میاں جی کا منہ پھولا رہا۔ بچوں نے باقاعدہ بحث کی تب وہ راضی ہوئے، کراچی کا مکان نوٹس دے کر خالی کرالیا اور ہم ناظم آباد میں منتقل ہوگئے۔ احمر نے زمینوں کے ساتھ ساتھ ٹریکٹر کے پرزوں کا بزنس بھی شروع کر دیا۔ کام میں برکت ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم لاکھوں میں کھیلنے لگے۔ میرے پڑوسی اپنا مکان بیچ رہے تھے۔ ہم نے اسے خریدلیا و نئی طرز کی کوٹھی تعمیر کی جس میں دو سرونٹ کوارٹرز بھی رکھے۔ دالان اور ہائی کمرا مغل طرز پر بنایا گیا۔ لان، میری بڑی بیٹی سیماں نے اپنے دوستوں سے مشورہ لے کر بنوایا۔ جب ہر طرح سے یہ قابل فخر ہوگیا تو پہلی دفعہ ہم نے محفل موسیقی کا اہتمام کیا۔ خاندان کے سب لوگوں اور احباب کو مدعو کیا گیا۔ یہ تقریب اتنی بھرپور اور شاندار رہی کہ مدتوں ملنے جلنے والوں میں اس کے تذکرے رہے۔

میرے شوہر نے فیصلہ کیا کہ مہینے میں ایک دفعہ ایسے اجتماع ضرور ہوا کریں گے تاکہ تفریح اور میل ملاقات کا شغل جاری رہے۔ ایسی محفلوں میں میری حیثیت مہارانیوں جیسی ہوتی تھی۔ میری بیٹیاں شہزادیوں جیسی سج دھج سے مہمانوں کو خوش آمدید کہتیں۔ یہ تقاریب مختلف نوعیت کی ہوتی تھیں، کبھی محفل میلاد کی صورت میں، کبھی رنگا رنگ

پروگرام کی شکل میں۔ میرا مقصد تو اپنے ملنے جلنے والوں کو تفریح مہیا کرنا یا ان سے میل ملاپ بڑھانا تھا۔ اللہ میاں نے پیسہ خوب دیا تھا، شوہر فرماں بردار تھا، اولاد ہونہار تھی اس کا شکر ادا کرنے کے لیے میلاد یا قرآن خوانی ہر اتوار کو صبح کراتی۔ احمر میرے مشاغل کو دل سے پسند کرتے تھے۔ وہ پندرہ دن خیر پور میں گزارتے تھے اور پندرہ دن ہمارے ساتھ، زندگی بڑی سبک رفتاری سے رواں تھی۔

ایک روز میں نے لنگر کا اہتمام کیا۔ میری بیٹی سیما نے میٹرک میں فرسٹ پوزیشن لی تھی۔ اس خوشی میں، میں نے یتیم خانے کے بچوں کی دعوت کی، احمر خیر پور میں تھے ان کی واپسی پر دیگر احباب کی دعوت کا پروگرام بنانا تھا۔ جسے ہم اپنی زبان میں ''بڑا کھانا'' کہتے تھے، شام کو قرآن خوانی ہوئی اور یتیم خانے کے بچوں کو کھانا دیا گیا۔ کھانے کی ہڑبونگ میں رات کے دس بج گئے۔ میں کمر سیدھی کرنے کے لیے اپنے بیڈ پر آ گئی۔ میرا چھوٹا بیٹا ضیا بھاگا ہوا آیا۔ کہنے لگا۔ ''امی باہر ایک عورت کھڑی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ اسے کھانا چاہیے۔ میں جانے کس موڈ میں تھی، بولی۔ ''جا اندر بلا لا۔ یہاں بٹھا کر کھانا کھلا دو۔'' میرا بیٹا اسے ساتھ لے آیا۔ ادھیڑ عمر کی سانولی سی عورت تھی۔ مجھے جھک کر سلام کیا۔ میں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ بہ ظاہر بھکارن نظر نہیں آ رہی تھی۔ لہٰذا پوچھ بیٹھی کہ کہاں رہتی ہو؟ اس نے چھت کی طرف اشارہ کیا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

''پہلے چھت کے تلے رہتی تھی۔ آج کل آسمان تلے گزارا کر رہی ہوں۔'' عجیب قنوطی جواب تھا۔ میرا تجسس بیدار ہو گیا، پوچھا۔ ''بھیک مانگنا پیشہ ہے ......؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''نہیں بیگم صاحب آج تین دن کا فاقہ تھا۔ کام کے لیے ماری ماری پھر رہی تھی۔ کام نہیں ملا تو خالی ہاتھ گھر جاتے ہوئے شرم آئی کہ بچے روٹی مانگیں گے تو کیا جواب دوں گی۔ یہاں بچوں کا جمگھٹا دیکھا تو رک گئی۔ پتا چلا کہ آج یہاں لنگر ہے ہاتھ پھیلانا پڑا۔''

میں نے ضیاء سے کہا کہ جاؤ مائی کے لیے کھانا لے آؤ وہ جانے لگا تو اس نے روک لیا بولی۔ ''بیگم صاحب ہم چار جئے ہیں، ہمارا کھانا بندھوا دو میں اپنے بچوں کے ساتھ ہی روٹی کھاؤں گی۔''

میں نے پوچھا۔ ''بچے کہاں ہیں، ان کا باپ کیا کرتا ہے۔'' وہ رونے لگی آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''کیا بتاؤں بیگم صاحب میرے آدمی نے مجھ پر اس عمر میں کیا ستم ڈھایا ہے۔ میری تین لڑکیاں ہیں، بڑی تیرہ سال کی ہے، جوان ہی سمجھو۔ میرا آدمی محلے کی ایک لڑکی کو بھگا کر لے گیا حیدر آباد جا کر اس نے نکاح کر لیا اور وہیں سے مجھے طلاق بھیج دی۔ محلے والوں نے ہم ماں بیٹیوں کو مار کر گھر سے نکال دیا۔ کرائے کا مکان تھا وہ خالی کرا لیا۔ سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ لڑکیوں کی ساتھ گھومنا کتنا دشوار ہے۔ عزت دار نہ ہوتی تو کوٹھے پر جا بیٹھتی اس کم بخت عزت نے یہ دن دکھایا ہے۔ لڑکیوں کو اپنی ایک جاننے والی کے گھر چھوڑا دو دن بعد اس نے بھی نظریں پھیر لیں۔ رشتے دار سارے انڈیا میں ہیں۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔''

اس کی داستان سن کر میں گھبرا گئی۔ پوچھا ''اس وقت لڑکیاں کہاں ہیں؟'' وہ بولی۔ ''ملیر میں ایک ملنگ بابا کی جھونپڑی ہے، تینوں کو وہاں بٹھا کر آئی ہوں۔ بابا مجذوب ہے دو دن جھونپڑی سے باہر رہتا ہے آج بھی وہ باہر نکلا ہوا ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''اگر وہ واپس آ گیا تو۔'' وہ عورت بولی۔ ''میں لڑکیوں کو اللہ کے بھروسے پر چھوڑ کر آئی ہوں ان کی وہی حفاظت کرے گا۔'' اس عورت کی کہانی میں جھوٹ کی بہ ظاہر کوئی

آ ... ش نظر نہیں آ رہی تھی اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ ستم زدہ ہے اس سے پوچھا کہ اس وقت واپس کیسے جاۓ گی۔ بولی بی بی بس پکڑوں گی، چونی پلو سے باندھ رکھی ہے۔ اگر کنڈیکٹر نے تنگ کیا تو اسے دے دوں گی۔

اتنی دیر میں ضیا چار آدمیوں کا کھانا پیک کرا کے لے آیا۔ میں نے اس عورت کو دس روپے دیے اور کھانا اس کے حوالے کر دیا۔ ہمدردی سے کہا کہ اگر کہیں ملازمت نہ ملے تو میرے پاس آ جانا میں تمہیں اپنے یہاں رکھ لوں گی۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ دوڑ کر آئی اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی میرے دونوں قدم پکڑ کر چومنے لگی۔ بولی۔

”بی بی میں یہ در چھوڑ کر اب کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے اپنے گھر رکھ لیجیے۔“

میری دونوں بیٹیاں بھی کمرے میں آ گئی تھیں۔ انہوں نے بھی اسے تسلی دی اور کہا کہ اپنا پتا دے دو کل ہم تمہیں بلوا لیں گے۔

وہ بولی۔”بی بی ہم پر تو آج کی رات بھاری ہے اگر ملنگ بابا اپنی جھونپڑی میں واپس آ گیا تو ساری رات درخت کے تلے گزارنا پڑے گی۔“

سیماں بولی۔”امی ڈرائیور کو بھیج کر اس کی بیٹیوں کو بلوا لو۔ بے چاری رات کو کہاں ماری ماری پھرے گی۔“

میں نے سیماں کی ضد پر ڈرائیور کو بلایا اسے علیحدہ لے جا کر سمجھایا کہ اس عورت کی انکوائری کرنا ہے جو کچھ کہہ رہی ہے اس میں صداقت ہے یا نہیں۔ ڈرائیور نے اس کا اتا پتا پوچھا اور جواب سن کر خوش ہو کر بولا میری پھوپی زاد بہن اسی گلی کے آس پاس رہتی ہے چلو میرے ساتھ میں تمہاری بچیاں بھی لے آؤں گا۔

رات کے تقریباً بارہ بجے کے قریب ڈرائیور اس عورت اور اس کی بچیوں سمیت واپس آیا۔ ہم لوگ بارہ ایک بجے سونے کے عادی ہیں۔ آج تو ویسے بھی چیزیں وغیرہ سمیٹنا تھیں اور اس عورت کا انتظار بھی تھا۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ وہ پہلے اپنی بہن کے گھر اس کو لے گیا تھا بہن اس کو جانتی ہے واقعی اس کے شوہر نے اس پر بہت ظلم کیا تھا، عورت نیک ہے، ایک ہفتہ پہلے محلے والوں کے کہنے پر مالک مکان نے ان ماں بیٹیوں کو گھر سے نکال دیا تھا جب سے یہ ادھر ادھر ماری ماری پھر رہی ہیں۔ ڈرائیور کی تصدیق پر مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں ان چاروں کے لیے سرونٹ کوارٹر خالی کرا دیا۔ اس میں، میں نے پرانا فرنیچر بھرا ہوا تھا۔ صبح سب نکال کر کباڑی کی دکان پر پہنچا دیا اور وہ ایک کمرے کا کوارٹر اس عورت کے حوالے کر دیا اور کہہ دیا کہ میرے گھر کا کام کاج سنبھال لے۔ تینوں وقت کھانا اور پانچ روپے تنخواہ ملے گی۔ بچیوں کی اترن اور عید تہوار پر کپڑے بھی بنوا دیا کریں گے۔ میرے ہاتھ چوم چوم کر اس عورت نے مجھے دعائیں دیں۔ کہنے لگی۔”بی بی برے دن کسی کے نہیں رہتے میں چند مہینے کے اندر اندر اپنے گھر والوں کو خط لکھ کر بلوا لوں گی۔ میرے بھائی بہت پیسے والے ہیں اپنی بہن کی کچھ نہ کچھ تو ضرور مدد کریں گے۔“

میں نے یہ اقدام اس کی بچیوں کی حفاظت کے لیے کیا تھا اس عورت کا کیا تھا کہیں بھی نوکری کر کے گزارا کر سکتی تھی لیکن جوانی میں قدم رکھنے والی لڑکیوں کا گھر گھر پناہ کی تلاش میں پھرنا ان کی بربادی کے مترادف تھا۔ تینوں لڑکیاں خوش شکل تھیں، فاقوں اور پیشانیوں نے انہیں کملا دیا تھا لیکن چند دنوں بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ بڑی ہو کر اچھی صورت نکالیں گی۔ بڑی تیرہ سال کی تھی، منجھلی نو برس کی تھی اور تیسری چھ سال کی ہو گی۔ میری بچیوں نے انہیں اپنی اترن دے دی تھی۔ جسے جنت خاتون نے کاٹ چھانٹ کر اپنی بیٹیوں کے قابل بنا لیا۔

جب احمر گھر آئے تو میں نے انہیں جنت کی پوری کہانی سنا دی۔ وہ کہنے لگے۔”تم بہت بھولی

عورت ہوایسی عورتیں ڈھونگ رچا کر گھر لوٹ لیا کرتی ہیں۔ مہربانی سے اس پر کڑی نظر رکھو اور میں اپنے طور پر اس کی تحقیقات کرتا ہوں اگر اس کی کہانی میں صداقت بھی موجود ہے تب بھی ایسی عورتوں پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے ہماری بچیاں جوان ہو رہی ہیں۔ خدا جانے یہ عورت آگے چل کر کیا چال چلن اختیار کرے جو ہم سب کے لیے پرابلم ہوجائے۔'' میں نے احمر کو یقین دلایا کہ ڈرائیور مجید اس کی کہانی کی تحقیقات کر چکا ہے اس کا شوہر واقعی اسے طلاق دے کر بھاگ گیا ہے۔ عورت شریف لگتی ہے۔ بچیاں بھی سلیقے کی ہیں، صبح سویرے ماں انہیں قرآن کا درس دیتی ہے۔ اگر ہماری وجہ سے کسی کی زندگی سنور جائے تو ثواب ہی ملے گا۔

احمر نے میری تقریر کا کوئی اثر نہیں لیا۔ جنت بی بی کو بلا بھیجا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ ''تم یہاں اکیلی رہتی ہو۔ بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے پیچھے یہ سارا صفایا کر کے تمہیں بے آسرا کر جائے۔ میں خود دیکھنا چاہتا ہوں کہ محترمہ کا جغرافیہ کیا ہے۔''

جنت ڈرتے ڈرتے آئی۔ اس نے کاٹ چھانٹ کر میرے کپڑے پہن لیے تھے اس لیے صاف ستھرے حلیے میں تھی۔ مجھے اور احمر کو سلام کر کے فرش پر بیٹھنے لگی۔

''احمر نے اس سے اس کی پوری داستان دوبارہ سنی۔ کہنے لگے اپنے شوہر کا کچھ اتا پتا معلوم ہے۔ میں حیدرآباد جانے والا ہوں۔ اگر اس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے تو اسے حوالات کی ہوا کھلا دوں گا۔'' جنت آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اگر اس کا اتا پتا معلوم ہوتا تو بچیوں کو لے کر اس کے در پر نہ جا پڑتی جس لڑکی کو لے کر بھاگا ہے انہوں نے پولیس میں رپٹ درج کرادی تھی بعد میں اس نے اپنے کسی دوست کے ہاتھ مجھے طلاق نامہ اور لڑکی کے گھر والوں کو اپنے نکاح کی خبر بھیج دی۔ پولیس نے دوست کو پکڑ کر مارا پیٹا تو اس نے یہ بتایا کہ وہ مجھے اسٹیشن پر ملا تھا مجھے اس کے ٹھکانے کا پتا نہیں۔''

احمر کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ ''میں آج ہی ڈی ایس پی سے بات کر کے کچھ کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ دراصل تم جوان عورت ہو۔ تمہاری بیٹیاں بھی چند سال بعد جوان ہوجائیں گی۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ تم ادھر ادھر ماری ماری پھرو۔ اگر شوہر راہ راست پر آجائے تو تمہیں اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اگر تم لوگوں کی صلح ہوسکتی ہے تو طلاق کی اہمیت خود بخود ختم ہوسکتی ہے۔''

جنت نظریں جھکائے بولی۔ ''میں آپ پر اور بی بی پر بھروسا کرتی ہوں جو مرضی میں آئے کیجیے۔ میں اپنی بیٹیوں کے مستقبل کی خ[illegible] کا سمجھوتا کرلوں گی۔'' جنت اٹھ کر چلی گئی۔

احمر کہنے لگے۔ ''عورت تو شریف [illegible] ہے پھر بھی تحقیق کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔'' چند دنوں بعد احمر نے جنت کے شوہر کا پتا نکلوالیا۔ حیدرآباد میں ان کے دوستوں کا خاصا بڑا حلقہ ہے ان کے لیے یہ کام آسان تھا۔ جنت کو بلا کر خوشخبری سنائی۔ وہ رونے لگی۔ بولی۔ ''صاحب جی آپ نے بڑی نیکی کی ہے مگر میں سوکن کی ساتھ نہیں رہوں گی وہ بچیوں کو اپنے ساتھ رکھ لے۔ میں کہیں مزدوری کر کے پیٹ پال لوں گی۔''

میں نے اور احمر نے اسے سمجھایا کہ پہلے شوہر سے مل لے بعد میں جیسے حالات ہوں گے اسی کے مطابق عمل کرنا۔ وہ حیدرآباد سے گرفتار کر کے کراچی لایا گیا تھا اور حوالات میں بند کردیا گیا تھا۔ اس کی بیوی کو اس کے والدین لے گئے تھے لیکن اندر ہی اندر ان لوگوں کی خدا جانے کیا کھچڑی پکی کہ لڑکی کے ماں باپ نے اسے اپنا داماد تسلیم کر کے صلح کرلی۔ وہ حوالات سے نکل کر لڑکی کے والدین کے گھر منتقل ہوگیا۔

میرے شوہر کا اصرار تھا کہ جنت اس کے پاس جا کر اپنا حق مانگے۔ جنت سوکن کے ساتھ رہنے پر

رضا مند نہیں تھی۔ احمر نے اسے راضی کرلیا کہ وہ شوہر سے ملنے میں اسے اپنے گھر بلوانا نہیں چاہتا کیوں کہ ہوسکتا ہے بعد میں وہ ہم لوگوں کو تنگ کرے۔ بہتر ہوگا کہ تم میرے ساتھ چلو، میں وہاں اسے تھانے میں بلوالوں گا۔ ساری باتیں ڈی ایس پی کے سامنے ہوں گی تاکہ اس کا دماغ درست رہے۔''

بمشکل جنت راضی ہوئی۔ کہنے لگی کہ صاحب میں اکیلی جاؤں گی بچیوں کو تھانے میں نہیں لے جانا چاہتی۔'' اس کی بات معقول تھی احمر اور میں نے مان لی، دوسری صبح احمر جنت کو ملیر لے گئے۔ ہم دونوں میاں بیوی کسی نہ کسی طریقے سے اس کا گھر پھر سے آباد کرنے کے خواہش مند تھے۔ میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہی تھی کہ میرے شوہر نے اس مسئلے میں دلچسپی لی۔ وہ اس طبیعت کے آدمی تھے کہ اگر انہیں کسی امداد کے لیے مجبور کریں تو چڑ جاتے تھے لیکن خود کسی کو مصیبت میں دیکھ لیں تو ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرنے پر تل جاتے تھے۔ اسی جذبے کے تحت وہ جنت کو اس کے شوہر سے مصالحت کرانے لے گئے۔

سہ پہر ان کی واپسی ہوئی۔ جنت کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ احمر بھی رنجیدہ لگ رہے تھے۔ مجھے بتانے لگے کہ وہ بہت حرام زادہ ہے۔ ہزار دھمکیاں دیں مگر اپنی بات پر اڑا رہا کہ میرا اس عورت سے کوئی واسطہ نہیں ہے، میں اسے طلاق دے چکا ہوں۔ بچیوں کا خرچا ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ ابھی تو خود بے روزگار ہوں۔ سسرال والوں کی روٹیاں توڑ رہا ہوں جب کچھ بندوبست ہوجائے گا تو خرچا بھیج دیا کروں گا۔ جنت کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا۔ میں نے احمر کو سمجھایا کہ عدالتوں کے چکروں میں آپ مت پڑیں۔ یہ عورت محنتی ہے۔ ہمارے یہاں پڑی رہے گی۔ بچیوں کو سلائی کے اسکول میں داخلہ دلا دوں گی دو تین سال بعد اپنا خرچا نکالنے کے قابل ہوجائیں گی عدالتوں میں خواری کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

احمر کسی صورت اپنی ناک نیچی کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔ جنت کے شوہر پر مقدمہ داغ دیا۔ کہنے لگے۔ ''سالے کو اپنے کرتوتوں کی کچھ تو سزا ملے۔''
اسے تو خیر کیا سزا ملنا تھی یہ سزا ہم لوگوں کو ہی بھگتنا پڑی، مقدمے کا سارا خرچا ہمیں برداشت کرنا پڑا۔ ہر پیشی پر احمر کو خود آنا پڑا۔ چھ مہینے تک احمر جنت کو اس کا حق دلانے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس دوران میں نے اس عورت کا پورا پورا خیال رکھا۔ میری بیٹی سیماں سے جنت نے انڈیا اپنے بھائیوں کو خط لکھوایا جس کا جواب دو مہینے بعد ملا لکھا تھا۔'' ہم کسی نہ کسی طریقے سے تمہیں پیسہ بھیجنے کی کوشش کریں گے۔ اس عرصے میں تم کسی طریقے سے قرض لے کر اپنا گزارا کرو اور بچیوں کی دل آزاری مت ہونے دینا۔''

جنت نے مجھے خط دکھا کر کچھ رقم طلب کی۔ میں نے احمر سے مشورہ لیا وہ کہنے لگے۔ ''شاکرہ اس عورت پر ہم پورا بھروسا کرسکتے ہیں۔ اس عرصے میں تم نے بھی اس کی سیرت دیکھ لی ہے۔ تم بلا کھٹکے رقم دے دو شاید یہ کوئی کاروبار کرنا چاہ رہی ہے۔''
میں نے پوچھا ''کتنی رقم دوں۔''
انہوں نے دو ہزار روپے میرے حوالے کیے کہنے لگے۔ ''یہ دے دو واپسی کی نیت مت رکھنا۔ سمجھ لینا خیرات دی ہے۔ جنت پیسے لے کر بازار گئی اپنے اور بچیوں کے لیے کپڑے لے کر آئی۔ مجھ سے پرمیشن مانگی اور جب ہلکے انگوری رنگ کے نئے جوڑے میں وہ میرے سامنے آئی تو میں حیران رہ گئی۔ وہ خاصی قبول صورت لگ رہی تھی۔ احمر اسے دیکھ کر کہنے لگے۔ ''بیگم یہ عورت سمندر جیسی گہری ہے خود کو بگاڑے رکھتی ہے کہ دنیا والوں کی بری نظریں اس پر نہ پڑیں۔'' میں نے جنت کو بہت سارے جوڑے نکال کر دیے کہ صاف ستھری رہا کرو۔ میں تمہیں نوکرانی نہیں اپنی

بہن جھتی ہوں۔" یہ میری ہی نہیں احمر کی بھی خواہش تھی کہ جنت اور اس کی بچیوں کو صاف ستھرا رکھا کرو۔ کیوں کہ آنے جانے والے انہیں ہمارا رشتے دار سمجھنے لگے ہیں اور یہ حقیقت بھی تھی جن لوگوں کو اس واقعہ کا پتا نہیں تھا وہ جنت کو ہماری رشتے دار سمجھتے تھے۔ کچھ ان کا رہن سہن نوکروں سے مختلف تھا اور کچھ صورت شکل کی اچھی تھیں میرے گھر کا سارا انتظام جنت نے بڑے سلیقے سے سنبھال لیا تھا گھر میں دعوت کا اہتمام ہوتا تو وہ سب کام خوبی سے نمٹا دیتی۔ اپنی بچیوں کو اسکول میں داخل کرا دیا تھا احمر نے کہا کہ پانچ سو روپے بچیوں کی تعلیم کے لیے دے دیا کرو یہ پڑھ لکھ کر ماں کا سہارا بن جائیں گی۔

ایک سال جنت ہمارے گھر رہی، مجھے اس سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ وہ ایک روز کی چھٹی لے کر اپنے ملنے جلنے والوں کے پاس ملیر جایا کرتی تھی۔ بچیوں کو گھر چھوڑ جاتی، شام کو واپس آتی۔ اس عرصے میں دو چار بار انڈیا سے اس کے بھائیوں نے کسی کی معرفت پیسے بھجوائے۔ میں نے اس سے تفصیل نہیں پوچھی اس نے خود بتایا کہ بچیوں کے اکاؤنٹ میں ڈال دیتی ہوں۔ میں اس سے مطمئن اور خوش تھی اور وہ مجھ سے۔ ایک روز وہ سر جھکا کر میرے سامنے آئی کہنے لگی۔ "بی بی آپ سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں آپ سن لیں تو مہربانی ہوگی۔ مجھے اس کے طرز تخاطب پر تعجب ہوا۔ پوچھا۔ "جنت خیر تو ہے۔"

وہ بولی بی بی! میں علیحدہ مکان کرائے پر لے رہی ہوں۔ خدا کے فضل سے میرے پاس اتنا پیسہ ہوگیا ہے کہ میں بچیوں کو لے کر الگ مکان میں رہ سکوں۔ میرے بڑے بھائی نے پیغام بھیجا ہے کہ تمہارے ماہانہ خرچ کا ہم نے انتظام کر دیا ہے۔ مجھے وہ ہر مہینے پانچ ہزار روپے بھیجا کریں گے جو میرے لیے بہت ہیں۔ میں آپ کے احسانات کا عمر بھر بدلہ نہیں چکا سکتی۔ مجھے آپ خوشی خوشی جانے کی اجازت دے دیں۔ آپ سے ملنے روزانہ آیا کروں گی۔"

جنت نے یہ خبر بالکل غیر متوقع طور پر سنائی تھی۔ میں ہکا بکا رہ گئی۔ احمر ٹھیک کہتے تھے یہ عورت گہرا سمندر تھی ایک سال ہمارے ساتھ رہی، بہت کم باتیں کرتی تھی۔ زیادہ وقت کام کاج یا اپنے کوارٹر میں گزارتی۔ اب جانا چاہ رہی تھی تو میں اسے روکنے والی کون تھی۔ پھر بھی احمر سے مشورہ کرنا ضروری تھا کیوں کہ وہ اس کے معاملات میں خاصی دلچسپی لیتے تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ صاحب آجائیں پھر چلی جانا۔ وہ بولی۔ "صاحب خدا جانے کب آئیں میں مکان کا کرایہ ادا کر چکی ہوں اگر کل تک منتقل نہ ہوسکی تو مالک مکان گڑبڑ کردے گا۔ میں روزانہ آتی رہوں گی صاحب سے ملاقات ہو جائے گی۔ آپ سے درخواست یہ کرنا تھی کہ بچیاں کچھ دن آپ کے پاس رہیں گی۔ اس عرصے میں مجھے لاہور بھی جانا ہے۔ میرے بھائی کا کچھ کام اٹکا ہوا ہے اسے کرنا ہے۔ جمعرات تک میں لوٹ آؤں گی پھر بچیوں کو ساتھ لے کر نئے گھر میں منتقل ہو جاؤں گی۔

جنت کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس نے یہ پروگرام کیسے بنایا جب کہ اس سے پہلے تو وہ ملیر جانے کے لیے بھی مجھ سے اجازت لیتی تھی۔ بہر حال یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا مجھے تھوڑا بہت صدمہ تو ہوا مگر یہی بہت تھا کہ اس نے مجھ سے اجازت لے لی تھی۔ دراصل میں اس کے کام کی عادی ہوگئی تھی۔ گھر کا کھانا پکانا، صفائی، مہمان داری سب کچھ اسی کے ذمے تھا۔ اب یہ سب کام مجھے خود سنبھالنا تھے۔ تھوڑا دکھ فطری تھا۔ لیکن اسے روکنا بھی بے کار تھا کیوں کہ وہ اپنا فیصلہ خود کر چکی تھی۔ دوسرے دن صبح وہ چلی گئی۔ بیٹیاں میرے پاس رہیں۔ ان سے پوچھا کہ تمہاری ماں نے اپنے جانے کے متعلق تمہیں کب بتایا تھا۔

بڑی نے جواب دیا ہمیں رات کو بتایا تھا کہ تم تینوں خالہ جی کے ساتھ رہو گی۔ میں چند دن میں لوٹ آؤں گی۔

دس دن تک وہ نہیں آئی۔ مجھے تشویش ہوئی کیوں کہ وہ چار دن کا کہہ کر گئی تھی اور یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اگر اسے نئے گھر میں منتقل ہونے میں دیر ہو گئی تو مالک مکان گڑبڑ کر دے گا۔ پھر اتنے دن کیسے رہی۔ بچیاں بھی پریشان نظر آ رہی تھیں۔ ماں کی طرح تینوں گھنی تھیں۔ زبان بند رکھتی تھیں۔ احمر کے آنے تک میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی مجھے ڈر یہ تھا کہ وہ حادثے کا شکار نہ ہو گئی ہو یا خدانا خواستہ بچیوں کو چھوڑ کر فرار ہو گئی ہو۔ خدا جانے اس کا کیا منصوبہ تھا لہذا میری پریشانی بجا تھی۔

احمر کا حیدرآباد سے فون آیا تو میں نے انہیں مختصر بتا دیا تو وہ بولے۔ ''میں چار روز بعد آ رہا ہوں یہاں آ کر کچھ کروں گا۔''

لیکن کچھ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی وہ گیارہویں روز آ گئی۔ مجھ سے معذرت کرنے لگی کہ کچھ پرانے ملنے جلنے والے مل گئے، انہوں نے روک لیا تھا۔ وہ لاہور سے خاصا سامان لائی تھی۔ میری بیٹی سیماں کو ایک جرسی دی، دونوں لڑکوں کو پین دیے میرے لیے کڑھا ہوا دوپٹا لائی تھی۔ اس کے اصرار پر میں نے تحفے لے لیے اسی شام کو وہ اپنا سامان اور بچوں کو لے کر چلی گئی۔ مجھے کہنے لگی۔ ''ابھی میں آپ کو اپنے گھر کا پتا نہیں بتاؤں گی۔ پہلے گھر ٹھیک ٹھاک کر لوں پھر آپ کو لینے آؤں گی۔''

چوتھے روز احمر آئے۔ میں نے انہیں ساری کتھا سنائی وہ کہنے لگے۔ ''ٹھیک ہے وہ اپنی مرضی کی مالک ہے اگر بہتر طریقے سے اپنی زندگی بسر کرنے کا موقع اسے مل گیا ہے تو ہم روکنے والے کون ہیں۔ ہمارا جو انسانی فرض تھا وہ ہم نے ادا کر دیا۔''

یہ عورت ایک بھولی بسری داستان بن جاتی جو بات یہیں پر ختم ہو جاتی۔ دو ماہ تک اس کی خیر خبر نہیں ملی۔ میں نے سوچا نمک حرام نکلی اگر دو چار لفظ خیریت کے بتا دیتی تو اس کا اپنا ہی بوجھ ہلکا ہوتا مگر ایک صبح مجھے میرے چچا نے آ کر بتایا کہ شاکرہ تم کس خیال میں ہو۔ جس عورت کو تم نے اپنے گھر میں پناہ دی تھی وہ تمہاری سوکن بن چکی ہے۔ احمر میاں نے نارتھ ناظم آباد میں ایک کوٹھی کرائے پر لے رکھی ہے وہ محترمہ اپنی بیٹیوں سمیت وہاں عیش کی زندگی بسر کر رہی ہیں اگر یقین نہیں آتا تو لو میں پتا دے دیتا ہوں جا کر تصدیق کر لو۔''

اور تصدیق کی ضرورت ہی کہاں پڑی۔

احمر نے اسی وقت کمرے سے نکل کر خود اعتراف کر لیا کہ میں دوسری شادی جنت سے کر چکا ہوں۔ اسے جا کر پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو سزا دینا ہے مجھے دو۔''

جی ہاں یہ جنت بی بی اب میرے شوہر کی چہیتی بیوی ہیں۔ میں اپنے بچوں کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتی ہوں۔ جنت نے نارتھ ناظم آباد میں شاندار کوٹھی بنوائی ہے۔ میرے دونوں لڑکے باپ کی وجہ سے اکثر وہیں رہتے ہیں اور میری بڑی بیٹی سیماں گھر کا خرچ چلانے کے لیے ملازمت کر رہی ہے۔ بیٹے باپ کے فرمانبردار بن گئے ہیں۔ لہذا ان کی کفالت باپ ہی کرتا ہے۔ میں نے اور میری بیٹیوں نے اس صورت حال کو تسلیم نہیں کیا۔ لہذا معتوب ہو کر جنت بی بی کی طرح خوار ہو رہے ہیں۔ جنت والے جو ہر ہم میں نہیں ہیں۔ لہذا ساری عمر اسی کسمپرسی میں گزرتی نظر آ رہی ہے۔

☆☆

مھکے پھول یادوں کے

سونیا خان

وہ بھونرا صفت دنیا گھوم آیا تو اس کی پسند کا معیار بھی بدل گیا۔ ایک دوشیزہ کے صبر کا فسانہ، اس نے اپنا حق چھوڑ کر ہر بندھن توڑ دیا کیونکہ کچے دھاگوں سے بندھے رشتوں کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔

ان بے وفاؤں کا قصہ جو منزلوں کو ڈھونڈتے اور پھر ٹھکرادیتے ہیں

ثمرہ انہیں کھلی کھلی آنکھوں سے مسلسل دیکھے جارہی تھی۔ اللہ کیسے خوب صورت ہوکر آئے ہیں۔ جیسے وہ جہانگیر رضا کی نظروں کو رخ بدلتے محسوس کرتی جھٹ سے پاس بیٹھی ثمینہ سے سرگوشیاں کرنے لگتی۔ جہانگیر رضا مسکرا پڑے۔ وہ بھی ایک گھاگ آدمی تھے۔ دنیا گھوم کر آئے تھے۔ ثمرہ کی اس ایکٹنگ پر دل ہی دل میں ہنس رہے تھے۔ پھر جب سب لوگ ان سے جی بھر کے بول لیے تب وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ثمینہ نے بہت کھینچا تانی کی مگر وہ اس کے ساتھ ان کے کمرے میں نہ گئی۔

لالہ زار میں وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی یہ عمارت کسی محل سے کم نہ تھی۔ شیشے ... سے آئینے کی طرح چمکتے نظر آتے اور رات کو جب چہار دیواری پر ہر دو دو گز کے فاصلے پر لگی ہوئی بتیاں جل اٹھتیں تو شیشوں پر سے ان کا عکس جھلملا کر بڑا خوب صورت چراغاں سا منظر پیش کرتا۔ بڑے سے گیٹ پر شیشوں کے موزیک میں لکھا ہوا ''لالہ زار'' ہر وقت چمکتا رہتا تھا۔ سفید پتھروں سے جدید طرز پر بنی ہوئی یہ خوب صورت کوٹھی اپنے مکینوں کی شان و شوکت کا منہ بولتی شاہکار تھی جس کی بڑی فرانسیسی طرز کی بنی کھڑکیوں پر بھاری بھاری پردے پڑے خوب صورت لان رنگا رنگ پھولوں سے ڈھکے رہتے تھے اور گھر میں ہر وقت زینت بیگم کے پوتوں، نواسوں اور نواسیوں کے قہقہے گونجا کرتے۔

نواب ملک یار جنگ عرصہ ہوا انتقال کر چکے تھے اور اب ان کی بیگم زینت مہارانیوں کی طرح اپنی سب اولاد کو سمیٹے اس محل نما کوٹھی میں رہتی تھیں۔ ان کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ سب کی شادیاں خاندان میں کی تھیں اور اب پانچوں کی اولادوں سمیت بڑے دبدبے اور وقار کے ساتھ رہتی تھیں۔

ان کی سب سے بڑی صاحبزادی عاتکہ تھیں، جب کہ بیٹے جہانگیر رضا اور بیٹیاں ثمینہ اور فوزیہ تھیں پھر دونوں بیٹے نواب صدر ملک اور نواب منصور ملک تھے۔ ثمرہ، احمر اور عامر نواب صفدر ملک کے تینوں بچے تھے۔ نواب منصور کے صرف ایک صاحبزادے فیصل تھے۔ عائشہ منجھلی صاحبزادی تھیں۔ ان کے دو بیٹے فراز اور شہریار اور بیٹی عظمیٰ تھی اور صبیحہ سب سے چھوٹی تھیں اور جن کی ایک دس سال کی بیٹی نادیہ تھی۔

ثمرہ ایک ہی پوتی تھی۔ اس لیے زینت بیگم کی بے حد لاڈلی ہونے کے علاوہ سب پھوپھیوں کی



آنکھ کا تارا تھی۔ یہ پورا خاندان بڑے خلوص اور چاہت سے رہتا تھا۔ سب بچے آپس میں بڑے اچھے دوست تے اور بہو بیٹیاں ایک ہو کر رہتی تھیں۔ زینت بیگم بہت روشن خیال تھیں۔ اس لیے گھر کا ماحول خاصا آزادانہ تھا۔ سب لڑکیاں پڑھ رہی تھیں اور لڑکے بڑے قابل اور ہونہار تھے۔ جہانگیر رضا سات سال کینیڈا میں رہ کر کامیاب آرکیٹیکٹ بن کر لوٹے تھے اور اب اپنی ذاتی فرم کھولنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ عامر ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کرنے لندن گئے ہوئے تھے۔ احمر اور فیصل انجینئرنگ کالج میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ فراز میڈیکل کے فائنل ائیر میں تھے اور شہریار نے ائیرفورس جوائن کرلی تھی۔ ثمینہ اور ثمرہ جو ہم عمر بھی تھیں اور رازدار سہیلیاں بھی۔ ایک ہی کالج میں، ایک ہی کلاس میں پڑھ رہی تھیں۔

عظمیٰ اور نادیہ کی گاڑی چھنتی تھی، دونوں کی عمروں میں بہت کم فرق تھا۔

ایک ہاتھ میں گلاس تھامے دوسرے ہاتھ میں سگریٹ لیے ایک طرف کو تنہا کھڑے وہ ہر ایک کا طائرانہ نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔ اب تک انہیں کوئی بھی شناسا سا نہ دکھائی دیا تھا۔ یہ تقریب ان کے بہت پرانے اور جگری دوست شہزاد نے اپنی شادی کی سالگرہ کے موقع پر کی تھی جس میں ان کا شامل ہونا از حد ضروری تھا، کیوں کہ وہ اس کی شادی کے موقع پر کینیڈا میں تھے اور اب ان کو واپس آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا۔ شہریار دوسرے مہمانوں میں مصروف تھا۔ انہیں تنہا کھڑا دیکھ کر ان کی طرف مسکراتا ہوا آیا۔

”بور تو نہیں ہو رہے۔“

''فی الحال تو نہیں۔'' وہ ہنس پڑے۔

''یقیناً ہو رہے ہو گے۔ اصل میں تمہارا کوئی شناسا بھی تو نہیں۔'' وہ ایک پل کو رکا۔

''اچھا ٹھہرو، تمہیں ایک بہت اچھی دوست سے ملواتا ہوں۔''

وہ شہزاد کے ساتھ چلتے ہوئے لان کے دوسرے سرے تک آ پہنچے۔

''وکی۔''

شہزاد کی آواز پر ایک نازک سی لڑکی ان کی طرف مڑی تو جہانگیر اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گیا۔ ایسا ملیح حسن تو انہوں نے پورے یورپ اور امریکا میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے گہرے بھورے بال جو کچھ کچھ سرخی مائل بھی تھے، بڑے خوب صورت انداز میں سیٹ کیے ہوئے تھے اور اس کی نیلی نیلی آنکھیں کچھ ایسی بھیگی ہوئی تھیں کہ لگتا تھا جیسے ابھی شفاف آنسو نکل پڑیں گے۔ اس کے چمکیلی براؤن لپ اسٹک لگے ہونٹوں پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ تھی۔ ایک نظر میں وہ جہانگیر کو اداسیوں کا مجسمہ لگی مگر دوسرے ہی لمحے جب وہ ہنستی ہوئی ان لوگوں کی طرف بڑھی تو وہ اپنا نظریہ بدلنے پر مجبور ہو گئے۔

''وکی! میرے بہت اچھے دوست سے ملو۔ جہانگیر رضا شاہ۔ ابھی کچھ دن ہوئے کینیڈا سے لوٹے ہیں اور جہانگیر! یہ وکی ہیں۔ میری اور اسما کی بہت اچھی دوست۔ بہت پر بہار شخصیت ہیں۔ ہمارے گھر کے سامنے والے گھر میں ان کا مستقل قیام ہے۔'' شہزاد نے بڑی روانی سے ان کا تعارف کرایا۔

جہانگیر نے رسمی جملے کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بڑی شستہ اردو میں ان سے مخاطب ہوئی۔

''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی جہانگیر! امید ہے آپ بھی ایسا ہی محسوس کریں گے۔''

وہ اسے اتنی روانی سے صاف اردو بولتے دیکھ کر حیرانی میں کوئی بات ہی کرنا بھول گئے۔ شہزاد انہیں اس طرح دیکھ کر زور سے ہنس پڑا۔

''ارے بھئی جہانگیر! وکی پندرہ سال سے پاکستان میں ہے اور اب ہم لوگوں کی طرح ہی اتنی اچھی اردو بول سکتی ہے کہ اسے دیکھ کر کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا کہ یہ آئرش ہے۔''

جہانگیر اپنی حیرانی پر قابو پا کر مسکرا دیے۔

''واقعی! مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ میں نے پہلی دفعہ کسی فارنر کو اتنی رواں اردو بولتے دیکھا ہے۔ بہرحال آپ کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزرے گا۔'' وہ وکی سے بڑے متاثر نظر آ رہے تھے۔

جہانگیر اسے ساتھ لیے ایک طرف بیٹھ گئے اور رسمی باتوں کے بعد ان میں باتوں کا جو سلسلہ چلا تو وہ دونوں آپس میں اتنے بے تکلف ہو گئے، جیسے ان کی کئی برسوں سے جان پہچان ہو۔ اس ملاقات میں وکی ان کو اپنے متعلق سب کچھ بتا گئی۔

وکی کے ڈیڈی آئرش اور مما سوئیڈش تھیں۔ اس کے ڈیڈی ایک انگلش فرم میں جنرل منیجر کی پوسٹ پر تھے۔ وکی کو پاکستان بہت پسند تھا اور اس کی مما کو بھی۔ وہ چھ سال کی تھی جب وہ لوگ پاکستان آئے تھے پھر اس نے امریکن اسکول سے سینئر کیمبرج کرنے کے بعد آرٹس کونسل جوائن کر لی تھی۔ اسے پاکستانی لباس بے حد پسند تھا۔ اکثر وہ اسے پہنتی بھی تھی۔ اسے یہاں کے گیت اور موسیقی سے عشق تھا۔ پاکستانی گھرانوں کے ساتھ میل جول رکھتی تھی اور ان میں گھل مل کے بالکل ان جیسی ہو جاتی تھی۔

جہانگیر اس سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ وہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ پرخلوص اور ملنسار بھی تھی۔ وہ بڑی اچھی مصور تھی۔ وکی نے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ جسے انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے قبول کر لیا تھا پھر وہ اس سے جلد ملنے کا وعدہ کر کے گھر لوٹ آئے تھے۔

☆☆☆

آج ''لالہ زار'' میں روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ لان میں ہر طرف خوشبو اور توس قزح کے

رنگ بکھر ہوئے تھے۔ گیٹ سے باہر سڑک کے اطراف گاڑیوں کی لمبی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ سرخ قمقموں کی سجاوٹ قابل دید تھی۔ کتنے ہی مہمان آچکے تھے۔ سریلے قہقہوں سے بار بار فضا گونج اٹھتی۔ یہ تقریب زینت بیگم نے اپنے لاڈلے نواسے سے جہانگیر رضا کی شاندار کامیابی کی خوشی میں کی تھی۔ جہانگیر رضا بہترڈنر سوٹ میں ملبوس اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ زیادہ تر مہمان آچکے تھے مگر انہیں جس کا انتظار تھا، وہ اب تک نہیں آئی تھی۔ وہ بار بار گھڑی دیکھتے۔ اب تک اسے آجانا چاہیے تھا۔ فراز ان کے ساتھ کھڑا تھا۔ کچھ کچھ ان کی بے تابی بھانپ گیا۔

''کیا کوئی خاص مہمان آنے والا ہے؟'' وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

''آں...... نہیں تو۔'' وہ ایک دم گڑبڑا گئے۔

فراز پھر کچھ شرارت سے کہنے ہی والا تھا کہ وہ کسی کو آتا دیکھ کر اچانک سیڑھیاں اتر کر اس کی طرف بڑھ گئے اور جب وہ پلٹے تو وکی ان کے ساتھ تھی۔ بلیو بلیک اور ریڈ نگ کے چیک کے پینٹ پر سرخ جرسی اور بلو ہاف کوٹ پہنے وہ ان کے بازو میں ہاتھ ڈالے بڑی بے تکلفی سے ہنستی ہوئی چلی آرہی تھی۔ تھوڑی دیر کو تو فراز بھی اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ واقعی اتنی حسین اور پرکشش تھی کہ ایک ہی نظر میں بری طرح متاثر کردیتی تھی۔

جہانگیر اور وکی سیڑھیاں طے کر کے فراز کے نزدیک آگئے۔ جہانگیر نے وکی کا فراز سے تعارف کرایا۔ وہ اس وقت اتنے خوش تھے کہ جیسے دونوں جہاں مل گئے ہوں۔ آنکھوں کی چمک اس قدر بڑھ گئی تھی کہ فراز انہیں دیکھ کر چونک گیا اور اس کے دل میں فوراً ایک خیال نے سر ابھارا مگر وہ جلد ہی سر جھٹک کر کسی مہمان کو ریسیو کرنے بڑھ گیا کیوں کہ جہانگیر تو وکی کو ساتھ لے کر فوراً اندر لاؤنج میں چلے گئے تھے۔

''اتنی دیر کیوں کردی۔'' انہوں نے شکوہ کیا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں جہانگیر! تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ دراصل مجھے آرٹس کونسل میں دیر ہوگئی۔ میں گھر بھی نہیں گئی، سیدھی یہاں آرہی ہوں۔'' اس نے دلنشیں انداز میں معذرت کی کہ وہ خفگی بھول کر خوش دلی سے مسکرادیے۔

''اچھا چلو...... تمہیں اپنے گھر والوں سے ملواؤں۔''

پھر جب جہانگیر نے اسے سب سے ملوانا شروع کیا تو وہ ان کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔ جہانگیر کی نانی زینت بیگم اس قدر باوقار اور حسین عورت تھیں کہ وہ ان سے مرعوب ہوکر رہ گئی پھر ان کی ساری کزنز اور بہنیں ایسی پیاری شکلوں کی تھیں اس پر ان کے بات کرنے کا دلنشین انداز دھیمی دھیمی ہنسی، دل موہ لینے والی ادائیں۔ بے تحاشا قیمتی اور خوب صورت کپڑوں میں لپٹی وہ بہت جلد وکی سے گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔

وکی کتنے ہی لوگوں سے ملتی جلتی چلی آئی تھی مگر اتنے پیارے اور پرخلوص لوگوں سے ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ یہاں آکر اسے بالکل اجنبیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ خاطور پر ثمرہ اور ثمینہ نے اس سے اتنی مہمان نوازی برتی کہ وہ ان کے اخلاق کی گرویدہ ہوگئی۔ جہانگیر نے اس کی بے حد خاطر کیں۔ وہ اس کے آگے پیچھے جارہے تھے اور وکی ہی دل میں شرمندہ ہوتی جارہی تھی۔ دراصل اس کو یہ گمان نہ تھا کہ جہانگیر اتنے اعلیٰ خاندان کی چشم، چراغ ہوں گے۔ اب تک اس کا ملنا جلنا اونچی سوسائٹی میں ہی تھا مگر کسی نواب خاندان کی شان وشوکت اور ٹھاٹھ باٹھ پہلی دفعہ دیکھنے میں آئے تھے۔ وہ سب کو حیران ہو ہو کر دیکھتی رہی۔

پھر وہ تینوں کھانا کھارہی تھیں۔ جب ہی جہانگیر ان کی طرف چلے آئے۔

''وکی! تم تکلف کررہی ہو اور یہ بہت غلط بات ہے۔''

پھر وہ منع ہی کرتی رہ گئی اور جہانگیر نے اس کی پلیٹ میں کئی چیزیں ڈال دیں۔ ثمرہ کو انہوں نے بری

طرح نظر انداز کر دیا تھا۔ ثمرہ نے اس بات کو بری طرح محسوس کیا اور پہلی دفعہ نظر اٹھا کر بڑے غور سے ان کی طرف دیکھا مگر وہ وکی میں محو تھے۔ تب ہی اس نے ان کی آنکھوں اور چہرے پر وہ خوشی لرزتی دیکھی جیسی خود اس کے چہرے پر جہانگیر کو دیکھ کر لرزتی تھی۔ اس کو شدت کی پیاس محسوس ہوئی اور وہ معذرت کر کے مڑ گئی۔

کھانے کے بعد قوالیوں کا پروگرام تھا مگر وکی ٹھہر نہ سکی کیوں کہ اس کا گھر خاصا دور اور سنسان علاقے میں تھا اور اسے اکیلا جانا تھا۔ جہانگیر اسے باہر تک چھوڑنے آئے۔ اس نے انہیں اپنے گھر آنے کی پرزور دعوت دی جسے وہ رد نہ کر سکے اور اس سے جلد ملنے کا وعدہ کر کے مہمانوں میں آ گئے۔

پھر جب قوالیاں شروع ہوئیں اور وہ اور ثمینہ بیٹھنے لگیں تو جہانگیر بھی آ کر ثمرہ کے برابر میں بیٹھ گئے مگر وہ ان سے نہ کوئی بات کر سکی اور نہ ہی انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ثمینہ کی باتوں کا ہاں ہوں میں جوب دیتی رہی اور جہانگیر اپنے ہی خیالوں میں کھوئے بیٹھے خالی خالی نظروں سے ہر ایک کو دیکھتے رہے۔

وکی سے جلد ملنے کا وعدہ تو انہوں نے کر لیا تھا مگر پھر ایسا ہوا کہ وہ اپنی فرم کی اسٹیبلشمنٹ کے سلسلے میں اس قدر مصروف ہو گئے کہ دو تین ہفتے گزرنے کے باوجود بھی وہ اتنا وقت نہ نکال سکے کہ ذرا دیر کو ہی وکی سے ملنے جا سکتے۔

اس دن بھی وہ بالکل سورج ڈھلنے کے بعد گھر میں داخل ہوئے تھے۔ ملازم کو چائے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے آنے کے تھوڑی دیر بعد میں ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

وکی کا فون تھا اور وہ ان سے بہت شکایت کر رہی تھی کہ اب تک اس کے ہاں ملنے نہیں آئے۔ انہوں نے اس سے معذرت کی اور تھوڑی دیر میں ملنے کا وعدہ کر لیا۔

وہ تیار ہو کر نیچے اترے تو سیڑھیوں پر ہی ثمرہ اور ثمینہ منہ پھلائے ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

''خیریت؟'' وہ باری باری دونوں کی طرف ان کے تے ہوئے موڈ کو دیکھ کر ہنس پڑے۔

''آپ نے صبح کیا وعدہ کیا تھا؟'' ثمینہ نے فوراً پھٹ پڑی۔

''یاد نہیں۔'' وہ انہیں چڑانے کے لیے لاپروائی سے بولے حالاں کہ انہیں خوب یاد تھا کہ انہوں نے پکچر دکھانے اور سینڈوچز کھلانے کا عدہ کیا تھا۔

''صبح آپ نے نہیں کہا تھا کہ تم دونوں کو پکچر دکھاؤں گا۔'' ثمینہ مارے غصے اور ضبط کے لال ہو رہی تھی اور ثمرہ چپ کھڑی تھی۔ دونوں لڑکیاں بے چاریاں ایک گھنٹے سے تیار ہو کر بیٹھی ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

''اوہو'' وہ تاسف سے بولے'' فیصل کے ساتھ چلی جاؤ۔'' وہ کچھ سوچ کر بولے۔

''نہیں......اس سے ہماری لڑائی ہے۔'' ثمرہ نے جھٹ انکار کر دیا۔

''ارے وہ کیوں؟'' وہ ہنس پڑے۔

''نہیں۔ اس کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ جانا ہوتا تو ہم آپ سے کیوں کہتے؟'' ثمینہ بھی کسی طرح راضی نہ تھی۔

''اچھا تمہاری دوستی کرا دیں پھر تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟'' وہ دونوں کو کسی طرح ٹالنا چاہ رہے تھے مگر وہ تھیں کہ ٹلنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

''نہیں ہم نہیں جائیں گے اس کے ساتھ۔ وہ اتنی بدتمیزی کرتا ہے۔'' ثمرہ نے ناک چڑھائی۔

''ہاں نہیں تو ساری پکچر کا مزا خراب کر دے گا اور سینڈوچز تو بالکل نہیں کھلائے گا۔'' ثمینہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اب تو وقت بھی نہیں رہا۔ کل سہی'' وہ گھڑی دیکھ کر جلدی سے اترنے لگے۔

''کل تو کبھی آئے گا ہی نہیں۔'' ثمینہ جل کر بولی۔ وہ سنی ان سنی کر کے باہر نکلتے چلے گئے۔

''اب کیا کریں؟'' ثمرہ بے چارگی سے بولی''

ایک گھنٹے سے تیار بیٹھے ہیں۔ سچ میں بڑی بور ہو رہی ہوں اس وقت۔"
"آج تو مجھے ہر صورت میں جانا ہے۔" ثمینہ بھی ضد میں آ گئی۔ "اب بھیا سے بالکل بات نہیں کرنا۔ ایسے ہی اڑاتے رہتے ہیں۔ میرا نہیں تو تمہارا ہی کچھ خیال لیتے۔" ثمینہ نے جو اسے جتایا تو اسے بھی اپنے نظر انداز کیے جانے پر بڑی انسلٹ محسوس ہوئی مگر وہ کچھ نہ بولی۔ ثمینہ نے اب دیکھا کہ اس کا موڈ بری طرح آف ہونے والا ہے تو دھیمے لہجے میں پوچھنے لگی۔
"چلو فیصل سے دوستی کر لیں۔" لڑائی تو ثمرہ سے ہوئی تھی۔ بیچ میں ثمینہ بھی آ کودی تھی کیوں کہ جب ثمینہ کی کسی سے لڑائی ہوتی تھی تو ثمرہ کا بولنا لازمی تھا۔ یوں دونوں کا فرض تھا کہ لڑائی بھی ساتھ مل کر کریں۔
دونوں بہت سوکھے منہ بنائے فیصل کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ سامنے ہی کرسی پر بیٹھا میز پر ٹانگیں پھیلائے کوئی میگزین دیکھ رہا تھا۔ ریڈیو کی تیز آواز سے پورا کمرا گونج رہا تھا۔ ان دونوں کو آتا دیکھ کر وہ میگزین منہ پر رکھ کر ٹانگیں پھیلا کر سوتا بن گیا۔
ثمینہ نے ثمرہ کو ٹھوکا دیا کہ وہ پہلے بات کرے کیوں کہ لڑی تو وہی تھی۔
"فیصل!" اس نے بڑے پیارے سے پکارا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔
"پیارے بھائی! ایک بات سنو۔" ثمرہ پھر لجاجت سے بولی۔ ثمینہ کو ہنسی آ گئی۔ فیصل نے تھوڑا سا اٹھ کر ریڈیو کی آواز فل کر دی اور پھر پہلے کی طرح لیٹ گیا۔
ثمینہ نے پہلے ریڈیو بند کیا اور پھر جو دونوں نے مل کے خوشامدیں شروع کی ہیں تو فیصل کو ہنسی روکنا دشوار ہو گیا۔ وہ دونوں مستقل بولے جا رہی تھیں اور اس کا ہر وہ کام کرنے کا وعدہ کر رہی تھیں جو وہ ان سے کبھی کہتا بھی نہ تھا اور اسے ہنستا دیکھ کر تو دونوں اور بھی زور شور سے منت سماجت میں لگی تھیں۔
"بس...... بس میری رانیوں بس۔" وہ بے تحاشا ہنسی روکتا ہوا ہاتھ اٹھا کر بولا۔
"اتنے بڑے دعوے مت کرو۔ ابھی جو سزا دوں گا تو بھڑک اٹھو گی۔"
"نہیں نہیں تم جو کہو گے ہم کریں گے۔" ثمینہ بول پڑی۔ "بس تم ہمیں لے چلو۔"
"اچھا...... ایک شرط۔" وہ بہت اکڑ کر بولا۔
"کیا؟" دونوں سوالیہ نشان بنی کھڑی تھیں۔
"پہلے وعدہ کرو جو کہوں گا وہ کرو گی۔"
"ہاں...... ہاں!" دونوں اثبات میں سر ہل گئیں۔
صبح ثمرہ نے لڑائی کی تھی اور آپ نے ان کا ساتھ دیا تھا۔" وہ ثمینہ سے مخاطب ہوا۔
"اس لیے۔" ثمرہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ سزا کے طور پر اسی وقت میرے جوتے پالش کیجیے۔" ثمرہ فوراً چلا پڑی۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ثمینہ سے بولا۔ "آپ کی سزا تھوڑی نرم سی ہے حالاں کہ ہونا نہیں چاہیے تھی بہر حال میرے کپڑوں پر استری کیجیے۔ میں ذرا نہا کر آؤں۔" وہ نوابوں کی سی شان سے کرسی سے اٹھا اور کھٹ سے غسل خانے کا دروازہ بند کیا۔ ثمینہ نے اتنی سزا پر شکر کیا مگر ثمرہ نے تو نہ جانے کتنی گالیاں دے ڈالیں۔ ثمینہ نے اسے دلاسا دیا۔
"بس ایک برش مار دو۔ ورنہ نہیں لے جائے گا۔ کیا فائدہ۔" دونوں مل کر کوستی رہیں۔ وہ اپنے اگلے پچھلے بدلے اسی طرح نکالتا تھا۔
پھر وہ بڑی شان سے تیار ہو کر دونوں پر خواہ مخواہ کا رعب جماتا رہا۔
"اپنے پیسے نکالو۔ میں ایک پائی بھی خرچ نہیں کروں گا اور خبردار جو سینما ہال میں کچھ کھانے پینے کی بات کی۔ ندیدیاں ہر وقت رال ٹپکاتی رہتی ہیں ہر چیز پر۔" دونوں غصے سے لال پیلی چپ چاپ اس کی بکواس برداشت کرتی رہیں۔
ادھر جہانگیر وغیرہ کے یہاں پہنچے تو وہ سراپا انتظار

بنی کھڑی تھی۔ انہیں دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھ آئی۔

''تم اتنے دن سے آئے کیوں نہیں؟ میں روز انتظار کیا۔'' وکی نے بڑے ناز سے شکوہ کیا۔

''سچ؟'' وہ بے یقینی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا دیے۔

''ہوں۔'' اس کی بھیگی بھیگی نیلی آنکھیں اور چمک اٹھیں۔

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم میرا انتظار کرتی رہیں تو میں آج بھی نہ آتا۔'' وہ شرارت سے بولے۔

''کیوں۔'' وکی فوراً ناراض ہوگئی۔

''اس لیے کہ......'' وہ ذرا جھجکے۔ ''اس لیے کہ تم اور شدت سے انتظار کرتیں اور پھر مجھے اچانک دیکھ کر تمہاری آنکھوں میں جو چمک اٹھتی تو تم اتنی حسین لگتیں کہ......'' وہ رک کر ہنس پڑے۔ ''تم اس وقت بھی اتنی حسین لگ رہی ہو کہ مجھے کوئی تشبیہ سمجھ میں نہیں آرہی۔''

ان کی بات سن کر وکی دھیمے سے مسکرادی۔

''کیا تمہیں اب بھی اندازہ نہیں کہ میں تمہارا کتنا شدت سے انتظار کرتی رہی؟''

''وکی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑے ناز سے شکوہ کرتی رہی اور جہانگیر اپنی کوتاہی پر بڑے دلنشین انداز میں معذرت کرتے رہے تھے۔

''آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ اپنی اس لاپروائی پر سخت پشیمانی ہے۔

وہ شوخی سے اس کے سامنے جھکے۔ مسکراتے ہوئے اتنے اچھے لگ رہے تھے کہ وہ سب شکوہ شکایت بھول گئی۔ ان کے اس انداز پر زور سے ہنس پڑی اور پھر ان کا بازو تھامے انہیں اندر لے گئی۔

اس دن وہ وکی کے ڈیڈی اور ماما سے ملے۔ وکی کی مما بہت خوب صورت تھیں بالکل وکی طرح۔ اس عمر میں وہ اتنی اسمارٹ اور چاق و چوبند تھیں کہ وکی کی بڑی بہن لگتی تھیں۔ انہوں نے بھی جہانگیر کو بے حد پسند کیا اور بڑی دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے پھر وکی انہیں اپنے اسٹوڈیو میں لے گئی۔ وہ اس کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ بڑی اچھی آرٹسٹ تھی حالاں کہ ابھی اسٹوڈنٹ تھی مگر پھر بھی اس کے فن میں بڑی پختگی تھی اور ایک انفرادیت بھی پائی جاتی تھی۔ وہ اس کی ایک ایک تصویر کو دیکھتے رہے۔ سراہتے رہے اور وکی مارے خوشی اور جوش کے سرخ ہوتی رہی۔

پھر وہ دونوں آؤٹنگ کے لیے نکل گئے۔ ان دن انہوں نے ڈھیر ساری باتیں کیں۔ وکی میٹھے پان بڑے شوق سے کھاتی تھی جہانگیر نے سنا تو انہیں بڑی ہنسی آئی وہ دیر تک ہنستے رہے۔

''میں روز ایک میٹھا پان کھاتی ہوں۔ سچ جب میرے ہونٹ اور زبان لال ہوجاتے ہیں مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔'' وہ اتنی معصومیت سے کہہ رہی تھی کہ انہیں بے اختیار اس پر پیار آگیا۔

پھر جب وہ دو تین گھنٹے وکی کے ساتھ گزار کر گھر لوٹے تو وہ دونوں فیصل کے ساتھ پکچر دیکھنے گئی تھیں۔ وہ یہ سوچ کر ہی ہنس دیے کہ فیصل نے انہیں کتنا پریشان کیا ہوگا پھر انہیں لے گیا ہوگا۔ وہ اس کی فطرت سے واقف جو تھے پھر انہوں نے سوچا کہ وہ کل ان دونوں کو ضرور پکچر دکھائیں گے اور جہاں وہ کہیں گی وہاں لے جائیں گے۔

دوسرے دن اتوار تھا اور صبح سے وہ دونوں فیصل اور احمر کے ساتھ بیٹھی کیرم کھیلتی رہیں۔ لاؤنج میں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا کیوں کہ وہ دونوں مستقل بے ایمانی کررہے تھے۔ وہ دونوں لڑکیاں مسلسل ہار رہی تھیں اور ان سے لڑے جارہی تھیں پھر بھی اسی امید میں جمی بیٹھی تھیں کہ اس بورڈ میں ان شاء اللہ ضرور ہرادیں گے۔ وہ دونوں فیصل اور احمر سے اس قدر برابری سے زبان چلارہی تھیں کہ جہانگیر حیران رہ گئے کیوں کہ وہ دونوں ان سے تین چار سال بڑے تھے مگر وہ کسی کو بھائی وائی نہیں کہتی تھیں۔ ٹھاٹ سے سب کے نام لیتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا۔

''تم کوئی ہمارے نانا، دادا جتنے تھوڑی ہو جو ہم تمہیں بھائی جان کہیں۔ تین چار سال کی بڑائی بھی

کوئی بڑائی ہوتی ہے۔"

پھر سب لڑکے تھک ہار کر بیٹھ گئے کیوں کہ وہ اور زیادہ انہیں چڑاتی تھیں۔ انہوں نے ٹوکنا چھوڑ دیا تو وہ خود ہی راہ راست پر آگئیں۔ فیصل چڑ کر کہتا تھا۔

"اصل میں ان سب کا دماغ دادی حضور نے خراب کیا ہے۔ کسی کو اپنے آگے کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ ہماری اماں بنی بیٹھی ہیں۔"

حقیقت بھی یہی تھی کہ اور لوگوں کے برعکس زینت بیگم لڑکوں کے بجائے لڑکیوں کو زیادہ چاہتی تھیں۔ انہوں نے سب کو یکساں آزادی دے رکھی تھی مگر ان کی تربیت اس ڈھنگ سے ہوئی تھی کہ وہ اس کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتی تھیں۔ اپنی من مانی کرتی تھیں اور لڑکوں کو تو بالکل گھاس نہیں ڈالتی تھیں اور اسی لیے سب لڑکوں کی متفقہ رائے تھی کہ وہ سب بہت منہ چڑھی، خودسر اور بدتمیز لڑکیاں ہیں۔ دوسروں پر اچھا تاثر دینے کے لیے بہت میٹھی بن جاتی ہیں۔ بن بن کے بولتی ہیں۔ بالکل میٹھی چھری ہیں اور ان سے زیادہ زبان دراز لڑکیاں سارے جہان میں چراغ لے کے ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملیں گی اور اس وقت تو یہ مثل ان پر بالکل صادق آرہی تھی۔

"فیصل کے بچے تم نے میری گوٹ کھسکائی ہے۔" ثمرہ لڑ پڑی۔

"جھوٹ نہیں بولو۔ میرا ہاتھ نیچے تھا۔" فیصل بھی دھاڑا۔

"تم جھوٹے ہو۔ میری گوٹ بالکل صاف جارہی تھی تم نے ادھر کھسکا کر اپنی گوٹ اٹکائی ہے۔" ثمرہ نے چلا کر اپنی گوٹ واپس رکھوا کر ہی دم لیا۔ کھیل پھر شروع ہوا۔ جہانگیر ان کے قریب آگئے اور بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھتے رہے اور ان کی بے ایمانیوں اور لڑائیوں پر ہنستے رہے۔

پھر ایسا ہوا کہ احمر کی گوٹ پاکٹ ہوتے ہوتے رہ گئی کیوں کہ ثمینہ نے نیچے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں لڑ پڑے۔ فیصل سگریٹ سلگانے کو دوسری طرف جھک گیا۔ ثمرہ نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر بے ایمانی سے دوسری باری لے لی۔ تیسری بار لینے کے لیے اس نے پھر اسٹرئیکر رکھا ہی تھا کہ جہانگیر بول پڑے۔

"ارے..... ارے بے ایمانی کررہی ہو۔ کتنی باریاں لوگی؟"

"آپ چپ رہیں۔ آپ کون ہوتے ہیں، دخل دینے والے؟" وہ تڑخ کر بولی اور پھر چھنگلی دکھاتے ہوئے بولی "آپ سے ہماری کٹی ہے۔"

جہانگیر کو اس کا طرز تخاطب بہت ناگوار گزرا۔ ثمرہ نے واقعی بہت بدتمیزی سے بات کی تھی۔ وہ تیز لہجے میں بولے۔

"تمیز سے بات کیا کرو ثمرہ ورنہ میں تمہارا دماغ صحیح کردوں گا۔" اور تیز تیز قدموں سے لاؤنج سے نکلتے چلے گئے۔

وہ چاروں ایک دم سناٹے میں آگئے۔ تھوڑی دیر بعد فیصل نے یاد دلایا کہ کھیل ادھورا پڑا ہے مگر ثمرہ تیزی سے کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر سیڑھیاں پھلا اوپر چلی گئی اور تینوں ہونق بنے بیٹھے رہ گئے۔ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

پھر تھوڑی دیر بعد کپڑے بدل کر نیچے آئی اور کسی کی طرف دیکھے بغیر دادی حضور کے کمرے میں گئی اور پھر وہاں سے نکل کر اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور ان لوگوں سے قریب سے ہو کر گزر گئی۔

"ثمرہ!" ثمینہ نے اسے پکارا۔ اس کے پیچھے جانے لگی مگر فیصل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پھر بٹھا دیا۔

"جانے دو۔ اس وقت بہت زیادہ چڑی ہوئی ہے اور دماغ کھائے گی۔"

"مگر پتا تو چلے کہاں جارہی ہے؟" ثمینہ بے چاری پریشان ہوگئی۔

"پوچھوگی تو تھپڑ ہی کھاؤ گی۔ اسے جانے دو۔ وہ کوئی غلط کام تو نہیں کرے گی۔" فیصل نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔

احمر بالکل چپ بیٹھا تھا۔ بہن کی بے عزتی اسے بھی شاق گزری تھی مگر ایک تو جہانگیر اس سے بہت بڑے تھے پھر ثمرہ کے منگیتر بھی تھے اور سب سے بڑی

بات یہ کہ ثمرہ نے اس وقت واقعی بدتمیزی کی تھی۔ وہ انہیں کسی طرح بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔
ثمرہ اور ثمینہ تو ان سے چڑی بیٹھی تھیں کیوں کہ وہ ان کو پروگرام کے مطابق لے نہیں گئے تھے پھر دونوں مستقل ہار رہی تھیں۔ کچھ اس بات کا بھی غصہ تھا جو ثمرہ ان کے ٹوکنے پر یوں چیخ اٹھی۔ بہر حال اس وقت ثمرہ کے جانے کے بعد سب ہی اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔
وہ سارا دن ثمرہ نے اپنی سہیلی نیٹو کے گھر گزارا۔
اور جہانگیر...... وہ وکی کو ساتھ لیے شہر سے باہر پر فضا مقام پر سارا دن گھومتے رہے۔
شام کو ثمرہ اور نیٹو پکچر دیکھ کر لوٹیں۔ وہ اسے چھوڑنے ڈرگ روڈ پر نکل آئی۔ نیٹو کا گھر ریسٹورنٹ کے ساتھ والی سڑک پر اندر کچھ دور جا کر تھا۔ ثمرہ نے جیسے ہی مین روڈ سے گاڑی اندر سڑک پر موڑی۔ اس کی نظر جہانگیر پر پڑی۔ وہ اپنی گاڑی سے اتر رہے تھے مگر وہ اکیلے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی۔ ثمرہ نے کار آہستہ کر لی پھر انہوں نے دیکھا کہ جہانگیر نے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر وکی کو سہارا دے کر اتارا تھا۔ وکی گہرے نیلے جینز اور زرد بلاؤز میں اپنے کندھے تک پڑے بالوں کو نیلے اور زرد پرنٹ کے بڑے خوب صورت اسکارف سے باندھے جہانگیر کا ہاتھ پکڑے پکڑے اتری اور پھر جہانگیر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اسے ریسٹورنٹ کے اندر لے گئے۔
"ارے سامنے دیکھ ثمرہ!" نیٹو کے یکا یک چیخنے پر وہ گھبرا کر زور سے بریک دبا بیٹھی اور گاڑی کے سامنے اچانک آنے والا بچہ بال بال بچ گیا۔
نیٹو کو گھر پر چھوڑ کر واپس آتے وقت شدت سے اس کا دل چاہا کہ وہ بھی اتر کر اندر جائے اور جہانگیر کو اپنی موجودگی جتا دے مگر پھر اسے دادی حضور کا خیال آ گیا جو اتنی زیادہ آزادی کی قائل نہیں تھیں کہ اکیلی لڑکیاں اس قسم کے پوش ریسٹورنٹ میں جا جا کر کافی پیالیاں اڑائیں اور پھر خود اس کی کیا وقعت رہ جاتی جہانگیر کی نظروں میں۔ جن کے خیال میں وہ بگڑی ہوئی مغرور اور بدتمیز لڑکی تھی۔
پھر وہ مغرب ہونے سے پہلے گھر میں داخل ہوئی تھی اور اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی تھی اور جہانگیر کی واپسی بارہ بجے رات کو ہوئی تھی۔
کئی دن گزر گئے۔ ثمرہ آپ ہی آپ ٹھیک ہو گئی۔ وہی ہنسی مذاق اور کھیل تماشے پھر شروع ہو گئے۔ ثمرہ اور جہانگیر آپ ہی آپ بالکل غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ دونوں میں بات چیت بالکل بند تھی۔ جہانگیر گھر میں ٹکتے ہی کب تھے۔ ان کی فرم نے کئی دن ہوئے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ کافی جم چکے تھے اور ان کا معمول بن گیا تھا کہ آفس سے آ کر ایک ڈیڑھ گھنٹا آرام کرتے اور پھر بن سنور کر نکل جاتے۔ رات کا کھانا بھی گھر پر شاذ و نادر ہی کھاتے تھے۔ سب ہی سمجھتے تھے کہ نئی نئی فرم ہے ابھی کام شروع ہوا ہے اس لیے انہیں بہت لوگوں سے ملنا پڑتا ہوگا۔
حقیقت ثمرہ کو معلوم تھی کہ ان کی شامیں کہاں گزرتی ہیں۔ صرف وہی جانتی تھی کہ اس کی شامیں وکی کے ساتھ گزرا کرتی ہیں۔

☆☆☆

جہانگیر اور وکی کی ملاقاتوں کو چھ مہینے گزر گئے۔ وہ ہر دوسرے دن اس سے ملا کرتے تھے۔ ان دن بھی وہ بڑے اہتمام سے تیار ہو کر گھر سے نکلے تھے۔ وکی نے انہیں اپنے گھر رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ وہ وکی کے یہاں پہنچے تو بڑی خاموشی تھی اور اس خاموشی کو پیانو کی ہلکی سی آواز توڑ رہی تھی۔ گاڑی پورچ میں روک کر وہ وارنڈے میں آ گئے۔ اندر سے پیانو پر پیاری دھن کی آواز آ رہی تھی۔
وہ کال بیل بجائے بغیر ہی بڑی بے تکلفی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ان کے قدم بے اختیار رک گئے۔ اس قدر فسوں خیز ماحول تھا۔ بڑی بڑی موم بتیاں جل

رہی تھیں اوران کی روشنی نے خواب ناک ماحول پیدا کر دیا تھا۔ جس نے ان کے حواسوں پر عجیب سا تاثر چھوڑا تھا اور اب سے بڑھ کر خود کا وجود۔

وہ نارنجی سی سادی سی ساری پہنے تھی۔ پیانو پر رکھی بڑی سی موم بتی کی پوری روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ جس سے اس کے چہرے کی رنگت میں لالیاں سی گھل رہی تھیں اور نیلی آنکھیں چمک کر اور بھیگی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے نارنجی لپ اسٹک لگے ہونٹوں پر اتنی پیاری مسکراہٹ تھی کہ جہانگیر اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ وہ مسلسل اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی اور پیانو بجاتی رہی۔ ہونٹوں پر وہی پیاری سی مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ وہ از خود رفتہ حالت میں اس کی طرف بڑھ گئے اور اس کے بالکل سامنے جا کر پیانو پر ہاتھ ٹیک کر اس کی طرف جھک گئے۔ اس نے دھن ختم کر کے اپنے دونوں ہاتھ جہانگیر کے ہاتھوں پر رکھ دیے۔ جہانگیر نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

''یہ کینڈل پارٹی کس خوشی میں ہے؟'' وہ چاروں طرف دیکھ کر بولے۔

''آج میری برتھ ڈے ہے۔'' وہ آنکھیں بند کر مسکرا دی۔

''سچ؟......تم نے مجھے کل کیوں نہیں بتایا؟'' جہانگیر نے شکایت کی۔

''اس لیے کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم میرے لیے کوئی تحفہ لاؤ۔'' وہ آنکھیں کھول کر ہنس دی۔

''کیوں؟'' جہانگیر کی پریشانی شکنیں پڑ گئیں۔

''میں اپنا تحفہ تم سے خود مانگوں گی۔'' وہ ان سے قریب ہو گئی۔

جہانگیر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وکی نے اپنا ہاتھ ان کے منہ پر رکھ دیا۔

''بس...... باقی باتیں کھانے کے بعد۔'' وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ چھوٹی گول میز پر دو بڑی خوب صورت برتھ ڈے کینڈلز جل رہی تھیں اور ایک چھوٹا سا برتھ ڈے کیک......

کھانا انہوں نے بے حد خوشی سے کھایا۔ جہانگیر بے حد کوشش کے باوجود کوئی بات نہ کر سکے۔ وکی بھی سر جھکا کر کھاتی رہی۔ اس کی مختصر باتوں کا وہ ہاں ہوں میں جواب دیتے رہے۔

کھانے کے بعد وہ دونوں لان میں نکل آئے۔ وکی خاموش تھی اور جہانگیر اس کی خاموشی سے الجھ رہے تھے۔

''کیا کسی بات پر ناراض ہو یا......؟'' وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھی۔

''میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔''

''پھر اتنی خاموشی کیوں ہے؟''

''میں اپنے آپ کو اس بات کے لیے تیار کر رہی ہوں کہ تم اگر وہ چیز مجھے نہ دے سکے جو میں تم سے مانگوں گی تو......!''

''تم مانگ کر تو دیکھو۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولے۔ ''تم میری جان بھی مانگو گی تو میں انکار نہیں کروں گا۔''

''جہانگیر!'' وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ ''تمہاری جان اتنی ازراں نہیں کہ اسے مجھ جیسی ہستی مانگے۔ تم جو میرے لیے جانے کیا بن گئے ہو۔'' وہ ان کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں تک لے گئی۔ اس کی آنکھوں کی نمی جہانگیر کے ہاتھوں میں آ گئی۔

وہ شدت جذبات سے کچھ بول نہ سکے۔ وکی نے سر اٹھا کر ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے دھیمے انداز میں مخاطب کیا۔

''میں تم سے تمہیں مانگ رہی ہوں جہانگیر! میں صرف تمہیں چاہتی ہوں۔''

جہانگیر جو پہلے ہی شدت جذبات سے مغلوب تھے اب دلی مراد بر آتے دیکھ کر مارے خوشی سے گنگ رہ گئے۔ کچھ جواب نہ دے سکے۔

''تم شاید یہ سوچ رہے ہو کہ ہم دونوں کے درمیان مذہب کی دیوار حائل ہے مگر یقین کرو یہ بالکل کھوکھلی دیوار ہے ہم ایک جھٹکے میں گرا سکتے ہیں۔ میں تمہاری خاطر اپنا مذہب بدلنے کا فیصلہ کر چکی

ہوں۔ میں تمہارے لیے مما ڈیڈی کو بھی چھوڑ سکتی ہوں۔'' اس کی آواز بھرا گئی مگر وہ برابر بولتی رہی۔
''پچھلے ایک ہفتے سے میری مما اور ڈیڈی سے مستقل بحث اور لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ وہ دونوں مجھ سے سخت ناراض ہیں کیوں کہ وہ دونوں کٹر مذہبی ہیں مگر میں ان کو اپنا اٹل فیصلہ سنا چکی ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جہانگیر! کیا تم اب بھی مجھ کو ٹھکرا دو گے؟'' اس کی نیلی آنکھوں سے آنسو پھسل پھسل کر جہانگیر کے ہاتھوں میں جذب ہوتے رہے۔
''تم نے ایسا کیوں سوچا۔ ایسا کیوں کہا کہ میں تمہیں ٹھکرا دوں گا۔'' جہانگیر نے اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا تو وہ ان کے سینے سے لگ کر سسک پڑی۔
''تم میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہو وکی! کیا تم اتنے دنوں میں میرے جذبات کا اندازہ نہیں لگا سکیں۔ جب تم میرے لیے اتنا کر سکتی ہو تو میں اس سے بڑھ کر تمہارے لیے کر سکتا ہوں۔ کیا تمہیں مجھ پر ذرا اعتماد نہیں تھا؟ انہوں نے شکایت کی تو وہ آنسوؤں کے درمیان مسکرا دی۔
''اسی اعتماد کے سہارے تو اتنا بڑا قدم اٹھانے کی جرأت کی ہے۔ تم دیکھ لینا۔ اعتماد کچے دھاگے کی طرح نہیں ہوگا۔ ہم اسی اعتماد سے اپنی منزل پا لیں گے۔'' جہانگیر اسے یوں ہی سینے سے لگائے رہے اور سوچتے رہے کہ اب انہیں بہت ثابت قدمی سے طوفان سے نمٹنا ہوگا جو ثمرہ سے ان کی آٹھ سال پرانی منگنی ٹوٹنے پر برپا ہوگا۔
پھر انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کل ہی خود زینت بیگم سے بات کریں گے۔

☆☆☆

پھر دوسرے دن تنہائی میں موقع پا کر جب جہانگیر نے بہت ہمت کر کے زینت بیگم سے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ شیرنی کی طرح دھاڑ اٹھیں۔
''تم کو اتنی جرأت کیسے ہوئی تم نے کیا سمجھ کر یہ بات کی ہے؟ تمہاری اتنی خودسری کہ تم ہمارے اتنے پرانے فیصلے کے خلاف آواز اٹھاؤ۔ یاد رکھو جہانگیر! ہم اپنے لاڈ و پیار میں خودسری برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم سونے کا نوالہ کھلاتے ہیں مگر شیرنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تم نے ہماری بے عزتی کی ہے۔ ثمرہ ہماری ایک ہی پوتی ہے۔ تم نے اس کی بے عزتی کی ہے۔ یہ ہمارے خاندان کے وقار کا مسئلہ ہے۔ تم نے ہماری بیٹی کو ٹھکرا دیا ہے۔ ہم اپنے خاندان کی یہ تذلیل برداشت نہیں کر سکتے۔'' وہ گرجتی دھاڑتی رہیں۔ انہیں سخت سست کہتی رہیں مگر وہ ان سب کے لیے اپنے آپ کو اچھی طرح تیار کر کے آئے تھے۔
''گستاخی معاف نانی حضور! مجھے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق ہے اور میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔'' ان کے خاموش ہوتے ہی جہانگیر بڑے آہستہ سے بولے تو وہ ان کے بات پر بری طرح بپھر گئیں۔
''آٹھ سال پہلے بھی تم نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا فیصلہ کیا تھا۔ ثمرہ تمہاری پسند تھی۔ تم نے خود ہی اسے اپنانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ہم نے تمہاری پسند کو ملحوظ خاطر رکھ کر تم دونوں کو انگوٹھیاں پہنائی تھیں۔''
''اس وقت کی بات دوسری تھی۔ اب میں۔'' وہ ان کی بات کاٹ کر بولیں۔
''اب تم ساری دنیا گھوم آئے ہو اس لیے تمہاری پسند کا معیار بھی بدل گیا ہے مگر یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اور نہ اتنی آسان جتنی تم سمجھ رہے ہو۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ سات سال دیار غیر میں رہ کر تم جب سنہرے جالوں سے بچتے رہے ان میں یہاں آ کر کیسے گرفتار ہو گئے؟''
''نانی حضور! آپ کی سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں مگر اب میرا ذہن اور دل بندھن کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔'' جہانگیر رضا اپنی بات پر اڑے رہے۔
''بہر حال یہ ہمارے پورے خاندان کا معاملہ ہے۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارے اس قدم سے خاندان کے تعلقات پر اثر پڑ سکتا ہے۔ اس حویلی میں جو پیار اور خلوص تمہیں ملا ہے وہ اور کہیں نہیں ملے گا اور تمہارے

اس فیصلے سے اس حویلی کا سارا سکون تباہ ہو جائے گا۔ جاؤ، ایسا کوئی قدم نہ اٹھانا جو یہاں کے سکون کو تباہ کرے۔" وہ ان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولیں۔

"میں نے اسی لیے کسی کا سہارا لیے بغیر آپ سے بات کی ہے کیوں کہ آپ کے فیصلوں پر ہی سب منحصر ہے۔ رہی کشیدگی کی بات تو یہ سب وقتی بات ہوگی۔ کچھ دن ماحول میں ضرور کشیدگی رہے گی مگر یہ تو سوچیں کہ میں اور ثمرہ زندگی بھر ایک دوسرے کے بن کر بھی ایک نہ بن سکیں گے کیوں کہ میں اسے کچھ نہ دے سکوں گا۔ میں اپنا سب کچھ وکی کو دے چکا ہوں۔ آپ نے فیصلہ نہ بدلا تو ہم دونوں کے ساتھ ساتھ وکی کی زندگی بھی تباہ ہو جائے گی اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا۔" ان پر کسی بات کا اثر نہیں تھا۔

زینت بیگم مارے غصے کے لرز گئیں مگر بڑی جہاندیدہ عورت تھیں۔ اپنے جذبات پر قابو پا کر بولیں۔

"جہانگیر! ہم تمہیں وقت دیتے ہیں۔ ایک ہفتے تک سوچو خوب اچھی طرح ساری باتوں کو مدنظر رکھ کر سوچو۔ امید ہے کہ تم کچھ مناسب فیصلہ کرسکو گے۔"

"میرے فیصلے میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں۔" وہ اکڑے کھڑے رہے۔

"اب تم جاسکتے ہو۔ یہ بات صرف ہمارے درمیان رہے گی۔ ہم نہیں چاہتے کہ ثمرہ کو کوئی صدمہ پہنچے۔ ہم تمہارے فیصلے کا انتظار کریں گے۔" جہانگیر ایک لفظ کہے بغیر دروازے سے باہر نکلتے چلے گئے اور زینت بیگم جو ان کی اس قدر بے ادبی کی متحمل نہ ہو پارہی تھیں۔ تھکے تھکے انداز میں سوچ میں ڈوب گئیں۔

"ثمرہ کا کیا ہوگا؟"

"اس کو جب پتا چلے گا تو کیا سوچے گی؟"

مگر وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ ثمرہ ان کی کمرے کی بالکونی میں کھلنے والی کھڑکی کے نیچے بیٹھی سب کچھ سن چکی ہے۔

لیکن وہ یہ سب کچھ سن کر نہ تو سکتے میں آئی نہ اسے ہسٹریا کا دورہ پڑا۔ وہ اس کے لیے اپنے آپ کو بہت پہلے سے تیار کررہی تھی۔ وہ بہت گہری تھی۔ سوچ سوچ کر پاگل ہوگئی تھی۔ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی تھی مگر آخر کار اپنے آپ کو اس بات کے لیے تیار کر چکی تھی۔ جہانگیر کے رویے سے اور سب سے بڑھ کر خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لینے کے بعد اسے اپنی قسمت کے پلٹ جانے کا پورا یقین ہوگیا تھا مگر وہ زبردستی ان کی زندگی میں داخل ہونے کی قائل نہیں تھی۔ اس چھ سات ماہ کے عرصے میں اس نے کیسے کیسے اپنے جذبات پر پہرے بٹھائے تھے اور اسی لیے اتنے لوگوں میں سے کوئی بھی اس کی کسی بات سے کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ حتیٰ کہ ثمینہ بھی جس کا اس کے ساتھ چوبیں گھنٹے کا ساتھ دیا۔

اتنی بڑی بات ہوگئی تھی مگر ان تینوں کے سوا کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ جہانگیر کو زینت بیگم سے بات کیے پورا ہفتہ گزر گیا تھا۔ وہ یہ پورا ہفتہ اڑے اڑے پھرے۔ نہ کسی سے بات کرتے نہ کسی کے پاس بیٹھتے۔ گھر میں بہت کم نظر آتے۔ زینت بیگم ان کی ساری مصروفیات دیکھ رہی تھیں اور انہیں جہانگیر کے کسی انداز سے بھی یہ نہ لگتا تھا کہ وہ جھک جائیں گے اور جہانگیر کو تو کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کیوں کہ وہ تو اٹل فیصلہ کر ہی چکے تھے اور یہ پورا ہفتہ وکی کے ساتھ گھوم پھر کے ان کا فیصلہ بالکل چٹان کی طرح ہوگیا تھا۔

اس دن وہ خلاف معمول دس بجے رات کو ہی گھر لوٹ آئے۔ اس وقت ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ سب لوگ نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کپڑے بدل کر باہر نکلے تو اس وقت تک خاصی تیز بارش ہو رہی تھی۔ وہ بارش دیکھنے یوں ہی گیلری میں چلے آئے۔ تب ہی ان کی نظر ثمرہ پر پڑی۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ تیز روشنی باہر آرہی تھی اور وہ خود اپنے کمرے کے سامنے درانڈے میں ریلنگ پر جھکی ہوئی باہر جھانک رہی تھی۔ جہانگیر آہستہ آہستہ قدموں چلتے ہوئے اس کے پاس جا کھڑے ہوئے اور پھر انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ پوری طرح بھیگ چکی تھی مگر بالکل بے خبر سی کھڑی تھی حتیٰ کہ اسے ان کے آنے کا علم بھی نہ ہوا۔

☆☆☆

''ثمرہ!...... یہاں کھڑی کیوں بھیگ رہی ہو؟ بیمار پڑ جاؤ گی۔ اندر جاؤ۔'' اسے اس طرح بھیگتے دیکھ کر وہ نرمی سے بولے۔

''بہتر تھا کہ مجھے کہنے کے بجائے آپ خود چلے جاتے۔ ناحق کھڑے بھیگ رہے ہیں۔'' وہ مڑ کر ان کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔

جہانگیر بھی خاصے بھیگ چکے تھے۔ ثمرہ کی بات پر کچھ نہ بولے۔ اسے ایک نظر دیکھا۔ گلابی شلوار اور کرتا بھیگ کر جسم سے چپک گئے تھے اور ٹھنڈی ہوا لگنے سے وہ ہولے سے کانپ رہی تھی۔ انہوں نے سر جھکا کر نیچے لان میں ایک نظر ڈالی۔

''کل دادی حضور کی دی ہوئی مہلت ختم ہو رہی ہے۔'' وہ سیدھی ان کی آنکھوں میں دیکھتی کہتی گئی۔

جہانگیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔

''فیصلہ تو یقیناً نہیں بدلا آپ کا کیوں؟''

''تو تم سب کچھ سن چکی ہو۔'' جہانگیر نے گہری سانس لی۔

''نہ بھی سنتی تو کیا فرق پڑتا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ مجھے پہلے ہی سب کچھ معلوم تھا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

جہانگیر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

''آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کی جاسوسی کرتی رہی ہوں۔ آپ کے رویے نے مجھے بہت پہلے ہی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور پھر میں نے اتفاق سے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ آپ کو وکی کے ساتھ دیکھا تھا اور جس انداز میں دیکھا تھا وہ مجھ پر ساری حقیقت آشکار کرنے کے لیے کافی تھا۔'' وہ مطمئن سی کھڑی بولتی رہی۔

جہانگیر منہ پھیرے کھڑے تھے۔ وہ کچھ نہ بولے تو پھر اس نے بڑے چبھتے ہوئے لہجے میں ان سے پوچھا۔

''کیا آپ دادی حضور کا سامنا کرتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔''

اس کے لہجے اور جملے پر جہانگیر بھنا گئے۔

''مجھے نانی حضور کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ میں انہیں پہلے ہی اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں۔''

''اور فیصلے میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں۔'' وہ بات کاٹ کر بولی تو وہ پھر بھنا گئے۔

''یقیناً۔''

''پھر کس بات پر جھجک رہے ہیں آپ؟'' وہ انہیں پوری طرح زچ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

''مجھے صرف دوسرے گھر والوں سے اندیشہ ہے۔''

''آپ کو ان سے اندیشے کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے تیزی سے بولی۔

''جہانگیر چپ کھڑے رہ گئے۔ وہ تھوڑ سا آگے آ کر ان کے مقابل ہو گئی اور ان کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بے باکی سے بولی۔

''اگر میں آپ سے پہلے ہی سب کے سامنے اس رشتے سے انکار کر دوں تو آپ کو کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہو گی اور رہی میں تو مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں سب سے ٹکرا سکوں۔ اب آپ اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیے۔ جا کر اطمینان سے سو جایئے اور ذرا مجھے بارش کا لطف اٹھانے دیجیے۔''

جہانگیر ایک دم مڑ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔ ان کے جاتے ہی وہ ریلنگ پکڑ کر اسی طرح جھک گئی کہ جیسے اس سے خود اپنا وجود سنبھالنا مشکل ہو رہا ہو۔ وہ بھیگتی رہی اور بارش کے قطروں کے ساتھ ساتھ آنسو اس کے گالوں سے بہتے ریلنگ کے ساتھ لگی کیاری میں گرتے رہے۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔ جہانگیر کہیں نہیں گئے۔ صبح سے ہی وہ نیچے لاؤنج میں سب کے ساتھ بیٹھے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ تاش کھیلتے رہے اور چائے کے دور چلتے رہے۔ وہ انتظار کرتے رہے کہ ثمرہ اب آئے گی، اب آئے گی مگر اس انتظار میں صبح سے دوپہر ہو گئی۔ وہ نیچے ہی نہ اتری نہ اپنے کمرے سے نکلی۔ انہیں فکر ہوئی کہ کہیں وہ بیمار نہ پڑ گئی ہو۔

انہوں نے کیرم کھیلنے کے بہانے سے نادیہ کو اسے بلانے بھیجا مگر وہ اکیلی واپس آ گئی۔

''ثمرہ آپی تو آرام سے لیٹی کتاب پڑھ رہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں ختم کر کے ہی اٹھوں گی۔''

اور جہانگیر کھول کر رہ گئے۔ وہ تو اس قدر بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے کہ کسی طرح ان کی مشکل آسان ہو۔ اور وہ بے نیاز آرام سے پڑی کتابیں پڑھ رہی تھی۔ انہوں نے دل میں سوچا۔ رات کو جھوٹ بول رہی ہوگی۔ بڑا کر کہہ رہی تھی۔ اب تھوڑی ہمت ہوگی انکار کرنے کی۔ خواہ مخواہ ہی سارا دن اس کے پیچھے خراب کیا۔

دوپہر کے کھانے پر بھی ثمرہ نہ آئی۔ زینت بیگم نے اسے بلوالیا تو اس نے کہہ دیا کہ کتاب بہت دلچسپ موڑ پر ہے وہ اسے نہیں چھوڑ سکتی۔ زینت بیگم نے اس کا کھانا کمرے میں ہی بھجوا دیا۔

''کتابوں کا کیڑا ہے۔ دیکھ لو صبح سے چپکی بیٹھی ہے۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا ہوش۔''

زینت بیگم ایسے دلار سے کہہ رہی تھیں جیسے وہ کوئی ننھی سی بچی ہو جو کھانے سے نخرے دکھاتی ہو۔ جہانگیر ان سے تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھے سر جھکائے کھانا کھاتے رہے۔ دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتے رہے اور اپنے آپ پر لعنت ملامت کرتے رہے کہ رات انہیں کیا ہو گیا تھا جو وہ اس کی الٹی سیدھی بکواس سنتے رہے اور اسے کوئی منہ توڑ جواب بھی نہ دیا۔

شام کو موسم ایسا پیارا ہو رہا تھا۔ بادل جھکے ہوئے تھے اور رات کو کھل کر بارش ہونے سے سبزہ نکھر گیا تھا۔ مالی نے شاید صبح ہی گھاس کاٹی تھی۔ ہموار نکھری دھلی گھاس آنکھوں کو ٹھنڈک بخش رہی تھی۔ سب کے اصرار پر شام کو لان میں چائے منگوائی گئی۔

''یہ ثمرہ نے صبح سے شکل ہی نہیں دکھائی۔'' فیصل کو بڑی حیرت تھی۔

''یہ کہو لڑنے کو کوئی نہیں ملا۔'' فراز نے فیصل کو چھیڑا۔

''اور کیا یہ جب تک اس سے دو چار گالیاں نہ کھالیں ان کا دن تھوڑی گزرتا ہے۔'' ثمینہ نے بھی فیصل کو چڑایا۔

''واقعی میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ اسے لڑائی نہیں ہوئی تو کھانا ہضم نہیں ہوا۔'' فیصل نے ان سب کی ایک ساتھ ہی کچی کر دی۔

''صبح میرے پاس آئی تھی۔'' زینت بیگم نے ثمینہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا تو جہانگیر ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ چور نظروں سے زینت بیگم کی طرف دیکھا وہ بڑی مطمئن سی بیٹھی تھیں۔

''بس سلام کر کے چلی گئی۔'' جہانگیر پھر ڈھیلے سے ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

زینت بیگم نے ملازمہ کو اسے بلانے بھیج دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہنستی مسکراتی بڑے خوب صورت نارنجی کپڑے پہنے زینت بیگم کے پاس چلی آئی۔ انہوں نے بڑے پیار سے اس کی پیشانی چوم لی۔ سب نے فرداً فرداً اسے پوچھا۔ وہ بڑی تر و تازہ بیٹھی چہکتی رہی۔ اس وقت جہانگیر کو اندازہ ہوا کہ وہ سارے گھر کی بہت چہیتی ہے اور خصوصاً زینت بیگم کی تو وہ دلاری ہے۔ وہ ان کی کرسی سے لگی گھاس پر بیٹھی تھی اور ان کی پلیٹ سے میوہ اٹھا اٹھا کر منہ میں ڈالتی جا رہی تھی۔ جہانگیر نے اس پر گہری نظر ڈالی۔ اتنا تر و تازہ نظر آنے کے باوجود اس کی آنکھوں کا بھاری پن نہیں چھپ سکا تھا جس پر اس نے یہ جواز دیا تھا کہ وہ سارا دن لیٹ کر پڑھتی رہی ہے۔

سب اپنی اپنی باتیں کر رہے تھے کہ وہ زور سے بول پڑی۔

''دادی حضور! آپ مجھے بہت چاہتی ہیں نا؟''

''میری چاند کو کچھ شک ہے کیا؟'' وہ ایسے دلارے سے بولیں کہ سب ہنس پڑے۔

''میں نے آپ سے آج تک کچھ نہیں مانگا۔ کوئی بات نہیں منوائی۔ آج آپ میری ایک بات مان لیجیے۔'' وہ ٹھنک رہی تھی۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ کوئی بچپنے کی ضد کرنے والی ہے۔ ماں نے اسے آنکھوں آنکھوں میں تنبیہ کی مگر اس نے دوبارہ ان

کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔" زینت بیگم ایسا ہی کچھ سمجھیں۔ "پہلے سب کے سامنے پکا وعدہ کریں۔ میری بات سے انکار نہیں کریں گی۔"

اب سب بڑے اشتیاق سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے جہانگیر کی طرف مسکرا کر ایک نظر ڈالی۔ ان کی کھلی کھلی آنکھوں میں حیرت کی سوا کچھ بھی نہ تھا۔ سمجھ تو وہ گئے تھے کہ وہ کیا منوانا چاہتی ہے مگر اتنی ہمت اور جرأت کی انہیں قطعی امید نہ تھی۔ اس نے جو کہا تھا وہی کر دکھانے والی تھی۔ وہ خود ایسا کر سکتے تھے۔ کبھی بھی نہیں۔

"چلو پکا وعدہ کیا۔ اب بولو تو سہی۔"

"تو پھر یہ......" اس نے دھیرے دھیرے منگنی کی انگوٹھی انگلی سے اتاری اور زینت بیگم کے سامنے کر دی۔ "منگنی کی انگوٹھی عاتکہ پھوپھو کو واپس کر دیجیے۔"

"ارے۔"

"یہ کیوں؟"

"یہ کیا بات ہوئی بھئی؟"

سب ہی کچھ نہ کچھ بول پڑے۔

بڑی بہو بیٹی کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئیں اور عاتکہ بے یقینی سے کبھی بھتیجی کو اور کبھی اپنے بیٹے کو جس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک اٹھی تھیں۔

"ثمرہ! ہم صرف اس کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔" زینت بیگم کا لہجہ یکسر بدل گیا تھا سب دم بخود بیٹھے تھے۔

"اس کی کوئی وجہ نہیں۔" ثمرہ آہستہ سے بولی۔

"بغیر کسی وجہ کے ہم تمہارا کوئی عذر، کوئی فیصلہ قبول نہیں کر سکتے۔"

انہوں نے اتنے سخت لہجے میں کہا کہ ثمرہ برداشت نہ کر سکی۔ ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رو دی۔

"دادی حضور! آپ نے سب کے سامنے وعدہ کیا تھا۔ آپ کو میری بات ماننا پڑے گی۔ پلیز دادی حضور! مان لیجیے۔" وہ سر اٹھائے اتنی التجا سے ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ سسک رہی تھی کہ ان کا دل لرز گیا۔ اس کی آنکھوں میں انہیں اس کے ٹوٹے سپنوں کی کرچیاں نظر آ گئیں اور وہ اس لمحے جان گئیں کہ وہ ایسا کرنے پر کیوں مجبور ہو گئی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"جب اتنی جرأت سے سب کے سامنے انکار کیا ہے تو پھر اسی ہمت سے کام لے کر یہ بھی بتا دو کہ تم نے اپنے بارے میں اور کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"مجھے کچھ عرصے کے لیے عامر بھیا کے پاس بھیج دیجیے۔" وہ تھوڑا سا رک کر بولی۔

"اور جہانگیر کو شادی کی اجازت دے دیجیے۔"

وہ اتنا کچھ کہہ گئی تھی کہ صورت حال سب پر واضح ہو گئی۔ جہانگیر کسی سے نظریں ملانے کی ہمت نہ پا رہے تھے۔ ملازمت بھری نظریں ان پر گڑی تھیں اور وہ پانی پانی ہوئے جا رہے تھے۔

"آج تک مجھے تمہارے اوپر فخر تھا جہانگیر! مگر آج میرا دل رو رہا ہے۔ کاش تم میرے بیٹے نہ ہوتے۔" عاتکہ ندامت کے مارے رو پڑیں۔

"دادی حضور! پھوپھو سے کہیے جہانگیر کو کچھ نہیں کہیں۔ شادی کی تیاریاں کریں اور اسی دھام دھام سے وکی کو دلہن بنا کر گھر لائیں۔ میرے جانے سے پہلے یہ نیک کام کر دیجیے۔" ثمرہ اس استقلال سے بولی مگر کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف عاتکہ کی سسکیاں خاموشی کو توڑتی رہیں۔

پھر اس کے لندن جانے کی تیاریاں، جہانگیر کی شادی کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ ہوتی رہیں۔ ثمرہ نے ٹھیک کہا تھا۔ جہانگیر سے کسی نے باز پرس نہ کی۔ عاتکہ بھی سب کچھ بھول کر شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔ وہی پر خلوص اور پر سکون ماحول لوٹ آیا۔

پھر ایک شام جہانگیر وکی کو دلہن بنا کر لے آئے۔ اس کا اسلامی نام مریم رکھا گیا۔ ثمرہ کے جانے کے دن قریب آ گئے۔

صبح ہی صبح اس کی فلائٹ جانا تھی۔ رات سب اس کے کمرے میں جمع رہے۔ ثمینہ بے تحاشا اداس ہو رہی تھی۔

"ثمرہ! تم چلی جاؤ گی پھر میں کیسے رہوں گی؟"

تو کیا ہوا؟ کچھ دن کی بات ہے پھر میں تمہیں بھابی بنا کر لے جاؤں گی۔'' ثمرہ زور سے بولی تو سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور ثمینہ کٹ کر رہ گئی۔

وہ سب بے تحاشا بول رہے تھے اور اسے جلد سے جلد واپس آنے کی تاکید کر رہے تھے پھر رات گئے وہ سب شور مچاتے ہوئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ثمینہ وہیں رہ گئی۔

ثمرہ! مجھے اب تک یقین نہیں آتا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔'' ثمینہ کو اس بات کا بے حد صدمہ تھا۔

''پھر تمہیں کیڑے نے کاٹا'' ثمرہ نے اس کی بات اچک لی۔

''تم اس موضوع پر بات کرتے کیوں گھبراتی ہو؟'' ثمینہ چڑ گئی۔

''کیا فائدہ ہوگا تمہیں اس سے؟'' وہ بیزاری سے بولی۔

''تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی۔ ثمرہ! تم نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ تم نے مجھ سے پوچھا تک نہیں اور اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔''

''فیصلہ میں نے نہیں میری قسمت نے کیا تھا۔'' ثمرہ اطمینان سے بولی۔

''سب بکواس ہے۔ ہم خود اپنی قسمت بناتے ہیں۔ منزلیں ڈھونڈتے ہیں۔ انہیں ٹھکراتے ہیں۔ اتنے پرانے بندھنوں کو توڑ دیتے ہیں۔'' اس نے ڈائریکٹ ثمرہ پر چوٹ کی تو وہ بلبلا اٹھی۔

''کس بندھن کی بات کر رہی ہو؟ جو کچے دھاگے ہوتے ہیں۔ میرا اور جہانگیر کا عناد اور محبت کا بندھن تھا اور یہ بندھن ایسے ہوتے ہیں کہ ذرا سا جھٹکا بھی نہیں سہار سکتے۔ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ مجھے بتاؤ ایسے بندھنوں میں جکڑ کر انسان کہاں جائے؟'' ثمینہ کچھ نہ بولی تو وہ تھوڑی دیر چپ ہو کر پھر بولی۔

''جہانگیر میری منزل نہیں تھے۔ میں نے انہیں نہیں ٹھکرایا ہے۔ انہوں نے پہلے اس بندھن کو ٹھیس لگائی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ بزرگوں کے سامنے میں نے پہل کی ہے کیوں کہ وہ ڈرتے تھے۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ بزرگوں سے ٹکر لے سکتے۔'' پھر جذبات کی روانی میں آ کر وہ سب کچھ ثمینہ کو بتا گئی۔

جہانگیر کی وکی سے ملاقاتیں، ان کا اس کے ساتھ برتاؤ اور زینت بیگم سے بات چیت کا رتی رتی حال اس نے ثمینہ کو بتا دیا۔

''اور اب میں جا رہی ہوں اس لیے کہ میرے سامنے کوئی منزل نہیں ہے۔ میں جہانگیر تو بھولنا چاہتی ہوں کہ آئندہ زندگی میں اس شخص کے ساتھ ناانصافی نہ کروں جو مجھے سہارا دے گا۔ آٹھ سال کی ذہنی رفاقت معمولی بات نہیں ہوتی۔ میں نہیں چاہتی کہ میں کسی دوسرے انسان کو دھوکا دوں۔ مجھے پتا ہے دادی حضور کیا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں میں اتنے لوگوں میں سے کسی ایک کا ہاتھ تھام لوں مگر تم خود سوچو ثمینہ! میری جگہ پر اپنے آپ کو رکھ کر سوچو۔'' وہ بے چارگی سے بولتی رہی۔

''میں جہانگیر کو پوری طرح بھلا دوں گی۔ ان کی ایک یاد، ایک ایک بات اپنے ذہن سے کھرچ کر نکال دوں گی اور جب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گی تو اس شخص کا ہاتھ تھام لوں گی جو سب سے پہلے میری منزل بن کر آگے آئے گا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ کچے دھاگوں سے بندھے رشتوں کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہے۔ خدا کرے تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے ہمیشہ دعا کروں گی کہ تم جلد سے جلد اپنی منزل پا لو۔ ایسے بندھن میں بند جاؤ جو کچے دھاگے نہ ہوں۔''

ثمینہ رو رہی تھی اور وہ دریچے سے باہر تاریکیوں میں جھانک رہی تھی جہاں اس کی نظر بھٹک بھٹک کر جہانگیر کے کمرے کی طرف اٹھ جاتی۔ اس نے تھک کر آنکھیں موند لیں اور دریچے سے سر ٹکائے ثمینہ کو روتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اس کے اپنے آنسو خشک ہو چکے تھے پھر اس نے آگے بڑھ کر ثمینہ کو اپنے بازوؤں میں اس طرح لے لیا جیسے اسے کبھی نہ جدا ہونے دے گی۔

☆☆

کچھ عشق تھا کچھ مجبوری

بشریٰ مسرور

شجر آسمانوں کو چھونے لگیں تو ان کے سائے زمین پر نہیں پڑتے۔ اولادیں جوان ہوجائیں تو ماں باپ ان کے لیے بوجھ بن جاتے ہیں۔ ایسے ہی ستم رسیدہ بوڑھوں کی کہانی، انہیں کسی گوشئہ عافیت کی تلاش تھی۔

گھر گھر کی کہانی، معاشرے میں موجود یہ کردار آپ کو ہر جگہ نظر آئیں گے

انہوں نے توتے کا پنجرہ بجھے دل کے ساتھ اپنی پڑوسن کو پکڑایا۔

''لو بھئی! سنبھال لو اسے، ہم تو چل دیے۔ بس زندگی باقی رہی اور خدا لایا تو پھر آئیں گے، ورنہ آج کے بعد ان بے زبانوں کے ساتھ تمہارا بھی اللہ نگہبان۔'' بسم اللہ بیگم نے ٹوکرے میں بیٹھی اپنی لال اور سفید مرغیوں پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور لگیں پڑوسن کیگ لے لگ کر آنسو بہانے۔

''اور سنو سکینہ بی! قسم سے میرا مری کا ہی منہ دیکھو جو میرے مٹھو اور لالو، چندوں کا خیال نہ رکھ سکو تو۔'' انہیں اس طرح روتے دیکھ کر پڑوسن کا بھی دل بھر آیا اور وہ بھی لگیں اپنے آنسو پونچھنے۔

''تم فکر ہی نہ کرو بہن! تمہاری لالو اور چندو تو بالکل میری اپنی مرغیوں کی طرح انہی کے ساتھ رہیں گی اور تمہارے مٹھو میاں کو بھی کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔''

''اللہ تمہارا بھلا کرے بہن!'' بسم اللہ بیگم نے دل سے دعا دی اور دفعتاً یاد آ جانے پر جلدی سے آنسو پونچھ کر اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چابی برآمد کی اور سکینہ کی جانب بڑھا دی۔

''یہ رکھ لو۔ میرے گھر کی چابی ہے۔ ہو سکے تو کبھی کبھار وہاں کی صفائی ستھرائی کروا دیا کرنا اور گملوں میں لگے پودے بھی یوں پڑے کہیں سوکھ ہی نہ جائیں لہٰذا تم سارے گملے اٹھوا کر اپنے ہاں رکھوا لینا۔'' پھر اپنے بڑے سے آنچل کا پلو کھول کر اس میں سے ہرے رنگ کا ایک مڑا تڑا نوٹ نکالا اور سکینہ بی کی مٹھی میں دبا دیا۔

''اوئی...... یہ کیا......؟'' سکینہ بی یوں بدکیں جیسے ہتھیلی پر کسی سانپ بچھو نے ڈنک مار لیا ہو۔

''ارے رکھو لو......'' بسم اللہ بیگم نے اصرار سے ان کی مٹھی دبائی۔ ''بس میرے مٹھو کو بھی کبھار امرود اور ہری مرچ منگوا کر ڈال دیا کرنا۔ بڑے ہی شوق سے ایسی چیزیں کھاتا ہے۔ نامراد، میں نے خود ہی اس کی عادتیں بگاڑ رکھی ہیں اور یہ کمبخت لالو......!''
انہوں نے ٹوکرے میں اطمینان سے بیٹھی ہوئی مرغی پر پیار بھری نظر دوڑائی۔

''کبھی کبھار تو اس کے نخرے ہی نہیں لیے پڑتے، بچی کچھی روٹی کے ٹکڑوں یا آٹے کی مروڑیوں پر تو منہ ہی نہیں مارتی کمبخت! تب میں اسے بازار سے گندم کے دانے منگوا دیتی ہوں۔''



”ارے تو کیا ہوگیا پھر؟...... میں کرلوں گی ناں سب، تم کیوں فکر کرتی ہو؟“ سکینہ نے نے روپے لوٹانے چاہے۔

”نہیں ......مگر تم یہ بھی رکھ لو۔ بلکہ اگر کم سمجھو تو بے شک اور مانگ لو۔“ انہوں نے دریا دلی دکھائی تو سکینہ بی خوامخواہ شرمسار ہوگئیں۔

”کیسی باتیں کررہی ہو؟“ لو تم ناراض ہوتی ہو تو یہ رکھ لیے۔“ کہہ کر انہوں نے نوٹ اپنے گریبان کی گہرائی میں منتقل کرلیا۔

”ارے خالہ! سحری بھی کرلی تھی ناں اچھی طرح سے؟“ سکینہ بی کی بہو نے مرغیوں کو آٹے کی مروڑیاں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بھئی اور تمہارے بجھوائے ہوئے سوجی کے حوالے نے تو سحری میں پراٹھوں کے ساتھ خوب ہی مزا دیا۔“ انہوں نے خوش دلی سے تعریف کی تو بی سکینہ کی بہو مسکرا دی۔

”وہ سحری وافطاری کے اوقات والا کیلنڈر تو سنبھال لیا تھا ناں؟“ سکینہ بی نے ان سے یاد دہانی کی خاطر پوچھا۔

”اے لو......وہ بھی کوئی بھولنے والی شے تھی۔ صندوق میں سب سے اوپر رکھا ہے۔“

”تو بس وہاں قیصر میاں سے لندن اور پاکستان کے اوقات کا فرق نکوا کر اسی حساب سحر وافطار کرلیا کرنا۔“ سکینہ بی نے ہدایت دی۔

”ہاں قیصر خود بھی تو خیر سے روزے رکھتا ہی ہوگا۔ پاکستان میں جب تک رہا کبھی میرے بچے نے نماز قضا نہ کی، نہ کوئی روزہ چھوٹا۔“ بسم اللہ بیگم نے فخر سے گردن تانے جواب دیا۔

”اے خالہ! اگر مولوی بصیر الدین تمہارے بارے میں پوچھ بیٹھیں تو بھلا کیا بتائیں ہم ان کو؟“ بی سکینہ کی بہو نے شرارت سے انہیں چھیڑا۔

”ارے خاک، اس منحوس کی صورت پر، وہ بھلا میرا خصم ہے جو مجھے پوچھے گا۔ مل گیا کہیں تو دیکھنا......“ وہ جانے کیا کہنے جا رہی تھیں کہ قیصر نے لکڑی کے دروازے پر لگی زنجیر کھٹکھٹائی۔

”اب آ بھی جایئے نہ اماں! ابھی تو لاہور ایئر پورٹ تک بھی جانے میں کافی وقت لگ جائے گا۔ گلی میں قیصر کی بیزار سی آواز گونجی تو بسم اللہ بیگم جلدی سے اپنا کہا سنا معاف کراتیں اپنے بند گھر پر حسرت بھری نظر ڈال کر شٹل کاک برقعے کے دونوں پٹ گرائے اور ہاتھ میں ٹین کی صندوقچی تھامے بیٹے کے پیچھے گلی میں نکل آئیں۔

سامنے ہی مولوی بصیر الدین برکاتی کی کریانے کی دکان تھی اور وہ دکان کے اندر لپٹن کی پڑیوں کے ہار تلے حسرت بھری نگاہوں سے بسم اللہ بیگم کو دور جاتا دیکھ رہے تھے۔

بسم اللہ بیگم نے بھی یکدم انہیں دیکھا تو نجانے کیوں بے اختیار دل دھڑک سا اٹھا اور برقعے میں آنکھوں کے آگے بنی جالی تلے، وہ نظریں جھکائے تیزی سے گلی کی نکڑ پر کھڑی بیٹے کی گاڑی کی جانب پیچھے بڑھ گئیں۔

☆☆☆

لندن کی حوالات میں آہنی سلاخوں کے پیچھے شدت غم سے نڈھال بسم اللہ بیگم نے مرے مرے قدموں سے آتے ہوئے اپنے بیٹے کو دیکھا تو گرم آنسوؤں کا لاوا جیسے گالوں پر بہہ نکلا۔

اس بڑھاپے میں شاید اسی ذلت کا سامنا کرنے کے لیے تو وہ ہزاروں میل سفر طے کر کے بیٹے کے ساتھ لندن آئی تھیں ورنہ تو کیسی عزت و آبرو سے اپنے گھر میں رہتی تھیں۔ بطور خاص رمضان المبارک میں تو اس وقت وہ اپنے لیے افطاری بنایا کرتی تھیں اور آج یہاں بند اپنے نصیب کو کوس رہی تھیں۔

پھر قیصر نے آ کر انگریزی زبان میں جانے ان پولیس والوں سے کیا گٹ پٹ کی کہ وردی میں ملبوس ایک لمبے تڑنگے آفیسر نے آخر اپنی کمر کی پیٹی سے منسلک چابی سے لاک اپ کا تالا کھول کر انہیں باہر نکالا اور اپنے ہمراہ لیے قیصر کے پاس چلا آیا۔

قیصر کو دیکھ کر وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں اور دوڑ کر بیٹے سے لپٹ گئیں اور لگیں بھوں بھوں رونے۔ آخر قیصر نے مشکل سے انہیں چپ کرایا اور نرمی سے انہیں اپنے سے الگ کرتے ہوئے پولیس افسروں سے معذرت کرتے ہوئے ہاتھ ملایا اور آنسو بہاتی ماں کو ساتھ لے کر باہر چلا۔

کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بھی وہ سسکیاں بھرتی اور دوپٹے کے پلو سے اپنی ناک اور آنکھیں رگڑتی رہیں اور قیصر جبڑے بھینچے چپ چاپ ڈرائیو کرتا رہا۔

کافی آگے جا کر بالآخر اس نے کار ایک ریسٹوران کے سامنے روک لی۔

”آیئے اماں! ...... آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی، پہلے کچھ کھا پی لیں پھر بعد میں گھر چلتے ہیں۔“ قیصر نے دوسری طرف سے آ کر ان کے دروازے کا لاک اور وہ چپ چاپ بیٹے کے پیچھے۔ ریسٹوران میں چلی آئیں جہاں ٹرکش برگرز، اٹالین کباب اور چاکلیٹ کافی کی ملی جلی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو ناک میں پہنچی تو بھوک کا احساس از خود انگڑائی لے کر پیدا ہو گیا ویسے بھی وہ روزہ دار تھیں۔ اس لیے وہ خود ہی اندازے سے سحری کے وقت بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے باورچی خانے میں جا کر جو مل جاتا کھا پی کر خدا کا شکر ادا کرتیں اور روزے کی نیت کر لیتیں اور کل رات بھی محض دو سوکھے سلائس، ایک پیالہ دودھ کے ساتھ نگل کر انہوں نے روزہ رکھ لیا تھا مگر افطار کا وقت گزرے بھی کافی وقت گزر گیا تھا اگرچہ روزہ اپنے وقت پر افطار نے کی نیت بڑھ چکی تھیں مگر اس کے بعد محض تھوک نگل کر رہ گئی تھیں چوں کہ سلاخوں کے پیچھے بند انہیں کیا ملتا۔

کچھ ہی دیر میں جب ویٹرس اٹالین برگرز، سر کے میں ڈوبی ہری مرچوں کے ترکی اچار اور سپینش چکن لیگز کافی کے بڑے بیگ کے ساتھ لے کر آئی تو ان کی آنکھیں دوبارہ جل تھل ہونے کو تیار تھیں۔

"اتنا کچھ کیوں منگوا لیا قیصر؟ میں کہاں کھا سکوں گی یہ سب۔ میرے لیے تو بس ایک چائے کا پیالہ اور بن کافی ہوتا۔" انہوں نے سادگی سے کہا۔

"جتنی بھوک ہو آپ اتنا کھا لیں باقی کا آپ کی سحری کے لیے پارسل بنوا لیں گے۔" اس نے ہولے سے کہہ کر سگریٹ سلگا لی اور جیب سے کوئی کاغذ نکال کر اس پر کچھ نوٹ کرنے لگا۔

اور پھر کچھ ہی دیر بعد جب وہ دوبارہ کار میں بیٹھی بیٹے کے ہمراہ اس کے گھر جا رہی تھیں تو قیصر نے ہی سکوت توڑا۔

"آپ ابھی تک یہاں کے ماحول کی عادی نہیں ہوئیں شاید" جواباً انہوں نے سسکی بھری اور اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور ناک رگڑی جو پہلے ہی رونے دھونے کے باعث لال ٹماٹر ہو رہی تھی۔

حالانکہ ابھی تو انہیں لندن آئے مہینہ بھر بھی نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی انہوں نے اپنے حساب سے تو مزاج میں بے پناہ تبدیلیاں پیدا کر لی تھیں، اپنی تمام عادات کو از سر نو ترتیب دیا تھا۔ ان کی انگریز بہو نا مناسب لباس پہنتی۔ وہ چپ چاپ دیکھتی رہ جاتیں۔ پوتا ان کے سامنے اپنی گرل فرینڈ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پھرتا۔ وہ کچھ نہ کہتیں۔ گھر میں ڈانس پارٹیاں ہوتیں اور بستر پر کان لپیٹے پڑی رہتیں۔ ہائے کیسے طمطراق وہ بیٹے کے ساتھ لندن آئی تھیں۔ سوچا تھا فرمانبردار بیٹا خدمت کرے گا۔ پوتا پوتی ان کے آگے پیچھے گھوم کر نت نئی کہانیوں کی فرمائش کریں گے۔ نیک سیرت بہو ان کا خیال رکھے گی۔ بھلا اس سے بڑھ کر اور حسین بڑھاپا اور کیا ہوگا کہ جب قیصر کو سالانہ وار چھٹیاں ہوں گی تو وہ لگے ہاتھوں بیٹے اور بہو کے ساتھ عمرے کی ادائیگی کو چلی جائیں مگر لندن آ کر ان کی تمام توقعات پر پانی پڑ گیا تھا کیوں کہ ان کی بہو اور بیٹا دونوں علی الصباح کام پر نکل جاتے تو پھر دن ڈھلے ہی گھر لوٹتے، قیصر کے علاوہ کسی کو گھر میں اردو نہیں آتی تھی۔ دو عدد پوتا پوتی بھی اپنی ماں کے نقش قدم پر گامزن تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے۔ ایسے میں بسم اللہ بیگم کو گویا قید تنہائی کاٹا کرتیں چوں کہ قیصر بھی بس نپی تلی بات کرتا، البتہ ماں کو گھریلو مشینوں کا استعمال پہلی فرصت میں سکھا دیا تھا تا کہ وہ اپنے کام خود انجام دے سکیں اور کپڑے دھونے اور چائے بنانے جیسے معمولی نوعیت کے کاموں کے لیے کسی کی محتاج نہ ہوں مگر وہ رشتوں کی محبت دل میں جگائے باقی گھر والوں کے کام بھی اپنے ذمے لیتی گئیں، برتن، کپڑے دھونے کے علاوہ صفائی ستھرائی اور گھر کی جھاڑ پونچھ تو وہ کر ہی دیا کرتیں مگر اس کے علاوہ بھی کچن کے کئی کام چابکدستی سے نمٹا لیتیں۔ تبھی تو ان کا وجود ان کی یورپین بہو کو غنیمت لگا کرتا۔

چوں کہ لندن جیسی جگہ پر گھریلو ملازم افورڈ کرنا ناممکن ہی تھا اور ابھی بھی بیٹے کو شکایت تھی کہ وہ نئے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پائی تھیں۔ یہ ان کی بدنصیبی ہی تو تھی...... تبھی وہ بس رو ہی گئیں۔

"دیکھیے اماں!" قیصر نے نرمی سے سمجھایا۔ "یہاں کوئی بات بری نہیں سمجھی جاتی اور نہ ہی یوں کھلے بندوں لڑکے اور لڑکیوں کا آپس میں میل جول کوئی معیوب بات سمجھی جاتی ہے پھر اگر سارہ کا کوئی بوائے فرینڈ گھر آ ہی گیا تھا اسے ملنے کے لیے تو اس میں آپ کے اتنے شدید ردعمل کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔"

بسم اللہ چورسی بن گئیں...... "مگر قیصر...... وہ ...... وہ ...... وہ لڑکا...... سارہ کے ساتھ......" ان کی پیشانی عرق ندامت سے تر ہو گئی۔ چہرہ سرخ پڑ گیا اور زبان نے اس سے آگے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اب وہ بیٹے کو کیسے سمجھاتیں کہ انہوں نے پوتی کو کس حالت میں دیکھا تھا۔ وہ بے چاری تو شامت کی ماری صرف سارہ کے کمرے میں سے دھونے کے

لیے میلے کپڑے اٹھانے کے لیے گئی تھیں مگر وہاں جو سین چل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر تو گویا ان کی رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہوگیا۔ اتنی جرأت سارہ کی کہ دادی کی موجودگی ہی میں کمرہ بند کیے اس لفنگے کے ساتھ گلچھرے اڑا رہی ہے۔ کوئی لحاظ و شرم کا پاس نہیں؟

"ٹھہر جا کمبخت ابھی بتاتی ہوں تجھے۔ مسٹنڈا کہیں کا، ہمارے ہی گھر میں ہماری ہی عزت سے کھیلنے آیا ہے۔ ہماری بھولی بھالی بچی کو پھنسالیا......"

انہوں نے اتاری جوجوتی اور لگائیں دو چار اس لڑکے کے۔ وہ تو الٹے پاؤں واپس بھاگ لیا مگر سارہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ان کے آگے آ کھڑی ہوئی اور انگلی اٹھا اٹھا کر لگی انہیں کچھ تنبیہ کرنے۔ وہ اس وقت سخت غصے میں تھی۔

"ٹھہر جا ابھی تیرا عشق کا بھوت اتارتی ہوں۔" انہوں نے پھر اپنی آستینیں چڑھائیں اور سارا پر پل پڑیں۔

"نامراد! ...... بے حیائی! ...... خاندان کی عزت خاک میں ملانے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ صلہ دیا ہے باپ کے لاڈ پیار کا؟ آلینے دے باپ کو، جو شام تک تیرا نکاح نہ پڑھوا دیا کسی اچھے مسلمان لڑکے سے تو کہنا......"

سارا کون سا کم تھی، اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے دادی کو نوچ کر رکھ دیا۔ وہ انگریزی میں چلا رہی تھی اور یہ اردو میں چیخ رہی تھیں۔ بوڑھا دم تھا کب تک جوان اور مستی کے نشے میں چور خون سے مقابلہ کرتیں......؟ ناچار بے دم ہو کر صوفے پر جا گریں اور سارہ ان کی گرفت ڈھیلی پا کر جو نکلی تو سب سے پہلے دادی کو کمرے کے اندر ہی لاک کیا اور پھر پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بھاگتی ہوئی گیلری میں آئی اور کانپتے ہاتھوں سے پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

باہر کے ملکوں کا قانون اٹھارہ سال سے کم عمر بچوں کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کرتا ہے، اتنا کہ ان کی مرضی کے بغیر کوئی ان کو انگلی بھی نہیں لگا سکتا اور یہاں تو دادی نے چودہ سالہ سارہ پر جوتیوں کی بارش کر دی تھی، نتیجتاً میں پولیس پلڑ کر لے گئی۔

بیٹے کے پیچھے تقریباً چھپ کر چلتی ہوئیں جب وہ اس کے فلیٹ میں داخل ہوئیں تو پوتی کمر پر ہاتھ رکھے کھا جانے والی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی اور ان کی ڈچ بہو کے تیور بھی کچھ کم خطرناک نہیں تھے لہٰذا وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے ایک کونے میں لگے اپنے بستر کی جانب بڑھ گئیں اور لحاف میں منہ چھپا کر پڑ رہیں جب کہ بیٹا اور بہو کے تیز تیز بولنے اور جھگڑنے کی آواز ان کے کانوں کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ بہو تو جارحانہ انداز میں حملہ آور ہو رہی تھی اور بیٹا دفاعی پوزیشن سنبھالے ہوئے تھا۔

انہیں اپنے کیے پر پچھتاوا ہونے لگا۔ خواہ مخواہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا اور جذبات میں آ کر بچے کے لیے مصیبت کھڑی کر دی۔ پہلے ہی بیچارا پرائے دیس میں غیر لوگوں کے درمیان ایسے رہ رہا تھا جیسے بتیس دانتوں تلے زبان، اوپر سے یہ نئی مصیبت آگئی میری بدولت۔ ان کا دل بجھ گیا اور آنکھیں جلنے لگیں۔

"اماں! آج اپنا سامان پیک کر لیجیے گا، سہ پہر تین بجے والی فلائٹ سے آپ واپس پاکستان جا رہی ہیں۔" صبح کام پر جاتے ہوئے قیصر نے انہیں اطلاع دی۔

"مگر میں اکیلی کیسے جاؤں گی قیصر......؟ مجھے تو راستوں کا بھی علم نہیں......" وہ جہاز کا اکیلے سفر کرنے سے گھبرا گئی تھیں۔

"آپ فکر مت کیجیے۔ میرا ایک دوست اسی فلائٹ سے پاکستان جا رہا ہے۔ وہ آپ کا پوری طرح سے خیال رکھے گا۔" قیصر نے تسلی دلائی۔ بحث کا نہ موقع تھا نہ کوئی گنجائش، سو چپ ہو رہیں۔ ویسے بھی کل کے واقعے کے بعد اب انہیں یہاں پر رہنا خود بھی بہت اذیت ناک لگ رہا تھا۔ سو واپس جانے میں ہی عافیت تھی۔

جب چلتے وقت ایئرپورٹ پر قیصر نے جیب

سے ہزار پاؤنڈ نکال کر ان کی مٹھی میں تھمائے اور نظریں جھکا کر دھیرے سے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔

''اماں! مجھے معاف کر دینا۔ میں آپ کی کوئی بھی خدمت نہیں کر سکا۔'' تو ایک بار پھر ان کا دل بھر آیا۔ بیٹے کی بے بسی تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی چکی تھیں چناں چہ ایڑیاں اٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

''مجھے بھی معاف کر دینا میرے لعل! میں اس تنگ نظر معاشرے میں بسنے والی ایک ایسی بیوہ عورت ہوں جو اگر ایک بار سر پر بیوگی کی چادر ڈال لے تو دوبارہ سہاگ کا آنچل اوڑھنا ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ تبھی تو......'' نجانے کیسے بے خیالی میں ان کی زبان سے یہ فقرہ پھسل گیا۔

قیصر چونک پڑا اور وہ خود نظر چرا گئیں۔

جہاز کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا۔ قیصر کا دوست بھی پہنچ چکا تھا لہٰذا وہ اپنے پر الوداعی نظریں ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

لاہور پہنچ کر وہ اپنی بیٹی قدسیہ کے ہاں دو روز بمشکل رہیں۔

''بس قدسیہ اب اماں کو جھمرہ نہیں جانے دینا۔ یہیں رہیں گی ہمارے ساتھ۔'' ان کا داماد محبت سے کہتا اور وہ مسکرا دیتیں۔

یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ وہ داماد کے گھر پڑی رہتیں۔ ''پھر کبھی آجاؤں گی۔'' وہ سب کا دل رکھنے کو کہتیں۔

''نانی اماں۔ عید تو ہمارے ساتھ ہی کیجیے گا۔'' ان کی نواسی ضد کرتی۔

''نہیں چندا! تم اپنے ممی پاپا کو لے کر آنا میرے پاس۔ میں تمہارے لیے چوڑی دار پاجامہ اور گوٹے والا کرتا تیار کر کے رکھوں گی۔'' وہ اسے محبت سے ساتھ لگا کر پیار سے تھپکتیں۔

''سچ نانی اماں؟'' اس کی آنکھیں خوشی سے دمک اٹھتیں۔

''ہاں میری گڑیا!'' وہ پیار سے اس کے بال سنوارتیں۔

پھر جب وہ سر پر برقع ڈلائے۔ اپنی ٹین کی صندوقچی ہاتھ میں اٹھائے داماد کے ساتھ موٹر سائیکل پر بس اسٹینڈ جانے کو تیار کھڑی تھیں تو قدسیہ جھجکتے ہوئے کہہ ہی بیٹھی۔

''اماں! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ عید کے بعد آپ ہمارے پاس ہی مستقل طور پر آجائیں؟ ویسے بھی وہاں جھمرے میں اب کون ہے آپ کا؟...... کسی دکھ بیماری میں خدانخواستہ بھلا کون بیٹھا ہے جو آپ کا خیال رکھے گا۔ یہاں تو ہم سب آپ کی خدمت کے لیے موجود ہیں اور پھر...... پھر وہ چک جھمرے والا مکان ویسے بھی خالی پڑا کس کام کا ہوگا اگر آپ اجازت دیں گی تو اسے بیچ کر عارف اپنے کاروبار میں پیسا لگالیں گے۔ آج کل کام مندہ ہی چل رہا ہے۔''

تب ان کی سمجھ میں آیا کہ ان کا سعادت مند داماد کیوں ان کے اتنا آگے پیچھے پھر رہا ہے اگرچہ قدسیہ کی مکان بیچنے والی بات سن کر ان کے دل پر گھونسا پڑا تھا مگر وہ ضبط کر کے مسکرا دیں۔

''اچھا بیٹی! واپس جا کر اس نگوڑے مکان کا بھی کچھ کرتی ہوں۔'' انہوں نے قدسیہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا تسلی دے ڈالی۔

میکا ہی تو کسی لڑکی کے لیے آس و امید کا مرکز ہوا کرتا ہے اور والدین کے گھر کا ہی دیا لیا بیٹی کو سسرال والوں کی نظروں میں بلند مقام عطا کرتا ہے، یہی سوچ کر تو انہوں نے قیصر کے دیے ہوئے پیسے عیدی کا نام کر کے پہلے ہی قدسیہ کو دے دیے تھے اور اب دل ہی دل میں مکان فروخت کرنے کا حتمی فیصلہ کر کے وہ بوجھل دل سے باہر نکل آئیں۔

چک جھمرہ جانے والے بس میں سیٹ کی پشت پر ٹیک لگائے۔ بیتے سمے کی یادیں ایک فلم کی طرح ان کی نظروں میں گھومنے لگیں۔ جب فقط تیرہ برس کی عمر میں بیاہ کے وہ حمید صاحب کے گھر آ گئی تھیں

اور سترہ سال کی عمر میں وہ دو بچوں (قدسیہ اور قیصر) ماں بن چکی تھیں۔ اچھی بھلی، خوب صورت زندگی گزر رہی تھی کہ ان کی ساڑے بائیس برس کی بہاروں بھری جوانی میں ایک دم بیوگی کی خزاں چھا گئی۔ ان کا سسرال اور میکے میں کوئی پرسان حال نہ تھا۔ چوں کہ حمید صاحب تو ویسے ہی سقوط ڈھاکا کے بعد تن تنہا ہی پاکستان آئے تھے اور بسم اللہ بیگم کے ابا نے اپنے دوست کا فرزند ہونے کے ناتے انہیں گلے سے لگالیا تھا اور اب والدین کی وفات کے بعد بہن بھائی بھی جیسے پرائے ہوگئے تھے۔ تبھی بیوی کے بعد ننھے منے بچوں کی دیکھ بھال کی تمام تر ذمے داری، بسم اللہ بیگم پر آگئی۔ ہمارے معاشرے میں غریب آدمی ایک بار مرتا ہے اور اس کے پسماندگان ہر روز ایک نئی موت کا مزا چکھتے ہیں چناں چہ بسم اللہ بی تو گھبرا ہی اٹھیں مگر خدا بھلا کرے ان محلے داروں اور خصوصاً مولوی بصیر الدین صاحب کے گھرانے کا جنہوں نے اس مصیبت کے عالم میں بسم اللہ بیگم کے گھرانے کا بھرپور ساتھ دیا۔

مولوی بصیر الدین مسجد کے پیش امام تھے اور اس کے علاوہ مسجد کے مدرسے میں بچوں کو قرآن پاک پڑھانے پر مامور تھے مگر اب انہوں نے کہہ دیا کہ بھئی بچے تو بے شک مدرسہ میں ہی دینی تعلیم حاصل کریں گے مگر بچیاں البتہ بسم اللہ بیگم کے پاس گھر میں جا کر پڑھا کریں۔

اگرچہ بسم اللہ بیگم نے محلے کی بچیوں کو قرآنی تعلیم دینے کی کوئی فیس یا کوئی ہدیہ مقرر نہیں کیا ہوا تھا مگر محلے والے اپنی استطاعت کے مطابق اتنا ضرور کرنے لگے کہ ان کی گزر بسر عزت سے ہونے لگی۔

مولوی بصیر الدین کی بیگم جو بی ملانی کے نام سے مشہور تھیں بڑی ہی نیک اور خدا ترس خاتون تھیں جب بھی جمعرات کے روز مولوی صاحب کے مدرسے کے بچے اہل محلہ سے جمعرات کا کھانا لے کر آتے تو وہ فوراً ٹرے میں پلیٹیں سجائے بسم اللہ بی کے ہاں ان کا حصہ دینے پہنچ جاتیں۔

''کیوں بلاوجہ تکلیف کی؟'' وہ شرمندہ سی ہوجاتیں۔

''بھئی کھانا ہماری ضرورت سے کافی زیادہ تھا۔ مدرسے کے بچوں نے بھی پیٹ بھر کے کھالیا اور تب بھی بچ رہا تو مولوی صاحب کہنے لگے کہ جا کر بسم اللہ بی کے ہاں دے آؤ۔ وہاں بھی چھوٹے بچے ہیں۔ خوشی سے کھالیں گے۔'' وہ سادگی سے تفصیل بتاتیں اور تب بسم اللہ بیگم جلدی جلدی برتن خالی کرتیں اور رنگ برنگ زردہ، حلوہ، پلاؤ نان اور نجانے کیا کیا اپنی پلیٹوں میں الٹتیں اور دل ہی دل میں اس پاک ذا کا شکر ادا کرتیں کہ جس نے انہیں بغیر کسی مشقت کے گھر بیٹھے رزق فراہم کیا تھا۔

مگر جاڑوں کی ایک صبح جیسے ہی مولوی بصیر الدین وضو کے لیے اپنے گرم بستر سے نکلے فالج کے حملے کا شکار ہوگئے البتہ یہ بھی غنیمت تھا کہ حملے کی شدت اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ہاتھ پاؤں بالکل ہی رہ جاتے بس ایک ٹانگ میں معمولی سا لنگڑا پن اور زبان میں ہلکی سی لکنت آگئی تھی۔ چناں چہ بچوں کو قرآن پاک پڑھانے سے خود ہی دستبردار ہوگئے کہ اب زبان کی لکنت کے باعث صحیح تلفظ نہیں کراپائیں گے۔ کسی زمانے میں کہیں ٹیلر ماسٹر کے پاس کام سیکھا تھا۔ وہ اب آڑے وقت میں کام آیا۔ محلے والے ان سے مردانہ کپڑوں کی سلائی بخوشی کرانے پر تیار تھے۔ بس اب کوئی ایسی جگہ درکار تھی جہاں وہ چار مشینیں رکھ کر دو شاگردوں کو بٹھا کر اپنا کام شروع کرسکتے۔ ان کا اپنا تو ایک ہی کمرے کا مکان تھا جس میں وہ خود مع بی ملانی اور ایک عدد بیٹی کے ہمراہ رہا کرتے تھے۔ تب یہ مسئلہ بسم اللہ بیگم نے انہیں اپنی بیٹھک معمولی کرائے پر دے کر حل کردیا۔ یوں بھی باہر کی طرف کا یہ کمرا فالتو ہی پڑا تھا۔ بیٹھکیں تو مردوں کے دو قدم سے آباد ہوا کرتی ہیں۔ اب حمید صاحب کے بعد بھلا بیٹھک میں کس کے مہمانوں کو آنا تھا۔ چلو اسی بہانے بیٹھک آباد تو ہوگی، مشینوں کے شور سے ہی سہی۔ اس گھر کا سناٹا تو ٹوٹے گا۔ بسم

اللہ بیگم نے سوچا حالاں کہ سناٹا تو ان کے پورے وجود میں رچ بس گیا تھا۔

یوں مولوی صاحب نے اپنا جمع جتھہ نکال اور اللہ کا نام لے کر بسم اللہ بی کی بیٹھک میں اپنے کام کا آغاز کردیا۔ چند ہی روز میں ان کا کام اچھا بھلا چل نکلا تو بسم اللہ بی نے بھی قیصر کے ہاتھ مکان میں پیغام بجھوادیا کہ اگر مناسب سمجھیں تو کپڑے کی کٹائی کر کے اندر بجھوادیا کریں میں سلائی کر کے دے دیا کروں گی اور جو اجرت بنے دیا کیجیے۔ یوں محنت اور صلاحیت کے دو چراغ روشن ہوگئے۔

اور ایک دن جب وہ ایک مردانہ واسکٹ سلائی کرنے کے بعد استری سے کریز جما کر بیٹھک کا دروازہ اندر سے بجا کر مولوی صاحب کو دینے کے لیے گئیں تو مولوی صاحب نے دروازے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر واسکٹ تھامی اور ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ان کو یہ پیشکش کی کہ اگر وہ چاہیں تو قیصر کو بھی ان کے پاس ٹیلرنگ کا کام سیکھنے بھیج سکتی ہیں۔ بس اسکول سے آکر دو تین گھنٹے ان کی دکان میں لگالیا کرے تو قیصر کو اس کام کا محنتانہ بھی ملا کرے گا۔

مگر ان کا دل نہ مانا، قیصر کے تو ابا مرحوم کی دلی خواہش اسے ڈاکٹر سرجن بنانے کی تھی تاکہ لوگوں کے کھلے ہوئے زخم سیا کرے، نہ کہ تیرے میرے چاک گریبان سیتا پھرے، لہٰذا انہوں نے صاف منع کردیا۔

''نہ مولوی جی! میرا قیصر تو ڈاکٹر بنے گا نہ کہ ٹیلر ماسٹر۔'' اور مولوی بصیر الدین خاموش ہوگئے۔

پھر جانے خدا کو کیا منظور ہوا جو بی ملانی کا ٹائیفائیڈ بگڑا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے چٹ پٹ ہوگئیں۔ اچھے بھلے مولوی بصیر الدین رنڈوے ہو کر مسکرانا بھی بھول گئے۔ دکان پر آتے تو پیچھے جان بچی کے گھر پر اکیلے ہونے کا دھڑکا لگا رہتا۔ کبھی کبھار بسم اللہ بیگم سے درخواست کرتے کہ وہ گھر کا کام کاج ختم کر کے ان کی بیٹی کی طرف چکر لگائیں۔

اب وہ کوئی سلا ہوا کپڑا پکڑنے کو بیٹھک کے دروازے سے ہاتھ باہر نکالتے تو بسم اللہ دیکھتیں کہ ان کی لمبی لمبی مضبوط انگلیاں ایسے مرجھائی ہوئی دکھائی دیتیں جیسے ٹوکری میں پڑے پڑے بھنڈیاں سوکھ گئی ہوں، آواز کا کرارا پن رخصت ہوگیا اور انہی دنوں انہوں نے اپنی چودہ سالہ زیب النسا کا سادگی سے نکاح کر کے اسے رخصت کردیا اور خود چھڑوں کی سی تنہا زندگی گزارنے لگے۔ تیز مرچ مسالوں والے بازاری کھانے کھا کھا کر معدے میں السر کی شکایت رہنے لگی اور وہ زیادہ تر ڈاکٹر کے کلینک پر نظر آتے۔

''اماں! اس خبیث مولوی سے فوراً ہی اپنی بیٹھک خالی کرالو۔'' ایک دن قیصر اسکول سے واپس آیا تو بستہ ایک طرف پھینک کر منہ پھلائے بیٹھ گیا۔ بسم اللہ بیگم کا دل دھک سے رہ گیا۔

یا اللہ خیر، کہیں بچے کے کان میں کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں پڑ گئی۔ ''ہوا کیا بیٹا آخر؟'' انہوں نے اپنے آنچل کے پلو سے اسے ہوا جھلتے ہوئے کہا۔

''اماں......لوگ کہتے ہیں کہ......کہ......'' قیصر کو سمجھ میں نہ آیا کہ بات کیسے شروع کرے۔ ''بس اماں لوگ آپ کے اور مولوی صاحب کے بارے میں بڑی عجیب وغریب باتیں کرتے ہیں۔'' جذبات کی شدت سے اس کا منہ سرخ ہوگیا۔

''کیا کہتے ہیں لوگ......؟'' انہیں خود اپنی آواز کسی کنویں سے آتی سنائی دی۔

''یہی کہ......آپ اور......مولوی بصیر الدین صاحب......آپس میں نکاح کرنے والے ہیں۔'' قیصر نے جیسے تیسے اپنا فقرہ پورا کیا۔ بسم اللہ بی سن ہو کر رہ گئیں۔

''اگر ایسا ہوا نا اماں!......تو میں......میں زہر کھالوں گا۔'' قیصر نے کہا اور دوڑتا ہوا گلی میں نکل گیا اور وہ گھنٹوں چولہے کے پاس بیٹھی روئے گئیں اور ساتھ ہی قدسیہ پیڑھے پر بیٹھی اپنی حیران نظروں سے انہیں تکتی رہی۔ یہ آج اماں کو کیا ہوا وہ سوچنے لگی۔ بیٹھک خالی کرنے پر مولوی بصیر الدین صاحب کو ذرہ

برابر کوئی اعتراض نہ تھا اور اب تو ویسے بھی بیٹی کی شادی کے بعد ان کے گھر کا اپنا کمرا خالی تھا۔ جسے وہ اپنے مصرف میں لا سکتے تھے چناں چہ اگلے دو چار روز میں انہوں نے بسم اللہ بیگم کی بیٹھک خالی کر دی۔

☆☆☆

اس روز ہانڈی چولہے سے فراغت کے بعد بسم اللہ بیگم سیدانی جی کو بہو کے لیے کروشیے کی شال بن رہی تھیں کہ بی سکینہ آ گئیں اور کچھ دیر بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اصل مدعا زبان پر لے ہی آئیں۔

''آخر کب تک یوں سسک سسک کر اپنی بیوگی کا سوگ مناؤ گی ابھی تو خیر سے جوان ہی ہو اور سامنے اتنی لمبی زندگی پڑی ہے۔ تن تنہا بھلا کیوں کر بسر ہوگی؟ میری مانو بسم اللہ! کسی بھلے مانس انسان سے نکاح کر لو اور یہ اپنے مولوی بصیر الدین صاحب سے بڑھ کر زیادہ شریف اور بامروت آدمی تمہیں کہاں ملے گا۔ ان کا بھی گھر بس جائے گا اور تمہارے بچوں کو بھی باپ کی شفقت میسر آ جائے گی۔ کہو تو آپس کے صلاح مشورے سے نکاح کے لیے کوئی نیک دن مقرر کر لیں۔'' بسم اللہ بیگم کو تو سنتے ہی پتنگے لگ گئیں۔

''اچھا تو اس موئے نے بھیجا ہے تمہیں!...... غیرت نہ آئی ذرا بھی اسے اپنا نکاح کے پیام ایک بچوں والی عورت کو بھجواتے؟ ...... نظر تو آ جائے ایک بار یہ لنگڑا مولوی کہیں، دوسری ٹانگ بھی توڑ کر ہاتھ میں نہ پکڑا دی تو کہنا...... اور...... سکینہ بی!...... تم تم بھی اس کی ایلچی بنی پیام لیے دوڑی چلی آئیں گویا کسی کنواری حسینہ کے لیے گلفام کا رشتہ لائی ہو۔ صاف کہے دیتی ہوں کہ ایسا ہی پسند ہے مولوی بصیر الدین تو اپنے رشتہ داروں سے کوئی لڑکی بیاہ لاؤ۔'' سکینہ بی تو اس عزت افزائی کے بعد سر پر پاؤں رکھ کر واپس گھر کو بھاگیں۔

مگر وقت کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ اس کا بھلا کسی کو پتا ہے؟ بسم اللہ بی اپنے دھیان میں بیٹھی توے پر روٹی ڈال رہی تھیں کہ اچھی بھلی سیڑھیاں اترتی قدسیہ نجانے کس طرح ٹھوکر کھا کر زمین پر گری اور اس کی پیشانی سے چیتے جاگتے، گاڑھے لہو کا فوراہ سا ابل پڑا، وہ گھبرا کر اٹھیں اور توے پر پڑی روٹی چھوڑ کر بچی کی طرف دوڑیں جس کے تمام کپڑے خون سے رنگین ہو چکے تھے۔ وہ جلدی سے اسے پانی کے نل پر لے گئیں اور زخم پر ٹھنڈا پانی ڈالا۔ برف کی ڈلی رگڑی اس کے علاوہ اور بھی جتنے ٹوٹکے آتے تھے آزما لیے۔ مگر خون تھا کہ بند ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ سکینہ بی بھی ادھر شور و غل سن کر گھر سے پھٹکری کی ڈلی لیے دوڑی آئیں تا کہ چھوٹا موٹا زخم ہو تو مل دیں مگر کہاں......؟

تب بسم اللہ بی نے کھونٹی سے اپنا شٹل کاک برقع اٹھا کر سر پر ڈال اور خون میں تقریباً نہائی ہوئی بچی کو کندھے سے لگائے قریبی ڈاکٹر کے کلینک کی طرف دوڑیں۔ تبھی مولوی بصیر الدین نیکی کا فرشتہ بن کر نجانے کہاں سے اپنی سائیکل پر اس طرف آ نکلے۔

''ارے......!'' قدسیہ کو اس طرح خون میں لت پت دیکھ کر ان کے منہ سے نکلا اور انہوں نے سائیکل روک لی۔

''آؤ قدسیہ بیٹی! جلدی سے سائیکل پر بیٹھ جاؤں میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔'' انہوں نے ایک ہاتھ سے قدسیہ کو اٹھا کر اپنی سائیکل پر آگے بٹھا لیا اور پھر نظریں نیچی کیے بسم اللہ بی سے مخاطب ہوئے۔

''قدسیہ کی ماں! تم چل کر اطمینان سے گھر بیٹھو اور اللہ سے خیر کی دعا مانگو، ہم بس یوں گئے اور یوں آئے۔'' انہوں نے تیزی سے سائیکل پر بیٹھتے ہوئے پیڈل مارا اور لمحے بھر میں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

بسم اللہ بی کو بھلا کہاں قرار آتا؟...... مامتا کی ماری، برقع سر سے اتارے بغیر وہیں گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر رونے لگیں۔ ''ہائے ...... ! قدسیہ کے ابا خود چلے گئے اور اور مجھے ان ننھے منے پودوں کو سینچنے کے

لیے آزمائش میں ڈال گئے۔" سکینہ بھی ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے انھیں تسلی دے رہی تھیں۔

تب ذرا ہی دیر بعد کیا دیکھتی ہیں کہ مولوی صاحب کی سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھی قدسیہ ہنستی مسکراتی ماتھے پر پٹی بندھوائے، ہاتھ میں نمک پارے بوندی کا لفافہ تھامے آرہی ہے۔

"لو بھئی قدسیہ! اترو اور جا کر اپنی ماں کی تسلی کراؤ، دیکھو تو بے چاری تمہاری وجہ سے کتنا پریشان ہو رہی ہے۔" انہوں نے ہاتھ کا سہارا لگا کر بچی کو سائیکل سے اتارا۔

"بھئی ماشاء اللہ بڑی ہی بہادر بیٹی ہے ہماری ("ہماری" پر بسم اللہ بیگم کا دل دھڑک اٹھا) چار ٹانکے یوں ہنستے کھیلتے لگوا لیے کہ پتا تک نہیں چلا۔ تم ایسے ہی گھبرا رہی تھیں۔" پھر سائیکل کے کیریئر میں سے دواؤں کا لفافہ بسم اللہ بی کو پکڑایا اور نصیحت کی۔ "یہ لال شربت ابھی گھر جاتے ہی بچی کو دو چمچے پلا دینا اور باقی دوائیں صبح دوپہر ایک ایک چمچہ کر کے دینا ہیں۔"

وہ برقعے کی اوٹ بنائے۔ اپنی انگلی کی پوروں سے آنسو صاف کرتے مولوی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بچی کو ساتھ لگائے گھر کے اندر چلی آئیں جہاں توے پر پڑی روٹی جل کر سیاہ ہو چکی تھی پھر کچھ بعد جب سکینہ بھی گھر چلی گئیں تو بچی کو دوائیں پلا کر سلانے کے بعد وہ دوبارہ روٹی پکانے بیٹھیں۔ قیصر بھی اسکول سے آتا ہی ہوگا بس، انہوں نے جلدی جلدی آٹے کا پیڑا بناتے ہوئے سوچا۔

رات کو دیر تک کپڑوں کی بچی کھچی کترنیں جوڑ کر قدسیہ کی گڑیا کے کپڑے سینے کے بعد جب بسم اللہ بیگم دن بھر کے تھکے ہارے وجود کے ساتھ بستر پر آ کر پڑیں تو دل جیسے کسی پشیمانی کے بھاری بوجھ تلے آ دبا۔ اگر سکینہ نے مولوی بصیر الدین کے نکاح کا پیام ڈال ہی دیا تھا تو کون سی کوئی گناہ والی بات کر دی تھی؟ بسم اللہ بی کی بھلائی کے لیے ہی مشورہ دیا تھا اور پھر مولوی نصیر الدین کوئی چور اچکے یا آوارہ لفنگے تو تھے نہیں بلکہ ایک زمانہ ان کی عزت کرتا تھا اور خود مولوی صاحب نے کٹھن حالات میں بسم اللہ کے گھرانے کا کتنا خیال رکھا تھا۔ ابھی تک بھی قیصر اور قدسیہ اگر کبھی اردو کے اشعار کی تشریح کرانے یا حساب کے سوال سمجھنے اور انگریزی پڑھنے مولوی صاحب کے پاس جاتے تو وہ دیر تک بڑی محبت اور توجہ سے ان کو پڑھایا کرتے۔ اب تند و تیز جذبات کی عینک اتاری تو بسم اللہ بی کو اپنے کیے پر تاسف ہونے لگا کیسے منہ بھر کر انہوں نے مولوی صاحب کو کوسنے دیے تھے اور انہیں لنگڑا تک کہنے سے گریز نہیں کیا تھا حالاں کہ لنگڑے پن کے باوجود وہ برے حالات میں بسم اللہ بیگم کے گھرانے کے لیے بیساکھی بنے رہے۔ وہ نادم ہو کر بستر پر اٹھ بیٹھیں۔

کیا انہیں مولوی صاحب کے نکاح کا پیام منظور کر لینا چاہیے؟ مگر اب تو انہوں نے بات ہی ختم کر دی تھی اور سکینہ بی نے بھی دوبارہ نہیں کہا تھا۔

کتنے ہی عرصے سے اس گھر میں کسی مرد کے قہقہے نہیں گونجے تھے۔ انہوں نے شوہر کی وفات کے بعد اپنے گرد خود ساختہ پابندیوں اور بندشوں کی دیواریں چن، خوشی کی ہر درز بند کر دی تھی اب گویا سناٹوں کے اس تابوت میں بند ان کا دل، تازہ ہوا کے خوش گوار جھونکے کو ترس رہا تھا۔ دفعتاً ان کی نظر سامنے دیوار پر لگے میلے سے آئینے پر پڑی تو وہ اپنا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئیں، رخصت ہوتی ہوئی جوانی، آنکھوں کے نیچے پڑے حلقوں اور جلد کی شکنوں کی صورت الوداعی تحائف ان کی جھولی میں ڈال کر جانے کو تیار کھڑی تھی۔

تب انہیں مولوی صاحب کے سفید، چکنے اور ملائم ہاتھ یاد آ گئے جن کی جوت بجھ چکی تھی اور وہ خود بھی تو دو بچوں کی ماں ہونے کے باعث گویا کیڑوں بھرا ایسا کباب تھیں جنہیں مولوی صاحب اب بھی اپنے خلوص کی بنا پر نگلنے کے لیے تیار تھے تب ان کا دل انہیں ایک انوکھے فیصلے پر اکسانے لگا۔

قدسیہ تو خیر ایک مصلحت پسند بچی تھی مگر اصل

مسئلہ قیصر کا تھا، خیر اسے بھی سمجھانے کی کوشش کروں گی، انہوں نے سوچا۔

''ہرگز نہیں۔'' قیصر نے سنا تو بپھر گیا۔ ''میں اپنے ابا کے سوا کسی دوسرے شخص کو تصور میں بھی باپ بنانے کا نہیں سوچ سکتا اگر ایسا ہوا تو میں مولوی کے بچے کو قتل کر کے خوسولی پر چڑھ جاؤں گا۔'' اس کی آنکھوں میں گویا خون اتر آیا۔ نویں جماعت کا طالب علم یکا یک ایک قد آور مرد کا روپ دھار کر گھر کی باگ دوڑ گویا اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور کبھی ننھے بچے کی صورت ان کی گود میں سر رکھے التجا سی کیا کرتا۔ ''تمہیں نہیں پتا اماں! میرے کلاس فیلوز مجھے کیسے طعنے دیں گے۔ لوگ ہمدردی کے بہانے مذاق اڑاتے ہیں آج کل، اور کوئی مذاق میں بھی میری ماں کے بارے میں کچھ کہے۔ گردن نہ مروڑ کے رکھ دوں اس کی۔'' وہ جوش سے کہتا تو بسم اللہ بی کی آنکھیں جھلملا اٹھتیں، واقعی اب انہیں نکاح کی کیا ضرورت تھی، جس شجر تلے انہیں سکھ کے دن بتانے تھے اس کی شاخیں اب اس قابل ہو رہی تھیں کہ وہ اس کے سائے تلے آرام سے بیٹھ سکتیں۔

چناں چہ اپنی خواہشوں اور حسرتوں کو میٹھی نیند سلا کر وہ دوبارہ زندگی کی دوڑ میں شامل ہو گئیں۔ نکاح کی بات گویا خواب گئی۔

مولوی صاحب نے بسم اللہ بیگم کی بیٹھک چھوڑی تو اپنے گھر میں بھی جی نہ لگا بھی محلے میں ایک دکان لے کر پرچون فروش بن بیٹھے۔ بسم اللہ کے گھر بھی زیادہ تر سامان انہی کے کریانہ اسٹور سے آیا کرتا۔ چند برس اور آگے سرک لیے۔ قیصر ڈاکٹر تو نہ بن سکا البتہ دسویں پاس کر کے ریفریجریشن کا کورس کیا اور کسی کے توسط سے باہر چلا گیا۔ گھر میں چار پیسے آئے تو میٹرک کرتے ہی قدسیہ کی بھی شادی ہو گئی اور وہ بیاہ کر لاہور چلی گئی، بسم اللہ بی کے دن رات تنہائی کے زہر میں بیتنے لگے۔ دن بھر پڑھنے والے بچے آ جاتے یا وہ ادھر ادھر پڑوس میں گھوم آتیں۔ مگر جیسے ہی گھر آتیں، سناٹے ان کے استقبال کو موجود ہوتے اور ان کا کلیجا منہ کو آنے لگتا۔ تب جانے کتنے ہی خط انہوں نے سکینہ کی بہو سے قیصر کو لکھوائے کہ وہ بہو بچوں کو لے کر پاکستان آ جائے یا انہیں اپنے بلا لے۔ بہو اپنے ہاتھوں بیاہ کر لانا تو ان کے نصیب میں نہیں تھا مگر انہیں مقدر سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ قیصر نے کچھ اچھا ہی دیکھ کر اسے شریک حیات بنایا ہوگا۔ وہ مطمئن تو تھیں مگر جلد از جلد بہو اور پوتا پوتی کو دیکھنے کے لیے بے تاب بھی تھیں مگر قیصر کو تو جیسے وہاں کی زمین نے پکڑ لیا تھا۔ پلٹ کر ہی نہ دیا۔

''خالہ! نکاح کر لو۔ اب بھی وقت ہے۔'' سکینہ بی کی بہو مشورہ دیتی۔

''ہٹاؤ بھی۔ اب قبر میں تانگیں لٹکی ہیں اور نکاح پڑھوالوں، جوانی میں تو کیا نہیں اب سفید چونڈے کے ساتھ لال دوپٹا اوڑھوں گی۔'' وہ ہنس دیتیں۔

بات آئی گئی ہو جاتی اور پھر ایک دن اچانک قیصر آیا اور ماں کو اپنے ساتھ ہی لے گیا جہاں سے وہ ٹھپے کھائی گیند کی طرح پلٹی تھیں۔ بس اڈے سے سالم تانگا کروا کر اپنی ٹین کی صندوقچی کے ہمراہ جب وہ گلی کے موڑ پر اتریں تو محلے بھر کے بچوں نے انہیں پہچان لیا اور ہر طرف آپا جی آ گئیں کا غل مچ گیا انہی بچوں کے ہمراہ وہ جلوس کی صورت میں اپنے گھر کی طرح چل دیں۔ مولوی صاحب کی دکان کے آگے سے گزرتے ہوئے جانے کیوں انہیں وہم سا ہوا کہ انہیں واپس آتے دیکھ کر مولوی بصیرالدین کے اجڑے منہ پر بہار سی آ گئی تھی اور وہ دھیرے سے اپنی کالی سفید مونچھوں تلے مسکرا دیے۔

بسم اللہ بی کا قافلہ بالآخر سکینہ بی کے گھر کے سامنے جا کر ٹھہر گیا تاکہ وہاں سے اپنے گھر کی چابی لے سکیں، مگر سکینہ بھی ایسے ہی فوراً کہاں آنے دیتی تھیں۔ دیر تک ساتھ چمٹا کر روتی رہیں۔ ''اے بسم اللہ! میرے سر کی قسم جو اگر اب محلہ سنسان کر کے کہیں جاؤ۔'' اور وہ سر ہلا کر آسودگی سے مسکرا دیں۔ انہیں

یکا یک یوں لگا گویا وہ اپنوں کے درمیان پہنچ گئی ہوں۔ آج انیسواں روزہ تھا اور افطار کا وقت بھی ہونے ہی والا تھا۔ سکینہ بی نے انہیں وہیں دسترخوان پر بٹھالیا۔ اسی دوران محلے کا ایک بچہ ہاتھوں میں ڈھکی ہوئی پلیٹیں لیے چلا آیا۔ ''یہ مولوی صاحب نے بھجوائے ہیں۔ بس جلدی سے پلیٹیں خالی کر دیں۔'' بچہ ابھی تک کھڑا تھا۔

سکینہ بی نے دیکھا۔ خوشبودار مٹر پلاؤ کے اوپر شامی کباب سجے تھے۔ انہوں نے فوراً پلیٹیں خالی کر کے جواباً ان میں وہی بڑے ڈال کر مولوی صاحب کی طرف بھجوا دیے۔

''یہ اپنے مولوی صاحب نے کیا نکاح کرلیا؟'' وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

''نہیں خالہ! تمہارے لیے اب بھی سیٹ خالی ہے۔'' سکینہ بی کی بہو پوری پٹاخہ تھی، شرارت سے باز نہ آئی۔

وہ شرمندہ سی ہوگئیں...... ''پھر یہ......؟'' انہوں نے پلیٹوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ارے کہاں......؟ بے چارے خود ہی آج کل ہانڈی روٹی پکایا کرتے ہیں حالاں کہ سبھی نے کہا کہ آپ تکلیف نہ کیا کریں ہم افطاری اور کھانا باری باری بھجوادیا کریں گے مگر وہ نہیں مانے۔'' سکینہ بی نے تفصیل بتائی تو وہ چپ رہ گئیں۔

افطار اور نماز مغرب کے بعد انہوں نے اپنی صندوقچی سے وہ تحائف نکال کر سکینہ بی اور ان کی بہو کے حوالے کیے جو وہ لاہور سے ان کے لیے لے کر آئی تھیں پھر اپنے مٹھو کو آ کر دیکھا جو ان کی خوشبو پا کر پنجرے میں خوب پھدک رہا تھا۔ لالو اور چندو بھی انہیں سکینہ بی کی مرغیوں کے ساتھ زیادہ خوش باش اور صحت مند نظر آئیں۔

اسی اثناء میں عید کا چاند نظر آنے کا اعلان ٹی وی پر ہونے لگا تو وہ سکینہ بی اور ان کی بہو کے ساتھ چھت پر چاند دیکھنے چلی آئیں۔ کافی تلاش کے بعد دور کسی مسجد کے گول گنبد کے ساتھ کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ میں بالآخر انہیں باریک سا ہلال عید نظر آ ہی گیا۔ تو بے ساختہ ان کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے۔

یکدم ہی ہر طرف چہل پہل ہونے لگی تب وہ اپنے گھر کی چابی مٹھی میں دبائے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

گھر بالکل اسی حالت میں موجود تھا۔ جس طرح وہ جانے سے پہلے چھوڑ کر گئی تھیں۔ شاید سکینہ بی روزانہ صفائی کرایا کرتی تھیں پودے بھی ہرے بھرے تھے۔

وہ اپنے بستر پر جا کر سکون سے لیٹ گئیں۔ اپنا گھر بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ وہ سوچنے لگیں۔ نجانے کب ہلکی سی غنودگی نے انہیں آلیا۔ تھکی ہاری تو تھیں آنکھ لگ گئیں۔

شاید رات کے دس بج رہے تھے۔ اچانک بسم اللہ بی پیٹ کے شدید درد سے بے چین ہو کر جاگ اٹھیں۔ نجانے کیوں رہ رہ کر مروڑ اٹھ رہے تھے حالاں کہ انہوں نے تو افطاری کے بعد کھانا بھی برائے نام ہی کھایا تھا مگر شاید افطاری میں بنی چھولوں کی چاٹ نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔

اب کیا کریں......؟

گاؤں میں تو ویسے بھی لوگ رات کو جلدی سو جاتے ہیں اور سردیاں شروع ہو جانے کے باعث سبھی لوگ اپنے اپنے کمروں میں دروازے سے مقفل کیے نیند کے مزے لے رہے ہوں گے ایسے میں وہ سکینہ بی کو بھی کیوں کر بلا پائیں گی۔

جب درد ناقابل برداشت ہو گیا تو ناچار برقع سر پر ڈالا اور مکان کو تالا لگا کر باہر نکل آئیں۔

گلی یہاں سے وہاں تک سنسان پڑی تھی البتہ سامنے مولوی صاحب کی دکان کھلی ہوئی تھی اور وہ بھی سامان اندر رکھ کر دکان بند کرنے ہی والے تھے۔

بسم اللہ بی کو اس وقت اچانک اس طرح اپنے سامنے پایا تو پلکیں تک جھپکنا بھول گئے۔

''مولوی جی! سیون اپ کی بوتل ہوگی آپ کے پاس؟'' وہ پیٹ کی تکلیف سے بے حال ہو رہی

تھی، چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

"ہاں کیوں، ابھی لو۔" وہ چونک کر مڑے اور بوتل نکال کر لگے جو اوپنر سے کھولنے تو ٹھاہ کی آواز کے ساتھ ہی بوتل پھٹ گئی، شیشے کے کئی ٹکڑے مولوی صاحب کے ہاتھ میں گھس گئے۔ یہاں سے وہاں تک سارا خون ہی خون پھیل گیا۔

واہ کیا قسمت پائی تھی۔ بسم اللہ بی نے جہاں قدم رکھ دیتیں بن بلائی مصیبت ساتھ چلی آتی۔

خون دیکھ کر تو وہ ہمیشہ سے ہراساں ہو جایا کرتی تھیں۔ اس وقت بھی سب کچھ بھول بھال کر اپنے سفید برقعے کا کونہ ان کے ہاتھ کے گرد لپیٹ دیا۔

مگر بات نہ بنی تب مولوی صاحب تو بھاگے ڈاکٹر کے کلینک کی طرف وہ بھی اخلاقاً ساتھ ہی چل دیں۔ ساری مصیبت تو انہی کی وجہ سے آئی تھی۔ نہ وہ بوتل مانگتیں نہ یہ نوبت آتی۔ ہاتھ کی پٹی کروا کر مولوی صاحب کو کچھ یاد آیا۔

"ارے قدسیہ کی ماں! تمہارے بھی تو پیٹ میں درد تھا۔ اپنی بھی دوا لے لیتیں" (ڈاکٹر تو جا چکا تھا اب ڈسپنسر بیٹھا چھوٹے موٹے کام نمٹا رہا تھا)

"اب کہاں رہا وہ منحوس درد دفع کرو۔" وہ نقاب سے آدھا منہ ڈھانپے مولوی صاحب کے ساتھ ہی واپس ہو لیں اور جب وہ اپنے گھر کی طرف بے دلی سے مڑیں تو مولوی صاحب نے پکار لیا۔

"کل صبح شیر خرمہ کی تیاری کے لیے دکان سے کچھ نہیں لو گی؟......دودھ، سویاں، چاول، بادام، پستہ اور چاندی کے ورق...... کچھ بھی نہیں چاہیے کیا؟"

"آہ......اب کون کھانے والا بیٹھا ہے وہاں" انہوں نے سرد آہ بھر کے سر جھکا لیا۔

"کیسا عجب اتفاق ہے کہ تمہارے گھر میں کھانے والے نہیں ہے اور میرے گھر میں کوئی پکانے والا نہیں۔" وہ زہر آلود سی ہنسی ہنس دیے۔ بسم اللہ بیگم نے چونک کر اوپر دیکھا جہاں مولوی بصیر الدین کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

زندگی کا کوئی ایک لمحہ بھی کبھار انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہو جاتا ہے۔ بسم اللہ بی بھی آج ایسے ہی کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آ گئیں اور لپک کر آگے بڑھیں اور مولوی بصیر الدین کا ہاتھ تھام لیا اور کچھ ہی دیر بعد دو زندگی کی خوشیوں کو ترسے ہوئے اور بال بچوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہائی کا عذاب جھیلنے والے وجود، ایک دوسرے کے گلے لگے۔ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

آدھی رات کو مولوی صاحب ساتھ گاؤں میں رہنے والے دوست قاضی امیر علی (نکاح خوان) کے ہاں سے چار گواہوں کی موجودگی میں نکاح پڑھوا کر بسم اللہ بی کو گھر لائے تو وہ نئی نویلی دلہن کی طرح لجا کر رہ گئیں۔

دونوں نے مل کر شیر خرمے کی تیاری کے لیے چھوارے بھگوئے۔ کشمش صاف کی اور ناریل کاٹ کر رکھا پھر مولوی صاحب کا کلف لگا کرتا شلوار انہوں نے اسی وقت استری کر کے الماری میں لٹکایا تاکہ وہ صبح بروقت تیار ہو کے عید کی نماز کو جا سکیں۔ اس گھر کی دیواروں نے ایک طویل عرصے کے بعد گھر میں چہل پہل کا سماں دیکھا تھا۔

بچے اگر انہیں بھول کر اپنی زندگی کی خوشیوں میں مگن ہو گئے تھے تو انہوں نے بھی زندگی کے بچے کچھے رنگ چرانے کو اپنا حق سمجھ لیا تھا۔

اب ان کا اصل گھر یہی مولوی صاحب کا ٹھکانا تھا اور یہیں انہیں باقی زندگی کے دن پورے کرنا تھے اور ابھی تو اپنے گھر کے باہر انہیں "برائے فروخت" کی تختی بھی لٹکانا تھی۔

مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اذان فجر بلند ہو رہی تھی اور بسم اللہ بی بڑے پیار سے بالوں میں انگلیاں پھیر کر مولوی صاحب کو جگا رہی تھیں کیوں نہ جگاتیں آخر آنے والی عید کی نئی صبح ان دونوں کے لیے ہی اپنے دامن میں نئی امیدوں اور مسرتوں کا پیغام لا رہی تھی۔

☆☆

دلوں کے بادباں سمٹے

صدف حسین

اپنی اچھی چیزوں کو دوسروں کی خوشی اور بہتری کے لیے دان کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ بھی ایسے ہی لوگوں کو پسند فرماتا ہے۔ جو دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیں۔ ایک وفا شعار کا قصہ، اس نے قربانی کا خنجر اپنے وجود میں اتار لیا تھا۔

ان لوگوں کے لیے بطور خاص جو دل کی سرگوشیوں پر گنگناتے ہیں



میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بساط زندگی اس طرح الٹ جائے گی۔ میں نے ایسا تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا شاید یہ قسمت تھی جس نے مجھے اس دوراہے پر لا کھڑا کیا۔ زبیر ابھی جو کچھ کہہ کے گیا تھا تو وہ اپنی جگہ درست تھا لیکن اس حادثے کے بعد میں بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ ایک وقت میں اس کی ہمراہی کی تمنائی تھی۔ لیکن پھر میں نے خود اسے اپنے ہاتھوں سائرہ کے نام کر دیا تھا اور اب سائرہ کی موت کے بعد اسے میری ضرورت تھی میں نے سوچنے کے لیے دو دن مانگے تھے...... سچ ہے انسان جو کچھ سوچے وہ خدا کے فیصلوں کے آگے انتہائی مجبور ہوتا ہے میں نے تو خلوص دل سے زبیر اور سائرہ کی کامیاب زندگی کی دعا مانگی تھی مگر اس طرح ہوگا کسے معلوم تھا۔ زبیر کے سوال سے میں جس مشکل کا شکار رہی ہوں اس کے سمجھنے کے لیے میں اپنی زندگی کی کہانی آپ کو سناتی ہوں۔

میرا نام ندا ہے۔ میرا تعلق ایک متوسط طبقے سے ہے۔ جب میں چار سال کی تھی تو میرے والد کا انتقال ہو گیا اور ہم نانا کے گھر آ گئے۔ چھ مہینے کے بعد امی کی شادی اکرام اللہ شیخ سے ہوگئی جو ایک خوش حال بزنس مین تھے۔ ان کی حیثیت نانا کی فیملی کے مقابلے میں کئی گنا اچھی تھی جس نے ان کی ایک بچی سائرہ کا باپ ہونے کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ ایک بچی کی ماں تو میری امی بھی تھیں اور نانا کے نزدیک یہ اہم بات تھی کہ انہوں نے میری ذمے داری بھی قبول کر لی تھی۔ امی مجھے اپنی شادی کے ایک ماہ بعد اپنے گھر لے گئیں۔ نانا کے گھر کے مقابلے میں ان کا گھر بہت اچھا تھا۔ امی کی سوتیلی بیٹی سائرہ نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا اور مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سائرہ نہ صرف مجھ سے اکھڑی رہتی بلکہ امی سے بھی بہت لیے دیے رہتی۔ یہ امی تھیں جنہیں زندگی کی آسودگی اور آرام بہت دیر سے میسر آیا تھا اور وہ کسی قیمت اسے کھونا نہیں چاہتی تھیں لہٰذا وہ سائرہ کی بدتمیزی اور بدسلوکی پر کچھ نہ کہتیں۔ اکرام اللہ شیخ نے پہلے دن واضح کر دیا تھا کہ وہ سائرہ کو ماں کا پیار اور توجہ تو دیں گی مگر وہ اس پر کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کر سکتیں اور ساتھ ہی میری پوزیشن بھی واضح کردی تھی کہ میں بھی سائرہ سے کسی قسم کی منفی بات نہیں کروں گی۔ امی نے اس بات کو گرہ میں باندھ کر فرماں بردار بیوی اور سائرہ کے لیے خلوص بھرے پیار کی انتہا کردی۔ لیکن وہ اپنی بیٹی کو اور اس کے جذبات کو یکسر فراموش کر گئیں۔

میں نے بھی بہت جلدی اس ماحول میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرلیا۔ میں سائرہ سے کچھ بولتی اور نہ اکرام اللہ شیخ سے۔ میں نے اپنی ضرورتوں اور خواہشات کو کافی محدود کرلیا تھا۔ ان حالات میں زبیر میرا بڑا اخلاقی سہارا تھا۔ وہ میرا ماموں زاد ہے۔ ممانی کا جلدی انتقال ہو گیا تھا ماموں کی جاب حیدرآباد میں تھی وہ وہیں رہتا تھا۔ لیکن جب وہ کراچی آتا تو میں نانا کے گھر جا کر اس سے ضرور ملتی۔ وہ بچپن ہی سے بہت ذمے دار تھا ہم میں بہت انڈر اسٹینڈنگ تھی اور یہ ذہنی ہم آہنگی وقت کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طریقے سے محبت کا تناور درخت بن چکی تھی۔

زبیر تعلیم مکمل کر کے بینک کی ملازمت اختیار کر چکا تھا۔ میری بھی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ سائرہ بھی یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کر کے اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ تفریحی مقامات کی سیر کر کے آئی تھی۔

زبیر نے کہا تھا کہ وہ میرے سلسلے میں امی سے بات کرنے والا ہے۔ اس لیے میں پہلے ہی امی سے یہ بات کرنا چاہ رہی تھی لیکن موقع نہیں مل رہا تھا کیوں کہ اب زیادہ وقت امی اور سائرہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے نظر آتیں۔ میرے سوتیلے والد شیخ صاحب بزنس کے سلسلے میں جرمنی گئے ہوئے تھے ایک روز جب میں بات کرنے کی غرض سے امی کے کمرے میں آئی تو سائرہ اور وہ باتوں میں مصروف تھیں مجھے آتا دیکھ کے خاموش ہوگئیں وہ دونوں ابھی ابھی کہیں سے آئی تھیں۔ میرے کمرے میں آنے سے سائرہ خاموشی سے وہاں سے چلی گئی۔ آج مجھے اس کے چہرے پر بہت پریشانی دکھائی دی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔

''کیا ہوا کوئی کام ہے؟'' امی مجھے مخاطب کرتے

ہوئے بولیں۔ ’’جی وہ آپ کہاں چلی گئی تھیں اس طرح؟‘‘
انہوں نے گہرا سانس لیا اور اپنے پاس بیڈ پر میرے لیے جگہ بناتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
’’کیا بات ہے آپ کچھ پریشان ہیں۔‘‘ میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے مجھے اک نظر دیکھا اور پھر سر جھکا کے، بنا کسی تمہید کے ایک دھما کا سا کر دیا۔
’’سائرہ نے شادی کرلی تھی۔‘‘
’’لیکن کب، کیسے آپ کیا کہہ رہی ہیں؟‘‘ میں نے حیران پریشان ہو کر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔
’’بتاتی ہوں!‘‘ انہوں نے آہستہ سے بات شروع کی۔
’’سائرہ اپنے ہم جماعت کو پسند کرتی تھی یہ سلسلہ کافی دنوں سے چل رہا تھا وہ لڑکا حیثیت میں سائرہ سے کہیں اچھا ہے جب سائرہ اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے گئی تو وہیں انہوں نے شادی کرلی۔ محبت واقعی اندھی ہوتی ہے، دونوں نے شادی تو کرلی لیکن محض چند دنوں کے ساتھ کے بعد ہی انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ دونوں کا زندگی بھر ساتھ رہنا مشکل ہے اور اس لڑکے نے سائرہ کو طلاق دے دی۔ چوری چھپے سہی لیکن دونوں نے نکاح کیا تھا مگر اب سائرہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے میں تو صرف یہ سوچ رہی ہوں کہ شیخ صاحب کو کیا کہوں گی، میں جانتی ہوں کہ وہ سائرہ کو بے پناہ چاہتے ہیں اور مجھے ہی الزام دیں گے کہ میں نے لڑکی کا خیال نہیں رکھا۔ جب کہ وہ میری سنتی ہی کب تھی۔ لیکن وہ ان کی بیٹی ہے وہ اسے بے قصور ہی سمجھیں گے تم تو ان کے مزاج سے واقف ہو اب بتاؤ میں کیا کروں؟‘‘
امی نے میرے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا میں نے ان کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے جواب دیا۔
’’اس میں آپ کی کوئی خطا نہیں یہ سراسر بے جا آزادی کا نتیجہ ہے، کیا وہ یہ بات نہیں جانتے؟‘‘
’’لیکن انہوں نے شادی کے بعد سائرہ کی تربیت کی ذمے داری مجھ پر ڈالی تھی میں نے ہر ممکن طریقے سے اپنی ذمے داری نبھائی، یہ الگ بات ہے کہ سائرہ نے آج تک میری ایک نہ سنی اور اب اتنا کچھ ہو جانے کے بعد وہ مجھ سے اس مسئلے کے حل کے لیے کہہ رہی ہے میں کیا کروں؟‘‘ ان کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔
میں نے آہستہ سے کہا۔ ’’آپ فکر نہ کریں اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرلیں گے۔‘‘
’’اس طرح مسئلہ حل نہیں ہوگا بیٹا!‘‘ ’’ابھی ان کے آنے میں ایک ہفتہ ہے۔ آپ نے کیا سوچا ہے؟‘‘ میں نے کہا۔
’’بیٹا! اب تک تو میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ جتنی جلدی ممکن ہو ہم سائرہ کی کہیں بات طے کردیں۔‘‘
’’لیکن امی اب اس بات کے بعد یہ کیوں کر ممکن ہے کیا آپ نے سوچا سائرہ کی شادی اس طرح کیسے ممکن ہے؟‘‘
’’ہاں!‘‘ امی نے ہلکے سے کہا۔
’’سائرہ کیا کہتی ہے؟‘‘
’’وہ اب کیا کہے گی بس خاموش ہے۔‘‘
’’تو کیا وہ دوسری شادی پر رضامند ہے۔‘‘
’’میں نے اس سے پوچھا تھا تو اس نے سر جھکا دیا۔ بیٹا اب اس کے پاس کوئی اختیار نہیں رہا۔ اب وہ حالات کے رحم و کرم پر ہے بیٹا! کچھ سوچو!‘‘ چند لمحے رک کر وہ بولیں۔ ’’میں جانتی ہوں تم نے بہت صبر کیا کبھی کچھ نہیں کہا مجھ سے۔ لیکن اب تم زبیر سے بات کرو...... یہ سمجھو کہ تمہیں اپنی ماں کی مدد کرنا ہے کیوں کہ شاید تم ہی یہ بات سمجھ سکتی ہو کہ میں آج اتنے عرصے بعد بھی مجبور ہوں۔ بیٹا عورت زندگی بھر اپنے سائبان کی تلاش میں ہی رہتی ہے۔‘‘
’’امی آپ فکر نہ کریں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا اللہ تعالیٰ آپ کا ایسا امتحان نہیں لے گا۔ اب آرام کریں صبح بات کریں گے۔‘‘ میں نے انہیں تسلی دی۔ میں نے انہیں تو آرام کا کہا مگر اب میری نیندیں اڑ گئیں تھی۔
سائرہ نے جو کچھ کیا اس کی ذمے دار امی کیسے ہیں؟ عمر کے اس حصے میں اکرام اللہ شیخ کس طرح امی کو بے اماں کر سکتے ہیں وہ بھی اپنی بیٹی کی غلطی پر امی کا یہ کہنا کہ جلد از جلد سائرہ کی شادی کردی جائے یہ

ساری باتیں میرے ذہن کو الجھا رہی تھیں۔ امی ہمیشہ سے ہی سمجھتی رہیں کہ اکرام اللہ شیخ نے ان سے شادی کر کے اور ان کی بیٹی کی ذمے داری قبول کر کے ان پر احسان کیا ہے اس کے بدلے میں انہوں نے ان کے لیے اور ان کی بیٹی کے لیے مکمل طور پر اپنی اور میری ذات کی نفی کی۔ حالاں کہ اس ایثار کو کبھی انہوں نے محسوس کیا اور نہ سائرہ نے۔ اب بھی اتنی بڑی بات ہو جانے پر وہ خوف زدہ تھیں اور سائرہ کی بہتری کا سوچ رہی تھیں۔ اب ایسا کون سا شخص یا خاندان ہو سکتا ہے جو سائرہ کو اس طرح قبول کر لے گا؟ اگر زبیر سائرہ سے شادی کر لے، ایسا کس طرح ممکن ہے؟ لیکن زبیر تو مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے تو کیا وہ میری بات نہیں مان سکتا۔ میں اب مستقل اسی بات کو سوچ رہی تھی اور آخر کار میں نے امی کے خوف زدہ چہرے کو یاد کر کے زبیر سے اس سلسلے میں بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور سوچ لیا کہ زبیر سے کوئی بات طے ہو جانے پر میں امی سے بات کروں گی۔

صبح اٹھتے ہی ضروری کاموں سے فارغ ہو کر میں نے زبیر کو بینک فون کیا زبیر کو میں نے چار بجے ایک ریسٹورنٹ میں بلایا تھا اور چار بجے تک میں اپنے آپ کو اس سے بات کرنے کے لیے تیار کرتی رہی۔ ریسٹورنٹ میں میرے سامنے بیٹھتے ہی اس نے کہا۔ ”ایسی بھی کیا ایمر جنسی تھی کہ صبح فون پر اس طرح ملنے کے لیے کہا۔“

”صبر.....صبر!“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے آہستہ سے کہا اور بڑی ہمت کر کے اس سے پوچھا۔ ”زبیر ایک بات بتاؤ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟“

وہ مسکرانے لگا۔ ”آج یہ بات پوچھنے کی کیا ضرورت پڑ گئی اور یہی پوچھنے کے لیے تم نے اس طرح ادھر بلایا ہے؟“

”زبیر پلیز! بتاؤ نا!“ میں نے اصرار کیا۔

”شاید تم جانتی ہو تمہیں پوچھنے کی ضرورت کیا ہے؟“

”میں اگر تم سے کچھ کہوں تو تم مانو گے؟“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”بھئی یہ تو بات پر منحصر ہے کہ تم کیا کہتی ہو!“ اس نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

”میں چاہتی ہوں کہ تم شادی کر لو۔“

میرے مزید کچھ بولنے سے پہلے اس نے کہا۔ ”تمہیں مجھے یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہیں میں تو یہ بات کرنے والا ہوں تو پھر پریشانی کی کیا بات ہے۔“

”نہیں میں چاہتی ہوں کہ تم سائرہ سے شادی کر لو۔“ میں فوراً بات مکمل کر کے ٹیبل کو گھورنے لگی۔

”کیا تم نے یہ مذاق کرنے کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے۔“ اس نے تھوڑی خفگی سے جواب دیا۔

”زبیر! یہ قطعی مذاق نہیں ہے میں زندگی میں شاید پہلی بار اس قدر سنجیدہ ہوئی ہوں میں بخدا دل سے یہ چاہ رہی ہوں کہ تم سائرہ سے جلد از جلد شادی کر لو میری خاطر میری محبت کی خاطر۔“ میں نے التجائیہ لہجہ اختیار کیا۔ ”ندا تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو، اور کس سے کہہ رہی ہو۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور سائرہ کو میں خوب جانتا ہوں اور تم تو مجھ سے بہت بہتر جانتی ہو تم نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی اور اکیلے فیصلہ کر کے اس میں مجھے کیسے شامل کر لیا۔“ وہ بہت خفا ہو رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”پہلے تم میری بات سن لو پھر کچھ کہنا اور پھر تمام بات شروع سے آخر تک اسے سنا دی۔ ”اب مجھے یہی حل نظر آیا ہے۔“ میں نے آخر میں کہا۔

”تو تم مجھے قربان ہونے کے لیے کہہ رہی ہو۔ تم خود غرض ہو رہی ہو۔ سائرہ اپنی مرضی سے سب کچھ کر کے بھی فائدے میں ہے اور پھوپھی نے دوسری شادی کے بعد صرف اپنے لیے سوچا اور سائرہ اس نے کبھی تمہیں بہن نہیں سمجھا اور تم وہ سب بھلا کر انسانیت کی کون سی مثال قائم کرنا چاہتی ہو اور میں اس سلسلے میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔“ اسے غصہ آ رہا تھا۔

”زبیر! تمہاری باتیں اپنی جگہ درست ہیں مگر امی نے جو کچھ کہا وہ اپنے لیے کہا لیکن وہ میری ماں ہیں میں کس طرح ان سے نفرت کر سکتی ہوں۔ زبیر حقیقتاً عورت محبت میں خود غرض ہوتی ہے بس اس کی خود غرضی کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں امی کو اپنی ازدواجی

زندگی عزیز تھی۔ سائرہ کو اپنی محبت اور مجھے ماں کی بقا عزیز ہے لیکن محبت ہمیں دوسروں کے لیے جینا بھی سکھاتی ہے، دوسروں کے لیے کچھ کرنے کا درس بھی دیتی ہے۔ زبیر میں نے زندگی میں بہت سمجھوتے کیے ہیں ایک اور کرلوں گی اور مجھے کوئی نہ کوئی ساتھی زندگی گزارنے کے لیے مل جائے گا لیکن سائرہ کی ایک غلطی نہ صرف اس کی بلکہ میری ماں کی زندگی کو جہنم میں بدل دے گی وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی بیزاوار کہلائے گی میں اگر ان کا بیٹا ہوتی تو بات الگ تھی میں تم سے التجا کر رہی ہوں کہ تم سائرہ سے شادی کرلو۔ میری ذات پر یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا۔ امی سائرہ سے بات کرلیں گی۔ وہ اب کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہے خدا کرے گا تمہاری زندگی اچھی گزرے گی۔ زبیر! میری زندگی کی یہ سب سے بڑی خوشی ہوگی۔ سمجھنے کی کوشش کرو!'' میں اپنی بات منوانے کی پوری سعی کر رہی تھی۔

''اب چلیں کافی وقت ہوگیا۔'' زبیر نے کہا۔ باتوں کے دوران ہم نے تھوڑا کھانا بھی کھایا۔ ''چلو میں تمہیں ڈراپ کردوں گا۔'' اس نے میری باتوں کا جواب دیے بغیر کہا۔

''نہیں پہلے میری بات کا جواب دو۔''

''ندا! تم نے مجھے دوراہے پر کھڑا کردیا ہے تم میری محبت کو آزما کر میرا امتحان لینا چاہ رہی ہو۔ ندا! جب تم مجھ سے الگ ہونے کا فیصلہ کر ہی چکی ہو تو مجھے بھی اس کے متعلق سوچنے کا وقت چاہیے۔''

گھر آکر جانے کیوں میرے دل کو اطمینان سا ہوگیا تھا شاید اسی کا نام زندگی ہے! انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ زبیر نے میرا مان رکھ لیا تھا میں نے امی سے بات کرلی تھی سائرہ کو بھی بتا دیا تھا۔ اس واقعے نے اس کی شخصیت میں کافی تبدیلیاں پیدا کردی تھیں۔ لیکن میرے دل میں کچھ کھو جانے کا احساس بھی تھا مگر اپنی اچھی چیزوں کو دوسروں کی خوشی اور بہتری کے لیے دان کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے جس کا احساس مجھے اب ہو رہا تھا مجھے امید تھی کہ اللہ تعالیٰ سب ٹھیک کردے گا۔

آخر کار زبیر اور سائرہ کی شادی ہوگئی سب ہی خوش تھے۔

زبیر ایک اچھا انسان تھا۔ میں زبیر کا جتنا احسان مانتی کم تھا مگر اب وہ مجھ سے بات نہیں کرتا تھا۔ کبھی کبھار سامنا ہوتا تو بس علیک سلیک رہتی۔ البتہ امی اور سائرہ کی نظروں میں مجھے تشکر کی پرچھائیاں نظر آتیں۔ مجھے عجیب سا محسوس ہوتا میں نے یہ سب کسی لالچ میں یا اونچا بننے کے لیے نہیں کیا تھا اپنی سی کوشش کی تھی کسی کے کام آنے کی۔

سائرہ کی ڈلیوری کے دن قریب آرہے تھے۔ ہاسپٹل جانے سے ایک دن پہلے اس نے مجھے بلا کر کافی باتیں کیں۔ بچپن سے جوانی تک کی اور آخر میں میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔

''میں تمہاری مجرم ہوں میں زبیر اور تمہارے درمیان آگئی میں نے غلطی بھی کی اور یہ بھی چاہا کہ مجھے کوئی خمیازہ نہ بھگتنا پڑے۔ تم عظیم اور منفرد لڑکی ہو۔ امی بھی عظیم ہیں اور زبیر بھی۔ انہوں نے مجھے کوئی احساس نہیں ہونے دیا کہ میں نے کیا کیا۔ میں ہی خود غرض ہوں مجھے بڑی دیر میں احساس ہوا کہ میں نے صرف اپنی لیے ہی سوچا، ندا! مجھے معاف کردو میں دنیا سے جاتے ہوئے کوئی بوجھ اپنے سینے پر لے کر نہیں جانا چاہتی۔''

''نہیں سائرہ پلیز! ایسی باتیں نہ کرو، تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ شاید خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نہ سائرہ جانبر ہوسکی اور نہ اس کا بچہ۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کے آگے انسان بے بس ہوتا ہے کسی نے ایسا نہیں سوچا تھا۔

زبیر ابھی ابھی یہی کہہ کے گیا تھا کہ اس نے میری بھی تو بات مانی تھی اور اب مجھے اس کا ساتھ دینا تھا۔ ہمارا ساتھ قسمت میں لکھا تھا لیکن اس امتحان کے بعد۔ میں نے زبیر کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ زبیر نے کہا تھا کہ ''کچھ لوگوں کی زندگی کا مقصد دوسروں کے کام آنا ہوتا ہے۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہوتی ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتا ہے جو دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیں اور اللہ کا یہ انعام بھی میں اب کھونا نہیں چاہتا۔''

☆☆

صبا کا در کھلا

شازیہ ظہیر

عورت تو ہمیشہ سے ہی قربانی دیتی چلی آئی ہے گھر کے لیے، حالات کی خاطر بہن بھائی، ماں باپ...... سب کے لیے۔ لیکن ممتا کی قربانی دینا سب سے مشکل کام ہے۔ لیکن جب انسان سمجھوتوں کی چادر اوڑھ لے، جو ہے جیسا ہے کی بنیاد پر قبول کرلے اور قسمت پر شاکر ہو تو زندگی بہت حد تک سہل ہوجاتی ہے۔

عورت ماں بن کر معتبر ہوجاتی ہے۔ یہ بات اس عورت کی سمجھ میں نہیں آئی جس کے دامن میں قدرت نے کوئی کرن نہیں رکھی تھی۔

خواہشوں، خوابوں اور خراشوں سے گندھی دل گداز کہانی





انسان کا دل اداس ہو تو ہر شہر کی شامیں اداس، ویران، اور سنسان ہو جاتی ہیں۔ جب دل آباد نہ ہو تو دن بھی آباد نہیں ہوتے۔

سارے موسم ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ گرم، حبس زدہ، ساون بھادوں مگر بات یہ تھی کہ اب رونا بھی نہیں تھا۔

"روئے تو کس کے لیے۔ سب کچھ تو طے شدہ تھا۔"

اگر غبار نکالنے کے لیے روتی تو فضول تھا کیوں کہ قسمت اب اس نہج پر تھی جہاں غبار، دھند تیزی سے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

اب تو اسے اپنے اندر صبر و برداشت و تحمل، استقامت جیسے اوصاف پیدا کرنا تھے۔

بعض اوقات چھوٹی سی احتیاطیں بڑے مرحلے طے کر دیتیں ہیں اور مرحلہ کوئی بھی ہو آخر طے ہو ہی جاتا ہے۔

آہستگی سے نبیلہ شفیع نے سر اٹھا کر چہار جانب دیکھا۔ جیسے غیر محسوس سا سناٹا اس کے وجود سے نکل کر پھیل گیا ہو۔

درخت سر جھکائے افسردہ تھے۔ خاموش تھے۔ اس ننھی سی لڑکی کے دکھ پر ماتم زدہ۔ ماتم کوئی بھی ہو شام غریباں ضرور بین کرتی ہے۔

ملگجا سا اندھیرا تھا۔ ملگجا سا اجالا۔

دوراہے پر کھڑی ہر چیز بے یارو مددگار ہوتی ہے۔

یقینی اور بے یقینی کے درمیان ہوتی ہے۔

آسمان سے پرندے نیچے اترنے شروع ہو گئے تھے۔ اپنے ٹھکانوں پر رات کچھ پرے لان کے کونے میں لگے برگد کے درخت پر ٹھہر گئے۔

کتنی صدیوں سے اس نے کتنے نشیب و فراز دیکھے ہوں گے۔

زمانے کے اطوار، اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیا ہو گا۔

کاش وہ جان سکتی پرانے لوگوں کے دکھ کیسے ہوا کرتے ہوں گے کیا اس جیسے...... اس کی ماں جیسے یا۔

یا پھر تمام غریبوں کے ایک جیسے ہی دکھ ہوتے ہیں۔ پیسے کا دکھ، روپے کا غم، دولت کا احساس کمتری مل جائے تو امیر و غریب میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔

یہ ہی تو امتیاز ہوتا ہے ان کے درمیان اسی سے تو غریب ہار جاتا ہے۔ جیسے اس کی ماں ہار گئی۔

چاروں اطراف سے نظریں بھٹک کر اپنی ہی ہتھیلیوں پر آ کر ٹھہر گئی۔ مہندی سے مزین نقش و نگار جواب ہلکے ہو کر مٹنے کے قریب تھے۔ اس کے جسم پر قیمتی سبز کلر کا لباس تھا۔ پیروں میں مہنگی سی جوتی بالکل ایسی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

ہاتھوں میں کھن کھن کرتیں چوڑیاں۔

کانوں میں ہلکے ہلکے موتیوں کے آویزے۔

لمبے گھنے بال جو پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔

اس کا معصوم حسن اس وقت جہاں سوز تھا

اس کا نصیب ہار گیا تھا دولت جیت گئی تھی۔

کسی کی ضرورت بن گئی تھی وہ اس کے خواب جیت گئے خواب ہی تو دیکھے تھے منزل تو نہیں سمجھا تھا۔ پھر لوگ اس کی معصومیت کے کیوں درپے ہو گئے۔

گیٹ سے باہر کوئی گاڑی تیزی سے گزری وہ چونک کر حال میں واپس آ گئی۔ اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔

اٹھ کر لان کی لائیٹیں آن کیں۔ دل میں خیال آیا کہ اندر جائے۔

شور شرابے کے عادی وجود کو خاموشی سے وحشت ہوتی ہے اور وحشت کے راگ بہت اذیت ناک ہوتے ہیں۔

اذیت ناکی کا پہلا راؤنڈ تھا۔

وہ اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ سادہ سا کمرا تھا۔ ایک بیڈ، الماری، ڈریسنگ ٹیبل، سادہ فرنیچر غالباً کم قیمت پر لے کر رکھا گیا تھا۔ بہر حال پتا نہیں تھا اس کی قسمت کی اداسی شاید اسی کے گھر کی فضا میں

حلول کر گئی تھی۔
یا پھر اداس لوگوں کے ساتھ اداسی ساتھ ساتھ سفر در سفر کرتی ہے۔
وہ دھیرے سے بیڈ پر لیٹ گئی۔
وہ اداس نہیں تھی اور نہ اداسی اس کی ذات کا حصہ تھی۔ بلکہ ایک ماہ پہلے تک تو بہت شوخ و چنچل قسم کی لڑکی تھی۔ گرین، اورنج، سرخ، شوخ رنگوں میں جس کی جان ہوا کرتی تھی۔ اداسی پر تم تو شاہد ہو۔
اس نے دھیرے سے پلکیں موند لیں۔
☆☆☆
ہنسی، مذاق، شوخی، شرارتیں کوئی بھی محفل ہو ہنسنے ہنسانے کا موقع چاہیے ہوتا تھا۔ آواز بہت اچھی تھی، انداز بہت پیارا...... ذہین اتنی کہ ہر کلاس میں ٹاپ کیا۔
اس کا گندمی پرکشش حسن، چمکدار جلد، سلکی چمکیلے بال، نازک بدن۔
حسن غربت میں ڈھل جائے تو ہر کسی کی نگاہ ٹھہر جاتی ہے۔
اور جب کمزوری ''غالب'' ہو تو ''رہنمائی'' کے لیے بہت سے ہاتھ بڑھتے چلے آتے ہیں۔ بیگم آفندی کی نگاہ انتخاب یوں ہی تو اس پر نہیں پڑی تھی۔ کچھ ان کی ضرورت بھی تو حائل تھی۔ کون اپنی دولت کو یوں ہی خرچ کیا کرتا ہے اور پھر اب تو وہ زمانہ ہی نہیں رہا شاید۔ خواہ مخواہ کسی کی مدد کی جائے۔
لڑکی ذات پر الزام لگ جائے تو وہ تمام عمر کے لیے ''چور'' بن جاتی ہے۔ بیگم آفندی نے اس کے اغوا کی کوشش اپنے ڈرائیور کی مدد سے ناکام کروادی تھی اور اسے بخیر و عافیت اس کے گھر پہنچایا تھا۔ ساری صورت حال بتائی تو اس کی یاں حاجرہ بی بی زار و قطار روتے ہوئے احسان مند تھیں مگر شکریہ ادا کرتے زباں سوکھ گئی تھی کہ کسی طرح۔ سے ان کے گھر کی عزت بچ گئی۔
پھر غریبوں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے...... سفید پوشی کا بھرم اور عزتوں کی چادر۔ تیز ہوا انہیں اڑا کر لے جائے تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے۔
''میں یہ احسان تمام عمر نہ بھولوں گی بیگم صاحبہ۔''
''کتنے بچے ہیں تمہارے؟'' بیگم آفندی نے ساری کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے سر جھکائے بیٹھی نبیلہ کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی ماں سے پوچھا۔
''نو بچے ہیں، چار بیٹے پانچ بیٹیاں۔''
''اس کا نمبر کون سا ہے؟''
''یہ جی دو بیٹیاں اور دو بیٹوں کے بعد۔'' اسی اثنا میں سدرہ چائے لے آئی۔ ساتھ میں بسکٹ بھی تھے۔
''کتنے بچوں کی شادیاں کی ہیں؟''
''ایک بیٹی کی شادی کی ہے بھائی کے گھر......'' دوسری کا رشتہ طے ہے خالہ کے گھر۔ سراج کی نوکری پکی نہیں ہوتی، منیر کو ملتی ہی نہیں، ابا ان کا ریٹائرڈ ہو چکا ہے۔ اب ایک کھوکھا لگا کر رکھا ہے پان سگریٹ کا۔''
مصائب و مشکلات کا ایسا منہ بند آتش فشاں تھا جو ذرا سی توجہ پاتے ہی پھٹ پڑا۔
''باقی بچے! کیا کرتے ہیں؟''
''پڑھتے بھی ہیں اور دہاڑیاں بھی لگاتے ہیں پیٹ کا دوزخ تو بھرنا ہی ہے۔''
''یہ کون سی کلاس میں ہے؟''
''یہ میری سب سے ذہین لڑکی ہے۔ اپنی محنت سے بارہ کلاسیں پڑھیں ہیں جی...... ٹیوشن پڑھا کر سلائی کر کے۔ بہت محنتی ہے پر اب کہتی ہے کہ ڈاکٹر بنوں گی۔ بہت شوق ہے اسے پڑھنے کا۔ پر بیگم صاحبہ ہم غریبوں کے پاس اتنے پیسے ہوں تو اکبری کی شادی نہ کر دوں۔''
اماں یوں ہی حالات کا رونا روتی جاتیں تھیں۔
''اچھا اب میں چلتی ہوں۔'' بغور اس کا جائزہ لیتی ہوئی بیگم آفندی کھڑی ہو گئیں۔ ''میں پھر آؤں گی۔''
''جم جم آجائیں جی۔ محسن ہیں جی آپ

ہماری۔" اماں کی خوشی قابل دید تھی اور نبیلہ کو اس خاتون کی نظروں سے الجھن ہو رہی تھی۔ بے شک انہوں نے اسے کڑی نظروں سے بچایا تھا۔
سچ اگر ان غنڈوں کی مراد بر آتی تو اس کا کیا حال ہوتا۔
اسے جھرجھری سی آ گئی۔ پھر کتنے دن تک وہ اس واقعے کو فراموش نہ کر سکی۔ ایک ہفتے بعد ہی وہ بیگم صاحبہ پھر آ گئیں۔
وہ اماں کے کان میں جانے کیا سرگوشیاں کرتی رہیں۔
وہ گئیں تو اماں ایسی تھیں جیسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔
ابا کے آنے پر اماں نے یہ خوش خبری گویا ٹرے میں رکھ کر پیش کی۔ "ان امیر خاتون نے اپنی نبیلہ کا رشتہ مانگا ہے۔ میری نبیلہ کی تو قسمت ہی کھل گئی۔ راج کرے گی۔ گاڑیوں میں گھومے گی۔"
اماں تو اس رشتے پر واری صدقے ہوتے نہ تھک رہی تھیں۔
اس کا حلق خشک ہو گیا، جان سوکھ گئی۔
"بھلی مانس اپنی ہی کہے جائے گی، کچھ دوسروں کی بھی سن۔ دیکھتی نہیں دنیا میں دھوکا، فراڈ کتنا ہو رہا ہے۔" ابا نے چپ کروایا۔
"مگر وہ اتنی نیک خاتون ہیں۔ پہلے نبیلہ کی مدد کی۔ اب انہیں نبیلہ اتنی پسند آ گئی ہے کہ اس کا رشتہ مانگا ہے۔"
اماں کی آنکھوں کی چمک ہی اور تھی۔
"سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا منیر کے ابا۔ اچھا ہے میری کسی......" اماں تو فیصلہ کیے بیٹھی تھیں۔
"ذات، برادری، خاندان؟"
"سنے گی تو جل جائے گی۔ بیٹی ہماری ہے فیصلہ بھی ہم کو ہی کرنا ہے۔ بس میں نے کہہ دیا اس رشتے کو قبول کر لو۔ دیکھنا ہمارے گھر کے بھی دن پھر جائیں گے۔"
معلوم نہیں اماں کے دن پھریں یا نہیں مگر میرے دن...... ایک آنسو آنکھوں کے کنارے سے نکل کر تکیے میں جذب ہو گیا۔
مائیں بیٹیوں کا سکون اور خوشیاں تو دیکھتی ہیں۔ اس کے دن پھرنے سے اماں کے دن کیسے پھریں گے۔
پہلے ہی مرحلے پر اس نے سوچا تھا سمجھ نہیں آئی تھی۔
دکھ، اذیت، تکلیف کی ایک لہر نے اسے بھگو دیا۔
اماں نے ابا کی ناراضی مول لے کر اقرار کیا تھا۔ کس قدر استحقاق تھا ان کے انداز میں۔ اس کے جھکے ہوئے سر نے اس کے وجود کو قربان گاہ بنا دیا۔
عورت تو ہمیشہ سے ہی قربانی دیتی ہے۔ گھر کے لیے، حالات کی خاطر، بہن، بھائی، ماں باپ...... سب کے لیے۔
عورت کے لغوی معنی شاید قربانی کے ہیں۔
اور واقعی اس کے گھر کے حالات بدل گئے۔
سراج منیر بھائی کو پکی نوکری مل گئی۔ ابا کی پینشن بحال ہو گئی۔
"دیکھ نبیلہ مجھے تو ظالم مت سمجھنا میں تیری ماں ہوں اور ماں اولاد کا برا نہیں چاہتی۔ یہ غربت جو ہوتی ہے نا نسل در نسل چلتی ہے۔ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ہاں کبھی قسمت مہربان ہو جائے یا پھر خدا کو ہی ترس آ جائے تو دن پھر جاتے ہیں۔ اس نیلی چھتری والے کو شاید ہم پر بھی ترس آ گیا ہے اور میں چاہتی ہوں میری کوئی تو بیٹی پیسوں میں کھیلے۔ بیگم آفندی بہت اچھی خاتون ہیں، تیرا بہت خیال رکھیں گی۔ ان کا بیٹا بہت بڑا بزنس مین ہے۔"
"پر اماں......"
"بس نبیلہ خدا کے کرم پر ناشکرہ پن نہیں کرتے۔" انہوں نے دھیرے سے اسے گلے لگا لیا۔
"اماں میں آپ سب کے بغیر کیسے رہوں گی۔"
"تو اتنی خوش رہی گی کہ ہم سب کو بھول جائے

گی۔“

”اماں میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔ میں بھی تو اس گھر کے دکھ سمیٹ سکتی ہوں۔“

”ہم غریبوں کے دکھ صرف مہربان لمحے اور خوش قسمت ساعتیں ہی سمیٹ سکتے ہیں۔ تو ہمیشہ خوش رہے گی۔“

پتا نہیں اماں کو کیوں یقین تھا۔

جب کہ اسے تو لمحہ بھر کو بھی یقین نہیں تھا۔

تمام بہن بھائی اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔

”اچھا پھر ایک شرط ہے۔“

معلوم نہیں کیوں اور کیسے اسے عقل آ گئی تھی۔

”کیا؟“ اماں نے حیرانی سے دیکھا۔

”میں پڑھنا چاہتی ہوں۔ مجھے میڈیکل میں ایڈمیشن مل جائے۔“

”ارے وہ سب پڑھے لکھے لوگ ہیں اگر تیری خواہش ہوگی تو کیوں نہیں تجھے پڑھائیں گے۔“

اماں تو خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔

اس بار بیگم آفندی تاریخ لینے آئیں تو انہوں نے کہہ دیا۔

”ضرور، حاجرہ بہن۔ کیوں نہیں۔ اگر اس کے نمبر اچھے ہیں تو میں خود اسے میڈیکل میں ایڈمیشن دلواؤں گی۔“ بیگم آفندی نے یقین دہانی کرائی۔

یوں بہت ساری مراعات لینے کے بعد اس کا عقد پچاس ہزار حق مہر کے عوض حارث آفندی سے پڑھا دیا گیا۔

چند ہی لوگ آئے تھے۔ اماں نے تمام شگن پورے کیے تھے۔ مایوں، ابٹن، مہندی سادگی سے رخصت ہو کر وہ بیگم آفندی کے گھر میں آ گئی۔

وہ خواتین نے اسے دائیں بائیں سے تھام رکھا تھا۔ بیگم آفندی برابر میں چل رہی تھیں۔

اف! اتنا شاندار گھر دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔

اس میں کیا نظر آیا۔ بیگم آفندی اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔

”تم بہت سمجھ دار، باشعور، عقل و فہم رکھنے والی لڑکی ہو۔ حالات کو جلد سمجھ لوگی۔ ہو سکتا ہے تمہاری ماں نے بتایا ہو مگر اب تم میرے گھر میں ہو۔ تمہیں آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔“

”اس گھر میں دو بہوئیں ہیں اور دونوں ہی اولاد سے محروم ہیں۔“ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”حارث کی شادی کو آٹھ سال ہو گئے ہیں مگر اس گھر کو اس جائیداد کو وارث کی ضرورت ہے۔“

”تم ہمیں اولاد کی خوشیاں دکھانا بدلے میں تمہیں منہ مانگی خوشیاں دیں گے۔ گھر، آسائشات تمہارے خوابوں کی تعبیر...... جو...... جو تم چاہو۔“

”میں ماں ہوں مجھے خود غرض مت سمجھنا۔ بس ترسی ہوئی ماں کی یہ آخری خواہش سمجھ لو۔“

دھیرے سے اپنا دامن پھیلا دیا۔

”حارث آج تمہارا نہیں ہے۔ کل ضرور تمہارا ہوگا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

وہ ساکت و جامد بیٹھی تھی۔

ذرا سی جو کشش محسوس ہو رہی تھی شادی سے وہ بھی یکسر غائب ہو گئی۔

ضرورت، قربانی، خواہش......

دھیرے سے انہوں نے اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا۔

وہ اس درجہ بحر استعجاب میں تھی کہ آنسوؤں نے بھی ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

”میں تمہیں حارث کے ساتھ اسلام آباد بھیجوں گی۔“

میں یہاں بھی رہتی ہوں امریکا میں بھی۔ بس بچوں کی وجہ سے آتی جاتی رہتی ہوں۔ تمہیں کبھی شکایت نہیں ہوگی۔ حارث کی بیوی نگار نے بھی وعدہ کیا ہے۔ تمہیں تکلیف نہیں دے گی۔ اولاد اس کی بھی خواہش ہے۔“

وہ سر جھکا کر سوچ رہی تھی اس زندگی میں اس کے لیے کہاں سکون ہوگا۔ خوشی کہاں اس کی

منتظر ہو گی۔
سب کے سب فائدے میں رہے۔ اماں کے دن پھر گئے۔
ان کو اولاد مل جائے گی۔
عمر بھر کا خسارہ تو اس کے حصے میں آیا۔
دلوں میں کون جھانکتا ہے۔
کمرا خالی ہو گیا۔ بیگم آفندی جا چکی تھیں۔ اپنا فرض پورا کر کے۔
تھوڑی دیر بعد ان کا بیٹا آ گیا۔ اپنا فرض پورا کرنے۔ حق کی تو اسے ضرورت ہی نہیں تھی۔
''معلوم نہیں یہ مائیں قسمت پر شاکر کیوں نہیں ہوتیں۔''
وہ شاید اس سے ہی مخاطب تھا۔ منہ کھڑکی سے باہر تھا۔ گھور اندھیرے میں جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔
''ضرورتیں محبتوں میں کبھی نہیں بدلتیں۔ ہاں محبتوں کے درمیان ضرورتیں آ جاتی ہیں۔ نگار...... میری بیوی، میری محبت، چاہت، خواب سب کچھ ہے وہ اتنی مکمل ہے کہ اس نے مجھے مکمل کر دیا ہے مگر ماں کا دل مطمئن نہیں حالاں کہ اولاد اتنی ضروری بھی نہیں مگر ماں کو کون مطمئن کرے۔''
نبیلہ نے دھیرے سے سر جھکا لیا۔
میں وہ لڑکی ہوں
جس کا گھونگھٹ اٹھا کر
یہ کہہ دے
میرا سب کچھ تمہارا ہے
سوائے دل کے
اور دل کے سوا رہ کیا جاتا ہے مگر اب اس کے ہاتھ بندھ چکے تھے۔ اب اسے کچھ نہیں سننا تھا اس کے بعد کہ......
میرا سب کچھ تمہارا ہے
سوائے دل کے
حقوق کی جنگ لڑنے سے پہلے ہی یاس اس کا نصیب بن گئی۔
''یہ ممی نے دی ہے۔'' ایک انگوٹھی اس کے پیروں کے پاس رکھ دی گئی۔ ''میں تمہیں کبھی تکلیف نہیں دوں گا۔''
''ہاں تم مجھ سے ایسا کچھ مت مانگنا جو میں تمہیں دے نہ سکوں...... باقی میں تمہیں نوازتا رہوں گا۔''
وہ اٹھ کر باتھ روم میں بند ہو گیا۔
اور وہ یوں ہی سر جھکائے بیٹھی رہ گئی۔
معلوم نہیں قسمت نے اسے اس نہج پر کیوں آزمایا تھا۔
وہ تو بہت کمزور، نازک سی جوہی کا پھول تھی۔
اتنی پریشانیوں میں پھول کملا جاتے ہیں۔
پھر وہ پورے دو ہفتے آفندی ہاؤس میں رہی۔
اس کی دونوں نندوں نے اسے خوش رکھا ابراہیم بھائی کی بیگم حنا بھابی نے اسے تسلی دی۔
اماں بہن بھائی اس سے ملنے آتے رہے۔
حارث کا سلوک اس سے مہربان تھا نرم لہجہ، خوب صورت الفاظ ایک دو بار باہر بھی لے کر گیا مگر...... اس سے زیادہ کی امید مت رکھنا۔

☆☆☆

حارث کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ اس کو واپس اسلام آباد جانا تھا۔ بیگم آفندی خود اسے ساتھ لے کر اسلام آباد آئیں۔
اتنا وسیع و عریض گھر اگر خواب بھی بنتی تو ایسا گھر نہ تراش سکتی تھی۔
وہ نگار کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔
جیسے کوئی مومی مجسمہ......
اتنی خوب صورت سپید...... سیاہ موٹی موٹی غزالی آنکھیں، بوٹا سا قد...... گھنے سیاہ گھنگھریالے بال...... موتیوں کی مانند ہموار سفید دانت...... رخسار کا ڈمپل، سیاہ تل، حارث کی وارفتگی لازمی تھی۔
وہ کیسے اپنے مدار سے ہٹ سکتا تھا۔
اس کے آگے تو وہ معمولی اور قبول صورت تھی۔
ضرورتیں انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتی ہیں۔ اس نے سر جھکا لیا۔

دو دن تک بیگم آفندی اس کے ساتھ رہیں۔
زمانے کی اونچ نیچ بتائی، وقت کے اسرار و رموز سے آشنا کیا۔
"یہ تمہارا اکاؤنٹ نمبر ہے۔ جب چاہو رقم نکلوا سکتی ہو۔"
"یہاں کے میڈیکل کالج میں تمہارا ایڈمیشن ہوگیا ہے۔ کلاسز کی تاریخ دیکھتی رہنا جب کسی چیز کی ضرورت ہو مجھ سے کہنا۔"
"یہ میرا امریکا کا اور یہ کراچی کا فون نمبر ہے۔"
میڈیکل میں ایڈمیشن تو اس کا خواب تھا۔ اس خواب کی تکمیل یوں ہوگی اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔
اس عورت نے اسے کس کس طرح نوازا تھا۔
تبھی وہ اسے قصوروار بھی نہیں ٹھہرا سکتی تھی۔
"انسان اگرچہ اپنی غرض کے لیے خود غرض ہو جاتا ہے لیکن ہم نے تمہارے احساسات کا بھی پاس کیا ہے اور ہاں اگر درمیان میں تم راستہ بدلنا چاہو تو کہہ دینا ہم تمہیں روکیں گے نہیں۔"
وہ سر جھکائے سنتی رہی۔
"ہماری خواہشوں کی تکمیل شاید اسی سود وزیاں کے ذریعے ہونا تھی مگر خسارے میں تم رہو گی اور نہ ہم۔"
اس میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ اس عورت کو سر اٹھا کر دیکھ لے جو اسے ایک ایسی منزل کے راستے تک لے آئی تھی جو سیراب بھی اور سراب دونوں ہی تھی۔
حد سے زیادہ سیرابی بھی انسان کو مدہوش کر دیتی ہے۔
اور کیا وہ مشرقی عورت نہیں تھی۔ اسے مشرقی روایات کا پاس نہیں تھا۔
اور اس کو بھی چھوڑو۔
کیا وہ اپنے گھر والوں کو دی ہوئی خوشیاں چھین سکتی تھی۔
قربان گاہ میں کوئی بھی قربان ہو جائے تو واپسی کا راستہ بھول ہی جاتا ہے۔

میری وسعت کی طلب نے مجھے محدود کیا
میں وہ دریا ہوں جو موجوں سے ساحل مانگے

اس کے ہونٹوں پر ایک گہری اور جامد چپ تھی۔ ایسی چپ جسے کوئی نہیں توڑ سکتا تھا۔
بولے بھی تو کیا بولے۔ لفظ سب ختم ہو چکے تھے۔
کہے بھی تو کس سے تمام ناتے صرف ناتے رہ گئے تھے۔
گویا اب اس کی ذات اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی تھی۔
"میں جانتی ہوں بیٹا اس عمر کے خواب کیسے ہوتے ہیں لیکن خواب ہی تو سب کچھ نہیں ہوتے نا۔ ہمیں خوابوں کی تعبیر تلاش کرنا پڑتی ہے۔ بعض اوقات عمر بیت جاتی ہے مگر چاہ نہیں ملتی۔ تم خوش قسمت ہو جب اس زندگی سے تھک جاؤ تو مجھے آواز دے لینا۔ میں تمہیں اپنے پاس بلالوں گی۔"
اس کا سر شانوں سے لگائے، بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرتے ہوئے سمجھا رہی تھیں۔ بلکہ اس کی برین واشنگ کر رہی تھیں۔
"حارث دل کا برا نہیں ہے، جب تم اس کو اولاد کی خوشی دو گی تو تمہارا ہو جائے گا لیکن اس کے لیے تمہیں ذرا انتظار کرنا ہوگا۔"
"مرد کبھی اپنے بچوں کی ماں کو دھتکار نہیں سکتا اور پھر یہ تو طے ہے نا ہم زندگی سے بھاگ نہیں سکتے۔"
"خود کو بدنصیب مت سمجھنا۔ تمہاری زندگی میں شاید تقسیم شدہ مرد ہی لکھا تھا۔ تقسیم شدہ مرد ہمیشہ ہی برا نہیں ہوتا۔"
تقسیم شدہ مرد...... اس کے دل میں دھکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ پھر بہت دیر تک اسے سمجھاتی رہیں۔ انا کا مضبوط خول محبت توڑتی ہے، ان کی ساری گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ زندگی کا سب سے آسان کام خود کو دھوکا دینا ہے۔ خرگوش کی طرح آنکھیں

بند کرلیں، کچھوے کی طرح اپنی گردن اپنے اندر چھپالیں، آنکھیں بند کرلیں......اور......اور۔

ضبط کرتے ہیں تو ہر زخم لہو دیتا ہے
آہ کرتے ہیں تو اندیشہ رسوائی ہے

گھڑی ساڑھے بارہ بجا رہی تھی۔ گیٹ تیزی سے کھلا پھر بند ہو گیا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی ہو گئی۔

حارث اور نگار اس کے کمرے کے آگے سے گزرے۔ ہنستے باتیں کرتے ہوئے اس سے بے پروا۔

شاید انہیں تو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوگا کہ کوئی تیسرا فرد بھی اس گھر میں موجود ہے۔

ابھی ابھی یہ لوگ ایئرپورٹ سے آرہے تھے۔ آج ممی واپس چلی گئی تھیں۔

وہ جو ایک آسرا، ہمت، احساس تھا، آج وہ سہارا بھی ہاتھوں سے نکل گیا۔

اب آج کے بعد کل سے اسے اپنے پیروں پر خود کھڑا ہونا تھا۔ اپنی جگہ خود بنانا تھی۔

تغیر، انسانی زندگی اور کائنات کا پہلا اصول ہے۔

اس کی زندگی میں تغیر ہی نہیں بلکہ تغیرات کا طوفان امڈ آیا تھا۔ المیہ کیا ہے؟

المیہ یہ نہیں ہوتا کہ سماج کی زنجیر کاٹنے کے لیے اپنے پیروں کو لہولہان کریں بلکہ المیہ یہ ہوتا ہے کہ آپ زخمی پیروں سے کھڑے ہوں اور کوئی راستہ آپ کو اپنی طرف نہ بلائے۔ اب اپنا خیال اور دھیان خود رکھنا تھا۔

اس کا خیال دھیان رکھنے والے لوگ بہت دور رہ گئے تھے۔

☆☆☆

صبح وہ اخبار دیکھ رہی تھی۔

سکھاں نے ابھی ابھی چائے لاکر دی تھی۔

اپنے گھر میں اتنی صبح وہ کبھی چائے نہیں پیتی تھی بلکہ عادت نہیں تھی۔

جہاں بہت کچھ بدل جائے وہاں عادتیں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔

ہر شہر کے لوگوں کی طرح اخباروں کی خبریں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ تاہم یہ ضرور تھا کہ کراچی کے اخباروں کے مقابلے میں یہاں کی خبریں پرسکون منظر پیش کرتی تھیں۔ ابھی اندرونی صفحات کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ حارث آگئے۔

''صبح بخیر!'' ایک نگاہ اٹھا کر دوسری نہ اٹھائی۔

جہاں ضرورتوں کی آماجگاہ ہو وہاں پر دلوں میں احساس کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔

''ٹھیک تو ہو؟'' سرسری سا لہجہ تھا۔

''جی!''

''کوئی پرابلم، کوئی پریشانی ہو تو کہہ دینا۔''

اس نے سر اوپر اٹھایا۔ ''جی؟''

''حارث۔ پلیز جلدی آیئے، دیکھیں تو آپ کی پسندیدہ نیوز۔''

اندر سے نگار کی آواز آئی۔ حارث آفندی اخبار دیکھتا ہوا پلٹ گیا۔

استحقاق کا کوئی لمحہ بھی تو اس کے پاس نہ تھا کہ وہ روکتی۔

وہ تو جب بھی نہیں روک سکی۔

جب......جب انسان محبت سے، نرمی سے، خلوص سے دلوں میں اترتا ہے اور پھر بالکل نئے لوگوں کو تو بہت زیادہ نرم رویے کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنوں سے بچھڑ کر آتے ہیں مگر یہاں...... یہاں تو صرف استحقاق تھا۔ جب کہ اس کی رضا......؟

حالاں کہ کسی عورت کو اس کی رضا کے بغیر حاصل کر لینا اس پر فتح کے جھنڈے گاڑنا ایسے ہی ہے جیسے کسی زندہ وجود کو زنگ آلود چھری سے ذبح کر دیا جائے۔ اس کی رضا کسی بھی معاملے میں تھی ہی کہاں۔

اس نے سرخ عروسی جوڑا نہیں پہنا......سرخ سمجھوتوں کی چادر اوڑھی تھی۔ خون آشام آنچل۔

ہاں ٹھیک ہی تو ہے بام عروج ہو، جذبوں کا دور دورہ ہو، ہر چیز کے نئے اسلوب میں بیان کرنے کا

موسم ہوتو اس پر صبر وضبط کا موسم آجائے زندگی یوں ہی ٹھنڈی شاموں جیسے ہوجایا کرتی ہے۔

اور وہ تو تھی بھی ایسی ......سوال تو یہ تھا اب زندگی کو کس نہج پر رواں رکھنا ہے؟ کیوں کہ زندگی سے جوش وخروش، ولولہ انگیزی اور جذبوں کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

ابھی کل ہی کی تو بات تھی جب وہ ایف ایس سی کے رزلٹ پر کس قدر خوش تھی۔ اس کا جوش وخروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

اب وہ میڈیکل میں جاسکتی تھی ایک اچھی اور قابل ڈاکٹر بن سکتی تھی۔ اس کا خواب......اس کا عشق...... اس کا جنون......کون نہیں واقف تھا اس سے......اور تو اور......اس نے بچوں سے مل کر جو بھی کھیل کھیلا اس میں ایک ڈاکٹر ضرور موجود ہوتا تھا اور ڈاکٹر وہ خود بنتی تھی۔

اس کے خواب ڈاکٹر سے شروع ہوکر ڈاکٹر پر ختم ہوتے تھے۔

اس کی اکثر باتیں میڈیکل سے شروع ہوکر میڈیکل پر ہی ختم ہوتیں۔

اس نے تو بہت سے منصوبے بنالیے تھے کہ کیا کرنا ہے۔ روپیہ بہت چاہیے تھا۔ فیس کتابیں اور دوسری چیزیں۔ وہ خوب محنت کرے گی۔ ٹیوشن زیادہ سے زیادہ کرے گی تو ضرور اس کے خواب رنگ لائیں گے۔

مگر......!اس کے خوابوں کی تعبیر کس طرح ہوئی۔ تمام منصوبے دھرے رہ گئے۔ اس کا میڈیکل میں ایڈمیشن ہوگیا۔ بس صرف اتنا ہی تو ہوا تھا تمام زندگی کے لیے خود کو رہن رکھ دیا تھا۔ اپنے جذبات، بصارتوں کو دار پر چڑھا دیا تھا۔

کسی جیتے جاگتے وجود میں سے دل نکال لیا جائے تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟

☆☆☆

ابھی تک اس کی نگار سے زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتی تھی۔ بہت ہوا تو لان میں نکل گئی۔ کھانے کے ٹائم پر، ڈرائنگ روم میں چلی گئی یا کبھی کچن میں چائے بنالی جاکر......یا پھر اگر لاؤنج میں کوئی موجود نہ ہوا تو ٹی وی پر پروگرام دیکھ لیے۔ ایک کل وقتی ملازمہ تھی اس کا نام سکھاں تھا مگر وہ پورا دن پاؤں جلی بلی کی مانند ادھر ادھر گھومتی رہتی تھی۔ حارث تھا اس سے اتنی بات چیت ہوتی تھی جتنی وہ ضرورت محسوس کرتا تھا۔ خیریت پوچھ لی......بس۔

ممی کی موجودگی تک نگار آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرتی تھی باقاعدہ لفظوں کا سہارا ابھی نہیں لیا۔

یہ جملے وہی ہوسکتے تھے جو ایک سوکن دوسری سوکن سے کہہ سکتی تھی۔ ایک چوکیدار تھا۔ پس گھر کی شامیں سونی ویران تھیں۔ دونوں میاں بیوی کو گھومنے پھرنے کا کریز تھا۔ جانے اسلام آباد کی سڑکیں انہوں نے کتنی ہزار دفعہ ناپ لی تھیں اور اگر گھر پر موجود ہوتے تو لان یا لاؤنج آباد ہوتا۔

دونوں نے اسے بلانے کا تکلف کبھی نہیں کیا اور نہ ہی اس نے کبھی سوچا کہ اسے ان دونوں کے درمیان بیٹھنا چاہیے۔

اس کی کلاسز ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ جب تک دن کسی نہ کسی طرح سے گزرنا ہی تھے۔ اس کے بعد......اس کے بعد وہ مصروف ہوجائے تو زندگی سہل ہوجائے گی۔

کتنی عجیب بات تھی اس گھر میں دو فون تھے اس کا کبھی فون نہیں آیا۔ نہ اماں ابا نے اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے کیا۔ وہ کہاں کرتیں۔ نہ ممی نے امریکا جاکر ضرورت محسوس کی۔ یوں لگتا تھا جیسے سب اسے اس ''خاص'' جگہ پر بھیج کر مطمئن، فرحاں ہوں۔ سب کی بس یہی رضا تھی۔

محبت......محبت، اس کے لیے سہانا خواب بن کر رہ گئی تھی۔

اس شخص کے افلاس پر رحم آتا ہے
جس کو ہر چیز ملی صرف محبت نہ ملی!

☆☆☆

اس روز بھی وہ لان میں ٹہل رہی تھی کہ نگار ادھر آ گئی۔
''سنو! تم زیادہ اپنے بیڈروم کی پچھلی سائیڈ پر رہا کرو۔'' اپنی سوچوں سے چونک کر اس نے سر اٹھایا۔
''کیوں؟''
''اس لیے کہ ہمارا کوئی ملنے والا آ سکتا ہے۔ ہم نے کسی کو تمہارے بارے میں نہیں بتایا۔''
''تو بتا دیجیے گا چھپانے والی کوئی بات نہیں۔ اب تو ہر چیز بازار میں مل جاتی ہے۔''
''لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز ہم خریدیں اس کی تشہیر بھی کریں۔''
''کیا ہوا نگار......'' حارث بھی ادھر آ گیا۔ تولیے سے سر کے بال رگڑتا۔ اس کی وجاہت، دراز قد نمایاں تھا۔
''سن لیا نا۔'' جواب میں وہ سینے پر بازو لپیٹے ان پر ایک نگاہ ڈال کر پلٹ گئی۔
''کیا ہوا؟''
''نخرے دیکھو نوابزادی کے، مالکن سمجھ رہی ہے خود کو۔'' نگار اس کی خاموشی پر کھول کر رہ گئی۔
''ہوا کیا آخر!''
''میں نے کہا پچھلے لان میں بیٹھا کرو۔ اب ہم نے کسی اور کو تو نہیں بتایا نا کہ......'' وہ بولتے بولتے جھجک کر چپ ہو گئی۔
''کیا......کہا......!'' حارث شرارت سے جھکا۔

نگار کا لہجہ کمزور ہو گیا۔ کمزوری اس کی بھی تو تھی نا۔
''بولو نا......'' شرارت ہنوز جاری تھی۔
''کچھ نہیں چلیں اندر......'' وہ اسے دھکیلتی اندر لے گئی۔
نگار بے حد خوب صورت اور ایک باوقار سی عورت تھی جو حارث سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ اپنے گھر والوں سے بغاوت کر کے اس نے یہ شادی کی تھی۔ اس کا حسن چاند کو شرماتا تھا اور مردوں کا یہ وصف ہے کہ یہ چکور بنیں۔ حارث نے تو عشق و عاشقی کے تمام ہی ریکارڈ توڑ دیے تھے اور جب وصل ہو گیا تو وہ کسی قیمت پر اس سے جدا ہونے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔
ان کی شادی کو آٹھ سال ہو چکے تھے۔ نواں چل رہا تھا۔ جانے اس میں خدا کی کیا رضا تھی دنیا کا علاج کرا لیا مگر گود ہری نہ ہوئی۔
ایک ماں کے لیے انتظار کے آٹھ سال بہت ہوتے ہیں۔ ہر سال بیگم آفندی جب بھی آتیں حارث کی دوسری شادی کا ذکر کرتیں۔ انہیں ہر قیمت پر ننھی منی خوشیاں چاہیے تھیں۔
''آپ تو اتنی دور ہوتی ہیں پھر کیوں بضد ہیں۔'' حارث زچ ہو جاتا۔
''ماں کتنی بھی دور کیوں نہ ہو، اولاد کے دکھ سکھ کی ساتھی ہوتی ہے۔ ہر لمحہ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔'' انہوں نے تاسف سے حارث کو دیکھا۔
''لیکن ممی ابھی ہم نہیں سمجھتے کہ ہمیں اولاد کی ضرورت ہے، پھر اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اللہ کو دینا ہو گی تو نگار سے ہی ملے گی۔''
''انتظار کے لیے نو سال کم تو نہیں ہوتے کیا میں یہ حسرت لیے ہی......''
''اللہ نہ کرے ممی کیسی باتیں کرتی ہیں۔''
''بس تو اس بار میں تمہاری دوسری شادی کروا کر ہی جاؤں گی۔ ایک تم نے اپنی پسند سے کر لی ایک میری پسند سے کر لو۔''
''ممی آپ دوسری شادی کا مطلب جانتی ہیں۔ یعنی مرد آدھا تیتر رہے نہ آدھا بٹیر میرے اندر اتنا حوصلہ نہیں ہے۔''
''لیکن میں نے تمہارے لیے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔ وہ لوگ ضرورت مند ہیں۔ ان کی تو گویا لاٹری نکل آئی ہے۔'' بیگم آفندی نے اطلاع فراہم کی۔
''گویا آپ نے بات بھی طے کر لی ہے۔'' حد

درجہ حیرانی ہوئی۔
''ہاں!'' اطمینان قابل دید تھا۔
''پلیز ممی میں اپنی پرسکون زندگی میں ہلچل نہیں چاہتا۔ آپ نہیں جانتی کہ......''
''میری بات سنو حارث...... مجبوریوں کے سودے بڑے پائیدار ہوتے ہیں۔ بازار سے ہر چیز کو خریدا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ غربت بھی...... غربت ہر دام میں بکتی ہے۔ ضرورت مند ہر طرح سے اسے خرید لیتے ہیں بس میں نے بھی ایک سودا کیا ہے اور یقیناً خسارے کا نہیں ہوگا۔ اگر تم میرا ساتھ دو۔''
حارث ہکا بکا ان کی باتیں سن رہا تھا۔
''میری خواہش ناجائز تو نہیں ہے نا اولاد کی خواہش تمہیں بھی ہوگی۔ بچوں کے بغیر گھر سونا اور ویران ہوتا ہے۔ ان کے دم سے ہی تو رونقیں ہیں۔''
''ممی ابھی ہم اور انتظار کر سکتے ہیں جب کہ آپ جانتی ہیں کہ......''
''وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اب میرے اندر بھی حوصلہ نہیں ہے۔''
''ممی نگار کسی صورت راضی نہیں ہوگی۔ اپنی اور میری جان ایک کر دے گی۔''
کمزور سا عذر تراشا گیا۔
''اس کو سمجھاؤ حارث یہ اس کی بھی ضرورت ہے اور ہم کوئی ناجائز کام نہیں کر رہے۔ کسی دوسرے کے بچے کو اڈاپٹ کرنے سے بہتر ہے، ہماری ضرورت صحیح طریقے سے پورے ہو جائے۔ جب اس لڑکی کی مرضی ہوگی تو اسے چھوڑ دیں گے اور نہیں تو پھر اسے میں اپنے پاس لے جاؤں گی۔'' ان کا لہجہ حتمی تھا۔
''ممی کیا کسی لڑکی کی زندگی اتنی سستی ہو سکتی ہے؟''
''ہاں! ہو سکتی ہے غریبوں کی زندگی اتنی ہی سستی ہوتی ہے۔ وہ اپنی غربت کو کبھی ختم نہیں کر سکتے۔ قسمت انہیں ایک موقع فراہم کرتی ہے۔ وہ اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھائیں۔ فائدہ اٹھانے کا حق تو ہر کسی کو ہے نا۔''
''انہوں نے بھی اپنی خواہشات، اپنے بیٹوں کی بے روزگاری اور بیٹی کے خواب بیچے ہیں۔ خوشحالی پر ان کا بھی حق ہے۔''
حارث حیران تھا۔
''نبیلہ کو میڈیکل میں جانے کا شوق ہے ایف ایس سی میں اس کی فرسٹ کلاس آئی ہے اور ڈاکٹر بغیر پیسوں کے نہیں بنا جا سکتا۔ اگر تم چاہو تو ایک معاہدہ کر لو جب تک وہ ڈاکٹر بنتی ہے۔ جب تک وہ یہاں رہ کر ہمیں اولاد کی نعمت سے نوازے۔ اس کے بعد فیصلہ ہو سکتا ہے۔''
وہ ہر حال میں حارث کو راضی کرنا چاہتی تھیں۔
''نگار مر جائے گی۔ یہ ادھوری زندگی کیسے بسر ہوگی۔''
''کوئی نہیں مرتا کسی کے لیے۔ اس کام کو یوں ہی ہونا تھا۔ تمہاری جائز اولاد تو ہوگی نا...... کسی شک و شبہ کی گنجائش کے بغیر۔ پھر غریبوں کو حقوق لینے آتے بھی نہیں ہیں۔ تمہیں کوئی تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ تمہاری زندگی میں دخل اندازی نہیں کرے گی وہ۔''
''ممی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' حارث کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔
''اور...... کیا وہ لڑکی بھی راضی ہو گئی ہے؟''
''تمہیں ایک بات کو کتنی دفعہ سمجھایا جائے۔ ہر زاویہ سے سمجھا دیا گیا ہے۔''
''اور اگر یہ ہی صورت حال آپ کی بیٹی کے ساتھ ہوتی تو آپ کا کیا فیصلہ ہوتا۔'' آواز پر دونوں چونکے۔
دروازے پر نگار کھڑی تھی۔
''اوہ تم! آؤ...... ابھی تمہارے بارے میں ہی باتیں کر رہے تھے۔''
''میرے بارے میں یا...... اپنے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں۔'' اس کا لہجہ سنجیدہ اور تند تھا۔
''اس کا مستقبل بھی تو تم سے وابستہ ہے نا۔''

’’پھر آپ کا یہ فیصلہ!‘‘

’’تمہاری بہتری کے لیے ہے۔ مرد کو اولاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیٹا وارث ہوتا ہے۔ اب ہم کتنے سال اور انتظار کر سکتے ہیں۔ کب آنے والا آئے۔ بڑا ہو تعلیم و تربیت کے مراحل سے گزرے۔ اس کے لیے ایک طویل انتظار چاہیے۔ کیا آٹھ سال کسی انتظار کے لیے کافی نہیں۔‘‘

انہوں نے آسانی سے سمجھایا۔

’’جب حارث نہیں چاہتے تو آپ کیوں بضد ہیں۔‘‘

’’یہ ایک ممتا کا تقاضا اور خاندان کا مسئلہ ہے۔ اسے راضی ہونا پڑے گا۔‘‘

’’مگر میں اسے دوسری شادی کی اجازت نہیں دے سکتی۔‘‘

’’ضد کرنے کا انجام تم جانتی ہو۔ کب تک یہ خالی ڈھول پیٹتا رہے گا۔‘‘ ان کا غصہ حد سے بڑھنے لگا۔

’’میرے دامن میں آگ لگی تو کوئی بھی خوش نہیں رہ سکتا۔‘‘ نگار بھل بھل رونے لگی۔

’’بہت دیکھ لیے ہیں یہ آنسو تم ان سے اب تک میدان نہیں جیت سکتیں۔ بہتر ہے کہ خاموشی سے پیچھے ہٹ کر وقت گزارنے کا انتظار کرو۔‘‘

’’حارث! سن رہے ہیں آپ......‘‘

’’پلیز نگار......تم ٹھہرو، میں بات کر رہا ہوں نا ممی سے۔‘‘ حارث نے دھیرے سے اسے سمجھایا۔

’’تم......! کیا بات کرو گے تم تو خود یہ چاہتے ہو۔ تمہاری یہی مرضی اور منشا ہے۔ دیکھنا تم ساری عمر خوش نہیں رہ سکتے۔‘‘ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

حارث نے اسے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

بیگم آفندی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

’’پلیز نگار خود کو سنبھالو۔ ممی کی خواہش بھی تو ناجائز نہیں ہے نا۔ آخر وہ ماں ہیں...... جب میں تمہیں یقین دلا رہا ہوں کہ میں تمہارا ہوں۔ تمہارا ہی رہوں گا۔ اس بات کا یقین کرو۔‘‘

’’تم میری محبت ہو......میری چاہت ہو، میرے خوابوں کی تکمیل ہو۔ کیا میں تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں؟ چاند کی چاندنی جب تک نہ پھیلے چاند ادھورا ہوتا ہے۔‘‘ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے سمجھاتا رہا۔

’’خوشی خوشی اجازت دو اس گھر کو بھی خوشی کی ضرورت ہے۔ شور و ہنگامے کی ضرورت ہے۔ اس کے بدلے میں تم جو چاہو شرط لکھوالو۔‘‘ اس کی آنکھوں سے آنسو سمیٹتے ہوئے حارث نے تسلی کے پھاہے رکھے۔

’’تمہاری مرضی یہی ہے نا۔‘‘

’’نہیں صرف ممی کی رضا ہے۔‘‘ وہ بولا۔

’’شادی کے بعد سب بدل جاتے ہیں۔‘‘ نگار کا سر جھکنے لگا۔

’’میں بدل جاؤں تو پھر کہنا۔‘‘ وہ دھیرے سے بولا اور اس نے کچھ سوچتے ہوئے سر جھکا لیا۔

تین دن بعد اس نے جواب دیا۔ اترے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ اس کے روبرو تھی۔

’’میں راضی ہوں حارث......یوں جیسے کسی نے سولی پر چڑھا دیا ہو مگر میری کچھ شرائط ہیں۔‘‘

’’کیا؟‘‘

’’سوائے اولاد کی خواہش کے تم اس سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے۔ دوسرا یہ کہ جب اس کی تعلیم ختم ہو جائے گی تو اس کو چھوڑ دو گے۔ تیسرا یہ کہ اس سے جذباتی لگاؤ نہیں پیدا کرو گے۔‘‘

ویران ویران انداز تھا......حارث کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔

’’میری جان! جہاں غرض ہو خود غرضی ہو وہاں لگن کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ جذباتی لگاؤ وہاں ہوتا جہاں محبت ہوتی ہے۔‘‘

’’اور محبت عشق کی حد تک صرف تم سے ہے۔‘‘

☆☆☆

انہی دنوں میڈیکل کالج کلاسز شروع ہو گئیں۔ انسان جب سمجھوتوں کی چادر اوڑھ لے، جو ہے جیسا

ہے کی بنیاد پر قبول کر لے اور قسمت پر شاکر ہو تو زندگی بہت حد تک سہل ہو جاتی ہے۔

سب سے زیادہ دکھ دوسرے سے توقعات دیتی ہیں۔ کیا، کیوں، کیسے، سوالات دکھوں میں اضافہ کرتے ہیں اور پھر جب اس بات کا احساس ہو کہ ہم کسی کے کچھ نہیں تو خود کو منوا کر، کرنا بھی کیا ہوتا ہے۔

زندگی جب رہن رکھ دی جاتی ہے تو پھر خوشیوں کا رس کشید کرنے کی خواہش بھی مفقود ہو جاتی ہے۔

اس کے سر پر بھی گھنے سایہ دار درخت کی چھتر چھایہ تن گئی مگر محبتوں کے معاملے میں یہ درخت بانجھ تھا اور بانجھ موسم کوئی سا بھی ہو بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ تاہم اب یہ ہوا کہ کتابوں کی مصروفیات میں الجھ کر اس نے بہت حد تک تکلیف دہ مراحل طے کر لیے تھے۔ کالج میں بھی اس کا لیے دیے والا انداز تھا۔ دعا سلام کی حد تک۔

''دل اس درجہ ٹوٹ گیا تھا کہ اب وہ کسی کو دوست بنانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ دوستی یعنی غمگساری ہمدردی تاسف...... کس کس کو اپنی داستان الم سناتی۔ کس کس کی ہمدردیاں وصول کرتی۔ یہ تو پھر شاید مشیت ایزدی تھی جو لکھا اس نے قبول کر لیا تھا۔''

اکاؤنٹ میں جمع کروانے کے علاوہ ممی اسے کافی رقم دے کر گئی تھیں، وہی ابھی تک چل رہی تھی۔

ابھی تک امریکا جا کر انہوں نے اس کی خیریت دریافت نہیں کی تھی۔ جب قریب کے لوگ...... اس کے ماں جائے بھول گئے وہ تو پھر غیر اور دور تھیں ان سے کیا شکوہ۔ ضرورت تو ان کی بھی پوری ہو گئی تھی۔ بس اب شاید انجام کا انتظار تھا۔

☆☆☆

اس نے دھیرے سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارے دل میں جو وسوسے اور واہمے ہیں انہیں نکال دو۔ حارث کبھی تم سے بے وفائی نہیں کرے گا۔''

''وعدہ!'' اس نے بے یقینی سے دیکھا۔

''اپنی جان کا۔'' بے ساختہ ہی انداز تھا۔

وہ بے یقینی کے درمیان تھی تاہم پھر بھی اعتبار کر لیا۔ حالاں کہ جو عزائم ممی کے تھے اس پر اس کا جارحانہ انداز ہو سکتا تھا مگر اسے اپنا گھر بھی بچانا تھا۔ اپنی محبت پر ثابت قدم بھی رہنا تھا۔

وہ ایک خوب صورت عورت تھی۔ خوب صورتی کے ساتھ اگر ذہانت بھی ہو تو خوب صورتی کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

اور......!

نبیلہ کو دیکھ کر نگار کو یقین آ گیا۔ یہاں صرف ضرورت ہے۔ وہ ایک واقعی غریب لڑکی تھی۔ سنجیدہ، غربت کی ماری...... اس سے کہیں کم صورت شروع سے ہی اس نے اپنا رویہ سخت رکھا تھا۔

نبیلہ کو یہاں بلانے کی شرط بھی اس نے رکھی تھی۔ وہ اپنے رویوں میں لچک نہیں پیدا کرنا چاہتی تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مرد ذات کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ اگر نبیلہ کو آفندی لاج میں رہنے دیتی تو حارث گاہے بگاہے ادھر جاتا اس کی غیر موجودگی میں وہ حاوی ہو سکتی تھی۔ ہمدردی محبت کا روپ دھار سکتی تھی۔ وہ اس کی جگہ لے سکتی تھی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ سامنے رہنے کا مقصد یہ تھا حارث نظروں کے سامنے رہتا۔ اس کی پہنچ میں اپنے قرب سے اپنے مسحور کن حسن سے اسے کہیں اور جانے ہی نہ دیتی۔

شوہر ایک ایسی چیز ہے جس میں عورت شراکت برداشت نہیں کرتی اور اگر مجبوری کے تحت کر بھی لے تو پاؤں جلی بلی بن جاتی ہے۔ اس مجبوری کو وہ بھی سمجھتی تھی مگر اب اس نے حارث پر کڑی نگاہ رکھی ہوتی تھی اور نبیلہ کو وہ خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

رات گئے تک اسٹڈی میں خود کو مصروف رکھتی۔ کتابیں واقعی بہت اچھی دوست اور ساتھی ہوتی ہیں۔ یادوں کے عذاب سے بچا لیتی ہیں۔

☆☆☆

حارث نے کسی ضرورت کے متعلق پوچھا ہی نہیں یا پوچھنے کے لیے اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اس روز لان میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ سکھاں پاس ہی

بیٹھی تھی۔ سکھاں سے باتیں کر کے وقت بہت اچھا گزر جاتا تھا۔

تبھی گیٹ کھلا اور دو خواتین اندر آ گئیں۔

''سلام بیگم صاحبہ!''

''وعلیکم السلام!''

''تمہاری بیگم صاحبہ ہیں؟'' اس کا جائزہ لیتے ہوئے سکھاں سے پوچھا۔

''جی میں بلا کر لاتی ہوں۔'' اندر چلی آئیں۔

''آپ بیٹھیں نا!'' اخلاقاً بٹھایا۔

''آپ کون ہیں مسز حارث کی......''

''جی۔'' وہ یک دم بوکھلا گئی۔ گو رشتہ جائز تھا مگر......

''میں، میں کزن ہوں حارث کی۔'' اسے یہی سوجھا۔

''اچھا...... کب سے یہاں ہیں؟ حارث نے تذکرہ ہی نہیں کیا۔ اکثر آتے جاتے رہتے ہیں یہ لوگ...... کبھی آیئے گا نا۔'' خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

سیدھی سادی، دوپٹا شانوں پر ڈالے ہوا سے بکھرتے بالوں کو سمیٹتی انہیں یہ لڑکی بہت اچھی لگی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''نبیلہ...... نبیلہ شیخ۔''

''ہاں بہت خوب صورت نام ہے مگر میں تمہیں بیلا کہوں گی۔ مائنڈ تو نہیں کرو گی۔'' مسکرا کر انہیں دیکھا۔

''میرے ابو مجھے بیلا کہتے تھے۔''

''پڑھتی ہو؟'' دلچسپی سے دیکھا۔

''جی میڈیکل کے فرسٹ ایئر میں ہوں۔'' فخر سے بتایا۔

دوسری خاتون دلچسپی سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

اچھی چارمنگ سی لڑکی تھی یک دم ہی انہیں پسند آ گئی بابر ان کا دیور تھا۔ برابر کا بنگلہ ان کا تھا۔

''وری گڈ جی...... حارث نے اتنے ذہین لوگ کہاں چھپا رکھے ہیں۔'' انہوں نے اپنے برابر والی خاتون کو ذو معنی انداز میں دیکھا۔

''لگتا ہے تمہارا مسئلہ حل ہو گیا۔'' جواباً سرگوشی ہوئی۔

''ہوں!''

تبھی نگار آ گئی۔

''تم...... یہاں...... سکھاں کے ہاتھ چائے بھیجو۔''

''جی!'' وہ اندر مڑ گئی۔

''تمہاری کزن بہت پیاری ہے۔''

''اچھا!'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

''بے چاری بہت مظلوم اور غریب ہے۔'' ترسی ہوئی نگاہ نبیلہ پر ڈالی۔

یک دم اس کے قدم رکے اور پھر آگے بڑھ گئے۔

اپنی آنے والی زندگی میں اسے ان لفظوں سے وحشت تھی۔ بے چاری مظلوم...... لیکن...... اس کا بس چلتا تو اپنی زندگی سے ان کو نکال دیتی۔ کیا اس کے چہرے پر لکھا ہے کہ وہ مظلوم ہے۔ اس پر ہمدردی کی بھیک ڈالو یا اس کے چہرے پر وہ کارڈ چھپا ہوا ہے جو کراچی کی بسوں میں عورتیں لے کر پڑھتی ہیں۔ جن پر لکھا ہوتا ہے۔ ہماری مدد کرو ہم مظلوم ہیں۔''

اف! اتنی قربانی کے باوجود یہ لفظ اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہ اپنے بیڈروم میں بند ہو گئی۔

''کوئی نہیں ہے اس کا اس لیے حارث اسے یہاں لے آئے۔ میں بھی اکیلی تھی۔ اب فکر کم ہوتی ہے۔'' دروغ گوئی سے کام لیا گیا۔

''بہت کیوٹ ہے، کہیں رشتہ وشتہ طے ہوا۔'' مسز مراد نے رازداری سے پوچھا۔ نگار ایک لمحہ سٹپٹا گئی۔

''آں...... نہیں ابھی کہاں ابھی تو پڑھ رہی ہے۔ پڑھنے کا بہت شوق ہے بے چاری کو۔ دور بھاگتی ہے شادی کے نام پر۔''

''اچھا جب شادی کا ارادہ ہو تو مجھے مت بھولنا۔ مجھے اپنے بابر کے لیے یہ لڑکی بہت پسند آ گئی ہے۔

دکھادوں گی اسے ایسے ہی۔"
رعنا نے فوراً ہی اپنا مدعا بیان کر دیا۔
"نگار جل بھن کر کباب ہو گئی۔"
"آپ کیسے آئی تھیں؟" موضوع تبدیل کیا۔
"ایسے ہی مسز نعیم کے گھر سے آ رہے تھے سوچا آپ سے مل کر گلہ دور کر دیں۔"
تبھی سکھاں چائے لے کر آ گئی۔
"اتنی دیر میں کام کرتے ہیں ہاتھ جلدی نہیں چل سکتے تھے۔ جاؤ یہاں سے ......" اندر کی ساری کھولن اس پر نکال دی۔
وہ ہڑبڑا کر پلٹ گئی۔
"تمہیں میں نے کتنی بار کہا ہے انیکسی سائیڈ میں رہا کرو تمہیں سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہارے متعلق ہم نے کسی کو نہیں بتایا۔ کس کس کو مطمئن کریں گے۔" وہ اس کے سر پر کھڑے ہو کر چیخ رہی تھی۔
"وہ تو اچانک اندر آ گئی تھیں میں ہٹ ہی رہی تھی۔"
"زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ خیال رکھنا۔" وہ سلگتی ہوئی نگاہ اس پر ڈال کر باہر نکل گئی۔
"یا اللہ......" وہ سر ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئی۔
کتنی پابندیاں لگیں گی مجھ پر۔
رات وہ زار و قطار روتے ہوئے حارث کو بتا رہی تھی کہ آج مسز مراد نے اسے دیکھا اور بابر کا پروپوزل دیا ہے۔
"اچھا۔"
"تم نے بتایا نہیں۔"
"یہ ہی کہہ دوں۔"
"ہاں!"
"یہ بتا دوں کہ وہ میری سوکن ہے۔ سارا دن چھریاں چلاتی ہے میرے دل پر۔"
"میرا مطلب ہے!" اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔
"یہ ہی مطلب ہے تمہارا ناں کہ لوگ مجھ پر ہنسیں۔"
"یار سمجھا کرو۔ تم یہ ورق ہی الٹا دیتیں کہ اس کا نکاح ہو چکا ہے۔"
"رخصتی ڈاکٹر بننے کے بعد ہے۔"
وہ روتے روتے اسے دیکھنے لگی۔
"روز روز کے سوالوں سے بہتر ہے یہ کہہ دو...... وہ کوئی بے جان چیز تو ہے نہیں کہ اسے چھپا دیا جائے۔ اس نے فی الحال ادھر ہی رہنا ہے۔ پڑھنا ہے۔ روز گھر سے باہر نکلنا ہے۔"
حارث نے تفصیل سے سمجھایا۔ نگار نے آنسو صاف کیے بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔
"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" اس نے تائید کی۔
"کیسا!"
"بہت اچھا......" اس کی چہک کے جواب میں اس نے مسکرا کر کہا۔
"خواہ مخواہ ہی میں نے رو کر خود کو ہلکان کیا۔"
"حارث میں آپ کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔ آپ اسے میری مجبوری سمجھ لیں۔" وہ دھیرے سے اس کے ساتھ لگ گئی۔
"معلوم نہیں یہ مجبوریوں کے فیصلے کیسے ہو جاتے ہیں۔"
"کیا میں کرنا چاہتا ہوں۔" اسے سمیٹ لیا اور اسے حارث کے اس بے ساختہ اظہار پر یقین آ گیا کہ حارث اس کا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔
محبتوں کو کوئی جدا نہیں کر سکتا۔
اس روز کئی دنوں کے بعد حارث اس کے کمرے میں آیا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ بیٹھی رہی۔
"کیسی ہو؟"
"ٹھیک ہوں۔"
وہ جانتی تھی استحقاق نہیں ہے نگاہ اٹھانے کا۔
"پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔"
"ٹھیک......" سر ہلا کر جواب دیا۔
پھر وہ کافی دیر تک بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا

رہا۔ وہ کرسکتا تھا آخر پیسوں سے خریدا تھا۔ خریدی ہوئی چیز پر حق، استحقاق ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ جھٹک نہیں سکتی تھی۔

آخران کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ مرد کسی بھی موڑ پر ہو، خواہ کیسی ہی محبت کیوں نہ ہو، اپنے حق کو نہ چھوڑتا ہے، نہ بھولتا ہے۔ پھر اس کی ضرورت بھی تھی اور صبح تک کند چھری کی اذیت سے تڑپاتی رہی۔

☆☆☆

انھی دنوں جب خزاں رسیدہ موسم عروج پر تھا، لان میں خشک پتوں کا ڈھیر شام تک جمع ہو جاتا۔ وہ کتنی دیر تک ان پر چلتی۔ ان کے ٹوٹنے کو محسوس کرتی۔ موسم کی اداسیاں بہت بڑھ گئی تھیں کہ اسے اپنے اندر تبدیلی کا احساس ہوا۔

کتنی دیر تک وہ گم صم رہی۔ آج...... آج بے اختیار رو دی۔ یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ ختم ہو گا تو کیا ہو گا۔

کس سے کہے، کیا کہے کہ، کہ وہ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ گویا گناہ کا بوجھ ہو جیسے۔

کتنے دن گزر گئے کالج مسلسل جا رہی تھی۔ نگار سے گریزپا تھی۔ حارث مل نہیں رہا تھا، ممی کا فون نہیں آیا تھا۔ کس سے کہے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

نگار نے اس کی گری ہوئی طبیعت کو دیکھا، محسوس کیا۔ یک دم ہی اس کے اندر آگ سی بھر گئی۔ جانے خدا نے کیسی یہ آزمائش کی گھڑیاں رکھی تھیں جن کلیوں کی مالا پرونے کی اس نے دعائیں مانگی تھیں، وہ کسی اور کے بطن سے کھل رہی تھیں۔

یا خدا! سرخ آنکھوں کو سنبھالتی وہ انگارہ ہو رہی تھی۔ جل کر حارث کو مبارک باد دی۔

''کس بات کی؟'' وہ سمجھا نہیں۔

''باپ بننے والے ہو۔''

''کیا؟'' خوشی بےساختہ تھی۔

''تمہیں نبیلہ نے بتایا نہیں۔'' بے یقینی سے دیکھا اور خود کو سنبھالا۔

''قطعی نہیں......''

''ہاں یہ سچ ہے۔'' اس نے یقین دہانی کروائی۔

حارث نے بےساختہ آنے والی خوشی کو اندر ہی روک لیا۔ ظاہر نہ ہونے دیا۔ سامنے کھڑی ہستی اس کی محبوبہ تھی۔ محبوبہ ہر دور میں عزیز ہوتی ہے لیکن یہ خوشی بھی کم نہ تھی۔ مکمل ہونے کا احساس ہی حد سے ماورا تھا۔

ننھا منا...... روئی ایسے گالوں والا وجود...... تصور کا پردہ مہکا، شدت سے دل اس کے پاس جانے کو چاہا مگر حدیں مقرر تھیں۔

''ڈاکٹر سے کنسلٹ کیا؟'' خود کو سنجیدہ رکھا۔

''ہاں ڈاکٹر عمرانہ کو فون کیا ہے۔ آج شام کو آئیں گی۔'' اس کا لہجہ ذرا شکستہ تھا۔

''تم کیوں اتنی ہرٹ ہو رہی ہو۔'' بےساختہ شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بولا۔

نگار نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر بےساختہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''ریلیکس یار!'' اس نے اسے دھیرے سے تھپکا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو۔''

''حارث جس خوشی کی ہمیں تلاش تھی جس کے لیے میں نے منتیں مرادیں مانگیں، وہ کسی اور کے حوالے سے کیوں ملی؟ ایسا کیوں ہوا؟ میں کتنی بدنصیب ہوں نا......''

اس کی ہچکیاں نہیں تھم رہی تھیں۔

حارث صرف اسے دلاسا ہی دے سکتا تھا۔ یہ خدا کی قدرت تھی...... اس کے کام وہ بہتر جانتا ہے۔

جہاں محبت عشق برابر ہوئی وہاں خواہشوں کا حاصل نہ ہوا۔ جہاں خواہشیں ٹھہریں وہاں محبت نہ ہوئی۔

ڈاکٹر عمرانہ نے تصدیق کردی۔ ساتھ ہی ادویات دیں، آرام کا مشورہ دیا، غذائی چارٹ بنا کر دیا اور پابندی سے مفصل چیک اپ کروانے کے لیے کہا۔ ہر مرحلہ خود بخود طے ہو جاتا ہے۔ وقت جیسے

خود بخود رواں ہے۔ دن رات کا چکر۔
''اب تم کھانا ہمارے ساتھ کھایا کرو گی۔'' پہلی بار حارث نے گویا آرڈر دیا۔
''میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ میں یہاں ہی ٹھیک ہوں۔''
''سنو! یہ بہت ضروری ہے۔ تنہائی تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔''
کچھ پس وپیش کے بعد وہ مان گئی حالاں کہ اندر سے بالکل راضی نہ تھی۔
''تم وین سے کالج نہیں جاؤ گی۔ میں تمہیں ڈراپ کردیا کروں گا۔'' حارث نے ایک اور حکم دیا۔
''میں بالکل نارمل ہوں...... خدانخواستہ۔''
''پلیز بیلا!'' اس نے سنجیدہ ہوکر اسے دیکھا۔ نگار پاس ہی کھڑی تھی۔
حالاں کہ دل چاہ رہا تھا اسے باہوں میں بھر کے بے تحاشا اپنی خوشی کا اظہار کرے۔ کیسا انمول خزانہ ملنے کو تھا۔
''جو کہہ رہا ہوں وہ کرو یہ بہت نازک موقع ہے۔ خیال ہمیں ہی رکھنا ہے۔''
''نگار تم میڈیسن کا خیال رکھا کرو۔'' ساتھ ہی اسے بھی آرڈر دیا۔
''ہوں۔'' وہ اندر سے خاکستر تھی۔ وہ جانتی تھی یہ سب وقتی ہے۔ صرف حال کے لمحوں تک...... بعد میں سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ یہ ذرا سی توجہ جو اسے مل رہی ہے واپس اس کی گود میں آجائے گی، مگر وہ ازلی جلن، حسد، رقابت وہ کیا ہوگی۔ سوکن سوکن ہی ہوتی ہے۔ ذرا سی توجہ بھی کیوں...... اس کا اندر باہر خاکستر ہو رہا تھا۔
عورت محبتوں کے معاملے میں بہت کچی ہوتی ہے۔ ذرا سا گریز روح تک جلا دیتا ہے۔ وہ رقابت کا شکار ضرور تھی مگر جاہل عورتوں کی طرح اس نے خود کو چھوڑا نہیں بلکہ مضبوطی سے اپنے قدم جما کر کھڑی تھی۔
یہی ذہین اور طرح دار خاتون کی نشانی ہوتی ہے۔

☆☆☆

صبح حارث خود کالج چھوڑنے کے لیے نکلا۔ درمیان میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مبارک سلامت کے الفاظ ڈھیرے رہ گئے۔ اس کے چہرے پر بہت سنجیدگی تھی۔
بیک مرر سے نظر آتا چمکدار چہرہ دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا اسے دیکھتا رہے دیکھا رہے۔ کیسی تخلیق کار تھی وہ خدا نے کس درجے پر اسے وسیلہ بنایا تھا۔ کیسا عکس چہرے پر ٹھہر گیا تھا۔

☆☆☆

اس روز کالج جلدی آف ہوگیا کوئی پیریڈ نہیں تھا۔ جلدی کالج سے نکل آئی۔ رکنا فضول ہی تھا۔
وین گھر سے ذرا فاصلے پر اتارا کرتی تھی۔ وہاں سے اتر کر پیدل گھر تک جانا ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے چادر کا پلو تھامے بیگ لٹکائے وہ آگے بڑھ رہی تھی کہ......
''ایکسکیوزمی۔'' کہہ کر کسی نے روک لیا۔ سر اٹھایا، سامنے ایک خوش شکل سا لڑکا کھڑا تھا۔
''جی......!'' اسے حیرانی ہوئی۔ آج تک ایسا اتفاق ہوا تو نہیں تھا۔
''مجھے بابر آفاق کہتے ہیں۔ آپ کے برابر والے گھر میں رہتا ہوں۔''
''جی۔'' حیرانی سے دیکھا۔
''آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ کون سے کالج میں پڑھتی ہیں۔''
غصے سے اس کا خون کھول گیا۔
''کوئی کام ہے؟'' اس نے تیکھے ابرو اٹھائے۔
''جی!''
''فرمایئے؟''
''جو میرا کام تھا میں نے کرلیا۔ باقی کام بھابھی کرلیں گی۔ شکریہ۔'' زیرلب مسکراتا، گہری نگاہ ڈالتا آگے بڑھ گیا۔
''خواہ مخواہ!'' کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

''اتنامت پڑھا کرو، تمہیں سکون، اطمینان اور خوش خوراکی کی ضرورت ہے۔'' اس روز بھی حارث اس کے کمرے میں آ گیا۔ اب دھیان و گیان کی خاطر اکثر آجاتا تھا۔

حارث کا آنا، باتیں کرنا۔ اسے یہ سب بہت عجیب لگا کرتا تھا مگر وہ حق رکھتا تھا۔ روکنے کی کوئی طناب اس کے ہاتھ میں نہ تھی۔

''ممی مبارک باد دے رہی تھیں۔'' انکشاف کیا۔

''اچھا ان کا فون آیا ہے۔''

''ہاں اکثر آتا رہتا ہے۔''

''اچھا......'' اسے عجیب سا لگا۔ اس سے ہی بات نہ کی۔

''تمہارا بہت پوچھ رہی تھیں۔''

''بات کرنے کی خواہش نہیں تھی۔ وہ تو......وہ تو......''

''کہیں باہر جانے کو دل چاہ رہا ہے۔'' حارث اب ایسی چھوٹی چھوٹی نوازشیں کرنے کے موڈ میں رہتا تھا۔

نگار پاؤں جلی بلی کی طرح ادھر سے ادھر حارث کی واپسی تک چکر لگاتی رہتی تھی۔

سکھاں ایک واحد عورت تھی جو اس راز سے واقف تھی۔ اسے بھی منع کر دیا گیا تھا کہ وہ کسی پر ظاہر نہ کرے۔

ظاہر کر کے اس نے کہاں جانا تھا۔ اس کا کون سا در، گھر تھا۔

☆☆☆

اس کی اسٹڈی جاری تھی۔ اس کے گھر سے کوئی اس کو ڈھونڈنے، پوچھنے نہیں آیا۔ گزرتے دنوں کے ساتھ وہ سردسی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی حالت اسے ان دیکھے جہاں کی سیر کراتی رہتی۔

سردیوں کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ گیلے موسموں کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھی بھر بھر آتیں مگر کچھ کہنے سننے کی تاب نہ تھی۔

میڈیسن کا حد سے زیادہ استعمال تھا۔ جب اس سرد موسم کی سرد صبح کے اجالوں میں پرائیویٹ اسپتال میں اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔

حارث کی خوشی دیدنی تھی۔ پورے ہاسپٹل میں مٹھائی بانٹی گئی، سب کچھ بھول کر نگار نے ننھے سے گلابی وجود کو سینے سے لگا لیا۔ شرط یہ بھی تو تھی۔ بچہ اس کا ہوگا، اس کی گود میں آنکھ کھولے گا۔ اس کو سیراب کرے گا۔ اس کی خالی جھولی بھرے گا۔ اسے تو معاوضہ مل گیا۔ ممتا کی ساری پیاس اس کے اندر اتر گئی۔

وہ ہاسپٹل سے ہی بچے کو لے گئی۔

آنکھ کھلی ہوش آیا تو موسم کی ساری ٹھنڈک پت جھڑ کی خزاں رسیدگی اس کے وجود کو بنجر کر گئی۔ بنجر نگار کب تھی بانجھ تو وہ تھی۔ اتنا کڑا سفر طے کیا۔ اتنی اذیت، دکھ، تکلیف برداشت کی پھر بھی تہی دامن کھڑی تھی۔ ایسا بھی بدنصیب ہوگا کوئی؟ ایک عمر تک پھول کی کاشت کرتا رہا، فصل کاٹنے کا وقت آیا تو کانٹے ہاتھ میں تھے۔

یہ تو طے تھا، دکھ کے شدید احساس سے آنکھیں بند کیں تو آنسو چھلک پڑے۔ بدنصیبی یہ بھی تو ہے۔ ایک عمر چلتے رہے اور گھر نہیں آیا۔ لیکن گھر کا راستہ طے کب ہوا تھا۔ ان راستوں پر تو عمر بھر بھٹکتے ہی رہنا تھا۔

منزل کا تعین ہی نہ ہوا تھا۔ کم مائیگی کا شدید ترین احساس یہ بھی تو ہے۔ کوئی لفظ شائستگی نہیں، نہ کوئی تصدیقی کلمات ادا ہوئے۔ نہ احساس شکر گزاری۔ بس جیسے وہ امانت دار تھی، امین کو چیز پہنچا دے۔

اف......احساس شکستگی تھا یا احساس شرمندگی۔

☆☆☆

''تھینک یو......تھینک یو بیلا۔ تم میرے لیے بہت عظیم ہو۔ تم نے مجھے وہ خوشی عطا کی ہے جس کا میں ساری عمر احسان نہیں اتار سکتا۔ جو مانگو دوں گا۔''

دھیرے دھیرے سرگوشیاں اس کے گرد پھیل رہی تھیں۔ گلاب کی پتیاں اس کے آنسوؤں کو سمیٹ رہی تھیں۔ بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔ حارث..... قریب بہت قریب تھے۔

اسے اپنے سارے دکھ ختم ہوتے محسوس ہوئے۔ آنسوؤں کی رفتار تیز ہوگئی۔ ''ہم لوگ خود غرض ہیں ہماری خود غرضی کو معاف کردو۔''

آنسوؤں کو پوروں پر سمیٹ لیا۔

''خوشی اور سکون کی کس منزل پر تھا۔''

''تم ماں ہو، ساری عمر ماں ہی رہو گی۔ وہ بانجھ ہے اسے تم نے سیراب کر دیا ہے۔ میں تمہیں سیراب کردوں گا۔''

اسے خود بھی اپنے لفظوں کی گہرائی کا اندازہ نہ تھا۔

''آج جو کہو گی پورا کروں گا۔'' اس کی خوشی دیدنی تھی۔

''صرف یہ.....'' بے ساختہ ہی وائیٹ شرٹ کے کالر مضبوطی سے تھام لیے۔

''بولو.....حوصلہ ہے۔'' آنسوؤں نے دامن تھام لیا۔ اس کا زرد چہرہ اور زرد ہو گیا۔

''مجھے جدائی سے خوف آتا ہے۔ مجھے کبھی الگ مت کیجیے گا۔ مجھے طلاق نہیں چاہیے۔ میں ساری عمر اس بچے کے سامنے رہنا چاہتی ہوں۔'' اس کا حوصلہ قیامت کا تھا۔ ضبط وصبر انتہا کا۔ پل استقامت پر کھڑی تھی۔

''مجھے منظور ہے۔'' حارث نے بے ساختہ ہی اس کی پیشانی چوم لی۔ اسے گویا قرار مل گیا۔

☆☆☆

نگار کو زبردست کھلونا مل گیا۔ گھر میں رونق آ گئی۔ سارے کام نگار خود کرتی۔ اس کا صبر وضبط قیامت کا تھا۔

اپنا وعدہ نبھا دیا۔ زبان پر حرف نہ لائی۔ ماں کی ممتا کو ویران کر دیا۔

تاہم دن میں ایک بار دیکھ ضرور لیتی۔

اس نے پھر سے خود کو کتابوں میں گم کر لیا تھا۔

اس روز لان میں آئی تو چونک گئی۔ لان میں بیگم صاحبہ اور رعنا کھڑی تھیں اور بچے کے متعلق استفسار کر رہی تھیں۔ نگار فخر سے بتا رہی تھی کہ......

''میرے جیٹھ کا بچہ ہے۔ انہوں نے ہمیں دے دیا ہے۔ اب میں پالوں گی۔ اپنا بیٹا بناؤں گی۔'' چہرے پر فخر تھا۔

گلابی گلابی معصوم بچے کو باہوں میں بھینچ لیا۔ چہرے سے خوشی چمک رہی تھی۔ نبیلہ کاریڈور کی طرف بڑھ گئی۔

''آپ کیسے آئیں؟''

''ہم اپنی مراد لے کر آئے ہیں۔ ہمارے بابر کو نبیلہ بہت پسند آ گئی ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''جی!'' وہ یک دم ہی ہونق رہ گئی۔

''آئندہ پوچھیں تو کہہ دینا کہ نکاح ہو چکا ہے۔''

''لیکن اس کا تو!'' زبان کہتے کہتے رک گئی۔ یک دم ہی دماغ کہیں اور چلا گیا۔

''آپ نے جواب نہیں دیا۔ کیا وہ کہیں انگیج ہے۔''

''آں......ہاں......کچھ ایسی ہی بات ہے مگر ابھی کچھ فائنل نہیں ہے۔ مطلب ہاں یا ناں کے درمیان ہے۔''

اس گول مول بات کا مطلب ان عورتوں کی سمجھ نہیں آیا اور نہ ساکت ہو جانے والی نبیلہ سمجھ سکی۔ صاف صاف کیوں نہ کہہ دیا کہ...... یہ کون سی چال ہے؟

''میں آپ کو حارث سے پوچھ کر جواب دوں گی۔''

''پلیز ہمارا خیال رکھیے گا۔ ہم لوگوں کی فیملی آپ کے سامنے ہے۔ کچھ ڈھکا چھپا نہیں ہے۔'' وہ لوگ بضد تھے۔

''جی میں جانتی ہوں مگر.....'' اس نے انہیں

بولی۔

''اور یہ آپ کی بیٹی میگھنا ہے۔''

''یہ تمہیں کہاں ملی؟''

عورت نے کچھ کہنے کے بجائے اس کی طرف ایک لفافہ بڑھا دیا۔ رتنا نے بڑی بے صبری سے لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر پڑھنے لگی۔ ہلکے آسمانی رنگ کے کاغذ پر بے حد ستھری تحریر میں لکھا تھا۔

''رتنا ڈارلنگ!

تمہاری امانت میگھنا کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ تم نہیں جانتیں میگھنا کو بحفاظت تم تک پہنچانے کے لیے مجھے کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس شخص نے میگھنا کو اغوا کیا تھا وہ قانون کی نظروں میں ایک خطرناک مجرم تھا۔ اپنی تمام زندگی کی کمائی اسے سونپ کر میں نے میگھنا کو حاصل کیا تھا میں نے کئی بار چاہا کہ تم سے ملوں۔ مگر ہوائی حادثے کے بعد میرا چہرہ اس قابل نہ رہا تھا کہ میں تمہارا سامنا کر سکتا۔ دوسری طرف اگر میں خود کو، بحیثیت راجن ظاہر بھی کر دیتا تو میرے لاکھ صفائی کرنے پر قانون مجھے نہیں چھوڑتا۔ پچھلے دنوں میں نے بہت ہمت کر کے تم سے ملنے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ تم پرکاش دوبے نام کے ایک دولت مند شخص کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کر چکی ہو۔ میں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ میں جن حالات میں جی رہا ہوں ان حالات میں تمہیں پریشانیوں کے سوا دے بھی کیا سکتا تھا۔ اسی دوران مجھے معلوم ہوا کہ میگھنا کو اغوا کرنے والا سانتا تمہارے چکر میں پڑ گیا ہے۔''

رتنا میں نے تمہیں کوئی سکھ نہیں دیا لیکن سانتا کو تمہارے راستے سے ہٹا کر میں نے سوچا تھا کہ اب تم ایک پرسکون زندگی گزار سکوگی۔ لیکن افسوس میں نے کل ہی اخبار میں پرکاش دوبے کے قتل کی خبر پڑھی۔ خیر بھگوان کو جو منظور تھا وہ ہوا۔ سنا ہے تم اب ایک کروڑ پتی بیوہ ہو، مجھے کبھی کبھی ہنسی آجاتی ہے کہ اپنے پہلے شوہر یعنی میرے ہوتے ہوئے تم بیوہ ہو۔ بہر حال مجھے تمہاری دولت سے کچھ نہیں لینا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے سائے میں میگھنا کی زندگی سنور جائے۔ سرسوتی نے میگھنا کو چار سال اپنی بیٹی کی طرح پالا ہے اس عرصے میں مجھ سے جو کچھ بن پڑا میں نے اس عورت کو میگھنا کی پرورش کے لیے دیا اب اگر ہو سکے تو اس عورت کا خیال رکھنا۔ یہ تمہاری میگھنا کی آیا ہے۔ ہاں ایک بات اور میری خواہش ہے کہ تمہارا شہر چھوڑنے سے پہلے آخری بار تمہیں قریب سے دیکھوں۔ کیا میری یہ خواہش پوری کروگی۔

میں کل رات ایک بجے تمہارے بیڈ روم کے دروازے پر تین بار دستک دوں گا اگر تم نے دروازہ کھول دیا تو میں سمجھوں گا کہ تم نے میری التجا قبول کر لی۔ ورنہ میں واپس چلا جاؤں گا۔''

بدنصیب۔ راجن

رتنا نے خط پڑھ کر سرسوتی کی طرف دیکھا۔

''کیا تم میگھنا کے ساتھ یہیں رہنا پسند کروگی۔''

''جیسے آپ کی اچھا'' سرسوتی سر جھکا کر بولی۔

''یوں بھی اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔''

رتنا نے میگھنا کو ایک بار پھر اپنے گلے سے لگا کر پیار کیا۔ پھر کچھ دیر تک سرسوتی سے اس کے بارے میں باتیں کرنے کے بعد ایک ملازم کو بلا کر کہا۔

''دیکھو ویر سنگھ یہ سرسوتی بہن ہیں انہیں اوپر والے کمرے میں لے جاؤ۔ آج سے یہ اپنی بے بی کے ساتھ یہیں رہیں گی۔''

ویر سنگھ نے کچھ کہے بغیر سر ہلایا اور سرسوتی میگھنا کا ہاتھ تھام کر نوکر کے ساتھ اوپر جانے والے زینوں کی طرف بڑھ گئی۔

سرسوتی کے جاتے ہی رتنا ایک بار پھر کسی گہری فکر میں غرق ہو گئی۔ اچانک ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلنے کی آہٹ پر وہ چونکی۔ ایک تندرست اور خوب صورت شخص کوٹھی کے دوسرے ملازم کے ہمراہ اندر داخل ہو رہا تھا۔

آنے والا شخص بہترین قسم کے سرمئی سوٹ اور ہلکے زرد رنگ کی ٹائی میں بے حد پروقار لگ رہا تھا۔ رتنا کو دیکھتے ہی وہ بڑے سلیقے سے تھوڑا خم ہوتے

ہوئے پرسکون لہجے میں بولا۔
''وقت لیے بغیر اس طرح اچانک آنے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔'' پھر اس نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا۔ ''شاید آپ ہی مسز رتنا ہیں۔''
''تشریف رکھیے۔'' رتنا اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میں ہی رتنا ہوں۔''
نووارد نے ایک طویل سانس لی اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر رتنا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں کرنل زاہد ہوں۔''
رتنا نے زاہد کے ہاتھ سے کارڈ لیتے لیتے اسے چونک کر دیکھا۔ پھر چند سیکنڈ تک کارڈ کو دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔
''کہیے۔ میں کیا خدمت کرسکتی ہوں؟''
''دیکھیے مسز رتنا۔'' زاہد دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں یہاں مسٹر پرکاش کے قتل سے متعلق چند ضروری باتیں معلوم کرنے آیا ہوں۔ اور آپ جانتی ہیں کہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم کسی ایسے کمرے میں چل کر بات کریں جہاں کسی تیسرے شخص کی آمد کا احتمال نہ ہو۔''
''آیئے۔'' رتنا بولی۔
پھر کچھ دیر بعد زاہد اس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ رتنا نے زاہد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''پرکاش کے سلسلے میں پولیس والے میرا بیان لے چکے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کچھ معلوم کرنا چاہتے ہوں وہ بھی پوچھ لیجیے ویسے میں......''
''ایک منٹ۔'' زاہد نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تو آپ یہ سمجھ لیجیے کہ میں جو کچھ معلوم کروں گا اس سے میرا مقصد آپ کو دکھ پہنچانا یا آپ پر شک کرنا نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں آپ کے مسٹر پرکاش کے اور مسٹر راجن کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ خصوصاً کچھ ایسی باتیں ہیں جو آپ کے علم میں نہیں۔ میری درخواست ہے کہ آپ مجھے اپنا ہمدرد سمجھ کر ہر بات کا صحیح جواب دیں۔''
''جب آپ سب کچھ جانتے ہیں تو مجھ سے کیا پوچھیں گے۔'' رتنا الجھے ہوئے انداز میں بولی۔
''آپ سے چند باتوں کی تصدیق کرنی ہے اور کچھ نئی باتیں معلوم کرنی ہیں۔''
''پوچھیے۔'' رتنا نے کہا۔
''میرے خیال میں آپ اس بات سے انکار نہیں کریں گی کہ مسٹر پرکاش سے پہلے آپ راجن نام کے ایک پائلیٹ کی بیوی تھیں۔''
''یہ سچ ہے کہ میری شادی پہلے راجن سے ہوئی تھی اور اس سے ایک لڑکی بھی تھی جسے راجن کی موت کے بعد اغواء کرلیا گیا تھا۔''
''کیا آپ اغواء کرنے والوں کو جانتی تھیں۔'' زاہد نے پوچھا۔
رتنا ایک لمحے کے لیے کچھ نروس سی دکھائی دی۔ پھر اس نے کہا۔
''پہلے نہیں جانتی تھی۔''
''پہلے سے آپ کی کیا مراد ہے؟''
''میرا مطلب ہے جب میگھنا غائب ہوئی تو میرے علم میں نہ تھا کہ اسے اٹھانے والا کون ہے؟ آپ جانتی ہیں وہ کون تھا؟''
''جی ہاں۔'' رتنا نے جواب دیا۔ ''اسے جنگل کشور یا سانتا نام کے ایک شخص نے غائب کیا تھا۔''
زاہد کے ہونٹوں پر عجیب سی پراسرار مسکراہٹ دوڑ گئی اس نے رتنا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ وہی سانتا تو نہیں، جو آپ کو کسی خفیہ تہہ خانے کا راستہ معلوم کرنے کے سلسلے میں بلیک میل کررہا تھا اور چند روز پہلے کلیر روڈ کی ہامینشن کے فلیٹ میں قتل کردیا گیا۔''
رتنا نے چونک کر زاہد کو دیکھا اور کانپتی آواز میں بولی ''یہ سچ ہے۔''
''مسز رتنا۔'' زاہد بولا۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ اس کی ڈائری میں آپ کا نام، پتا اور آپ کے بارے میں کچھ ایسی تفصیلات درج تھیں کہ اگر وہ ڈائری پولیس تک پہنچ جائے تو آپ حراست میں لی جاسکتی ہیں۔''
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بہت روشن سویرا ہے

سمیرا رؤف

کبھی دریا کا پانی بھی واپس آیا ہے پانی تو بس آگے بہتا ہے۔ پانی کب الٹا چلتا ہے۔
وہ دوشیزہ جو دل کی بستی کے اک کوچے میں اپنی محبت وارنے آئی تھی یہ خیال اس کے لیے کسی سوچ کا محور بن گیا۔

گھر کی دہلیز پر کھڑی ایک کنواری کا قصہ، ضبط کے جبر نے اسے آلودہ ہونے سے بچالیا تھا

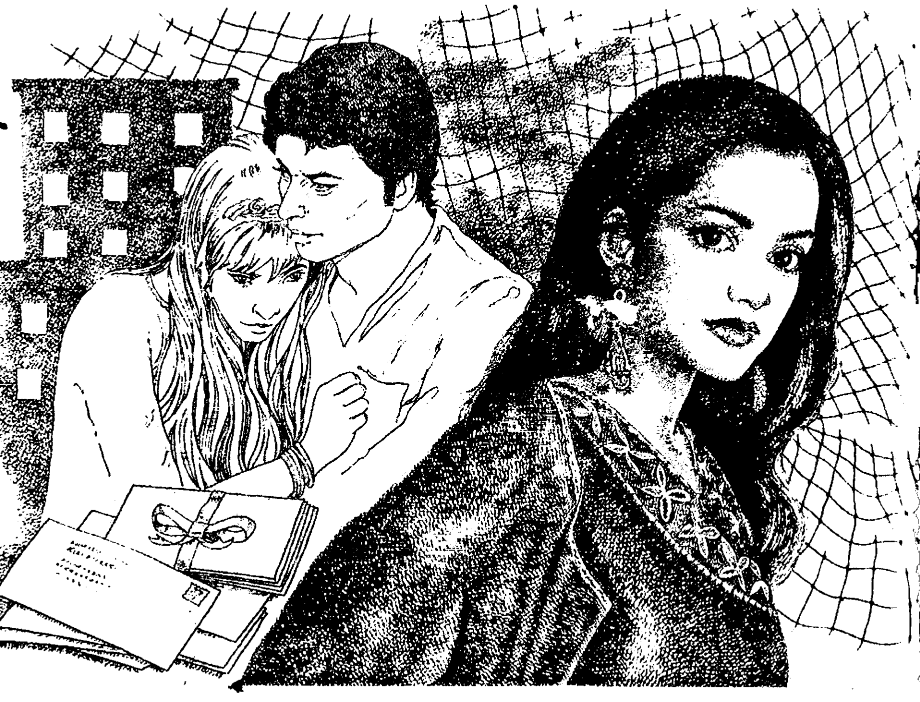
اپنے کمرے سے گیٹ تک کا فصلہ مجھے چند قدموں اور ایک گھنٹے میں طے کرنا تھا لیکن یہ چند قدم اور ایک گھنٹہ میری زندگی کا سب سے اہم اور سب سے تکلیف دہ سفر تھا۔ ایک گھنٹے بعد میرے کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والے پیپل کے درخت تلے شیراز کو اپنی بائیک پر آکر کھڑے ہونا تھا اور تین مرتبہ ایک بائیک کی ہیڈ لائٹ جلا بجھا کر مجھے نیچے آنے کا اشارہ دینا تھا اور اب میرے لیے اس تک پہنچنا محض چند قدموں اور ایک گھنٹے کی بات تھی۔

امی اور ابو اپنے کمرے میں آرام سے سوئے ہوئے تھے۔ امی نے آج بہت مصروف دن گزارا تھا۔ اس لیے تھک ہار کر اب وہ بہت گہری نیند سو رہی تھیں۔ اور ابو کی عادت تھی گہری نیند سونے کی۔ کوئی سر پر کھڑا ہو کر ڈھول بھی بجائے ابو کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ اب بھی ان کے خراٹوں کی آواز میرے کمرے تک آرہی تھی۔ بھائی کے کمرے کی لائٹ رات ساڑھے بارہ بجے بند ہوئی تھی ان کی بھی عادت تھی کہ تکیے پر سر رکھتے ہی سو جاتے تھے یعنی ہر طرف سے لائن کلیئر تھی۔

شیراز سے میری ملاقات بھی بہت دلچسپ انداز میں ہوئی تھی۔ شاید کسی اور کو اس میں کوئی دلچسپی نظر نہ آئے لیکن میرے لیے اس پہلی ملاقات میں بہت کشش تھی اور وہ میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھا۔

شیراز رخسانہ کا بھائی تھا اور رخسانہ میری کلاس فیلو تھی۔ گوکہ کالج میں ہم پہلے سے لے کر تیسرے سال تک اکٹھے ہی تھے لیکن اس سے میری دوستی کی شدت میں اضافہ تھرڈ ایئر میں آکر ہی ہوا تھا۔ اس سے قبل ایف ایس سی میں تو کورس سے ہٹ کر بات کرنے کا بھی خیال نہیں آیا تھا۔ پھر تبھی تمام تر محنت کے باوجود جب مجھے اور رخسانہ کو میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ملا اور ہم تھرڈ ایئر میں اکٹھے ہوئے تو میڈیکل کالجوں، ایجوکیشن سسٹم اور نہ جانے کس کس کو مل کر گالیاں دیتے ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ اور تب ہی ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا شروع ہوا۔

ایک عرصے تک میں نے شیراز کا صرف نام سن رکھا تھا۔ کبھی رخسانہ کے گھر جاتی تو پتا چلتا کہ آج سب دوستوں کا کمبائن اسٹڈی کا پروگرام ہے۔ کبھی



پتا چلتا کہ وہ آج دیر تک اسپتال میں رہے گا اور کبھی معلوم ہوتا کہ ہے تو اپنے کمرے میں لیکن پڑھائی میں مصروف ہے۔

"تمہارا بھائی تو مجھے کتابوں کا کیڑا لگنے لگا ہے۔" ایک دن میں اس کے گھر گئی تو کہنے سے نہ رہ سکی۔

"ارے نہیں وہ تو بہت زندہ دل ہے اور زندگی کو خوب انجوائے کرنے کے قائل ہے لیکن اس نے ہر کام کا ایک وقت مقرر کیا ہوا ہے۔ پڑھائی کے وقت پڑھائی اور سوشل لائف کے وقت سوشل لائف اور اس اصول پر وہ بہت سختی سے عمل کرتا ہے۔"

"پھر تو مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے تمہارے بھائی پر۔ دیکھو کتنا اچھا ہو رہا ہے موسم۔" میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔

کتنی ہی بارش ہو چکی تھی پھر بھی آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یوں تو مون سون میں بہت حبس ہو جاتا ہے لیکن اس دن خلاف معمول درختوں کے دھلے دھلائے پتے آہستہ روی سے لیکن مسلسل حرکت میں تھے۔

"چلو باہر لان میں ککلی ڈالتے ہیں۔" رخسانہ کو اچانک خیال آیا۔ اسے ہمیشہ اچانک ہی بہت دلچسپ کام سوجھ جاتے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں لان میں ہم دونوں ککلی ڈال رہے تھے۔

"کِکلی کلیر دی، پگ میرے ویر دی
دوپٹا میرے بھائی دا، فٹے منہ جوائی دا"

ہم خوب زور شور سے گا رہے تھے۔ پھر تھوڑی

ہی دیر میں ہم دونوں بے دم ہو گئے۔
"ویسے ایک بات ہے رخی۔" میں گیلی گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "بھائی کا دوپٹا کیسے ہوسکتا ہے؟"
"ہاں سوچنے والی بات ہے۔" وہ میرے برابر میں بیٹھ گئی۔ "بھائی کا سہرا ہوتو کوئی بات بھی تھی۔"
"خیر ہمیں کیا۔ وہ دوپٹا یا سہرا باندھے جمہوری دور ہے۔"
"میرے خیال میں یہ وہ دوپٹا ہے جس کے تلے بھائی کو مہندی کے لیے لاتے ہیں۔" رخی نے خیال ظاہر کیا۔
"ہوگا۔"
"کیا خیال ہے پارو، آنکھ مچولی نہ کھیلیں؟" رخسانہ کو پھر خیال سوجھا۔
"دو بندے کیا آنکھ مچلی کھلیں گے۔"
"تو میں سب بچوں کو جمع کر لیتی ہوں۔"
"کن بچوں کو......؟"
"بھئی اردگرد بچے بھرے پڑے ہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی صرف اشتہاروں میں ہے۔"
تھوڑی دیر میں لان میں ڈھیر سارے بچے بھرے ہوئے تھے۔ کھیل شروع ہوا۔ رخسانہ نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور پھر مجھے گھما کر تالی بجادی۔ ہر طرف تالیاں بج رہی تھی۔ قہقہے لگ رہے تھے اور میں کبھی ستون کو پکڑتی اور کبھی درخت سے لپٹ جاتی۔
"افوہ! کیا مصیبت ہے۔ مجھ سے نہیں پکڑا جاتا۔" میرے ہاتھ آنکھوں پر بندھی پٹی کی طرف بڑھے۔
"پٹی نہیں اتارنی......" رخسانہ چلائی۔ "تم نے ٹاس ہارا تھا۔"
"میں ایک مرتبہ پھر آواز کی سمت لپکی اور بالآخر ایک بازو کو سختی سے تھام لیا۔
"پکڑ لیا ناں میں نے آخر۔" میں بھی چلائی اور جلدی سے پٹی کھول دی۔
کتنی دیر سے سیاہ پٹی میں جکڑی ہوئی آنکھوں نے جب روشنی کا سامنا کیا تو میری آنکھیں ایک بار پھر خود ہی بند ہو گئیں۔ میرے اردگرد قہقہے بکھر رہے تھے اور ان میں سب سے نمایاں قہقہہ رخسانہ کا تھا۔ میری آنکھیں جب کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی، جسے میں نے پکڑ رکھا تھا وہ نہ تو رخسانہ تھی نہ کھیل میں حصہ لینے والا کوئی بچہ۔ وہ بہت وجیہہ نوجوان تھا جو شرارت آمیز انداز میں میری جانب دیکھ رہا تھا میں نے جلدی سے اس کا بازو چھوڑ دیا۔
"کبھی پَنر کریوں بھی چھوڑتے ہیں۔" وہ شرارت سے ہنسا۔ "اور وہ بھی میرے جیسا ہینڈسم نوجوان کہ جسے پکڑنا اتنا آسان نہیں ہے۔"
"جی؟" میں نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔
"میں اتنی مشکل اردو تو نہیں بولتا۔"
"مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ مجھے تنگ کر کے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اس لیے میں بھی برابر کی چوٹ دینے کے لیے میدان میں اتر آئی۔
"لگتا ہے بہت خوش فہمی ہے اپنے بارے میں آپ کو۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔
"خوش فہمی تو خود بخود ہو جائے گی جب کوئی لڑکی میرا بازو پکڑنے کے بعد اتنی خوشی سے پکڑ لیا کا شور مچائے گی۔
"گویا آپ کی خوش فہمی کی بنیاد پر میری غلط فہمی پر ہے۔ میں تین مرتبہ سرو کے درخت کو بھی پکڑ کے یہی بات کہہ چکی ہوں۔"
"تین مرتبہ سرو اور چوتھی مرتبہ سرو قد، بالآخر آپ صحیح جگہ پہنچ ہی گئیں۔"
رخسانہ ہنستے ہوئے ان کے درمیان آگئی۔
"غلط فہمی تھی یا خوش فہمی۔ اب جنگ بند کرو۔" پھر وہ بچوں سے مخاطب ہوئی۔ "چلو بچوں کھیل ختم ہو گیا۔ اب بھاگ جاؤ یہاں سے۔"
"یہ شیراز ہے۔" بچوں کے جانے کے بعد رخسانہ نے تعارف کروایا۔ "اور رازی یہ میری بہت

اچھی سہیلی پارہ ہے۔''
بس تعارف کی دیر تھی اور ہم دونوں یوں بے تکلف ہوگئے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ گیلی گیلی گھاس پر بیٹھ کر ہم نے دنیا جہان کی باتیں کرڈالیں۔ رازی بہت دلچسپ شخص ثابت ہوا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی پڑھائی کا کیڑا اتنی دلچسپ باتیں بھی کرسکتا ہے۔
رازی کی شخصیت بہت مقناطیسی تھی۔ وہ اپنی وجاہت اور ذہانت سے ہر محفل میں فوراً ہی نمایاں ہوجاتا تھا۔ یہ اس کی شخصیت کا ہی کمال تھا کہ میں روز بروز اس کی جانب کھنچی جارہی تھی۔ رخسانہ کا اور میرا ایک دوسرے کے گھر بہت آنا جانا تھا۔ جب میں اس کے گھر جاتی تو رازی اپنی پڑھائی چھوڑ کر ہمارے پاس آجاتا اور اس کے بعد ہم کتنی دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ پکوڑے اور چپس کھاتے اور ان ڈور گیمز کھیلتے۔
ایسے ہی ایک دن جب ہم کیرم کھیل رہے تھے اور رازی نے ایک ہی بازی میں آدھے سے زیادہ بورڈ کا صفایا کردیا تھا۔ رخسانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
''میں اور پکوڑے لے آؤں۔ میرے آنے تک باری نہیں کرنی۔''
''آلو والے لانا۔'' میں نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ''پیاز والے نہ لانا۔''
''تم آلو پیاز چھوڑ کر ذرا میری طرف متوجہ ہوسکتی ہو؟'' شیراز نے اسٹرائیکر بورڈ پر رکھ دیا۔
''ہوگئی متوجہ کہو کیا کہنا ہے۔''
''مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔'' اس نے بہت اطمینان سے کہا۔
''کیا؟'' میں حیرت سے چلائی۔
''شی۔'' اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔
''کیا؟'' اب کے میں نے بہت آہستگی سے کہا۔
''تمہیں سنائی نہیں دیتا کیا؟ اظہار محبت سے پہلے مجھے تمہیں کسی اچھے سے ای این ٹی (E.N.T) اسپیشلسٹ کو دکھانا پڑے گا۔''
''سنائی تو دے رہا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آرہا۔ کیا تم واقعی وہی کہہ رہے ہو جو میں سن رہی ہوں؟''
''اگر تمہارے کان ٹھیک ہیں تو سو فیصد وہی کہہ رہا ہوں جو تم سن رہی ہو۔''
''کیا تم یہ بات بقائمی ہوش وحواس کہہ رہے ہو؟''
''ہاں، یہ حماقت مجھ سے بقائمی ہوش وحواس ہی سرزد ہورہی ہے۔''
''بعد میں مکر وگے تو نہیں؟''
''ارادہ تو نہیں ہے۔ Let's Hope So''
''سچی، رازی میں بھی یہی محسوس کررہی ہوں۔''
''کیا......؟''
''کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔''
''یہ حادثہ تمہارے ساتھ کب سرزد ہوا تھا؟''
''جس دن میں نے تمہیں پکڑ لیا تھا۔'' میں بولی۔ ''اور تم سے یہ حماقت کب سرزد ہوئی؟''
''جب کِکلی کلیر دی گاتے ہوئے کِکلی ڈال رہی تھیں۔''
''لیکن تب تو تم پڑھ رہے تھے۔ تم نے مجھے کہاں دیکھا تھا۔'' میں نے جرح شروع کی۔
''میں اس وقت پڑھ رہا تھا جب یہ بے ہنگم شور میرے کانوں میں پڑا تھا۔ سخت غصے میں جب میں تم لوگوں کو ڈانٹنے کے لیے اٹھا تو تم کِکلی ڈال رہی تھیں۔ اس موسم میں تمہارا آتشی گلابی سوٹ اور کھلے ہوئے بال، ایسا غضب ڈھا رہے تھے کہ میں تو دیکھتا ہی رہ گیا۔''
''اس دن میں نے آتشی گلابی کپڑے پہنے ہوئے تھے؟'' میں نے ذہن پر زور دیا۔
''تم بھول سکتی ہو لیکن میں نہیں بھول سکتا۔'' وہ میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔
''تو پھر اظہار میں اتنی دیر کیوں لگائی؟'' میں

نے شکایتی لہجے میں کہا۔
"میں نے سوچا تھا کہ جب تک مجھے یقین نہیں ہو جاتا کہ یہ کوئی وقتی جذبہ نہیں ہے تب تک میں اظہار نہیں کروں گا۔ میں ساتھ نبا ہنے کا قائل ہوں وقت گزاری کا نہیں۔"
"اور اب یقین آ گیا کہ یہ وقتی جذبہ نہیں ہے۔"
"ہاں اب پورا یقین آ گیا ہے۔" وہ مسکرایا۔ "اور جب تمہیں مجھ سے محبت ہوگئی تھی تو تم نے اب تک مجھے کیوں نہیں بتایا تھا؟"
"میں کیسے کہہ سکتی تھی۔" میں ہنسی۔ "اچھی لڑکیاں ایسا نہیں کرتیں۔"
"چلو ابھی اتنی دیر تو نہیں ہوئی۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔
اچانک دروازے کی جانب سے رخسانہ کے کھنکار کی آواز آئی۔ میں جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بالوں میں پھیرنے لگی۔ شیراز بھی ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا۔
"یہ آ گئے پکوڑے آلو والے۔" گو کہ رخسانہ نے ہمیں دیکھ لیا تھا لیکن اس نے یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔
"تھینک یو۔" میں نے خاصا اٹکتا ہوا کانپتا ہوا شکریہ ادا کیا۔
"چلو رازی، وہیں سے کھیل شروع کرو۔" اس نے پلیٹ قالین پر رکھ کر کہا۔
لیکن اس کے بعد کھیل بورڈ پر کم اور ہماری آنکھوں کے درمیان زیادہ ہوا۔ رخسانہ نے یہ سب کچھ محسوس کیا لیکن جان بوجھ کر انجان بنی رہی۔
گھر آ کر میں کتنی دیر سوچتی رہی۔ رخسانہ کے رویے نے مجھے شش و پنج میں مبتلا کر دیا تھا۔ معلوم نہیں اسے یہ بات اچھی لگی تھی یا بری۔ وہ خوشی کا اظہار کرتی یا غصے سے پھٹ پڑتی۔ میرا ذہن دونوں صورت حال کو آسانی سے قبول کر لیتا۔ لیکن اس کا یہ رویہ جس میں لاتعلقی، بے نیازی اور غیر جانبداری تھی، اس نے مجھے عجیب مخمصے میں ڈالا ہوا تھا۔
اور پھر شیراز کا لمس تھا جو بہت انوکھا اور سنسنی خیز تھا، اس کی باتیں تھیں۔ وہ بے حد وجیہہ شخص مجھ سے محبت کرنے لگا تھا۔ کتنا خوش گوار احساس تھا کہ جسے میں چاہتی تھی، دل ہی دل میں جس کے متعلق سوچتی تھی وہ بھی مجھے چاہتا تھا۔ اس نے بھی میری محبت ایک عرصے سے اپنے دل میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ بھی میرے متعلق سوچتا تھا۔
"ٹرن ٹرن" ٹیلی فون کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی مجھے سوچ کے دائرے سے باہر کھینچ لائی۔
"ہیلو۔" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔
"رازی بول رہا ہوں پارو۔"
"رازی۔" میں نے زیر لب کہا اور اپنے اردگرد کا جائزہ لیا لیکن کوئی بھی میری جانب متوجہ نہیں تھا۔
"ہاں کیسی ہو؟"
"ٹھیک ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔
"کیا کر رہی تھیں......؟"
"تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی......" میں نے کہا۔ "اور یہ بھی کہ......"
"کہ کیا......؟"
"کہ رخی کا رویہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ اس نے کوئی ردعمل نہیں دیا کچھ تو کہا ہوتا۔ میں بہت الجھن میں ہوں۔"
وہ زور سے ہنس پڑا۔
"میں نے تمہیں یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ وہ بہت سخت قسم کی جرح کر کے نکلی ہے ابھی کمرے سے۔"
"کیسی جرح؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔
"مجھ سے پوچھا جا رہا تھا کہ میں سچ مچ تم سے محبت کرتا ہوں؟ اگر کرتا ہوں تو کہیں تمہیں درمیان میں تو نہیں چھوڑ جاؤں گا وغیرہ۔"
"پھر کیا کہا تم نے؟"

”میں نے کہا کہ پارو کو چھوڑنے کا سوال ہی نہیں ہے مجھے اسے بھگانا پڑا تو یہ بھی کر گزروں گا۔“

”کچھ خدا کا خوف کرو۔“ میں نے جھرجھری لی۔ میرے لیے یہ بات ناقابلِ قبول اور ناممکن سی تھی۔

لیکن آج ناممکن، ممکن میں بدل رہا تھا۔ آج رات، ڈھائی بجے میں شیراز کے ساتھ اس کے بھروسے پر یہ گھر چھوڑ رہی تھی میں نے گھڑی کی سمت دیکھا۔ فاصلہ ہولے ہولے سمٹ رہا تھا چند قدم اور فقط پینتالیس منٹ۔

میں وقت گزاری کے لیے اپنے تاریک کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوگئی۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے کچھ کچے مکان نما جھونپڑے تھے۔ یہاں رہنے والے مرد مزدوری کرتے تھے یا پھر چارپائیوں پر پڑ کر سگریٹ کے کش لگاتے رہتے تھے۔ اور یہاں کی عورتیں محلے کے گھروں میں کام کرتی تھیں۔ یہ چند گھر میرے اوپر کی منزل پر واقع کمرے سے بالکل واضح طور پر دکھائی دیتے تھے۔ نہ صرف دکھائی دیتے تھے بلکہ وہاں کی جانب امی کی سرگوشی تک صاف سنائی دیتی تھی۔ کبھی ہماری کام والی کو تاخیر ہوجاتی تو امی میرے کمرے کی کھڑکی سے آواز دے کر بلالیتیں۔

کھڑکی سے دور تک نظر آتے کچے پکے سب گھروں میں تاریکی اور نیند کا خمار تھا۔ فقط دو گھروں میں چہل پہل تھی۔ ہماری جمعدارنی جسے ہم ماسی کہتے تھے اور گھر کے دیگر کام کاج کرنے والی چھیماں، ان دونوں کے گھروں میں رت جگا تھا۔

ماسی بان کی چارپائی پر پڑی کھانس رہی تھی اور اس کی بیٹی رانی پریشانی کے عالم میں بے کواڑ کے کمرے کے اندر باہر ہو رہی تھی۔ کبھی ماں کے پاس اندر جاتی اور کبھی باہر صحن میں نکل آتی۔ کمرے میں ماسی کے سر کے عین اوپر زرد روشنی پھیلاتا ایک بلب لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے کمرے کے اندر تک کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”رانی!“ ماسی نے آواز دی۔

اور رانی جو صحن میں کھڑی ہوئی تھی جلدی سے اندر کی جانب لپکی۔

”کیا ہوا اماں؟“

”بار بار حلق خشک ہو رہا ہے، ذرا پانی تو پلانا۔“

رانی نے گھڑے سے پانی نکال کر ماسی کو تھما دیا۔

”میری تو پسلیاں بھی دکھ گئی ہیں کھانستے کھانستے۔“ اس نے پانی پی کر خالی گلاس رانی کی طرف بڑھا دیا۔

”اماں، اب سونے کی کوشش کرو۔“

”کوشش تو کر رہی ہوں مگر کمبخت نیند بالکل ہی آنکھوں سے غائب ہے۔“ تمہارے ابا کی فکر لگی ہوئی ہے، نیند کہاں آئے گی۔“

”ابا کی فکر کی ضرورت نہیں۔ وکیل صاحب نے کہا تو ہے کہ ان کا کوئی قصور نہیں کل تک وہ ابا کو لے آئیں گے۔“

”کوئی قصور بھی تو نہیں تھا ان کا خواہ مخواہ دھر لیا پولیس والوں نے۔ جھگڑا تھا کسی اور کا اور پولیس پکڑ کر لے گئی راہگیروں کو۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں اماں کہ کل تک ابا گھر واپس آجائے گا۔ ابا کا قصور ہوتا تو پولیس چھوڑتی بھلا۔ انہیں بند کر کے کیا کرنا ہے پولیس کو۔ تم بس سونے کی کوشش کرو۔“

ماں کو تسلی دے کر وہ صحن میں نکل آئی۔ بیرونی دروازے کی کنڈی کھول کر باہر جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے بند کر کے کنڈی لگالی اور واپس آگئی۔

”کیا اسے بھی کسی کا انتظار ہے؟“ میں نے سوچا۔

وہ مضطرب انداز میں پہلے کی طرح کمرے اور صحن کے درمیان ٹہلنے لگی۔

رانی کی طرف سے میری توجہ چھیماں کے

رونے کی آواز نے ہٹائی۔ اس کا دو مہینے کا بیٹا بیمار تھا۔ آج صبح ہی اس نے امی سے ذکر کیا تھا اور اسی لیے تھوڑی ہی دیر میں واپس چلی گئی تھی۔

''میرا منا میرا سب کچھ ہے۔'' وہ رو رہی تھی۔ ''اسے کچھ ہو گیا تو منے کے ابا تم مجھ مری کا منہ دیکھو گے۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو۔'' اس کا میاں تڑپ کر بولا۔ ''اسے کچھ ہوگا نہ تمہیں۔''

''تو یہاں کیوں بیٹھے ہو، دوا دارو کیوں نہیں کرتے؟''

''گیا تو تھا تمہارے سامنے ہی لیکن اتنی رات کو ڈاکٹر مل ہی نہیں رہا۔ کوئی مل جائے تو یہاں آنے پر تیار نہیں ہوتا۔''

''تو میں ساتھ چلتی ہوں تمہارے، کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی خدا ترس ڈاکٹر مل ہی جائے گا۔''

''میرے پاس صرف بیس روپے ہیں۔'' چھیماں کے میاں نے جیسے اعتراف جرم کیا۔

''ہائے یہ غریبی۔'' چھیماں کی آواز بلند ہوگئی۔ ''میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو میں ان سب محل نما کوٹھیوں کو آگ لگادوں گی۔ سب کو ختم کردوں گی۔'' وہ دیوانہ وار اپنے بیٹے کو چومنے لگی۔ پھر سر اٹھا کر بولی۔ ''چلو منے کے ابا۔ باہر نکلیں گے تو شاید کچھ سبب بن جائے۔ گھر میں تو ساری رات روتے پیٹتے ہی گزر جائے گی۔''

اس نے بیٹے کو گود میں اٹھایا اور چپل پہن کر اپنے میاں کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئی۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ ماں باپ کی محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ امی بتایا کرتی تھیں کہ بچپن میں ایک مرتبہ آدھی رات کو میرے کان میں شدید درد ہوگیا۔ پہلے تو امی نے چند گھریلو نسخے آزمائے، لیکن جب میرے رونے کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا تو امی ابو ٹیکسی پکڑ کر پورے شہر میں ڈاکٹر کی تلاش میں مارا ماری کرتے رہے۔ ابو کو مجھ سے اتنی محبت تھی کہ جب میرا رونا کسی طرح نہ تھما تو وہ بھی رونے لگے۔

اور پھر ایک مرتبہ میں نے اسکول کے ڈرامے میں حصہ لیا۔ ڈرامے کے آخر میں مجھے مرجانا تھا۔ میں اپنے کمرے ریہرسل کررہی تھی۔ ڈائیلاگ بولتے ہوئے جب میں پٹ سے نیچے گری تو اتفاق سے اسی وقت کمرے کے باہر سے امی گزر رہی تھیں۔ مجھے گرتے دیکھ کر بھاگی بھاگی کمرے میں آئیں۔

''پارو! کیا ہوا ہے؟'' انہوں نے پریشان کن انداز میں پوچھا۔

''کچھ امی کو تنگ کرنے کی خاطر اور کچھ اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا امتحان کے لیے میں نے اپنے حلق سے چند بے معنی قسم کی آوازیں نکالیں جیسے نزع کے عالم میں ہوں اور پھر سر کو ایک جانب گرادیا۔''

''ہائے میری پارو کو کیا ہوگیا۔'' امی پچھاڑیں کھانے لگیں۔ سارا گھر جمع ہوگیا۔

اس گھبراہٹ اور پریشانی میں کسی کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ میری نبض دیکھ لے۔ بھائی نے جلدی سے کار باہر نکالی تاکہ مجھے اسپتال لے جایا جاسکے۔ جب میں نے دیکھا کہ اب سب کی پریشانی عروج پر پہنچ چکی ہے اور امی بے ہوش ہونے والی ہیں تو ڈرامہ ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''امی! میں پھر سے زندہ ہوسکتی ہوں۔ اگر آپ مجھے مزیدار سی کھیر کھلانے کا وعدہ کریں تو۔'' میں نے ایک آنکھ کھول کر کہا۔ میری چہکتی ہوئی آواز سن کر ایک لمحے کے لیے تو خاموشی چھاگئی اور پھر......

''میں سوچتے سوچتے ہنس پڑی۔

''امی نے ایک کالا بکرا منگوا کر میرے نام کا صدقہ دیا تھا اور بہت سختی سے یہ احکام بھی صادر کردیے تھے کہ میں نے آئندہ ایسی بے ہودہ حرکت کی تو میری خیر نہیں۔ اور ڈرامہ! ایسے ڈرامے میں حصہ لینے کا تو سوال ہی نہیں تھا جس کے آخر میں مجھے مرنے کا سین ادا کرنا ہوگا۔

بعد میں بھی میں کبھی کبھار ہنستی تھی۔ ''اگر میں سچ مچ مرگئی ہوتی تو آپ اسی طرح روتیں اور جواب میں مجھے ڈھیروں جھڑکیاں سننا پڑتی تھیں۔

پھر پتا نہیں اب کیا ہوا تھا انہیں۔

جب سے ڈاکٹر اسد کا رشتہ آیا تھا امی ابو میری کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں تھے۔ میں نے کتنی مرتبہ ان سے بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پہلے تو ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا میری بات سننے کے لیے۔ صبح کالج جانے سے پہلے ابو کو پکڑا لیکن اس دن انہیں آفس سے دیر ہو رہی تھی۔ شام کو امی سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کچن میں پسینے سے تر بتر پہلے ہی بیزار کھڑی تھیں۔

''کوئی وقت تو دیکھ لیا کرو پارو۔'' وہ پسینہ پونچھ کر پریشر ککر میں چمچ چلانے لگیں۔ ''اتنی گرمی میں کیوں سر پر سوار ہوگئی ہو۔''

''امی! مجھے بہت ضروری بات کرنا ہے۔''

''مجھے بھی بہت ضروری کھانا پکانا ہے آج ڈاکٹر اسد کے گھر والے ڈنر پر آرہے ہیں۔''

''لیکن امی مجھے نہیں کرنا شادی۔''

''اچھا اس وقت تو میرے سر سے اترو، بعد میں دیکھ لیں گے کہ شادی کرنا ہے یا نہیں۔''

''میں مایوس ہو کر بھائی کے پاس گئی۔ وہی امید کی آخری کرن تھے لیکن ان کے کمرے میں ان کے تین دوست بیٹھے ہوئے تھے۔

رات کو ڈاکٹر اسد کی امی ابو اور بہنیں آئیں لیکن میری ان سے بہت سرسری سی ملاقات ہوئی۔ اس چار پانچ منٹ کی ملاقات میں، میں نے بہت سرد مہری کا مظاہرہ کیا لیکن اسے انہوں نے میری شرم و حیا سمجھا۔ میں انہیں پسند آئی تھی۔ امی یہ خبر سنانے کے لیے میرے پاس آئیں۔

''اب جلد ہی تمہاری منگنی کردیں گے۔''

''لیکن امی میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے...... شادی نہیں کرنا۔''

''الٹی سیدھی باتیں کرنے میں تو تمہارا جواب نہیں ہے پارو، مجھے تمہاری یہ حرکتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔''

''یہ آپ کو الٹی سیدھی بات لگتی ہے؟''

''کیوں نہیں کرنا تم کو شادی۔''

''مجھے آپ کا وہ ڈاکٹر اسد بالکل پسند نہیں۔''

''کیا ہے اسے، کیوں پسند نہیں ہے وہ؟ کیا اس کے سینگ ہیں یا ہاتھی جتنے لمبے کان ہیں۔'' امی نے غصے سے ڈپٹا۔ ''ہم نے انہیں ہاں کہہ دی ہے۔''

''مجھ سے پوچھے بغیر آپ کو یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا ناں۔''

''یعنی اب کوئی کام کرنے سے پہلے مجھے آپ سے اجازت لینا ہوگی۔''

''میں یہ تو نہیں کہہ رہی امی۔'' میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''لیکن میری اپنی شادی کے سلسلے میں آپ کو مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا ناں۔''

''مجھے معلوم ہے پارو کہ تمہارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔ اور میں تمہارے بارے میں جو بھی فیصلہ کروں گی تمہاری بہتری اور بھلائی سامنے رکھتے ہوئے ہی کروں گی۔''

''امی! اگر آپ کو میری بھلائی کا خیال ہے تو کیا مجھے خود اپنی بھلائی کا خیال نہیں ہوگا؟'' میں نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ ''میں بھی اپنے بارے میں سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کروں گی۔''

''کیا چاہتی ہو تم، میں انہیں انکار کردوں۔ اپنی زبان سے پھر جاؤں۔ شریفوں کے گھروں میں ایسا نہیں ہوا کرتا۔'' امی کا انداز فیصلہ کن تھا۔

''ایسا نہیں ہوتا لیکن ایسا تو ہوتا ہے کہ بیٹیوں سے ان کی شادی کے سلسلے میں پوچھ لیا جائے۔'' میں چڑ گئی تھی۔ شیراز سے جدائی کا تصور ہی میرے لیے روح فرسا تھا۔

''تمہارے انکار کی کوئی ٹھوس وجہ بھی ہے یا یوں ہی نخرے کر رہی ہو بس۔''

''اب وقت آگیا تھا کہ میں امی کو شیراز کے متعلق بتا دیتی۔

''جی۔'' میں ناخنوں سے نیل پالش کھرچنے لگی۔

''سیدھی بات کرو تمہارے، ''جی'' سے میں کیا

سمجھوں۔"

"امی، میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔"

امی کے لیے میرا یہ انکشاف کسی بم کے دھماکے سے کم نہیں تھا۔

"کیا؟ کیا کہہ رہی ہو؟" انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

"جی امی، میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔ اس لیے یہاں شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"تمہیں پتا ہے پارو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" وہ بے یقینی سے بولیں۔

"جی۔"

"کون ہے وہ؟" امی کے لہجے میں سختی تھی۔

"شیراز۔" میں نے مختصراً کہا۔

"کون شیراز؟ وہی رخسانہ کا بھائی؟"

"جی امی۔"

گھر میں...... سب کے لیے یہ خبر بم دھماکا ثابت ہوئی تھی۔ امی اور ابو ایک دم شیراز کے خلاف ہوگئے تھے جو ان کی بھولی بھالی پارو سے ناٹک کررہا تھا۔ میں نے شیراز کی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا بھی کچھ فائدہ نہیں ہوا بلکہ اس پر آیا ہوا تمام غصہ بھی انہوں نے مجھ پر نکالا۔

دو دن تک میں اپنے کمرے میں بند روتی رہی۔ امی، ابو اور بھائی نے پوری کوشش کرلی کہ میں کچھ کھا پی لوں لیکن شیراز سے جدائی کا تصور کرتے ہی میری ساری بھوک پیاس اڑ چکی تھی۔ ان دونوں ایک بھائی ہی تھے جو مجھے سے پیار سے سمجھاتے لیکن امی ابو نے پیار سے لے کر ڈانٹ ڈپٹ تک ہر حربہ آزما ڈالا۔

"کیوں ڈانٹتے ہیں آپ لوگ اسے؟" بھائی کی دبی دبی سی آواز مجھے کمرے کے باہر سے سنائی دی تھی۔

"اس کے سر پر شیراز کا جو بھوت سوار ہے وہ ایسے نہیں اترے گا۔" امی کی غصے میں بھری آواز آئی۔

"امی! آپ لوگوں کا طریقہ کار غلط ہے۔ پہلے ہی ہم سے ایک غلطی ہوچکی ہے کہ ہم نے شادی کے سلسلے میں پارو سے پوچھا تک نہیں۔" بھائی نے کہا۔ "اس طرح وہ ضد پکڑ لے گی اور بات مزید بگڑے گی۔"

"تم اسے اور شہ مت دو میں تو اسے سمجھاتے سمجھاتے پاگل ہوگئی ہوں لیکن وہ تو کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کس زبان میں سمجھے گی۔ اب ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے کہ جلد از جلد اس کی منگنی اور پھر شادی کردی جائے۔"

"لو یہ الزام بھی میرے سر۔" میں نے غصے سے سوچا۔ "کسی نے میری بات سمجھنے کی تو کجا سننے کی بھی زحمت نہیں کی۔ شیراز کا نام میرے ہونٹوں پہ آتا ہی ہے کہ سب بپھر جاتے ہیں میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب میری بات کس زبان میں سنیں گے۔"

اور پھر اس دن تو حد ہی ہوگئی۔ شیراز کو خبر ہوئی تو اس نے اپنے امی ابو کو ساری بات بتا کر میرے لیے پروپوزل لے جانے پر آمادہ کیا۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا اس کی امی نے ہمارے گھر آنے کے لیے ٹائم سیٹ کرنے کی غرض سے فون کیا لیکن امی نے خاصی رکھائی اور سرد مہری سے انہیں گھر آنے سے منع کردیا۔

"اب آپ کو یقین آجانا چاہیے تھا کہ شیراز ناٹک نہیں کررہا بلکہ سنجیدہ ہے۔" میں آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

"اب تمہاری زبان پر اس لڑکے کا نام آیا تو میں تمہاری زبان کاٹ دوں گی۔ اور کان کھول کر سن لو۔ اس مہینے کی پہلی تاریخ کو تمہاری منگنی ہے اس سے۔" وہ غصے سے پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

اب اس کے علاوہ کیا چارۂ کار تھا کہ میں اور شیراز کورٹ میرج کرلیں۔ یہ پروگرام ہم نے رات دو بجے فون پر طے کیا تھا جب اٹھائیس کی رات کو شیراز نے کہا تھا۔ "یہ کنفرم ہے۔"

"ہاں۔" میں بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

اس طرح گھر کی دہلیز عبور کرنا میرے لیے

بہت تکلیف دہ تھا۔ امی ابو اور بھائی کو یوں چھوڑ کر جانا میرے دل کو کاٹ رہا تھا لیکن کیا کرتی، وہ تو میری کوئی بات سننے تک پر تیار نہیں تھے۔

اور آج اٹھائیس کی رات تھی شیراز کے آنے میں صرف پچیس منٹ باقی تھے اور گھڑی کی سوئی ہر سیکنڈ کے حساب سے آگے بڑھ رہی تھی۔

وقت گزاری کے لیے میں نے ماسی کے جھونپڑے نما کچے مکان کی طرف دیکھا۔ لگتا تھا کہ ماسی سو چکی ہے۔ رانی بہت احتیاط سے کمرے سے باہر نکلی اور صحن کے تاریک کونے کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ روشنی میں آئی تو اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی پوٹلی تھی۔ ابھی وہ دبے قدموں بیرونی دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی کہ ماسی کو ایک مرتبہ پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔

''رانی۔'' اندر سے ماسی کی آواز آئی۔

رانی نے پوٹلی وہیں دروازے کے قریب تاریکی میں رکھا اور اندر کمرے کی جانب بڑھی۔

''پانی۔'' ماسی کے حلق سے کراہ کی صورت میں نکلا۔

رانی نے گھڑے سے گلاس میں پانی نکال اور ماسی کو پلانے لگی۔

''اماں، اب سو جاؤ ناں۔''

''سونے کی کوشش تو کر رہی ہوں لیکن دل بہت بے چین ہے۔'' ماسی بولی۔ ''دعا کر آج رات خیریت سے گزر جائے۔''

''کیوں نہیں اماں، تم سو جاؤ گی تو پتا بھی نہیں چلے گا کہ کب رات شروع ہوئی اور کب ختم۔''

''ماسی نے رانی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر نیچے کیا اور پھر اسے ماتھے پر پیار کر کے بولی۔'' میری وجہ سے تجھے بھی آرام نہیں۔ آج رات تو نہ ہوتی تو مجھے پانی کون پلاتا۔ میں تو مر گئی ہوتی کب کی۔ اسی دن کے لیے لوگ اولاد کی دعا کرتے ہیں۔ رانی میں نے آج رات تجھے بہت تنگ کیا ہے لیکن کیا کروں مجھے لگ رہا ہے جیسے کوئی میرے کلیجے پر چھریاں چلا رہا ہو۔ بس آج رات خیریت سے گزر جائے۔''

''اماں! تم سونے کی کوشش کرو۔''

''اچانک سائیکل کی گھنٹی بجنے لگی۔

''ٹن ٹن، ٹن ٹن۔''

رات کے سناٹے میں یہ آواز بہت واضح تھی۔ میری نگاہ آواز کی سمت چلی گئی۔ لیمپ پوسٹ کے نیچے ایک نوجوان سائیکل لیے کھڑا تھا۔

''ہوں۔'' رانی کی بے چینی کا سبب اب میری سمجھ میں آیا تھا۔ وہ بھی اسی کشتی میں سوار ہونے جا رہی تھی جس کشتی میں مجھے سوار ہونا تھا۔

''اماں! آنکھیں بند کرو گی تو خود ہی نیند آ جائے گی۔'' رانی اسے ویسے ہی تھپکنے لگی جیسے کسی چھوٹے بچے کو تھپکا جاتا ہے۔ وہ ماں کو تھپک کر سلانے کی کوشش کرتی رہی اور لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑا نوجوان اس کا انتظار کرتا رہا۔

اسی وقت چھیماں اور اس کا میاں لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑے نوجوان کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنے پکے گھر میں داخل ہوئے۔

''شکر ہے مولا۔ میں ساری زندگی اس ڈاکٹر کو دعائیں دوں گی جس نے میرے منے کو نئی زندگی دی ہے۔'' وہ صحن میں رکھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ''دیکھو اب تاپ کچھ کم لگ رہا ہے۔''

''ہاں۔'' اس کے میاں نے بھی اس کا ماتھا چھو کر اقرار میں سر ہلایا۔ پھر وہ قدرے توقف سے بولا۔ ''چھیماں''

''کیا ہے؟''

''جب ہم بوڑھے ہو جائیں گے اور ہمارا منا جوان ہو جائے گا تب کیا وہ بھی ہمارے بیمار ہونے پر ایسے ہی راتیں جاگ کر گزارے گا؟ ہم سے ایسے ہی محبت کرے گا جیسے ہم اس سے کرتے ہیں۔''

چھیماں ہولے سے ہنس پڑی۔ ''منے کے ابا تم بھی کمال باتیں کرتے ہو۔ کبھی ندی کا پانی بھی واپس آیا ہے۔ پانی تو بس آگے بہتا ہے۔ جیسے ہم اس سے محبت کرتے ہیں ویسے یہ اپنے بیٹے سے کرے گا اور

اس کا بیٹا اپنے بیٹے سے۔ ماں باپ کا کام محبت دینا ہے وہ دیتے ہیں۔ اولاد کا کام محبت لینا ہے وہ لیتی ہے۔ منا بھی اپنے حصے کی محبت ہم سے لے کر اپنی اولاد میں بانٹے گا۔ ہم یوں ہی خالی رہ جائیں گے۔ کبھی پانی بھی الٹا چلا ہے۔"

وہ دونوں خاموش ہوگئے۔ اب ہر طرف سناٹا تھا لیکن یہ سناٹا کتنا متکلم تھا۔

"آج رات تو نہ ہوتی تو مجھے پانی کون پلاتا؟" ماسی کی آواز سناٹے کو چیر رہی تھی۔

اسی دن کے لیے لوگ اولاد کی دعا کرتے ہیں۔"

چھیماں کی آواز باز گشت بن کر سناٹے سے ٹکرا رہی تھی۔

"ہم یوں ہی خالی رہ جائیں گے۔ کبھی پانی بھی الٹا چلا ہے۔"

ماسی کو کچھ آرام ہوا تو رانی ایک مرتبہ پھر دروازے کی طرف لپکی۔ دروازے کی کنڈی کھول کر وہ باہر نکلنا چاہتی تھی کہ ماسی نے آواز دی۔

"رانی......!"

رانی وہیں ٹھٹک گئی۔

"رانی کنڈی کس کے لیے کھولی ہے کیا ابا آیا ہے؟" وہ چپکی کھڑی رہی۔

"رانی......" ماسی چلائی۔ "رانی......"

"رانی نے ایک نظر مڑ کر کمرے کیا ندر لیٹی ہوئی ماں کو دیکھا اور پھر دراوزے سے باہر نکل گئی۔

ماسی مسلسل رانی کو پکار رہی تھی لیکن رات کی تاریکی نے اس کی رانی کو نگل لیا تھا۔ رانی کو پکارتے ماسی کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

"پانی۔" وہ کراہی۔ "رانی کہاں چلی گئی۔ کوئی ہے؟ پانی۔"

"لیکن اس ایک کمرے کے کچے سے گھر میں اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ رانی کے چلے جانے سے وہ ایک دم کتنی تنہا ہوگئی تھی۔ اسے پانی پلانے والا بھی کوئی نہیں تھا اور وہ مسلسل کھانس رہی تھی۔

"ہم یوں ہی خالی رہ جائیں گے۔ کبھی پانی بھی الٹا چلا ہے۔" چھیماں کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

ماسی کی کھانسی اور پانی پانی کی صدا سے میری توجہ اس وقت ہٹی جب شیراز کی بائیک سڑک پر مڑی۔ تھوڑی دیر میں اس کی بائیک پیپل کے درخت کے نیچے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ وہیں بائیک پر بیٹھا ہوا لیمپ پوسٹ میں لگے بلب سے نکلنے والی دھندلی روشنی میں کسی ہیولے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس نے تین مرتبہ ہیڈ لائٹ جلا بجھا کر مجھے نیچے آنے کا اشارہ دیا۔

میں نے ایک نظر کمرے کے در و دیوار پر ڈالی۔ میرا دل بھر آگیا۔ اس کمرے سے میری کتنی یادیں وابستہ تھیں۔ جہاں میں نے اپنے بچپن کے معصوم دن ہنستے روتے، شرارتیں کرتے گزارے تھے۔ میٹرک کے امتحان کی تیاری اسی کرسی پر بیٹھ کر کی تھی اور ایف، ایس سی کے دو سال بھی اس کرسی پر اور کبھی بستر میں دبک کر پڑھتے ہوئے گزارے تھے۔ یہیں ڈرامے کی ریہرسل کرتے ہوئے میں نے امی کو ڈرایا تھا اور امی میری خاطر دھاڑیں مار مار کر روئی تھیں۔ یہیں میں نے شیراز کے لیے خواب دیکھنا شروع کیے تھے اور یہیں اس کے لیے کتنے دن روتے ہوئے گزارے تھے۔

میں نے ایک اور الوداعی نگاہ اپنے کمرے کے در و دیوار پر ڈالی اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔ سیڑھیاں اتر کر میں نے جلدی سے صدر دروازے کی کنڈی کھولی ہی تھی کہ ماسی کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔

"آج رات تو نہ ہوتی تو مجھے پانی کون پلاتا۔ میں تو کب کی مرگئی ہوتی۔ اسی دن کے لیے تو لوگ اولاد کی دعا کرتے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے کوئی میرے کلیجے پر چھریاں چلا رہا ہے بس آج رات خیریت سے گزر جائے۔"

اور پھر ٹن ٹن کرتی گھنٹی نے اسی سے اس کی ساری کائنات چھین لی تھی۔ ماسی کی کھانسی، اس کی کراہیں، بیٹی کے لیے اس کی پکار، سب کچھ بے معنی ہوگیا تھا۔ وہ پیاسی تھی اور شاید ''ہم یوں ہی خالی رہ جائیں گے۔ کبھی پانی بھی الٹا چلا ہے۔'' چھیماں کی مدھم سی ہنسی کی بازگشت مجھے سنائی دی۔

''نہیں۔'' میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔
میں نے اپنے کان بند کرلیے لیکن یہ سب آوازیں میرا تعاقب کررہی تھیں ان آوازوں کے درمیان سائیکل کی گھنٹی ٹن ٹنا رہی تھی۔ بائیک کی ہیڈ لائٹس جل بجھ رہی تھیں۔

''پارو کو چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ مجھے اسے بھگانا پڑا ناں تو یہ بھی کرگزروں گا۔'' شیراز مجھ سے کہہ رہا تھا۔

''آجاؤ، آجاؤ۔'' سائیکل کی گھنٹی ٹن ٹن کررہی تھی۔ جلتی بجھتی ہیڈ لائٹس مجھے اپنے جانب بلا رہی تھیں۔

میں نے قدم آگے بڑھایا۔

''ہاں، ہم یوں ہی خالی رہ جائیں گے۔ پانی بھی کبھی الٹا چلا ہے۔''

میں سراسیمہ ہوگئی۔ یہ مایوسی چھیماں کی آواز کی نہیں اماں کی آواز کی تھی۔ میری ماں کی آواز کی، رانی کی ماں کی آواز کی منے کی ماں کی آواز کی، کائنات کی سب ماؤں کی آواز کی۔

میرا بڑھتا قدم پیچھے ہٹ گیا۔ آنسو بھری آنکھوں سے میں نے کھلے دروازے سے دکھائی دیتے شیراز کی جانب دیکھا جو میرا انتظار کررہا تھا اور پھر دروازہ بند کرکے کنڈی لگالی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے لیمپ جلایا۔ میز کی دراز سے کاغذ نکالا اور جلدی جلدی لکھنے لگی۔

''سیدھے راستے سے دن کی روشنی میں آؤ۔''

''پارو میری جان۔'' امی کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں ان کی پائنتی پر سر ٹکائے سوئی ہوئی تھی۔ ان کے پاؤں پر سر رکھ کر روتے روتے پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''امی! میں رو پڑی۔

''نہیں، روتے نہیں ہیں۔'' انہوں نے مجھے چمکارا۔

''امی! رانی ماسی کو اکیلا چھوڑ کر اس سائیکل والے کے ساتھ چلی گئیں۔''

''ہاں مجھے ابھی ہی پتا چلا ہے لیکن تم مت رو۔'' امی نے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''ماسی نے اسے کتنی آوازیں دیں۔ کتنا پکارا لیکن وہ پانی پلانے کے لیے بھی نہیں رکی۔'' میں جنون کے عالم میں روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اگر کل رات میں بھی شیراز کے ساتھ چلی جاتی تو شاید پھر کبھی اس گھر کو نہ دیکھ سکتی۔ کبھی آپ کو پانی نہ پلا سکتی۔ کبھی راتوں کو آپ کے لیے نہ جاگ سکتی جیسے آپ میری خاطر جاگی تھیں۔''

''پارو......!'' امی گنگ ہوکر میری صورت دیکھنے لگی۔

''شکر ہے میں نے یہ حماقت نہیں کی امی۔ میں ایسے کیسے جاسکتی تھی۔'' میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور روئے گئی۔

''امی!'' میرے قریب ہی بھائی کی آواز آئی جنہیں میں نے اب تک وہاں کھڑے دیکھا ہی نہیں تھا۔ ''اس کا دماغ درست ہوگیا ہے، اب آپ لوگ بھی ضد چھوڑ دیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسد برا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ آپ شیراز سے مل تو لیں۔ شادی تو ہمیں پارو کی کرنا ہی ہے، کیا یہ بہت نہیں کہ اگر شیراز اچھا ہو تو ہم اس کی شادی اسی کردیں۔ رانی ماسی کو چھوڑ کر چلی گئی لیکن اس نے اس گھر کی عزت رکھی ہے۔ آپ بھی اس کا مان رکھ لیں۔

امی کچھ دیر تک مجھے دیکھتی رہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ مجھے خود سے لپٹا لیا۔ میرے دل میں اندر تک سکون اتر گیا۔

☆☆

میرے خواب لے گیا

رعنا فاروقی

مرد فطرتاً ہرجائی ہوتا ہے۔ پہلے وہ کسی ایک عورت پر لفظوں کا جال پھینکتا ہے۔ جب وہ حاصل ہوجاتی ہے تو پھر وہ نئے جہاں تسخیر کرنے نکل جاتا ہے۔ قربتوں اور فاصلوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہوگئی تھی۔

صبح وصال کے ماروں کا فسانہ، برق جس آشیانے پر گری اسے بنانے میں ایک زمانہ لگا تھا

فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد میرے میاں اپنے آبائی پیشے زمینداری کی طرف مائل ہوگئے۔ کچھ زمینیں انھیں انہیں اپنے والد سے ترکے میں ملی تھیں اور کچھ انہوں نے خود خریدیں۔ جفاکش وہ شروع ہی سے تھے۔ جلد اس پیشے میں مہارت حاصل کرلی وہ مصر تھے کہ ہم سب دیہات میں اپنی رہائش گاہ بنائیں۔ لیکن میرا جی گاؤں میں نہیں لگتا تھا۔ چھ بچے تھے، چار لڑکیاں اور دو لڑکے سب ماشاء اللہ کالجوں میں زیر تعلیم تھے انہیں ہوٹلوں میں داخل کر کے خود دیہات کی کسی حویلی میں قید ہوجانا مجھے پسند نہیں تھا۔

میرا احمر (شوہر) سے کبھی شدید اختلاف نہیں ہوا۔ چھوٹے موٹے اختلافات تو ازدواجی زندگی میں ناگزیر ہیں لیکن جہاں تک میری اور احمر کی ذہنی ہم آہنگی کا تعلق تھا مجھے فخر رہا کہ جو وہ سوچتے تھے میں خود بخود سمجھ جاتی تھی۔ ان سے مجھے محبت تھی لہذا خدمت میں بھی مزا آتا تھا۔ احمر بھی مجھے بے پناہ چاہتے تھے۔ شادی سے پہلے ہم دونوں کا چھوٹا موٹا رومانس بھی چلا تھا۔ میں ان کے والد کے دوست کی بیٹی تھی۔ دور کی رشتے داری بھی تھی۔ گھر پاس پاس تھے۔ احمر، علی گڑھ میں پڑھتے تھے اس زمانے میں جو لڑکا علی گڑھ میں پڑھتا تھا وہ گھر بیٹھی لڑکیوں کا آئیڈیل ہوتا تھا۔ وہ چھٹیاں گزارنے گھر آتے اور میں انہیں مزے مزے کی چیزیں بنا کر بھیجا کرتی۔ جواب میں وہ دو چار کتابیں مجازیا شکیل کے تازہ اشعار بھیج دیا کرتے۔ سالوں ہم دونوں اس آتش عشق میں سلگتے رہے تب ہم دونوں کے والدین کو خبر ہوئی۔ دونوں شرفا کے گھرانے تھے کسی بدمزگی کے بغیر ہماری شادی کی بات طے ہوگئی۔ احمر کو فوج میں کمیشن مل گیا۔ جانے سے پہلے ہماری شادی ہوگئی۔ اپنے بیاہ کا پس منظر مختصراً اس لیے بتا رہی ہوں کہ آپ ہماری خوشگوار ازدواجی زندگی کا پورا تصور ذہن میں محفوظ کرلیں، میں انہیں جی جان سے چاہتی تھی اور وہ مجھے ہر ممکن طور پر خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ہم لوگ کراچی منتقل ہوگئے۔ میرے سسرال والے پنجاب میں رہائش پذیر ہوئے کیوں کہ وہ زمینداری سے تعلق رکھتے تھے۔ ملازمت کے دوران میں مختلف جگہوں پر اپنے شوہر کے ساتھ رہی لیکن گھر کراچی میں ہی بنوایا



تھا۔ جو کرائے پر چڑھا رہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے خیر پور میں زمینیں خریدیں اور مصر تھے کہ ہم بھی زمینوں پر رہیں۔ اس معاملے پر میرا ان سے پہلی بار اختلاف ہوگیا۔ میرے پانچوں بچوں کی خواہش تھی کہ ہم کراچی رہیں گے۔ کچھ دن میرے میاں جی کا منہ پھولا رہا۔ بچوں نے باقاعدہ بحث کی تب وہ راضی ہوئے، کراچی کا مکان نوٹس دے کر خالی کرالیا اور ہم ناظم آباد میں منتقل ہوگئے۔ احمر نے زمینوں کے ساتھ ساتھ ٹریکٹر کے پرزوں کا بزنس بھی شروع کردیا۔ کام میں برکت ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم لاکھوں میں کھیلنے لگے۔ میرے پڑوسی اپنا مکان بیچ رہے تھے۔ ہم نے اسے خریدلیا و نئی طرز کی کوٹھی تعمیر کی جس میں دو سرونٹ کوارٹرز بھی رکھے۔ دالان اور ہائی کمرا مغل طرز پر بنایا گیا۔ لان، میری بڑی بیٹی سیماں نے اپنے دوستوں سے مشورہ لے کر بنوایا۔ جب ہر طرح سے یہ قابل فخر ہوگیا تو پہلی دفعہ ہم نے محفل موسیقی کا اہتمام کیا۔ خاندان کے سب لوگوں اور احباب کو مدعو کیا گیا۔ یہ تقریب اتنی بھرپور اور شاندار رہی کہ مدتوں ملنے جلنے والوں میں اس کے تذکرے رہے۔

میرے شوہر نے فیصلہ کیا کہ مہینے میں ایک دفعہ ایسے اجتماع ضرور ہوا کریں گے تاکہ تفریح اور میل ملاقات کا شغل جاری رہے۔ ایسی محفلوں میں میری حیثیت مہارانیوں جیسی ہوتی تھی۔ میری بیٹیاں شہزادیوں جیسی سج دھج سے مہمانوں کو خوش آمدید کہتیں۔ یہ تقاریب مختلف نوعیت کی ہوتی تھیں، کبھی محفل میلاد کی صورت میں، کبھی رنگارنگ

پروگرام کی شکل میں۔ میرا مقصد تو اپنے ملنے جلنے والوں کو تفریح مہیا کرنا یا ان سے میل ملاپ بڑھانا تھا۔ اللہ میاں نے پیسہ خوب دیا تھا، شوہر فرماں بردار تھا، اولاد ہونہار تھی اس کا شکر ادا کرنے کے لیے میلاد یا قرآن خوانی ہر اتوار کو صبح کرانی۔ احمر میرے مشاغل کو دل سے پسند کرتے تھے۔ وہ پندرہ دن خیر پور میں گزارتے تھے اور پندرہ دن ہمارے ساتھ، زندگی بڑی سبک رفتاری سے رواں تھی۔

ایک روز میں نے لنگر کا اہتمام کیا۔ میری بیٹی سیما نے میٹرک میں فرسٹ پوزیشن لی تھی۔ اس خوشی میں، میں نے یتیم خانے کے بچوں کی دعوت کی، احمر خیر پور میں تھے ان کی واپسی پر دیگر احباب کی دعوت کا پروگرام بنانا تھا۔ جسے ہم اپنی زبان میں ''بڑا کھانا'' کہتے تھے، شام کو قرآن خوانی ہوئی اور یتیم خانے کے بچوں کو کھانا دیا گیا۔ کھانے کی ہڑبونگ میں رات کے دس بج گئے۔ میں کمر سیدھی کرنے کے لیے اپنے بیڈ پر آ گئی۔ میرا چھوٹا بیٹا ضیا بھاگا ہوا آیا۔ کہنے لگا۔ ''امی باہر ایک عورت کھڑی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ اسے کھانا چاہیے۔ میں جانے کس موڈ میں تھی، بولی۔ ''جا اندر بلا لا۔ یہاں بٹھا کر کھانا کھلا دو۔'' میرا بیٹا اسے ساتھ لے آیا۔ ادھیڑ عمر کی سانولی سی عورت تھی۔ مجھے جھک کر سلام کیا۔ میں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ بہ ظاہر بھکارن نظر نہیں آ رہی تھی۔ لہذا پوچھ بیٹھی کہ کہاں رہتی ہو؟ اس نے چھت کی طرف اشارہ کیا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

''پہلے چھت کے تلے رہتی تھی۔ آج کل آسمان تلے گزارا کر رہی ہوں۔'' عجیب قنوطی جواب تھا۔ میرا تجسس بیدار ہو گیا، پوچھا۔ ''بھیک مانگنا پیشہ ہے......؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''نہیں بیگم صاحب آج تین دن کا فاقہ تھا۔ کام کے لیے ماری ماری پھر رہی تھی۔ کام نہیں ملا تو خالی ہاتھ گھر جاتے ہوئے شرم آئی کہ بچے روٹی مانگیں گے تو کیا جواب دوں گی۔ یہاں بچوں کا جمگھٹا دیکھا تو رک گئی۔ پتا چلا کہ آج یہاں لنگر ہے ہاتھ پھیلانا پڑا۔''

میں نے ضیاء سے کہا کہ جاؤ مائی کے لیے کھانا لے آؤ وہ جانے لگا تو اس نے روک لیا بولی۔ ''بیگم صاحب ہم چار جیے ہیں، ہمارا کھانا بندھوا دو میں اپنے بچوں کے ساتھ ہی روٹی کھاؤں گی۔''

میں نے پوچھا۔ ''بچے کہاں ہیں، ان کا باپ کیا کرتا ہے۔'' وہ رونے لگی آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''کیا بتاؤں بیگم صاحب میرے آدمی نے مجھ پر اس عمر میں کیا ستم ڈھایا ہے۔ میری تین لڑکیاں ہیں، بڑی تیرہ سال کی ہے، جوان ہی سمجھو۔ میرا آدمی محلے کی ایک لڑکی کو بھگا کر لے گیا حیدر آباد جا کر اس نے نکاح کر لیا اور وہیں سے مجھے طلاق بھیج دی۔ محلے والوں نے ہم ماں بیٹیوں کو مار کر گھر سے نکال دیا۔ کرائے کا مکان تھا وہ خالی کرا لیا۔ سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ لڑکیوں کی ساتھ گھومنا کتنا دشوار ہے۔ عزت دار نہ ہوتی تو کوٹھے پر جا بیٹھتی اس کم بخت عزت نے یہ دن دکھایا ہے۔ لڑکیوں کو اپنی ایک جاننے والی کے گھر چھوڑا دو دن بعد اس نے بھی نظریں پھیر لیں۔ رشتے دار سارے انڈیا میں ہیں۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔''

اس کی داستان سن کر میں گھبرا گئی۔ پوچھا'' اس وقت لڑکیاں کہاں ہیں؟'' وہ بولی۔ ''ملیر میں ایک ملنگ بابا کی جھونپڑی ہے، تینوں کو وہاں بٹھا کر آئی ہوں۔ بابا مجذوب ہے دو دن جھونپڑی سے باہر رہتا ہے آج بھی وہ باہر نکلا ہوا ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''اگر وہ واپس آ گیا تو۔'' وہ عورت بولی۔ ''میں لڑکیوں کو اللہ کے بھروسے پر چھوڑ کر آئی ہوں ان کی وہی حفاظت کرے گا۔'' اس عورت کی کہانی میں جھوٹ کی بہ ظاہر کوئی

آمیزش نظر نہیں آ رہی تھی اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ ستم زدہ ہے اس سے پوچھا کہ اس وقت واپس کیسے جائے گی۔ بولی بی بی بس پکڑوں گی، چونی پلو سے باندھ رکھی ہے۔ اگر کنڈیکٹر نے تنگ کیا تو اسے دے دوں گی۔

اتنی دیر میں ضیا چار آدمیوں کا کھانا پیک کرا کے لے آیا۔ میں نے اس عورت کو دس روپے دیے اور کھانا اس کے حوالے کر دیا۔ ہمدردی سے کہا کہ اگر کہیں ملازمت نہ ملے تو میرے پاس آ جانا میں تمہیں اپنے یہاں رکھ لوں گی۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ دوڑ کر آئی اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی میرے دونوں قدم پکڑ کر چومنے لگی۔ بولی۔

''بی بی میں یہ در چھوڑ کر اب کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے اپنے گھر رکھ لیجئے۔''

میری دونوں بیٹیاں بھی کمرے میں آ گئی تھیں۔ انہوں نے بھی اسے تسلی دی اور کہا کہ اپنا پتا دے دو کل ہم تمہیں بلوا لیں گے۔

وہ بولی۔''بی بی ہم پر تو آج کی رات بھاری ہے اگر ملنگ بابا اپنی جھونپڑی میں واپس آ گیا تو ساری رات درخت کے تلے گزارنا پڑے گی۔''

سیماں بولی۔''امی ڈرائیور کو بھیج کر اس کی بیٹیوں کو بلوا لو۔ بے چاری رات کو کہاں ماری ماری پھرے گی۔''

میں نے سیماں کی ضد پر ڈرائیور کو بلایا اسے علیحدہ لے جا کر سمجھایا کہ اس عورت کی انکوائری کرنا ہے جو کچھ کہہ رہی ہے اس میں صداقت ہے یا نہیں۔ ڈرائیور نے اس کا اتا پتا پوچھا اور جواب سن کر خوش ہو کر بولا میری پھوپی زاد بہن اسی گلی کے آس پاس رہتی ہے چلو میرے ساتھ میں تمہاری بچیاں بھی لے آؤں گا۔

رات کے تقریباً بارہ بجے کے قریب ڈرائیور اس عورت اور اس کی بچیوں سمیت واپس آیا۔ ہم لوگ بارہ ایک بجے سونے کے عادی ہیں۔ آج تو ویسے بھی چیزیں وغیرہ سمیٹنا تھیں اور اس عورت کا انتظار بھی تھا۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ وہ پہلے اپنی بہن کے گھر اس کو لے گیا تھا بہن اس کو جانتی ہے واقعی اس کے شوہر نے اس پر بہت ظلم کیا تھا، عورت نیک ہے، ایک ہفتہ پہلے محلے والوں کے کہنے پر مالک مکان نے ان ماں بیٹیوں کو گھر سے نکال دیا تھا جب سے یہ ادھر ادھر ماری ماری پھر رہی ہیں۔ ڈرائیور کی تصدیق پر مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں ان چاروں کے لیے سرونٹ کوارٹر خالی کرا دیا۔ اس میں، میں نے پرانا فرنیچر بھرا ہوا تھا۔ صبح سب نکال کر کباڑی کی دکان پر پہنچا دیا اور وہ ایک کمرے کا کوارٹر اس عورت کے حوالے کر دیا اور کہہ دیا کہ میرے گھر کا کام کاج سنبھال لے۔ تینوں وقت کھانا اور پانچ روپے تنخواہ ملے گی۔ بچیوں کی اترن اور عید تہوار پر کپڑے بھی بنوا دیا کریں گے۔ میرے ہاتھ چوم چوم کر اس عورت نے مجھے دعائیں دیں۔ کہنے لگی۔''بی بی برے دن کسی کے نہیں رہتے میں چند مہینے کے اندر اندر اپنے گھر والوں کو خط لکھ کر بلوا لوں گی۔ میرے بھائی بہت پیسے والے ہیں اپنی بہن کی کچھ نہ کچھ تو ضرور مدد کریں گے۔''

میں نے یہ اقدام اس کی بچیوں کی حفاظت کے لیے کیا تھا اس عورت کا کیا تھا کہیں بھی نوکری کر کے گزارا کر سکتی تھی لیکن جوانی میں قدم رکھنے والی لڑکیوں کا گھر گھر پناہ کی تلاش میں پھرنا ان کی بربادی کے مترادف تھا۔ تینوں لڑکیاں خوش شکل تھیں، فاقوں اور پیشانیوں نے انہیں کملا دیا تھا لیکن چند دنوں بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ بڑی ہو کر اچھی صورت نکالیں گی۔ بڑی تیرہ سال کی تھی، منجھلی نو برس کی تھی اور تیسری چھ سال کی ہوگی۔ میری بچیوں نے انہیں اپنی اترن دے دی تھی۔ جسے جنت خاتون نے کاٹ چھانٹ کر اپنی بیٹیوں کے قابل بنا لیا۔

جب احمر گھر آئے تو میں نے انہیں جنت کی پوری کہانی سنا دی۔ وہ کہنے لگے۔''تم بہت بھولی

عورت ہو ایسی عورتیں ڈھونگ رچا کر گھر لوٹ لیا کرتی ہیں۔ مہربانی سے اس پر کڑی نظر رکھو اور میں اپنے طور پر اس کی تحقیقات کرتا ہوں اگر اس کی کہانی میں صداقت بھی موجود ہے تب بھی ایسی عورتوں پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے ہماری بچیاں جوان ہو رہی ہیں۔ خدا جانے یہ عورت آگے چل کر کیا چال چلن اختیار کرے جو ہم سب کے لیے پرابلم ہو جائے۔'' میں نے احمر کو یقین دلایا کہ ڈرائیور مجید اس کی کہانی کی تحقیقات کر چکا ہے اس کا شوہر واقعی اسے طلاق دے کر بھاگ گیا ہے۔ عورت شریف لگتی ہے۔ بچیاں بھی سلیقے کی ہیں، صبح سویرے ماں انہیں قرآن کا درس دیتی ہے۔ اگر ہماری وجہ سے کسی کی زندگی سنور جائے تو ثواب ہی ملے گا۔

احمر نے میری تقریر کا کوئی اثر نہیں لیا۔ جنت بی بی کو بلا بھیجا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ ''تم یہاں اکیلی رہتی ہو۔ بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے پیچھے یہ سارا صفایا کر کے تمہیں بے آسرا کر جائے۔ میں خود دیکھنا چاہتا ہوں کہ محترمہ کا جغرافیہ کیا ہے۔''

جنت ڈرتے ڈرتے آئی۔ اس نے کاٹ چھانٹ کر میرے کپڑے پہن لیے تھے اس لیے صاف ستھرے حلیے میں تھی۔ مجھے اور احمر کو سلام کر کے فرش پر بیٹھنے لگی۔

''احمر نے اس سے اس کی پوری داستان دوبارہ سنی۔ کہنے لگے اپنے شوہر کا کچھ اتا پتا معلوم ہے۔ میں حیدرآباد جانے والا ہوں۔ اگر اس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے تو اسے حوالات کی ہوا کھلا دوں گا۔'' جنت آنسو پونچھتے ہوئے بولی ۔''مجھے اگر اس کا اتا پتا معلوم ہوتا تو بچیوں کو لے کر اس کے در پر نہ جا پڑتی جس لڑکی کو لے کر بھاگا ہے انہوں نے پولیس میں رپٹ درج کرا دی تھی بعد میں اس نے اپنے کسی دوست کے ہاتھ مجھے طلاق نامہ اور لڑکی کے گھر والوں کو اپنے نکاح کی خبر بھیج دی۔ پولیس نے دوست کو پکڑ کر مارا پیٹا تو اس نے یہ بتایا کہ وہ مجھے اسٹیشن پر ملا تھا مجھے اس کے ٹھکانے کا پتا نہیں۔''

احمر کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ ''میں آج ہی ڈی ایس پی سے بات کر کے کچھ کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ دراصل تم جوان عورت ہو۔ تمہاری بیٹیاں بھی چند سال بعد جوان ہو جائیں گی۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ تم ادھر ادھر ماری ماری پھرو۔ اگر شوہر راہ راست پر آ جائے تو تمہیں اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اگر تم لوگوں کی صلح ہو سکتی ہے تو طلاق کی اہمیت خود بخود ختم ہو سکتی ہے۔''

جنت نظریں جھکائے بولی۔ ''میں آپ پر اور بی بی پر بھروسا کرتی ہوں جو مرضی میں آئے کیجیے۔ میں اپنی بیٹیوں کے مستقبل کی خاطر ہر قسم کا سمجھوتا کر لوں گی۔'' جنت اٹھ کر چلی گئی۔

احمر کہنے لگے۔ ''عورت تو شریف ہے پھر بھی تحقیق کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔'' چند دنوں بعد احمر نے جنت کے شوہر کا پتا نکلوا لیا۔ حیدرآباد میں ان کے دوستوں کا خاصا بڑا حلقہ ہے ان کے لیے یہ کام آسان تھا۔ جنت کو بلا کر خوشخبری سنائی۔ وہ رونے لگی۔ بولی۔ ''صاحب جی آپ نے بڑی نیکی کی ہے مگر میں سوکن کی ساتھ نہیں رہوں گی وہ بچیوں کو اپنے ساتھ رکھ لے۔ میں کہیں مزدوری کر کے پیٹ پال لوں گی۔''

میں نے اور احمر نے اسے سمجھایا کہ پہلے شوہر سے مل لے بعد میں جیسے حالات ہوں گے اسی کے مطابق عمل کرنا۔ وہ حیدرآباد سے گرفتار کر کے کراچی لایا گیا تھا اور حوالات میں بند کر دیا گیا تھا۔ اس کی بیوی کو اس کے والدین لے گئے تھے لیکن اندر ہی اندر ان لوگوں کی خدا جانے کیا کھچڑی پکی کہ لڑکی کے ماں باپ نے اسے اپنا داماد تسلیم کر کے صلح کر لی۔ وہ حوالات سے نکل کر لڑکی کے والدین کے گھر منتقل ہو گیا۔

میرے شوہر کا اصرار تھا کہ جنت اس کے پاس جا کر اپنا حق مانگے۔ جنت سوکن کے ساتھ رہنے پر

رضا مند نہیں تھی۔ احمر نے اسے راضی کرلیا کہ وہ شوہر سے ملے میں اسے اپنے گھر بلوانا نہیں چاہتا کیوں کہ ہوسکتا ہے بعد میں وہ ہم لوگوں کو تنگ کرے۔ بہتر ہوگا کہ تم میرے ساتھ چلو، میں وہاں اسے تھانے میں بلوالوں گا۔ ساری باتیں ڈی ایس پی کے سامنے ہوں گی تاکہ اس کا دماغ درست رہے۔''

بمشکل جنت راضی ہوئی۔ کہنے لگی کہ صاحب میں اکیلی جاؤں گی بچیوں کو تھانے میں نہیں لے جانا چاہتی۔'' اس کی بات معقول تھی احمر اور میں نے مان لی، دوسری صبح احمر جنت کو ملیر لے گئے۔ ہم دونوں میاں بیوی کسی نہ کسی طریقے سے اس کا گھر پھر سے آباد کرنے کے خواہش مند تھے۔ میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہی تھی کہ میرے شوہر نے اس مسئلے میں دلچسپی لی۔ وہ اس طبیعت کے آدمی تھے کہ اگر انہیں کسی امداد کے لیے مجبور کریں تو چڑ جاتے تھے لیکن خود کسی کو مصیبت میں دیکھ لیں تو ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرنے پر تل جاتے تھے۔ اسی جذبے کے تحت وہ جنت کو اس کے شوہر سے مصالحت کرانے لے گئے۔

سہ پہر ان کی واپسی ہوئی۔ جنت کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ احمر بھی رنجیدہ لگ رہے تھے۔ مجھے بتانے لگے کہ وہ بہت حرام زادہ ہے۔ ہزار دھمکیاں دیں مگر اپنی بات پر اڑا رہا کہ میرا اس عورت سے کوئی واسطہ نہیں ہے، میں اسے طلاق دے چکا ہوں۔ بچیوں کا خرچا ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ ابھی تو خود بے روزگار ہوں۔ سسرال والوں کی روٹیاں توڑ رہا ہوں جب کچھ بندوبست ہوجائے گا تو خرچا بھیج دیا کروں گا۔ جنت کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا۔ میں نے احمر کو سمجھایا کہ عدالتوں کے چکروں میں آپ مت پڑیں۔ یہ عورت محنتی ہے۔ ہمارے یہاں پڑی رہے گی۔ بچیوں کو سلائی کے اسکول میں داخلہ دلا دوں گی دو تین سال بعد اپنا خرچا نکالنے کے قابل ہوجائیں گی عدالتوں میں خواری کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

احمر کسی صورت اپنی ناک نیچی کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔ جنت کے شوہر پر مقدمہ داغ دیا۔ کہنے لگے۔ ''سالے کو اپنے کرتوتوں کی کچھ تو سزا ملے۔'' اسے تو خیر کیا سزا ملنا تھی یہ سزا ہم لوگوں کو ہی بھگتنا پڑی، مقدمے کا سارا خرچا ہمیں برداشت کرنا پڑا۔ ہر پیشی پر احمر کو خود آنا پڑا۔ چھ مہینے تک احمر جنت کو اس کا حق دلانے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس دوران میں نے اس عورت کا پورا پورا خیال رکھا۔ میری بیٹی سیماں سے جنت نے انڈیا اپنے بھائیوں کو خط لکھوایا جس کا جواب دو مہینے بعد ملا لکھا تھا۔ ''ہم کسی نہ کسی طریقے سے تمہیں پیسہ بھیجنے کی کوشش کریں گے۔ اس عرصے میں تم کسی طریقے سے قرض لے کر اپنا گزارا کرو اور بچیوں کی دل آزاری مت ہونے دینا۔''

جنت نے مجھے خط دکھا کر کچھ رقم طلب کی۔ میں نے احمر سے مشورہ لیا وہ کہنے لگے۔ ''شاکرہ اس عورت پر ہم پورا بھروسا کرسکتے ہیں۔ اس عرصے میں تم نے بھی اس کی سیرت دیکھ لی ہے۔ تم بلا کھٹکے رقم دے دو شاید یہ کوئی کاروبار کرنا چاہ رہی ہے۔''

میں نے پوچھا ''کتنی رقم دوں۔''

انہوں نے دو ہزار روپے میرے حوالے کیے کہنے لگے۔ ''یہ دے دو واپسی کی نیت مت رکھنا۔ سمجھ لینا خیرات دی ہے۔ جنت پیسے لے کر بازار گئی اپنے اور بچیوں کے لیے کپڑے لے کر آئی۔ مجھ سے پرمیشن مانگی اور جب ہلکے انگوری رنگ کے نئے جوڑے میں وہ میرے سامنے آئی تو میں حیران رہ گئی۔ وہ خاصی قبول صورت لگ رہی تھی۔ احمر اسے دیکھ کر کہنے لگے۔ ''بیگم یہ عورت سمندر جیسی گہری ہے خود کو بگاڑے رکھتی ہے کہ دنیا والوں کی بری نظریں اس پر نہ پڑیں۔'' میں نے جنت کو بہت سارے جوڑے نکال کر دیے کہ صاف ستھری رہا کرو۔ میں تمہیں نوکرانی نہیں اپنی

بہن سمجھتی ہوں۔" یہ میری ہی نہیں احمر کی بھی خواہش تھی کہ جنت اور اس کی بچیوں کو صاف ستھرا رکھا کرو۔ کیوں کہ آنے جانے والے انہیں ہمارا رشتے دار سمجھنے لگے ہیں اور یہ حقیقت بھی تھی جن لوگوں کو اس واقعہ کا پتا نہیں تھا وہ جنت کو ہماری رشتے دار سمجھتے تھے۔ کچھ ان کا رہن سہن نوکروں سے مختلف تھا اور کچھ صورت شکل کی اچھی تھیں میرے گھر کا سارا انتظام جنت نے بڑے سلیقے سے سنبھال لیا تھا گھر میں دعوت کا اہتمام ہوتا تو وہ سب کام خوبی سے نمٹا دیتی۔ اپنی بچیوں کو اسکول میں داخل کرا دیا تھا احمر نے کہا کہ پانچ سو روپے بچیوں کی تعلیم کے لیے دے دیا کرو یہ پڑھ لکھ کر ماں کا سہارا بن جائیں گی۔

ایک سال جنت ہمارے گھر رہی، مجھے اس سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ وہ ایک روز کی چھٹی لے کر اپنے ملنے جلنے والوں کے پاس ملیر جایا کرتی تھی۔ بچیوں کو گھر چھوڑ جاتی، شام کو واپس آتی۔ اس عرصے میں دو چار بار انڈیا سے اس کے بھائیوں نے کسی کی معرفت پیسے بھجوائے۔ میں نے اس سے تفصیل نہیں پوچھی اس نے خود بتایا کہ بچیوں کے اکاؤنٹ میں ڈال دیتی ہوں۔ میں اس سے مطمئن اور خوش تھی اور وہ مجھ سے۔ ایک روز وہ سر جھکا کر میرے سامنے آئی کہنے لگی۔ "بی بی آپ سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں آپ سن لیں تو مہربانی ہوگی۔ مجھے اس کے طرز تخاطب پر تعجب ہوا۔ پوچھا۔ "جنت خیر تو ہے۔"

وہ بولی بی بی! میں علیحدہ مکان کرائے پر لے رہی ہوں۔ خدا کے فضل سے میرے پاس اتنا پیسہ ہوگیا ہے کہ میں بچیوں کو لے کر الگ مکان میں رہ سکوں۔ میرے بڑے بھائی نے پیغام بھیجا ہے کہ تمہارے ماہانہ خرچ کا ہم نے انتظام کر دیا ہے۔ مجھے وہ ہر مہینے پانچ ہزار روپے بھیجا کریں گے جو میرے لیے بہت ہیں۔ میں آپ کے احسانات کا عمر بھر بدلہ نہیں چکا سکتی۔ مجھے آپ خوشی خوشی جانے کی اجازت دے دیں۔ آپ سے ملنے روزانہ آیا کروں گی۔"

جنت نے یہ خبر بالکل غیر متوقع طور پر سنائی تھی۔ میں ہکا بکا رہ گئی۔ احمر ٹھیک کہتے تھے یہ عورت گہرا سمندر تھی ایک سال ہمارے ساتھ رہی، بہت کم باتیں کرتی تھی۔ زیادہ وقت کام کاج یا اپنے کوارٹر میں گزارتی۔ اب جانا چاہ رہی تھی تو میں اسے روکنے والی کون تھی۔ پھر بھی احمر سے مشورہ کرنا ضروری تھا کیوں کہ وہ اس کے معاملات میں خاصی دلچسپی لیتے تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ صاحب آجائیں پھر چلی جانا۔ وہ بولی۔ "صاحب خدا جانے کب آئیں میں مکان کا کرایہ ادا کر چکی ہوں اگر کل تک منتقل نہ ہوسکی تو مالک مکان گڑبڑ کر دے گا۔ میں روزانہ آتی رہوں گی صاحب سے ملاقات ہوجائے گی۔ آپ سے درخواست یہ کرنا تھی کہ بچیاں کچھ دن آپ کے پاس رہیں گی۔ اس عرصے میں مجھے لاہور بھی جانا ہے۔ میرے بھائی کا کچھ کام اٹکا ہوا ہے اسے کرنا ہے۔ جمعرات تک میں لوٹ آؤں گی پھر بچیوں کو ساتھ لے کر نئے گھر میں منتقل ہو جاؤں گی۔

جنت کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس نے یہ پروگرام کیسے بنایا جب کہ اس سے پہلے تو وہ ملیر جانے کے لیے بھی مجھ سے اجازت لیتی تھی۔ بہرحال یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا مجھے تھوڑا بہت صدمہ تو ہوا مگر یہی بہت تھا کہ اس نے مجھ سے اجازت لے لی تھی۔ دراصل میں اس کے کام کی عادی ہوگئی تھی۔ گھر کا کھانا پکانا، صفائی، مہمان داری سب کچھ اسی کے ذمے تھا۔ اب یہ سب کام مجھے خود سنبھالنا تھے۔ تھوڑا دکھ فطری تھا۔ لیکن اسے روکنا بھی بےکار تھا کیوں کہ وہ اپنا فیصلہ خود کر چکی تھی۔ دوسرے دن صبح وہ چلی گئی۔ بیٹیاں میرے پاس رہیں۔ ان سے پوچھا کہ تمہاری ماں نے اپنے جانے کے متعلق تمہیں کب بتایا تھا۔

بڑی نے جواب دیا ہمیں رات کو بتایا تھا کہ تم تینوں خالہ جی کے ساتھ رہو گی۔ میں چند دن میں لوٹ آؤں گی۔

دس دن تک وہ نہیں آئی۔ مجھے تشویش ہوئی کیوں کہ وہ چار دن کا کہہ کر گئی تھی اور یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اگر اسے نئے گھر میں منتقل ہونے میں دیر ہو گئی تو مالک مکان گڑبڑ کر دے گا۔ پھر اتنے دن کیسے رہی۔ بچیاں بھی پریشان نظر آ رہی تھیں۔ ماں کی طرح تینوں گھنی تھیں۔ زبان بند رکھتی تھیں۔ احمر کے آنے تک میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی مجھے ڈر یہ تھا کہ وہ حادثے کا شکار نہ ہو گئی ہو یا خدانا خواستہ بچیوں کو چھوڑ کر فرار ہو گئی ہو۔ خدا جانے اس کا کیا منصوبہ تھا لہٰذا میری پریشانی بجا تھی۔

احمر کا حیدرآباد سے فون آیا تو میں نے انہیں مختصر بتا دیا تو وہ بولے۔ ''میں چار روز بعد آ رہا ہوں یہاں آ کر کچھ کروں گا۔''

لیکن کچھ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی وہ گیارہویں روز آ گئی۔ مجھ سے معذرت کرنے لگی کہ کچھ پرانے ملنے جلنے والے مل گئے، انہوں نے روک لیا تھا۔ وہ لاہور سے خاصا سامان لائی تھی۔ میری بیٹی سیماں کو ایک جرسی دی، دونوں لڑکوں کو پین دیے میرے لیے کڑھا ہوا دوپٹا لائی تھی۔ اس کے اصرار پر میں نے تحفے لے لیے اسی شام کو وہ اپنا سامان اور بچوں کو لے کر چلی گئی۔ مجھے کہنے لگی۔ ''ابھی میں آپ کو اپنے گھر کا پتا نہیں بتاؤں گی۔ پہلے گھر ٹھیک ٹھاک کر لوں پھر آپ کو لینے آؤں گی۔''

چوتھے روز احمر آئے۔ میں نے انہیں ساری کتھا سنائی وہ کہنے لگے۔ ''ٹھیک ہے وہ اپنی مرضی کی مالک ہے اگر بہتر طریقے سے اپنی زندگی بسر کرنے کا موقع اسے مل گیا ہے تو ہم روکنے والے کون ہیں۔ ہمارا جو انسانی فرض تھا وہ ہم نے ادا کر دیا۔''

یہ عورت ایک بھولی بسری داستان بن جاتی جو بات یہیں پر ختم ہو جاتی۔ دو ماہ تک اس کی خیر خبر نہیں ملی۔ میں نے سوچا نمک حرام نکلی اگر دو چار لفظ خیریت کے بتا دیتی تو اس کا اپنا ہی بوجھ ہلکا ہوتا مگر ایک صبح مجھے میرے چچا نے آ کر بتایا کہ شاکرہ تم کس خیال میں ہو۔ جس عورت کو تم نے اپنے گھر میں پناہ دی تھی وہ تمہاری سوکن بن چکی ہے۔ احمر میاں نے نارتھ ناظم آباد میں ایک کوٹھی کرائے پر لے رکھی ہے وہ محترمہ اپنی بیٹیوں سمیت وہاں عیش کی زندگی بسر کر رہی ہیں اگر یقین نہیں آتا تو لو میں پتا دے دیتا ہوں جا کر تصدیق کر لو۔''

اور تصدیق کی ضرورت ہی کہاں پڑی۔

احمر نے اسی وقت کمرے سے نکل کر خود اعتراف کر لیا کہ میں دوسری شادی جنت سے کر چکا ہوں۔ اسے جا کر پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو سزا دینا ہے مجھے دو۔''

جی ہاں یہ جنت بی بی اب میرے شوہر کی چہیتی بیوی ہیں۔ میں اپنے بچوں کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتی ہوں۔ جنت نے نارتھ ناظم آباد میں شاندار کوٹھی بنوائی ہے۔ میرے دونوں لڑکے باپ کی وجہ سے اکثر وہیں رہتے ہیں اور میری بڑی بیٹی سیماں گھر کا خرچ چلانے کے لیے ملازمت کر رہی ہے۔ بیٹے باپ کے فرمانبردار بن گئے ہیں۔ لہٰذا ان کی کفالت باپ ہی کرتا ہے۔ میں نے اور میری بیٹیوں نے اس صورت حال کو تسلیم نہیں کیا۔ لہٰذا معتوب ہو کر جنت بی بی کی طرح خوار ہو رہے ہیں۔ جنت والے جو ہر ہم میں نہیں ہیں۔ لہٰذا ساری عمر اسی کسمپرسی میں گزرتی نظر آ رہی ہے۔

☆☆

مہکے پھول یادوں کے

سونیا خان

وہ بھونرا صفت دنیا گھوم آیا تو اس کی پسند کا معیار بھی بدل گیا۔ ایک دوشیزہ کے صبر کا فسانہ، اس نے اپنا حق چھوڑ کر ہر بندھن توڑ دیا کیونکہ کچے دھاگوں سے بندھے رشتوں کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔

ان بے وفاؤں کا قصہ جو منزلوں کو ڈھونڈتے اور پھر ٹھکرا دیتے ہیں

ثمرہ انہیں کھلی کھلی آنکھوں سے مسلسل دیکھے جارہی تھی۔ اللہ کیسے خوب صورت ہو کر آئے ہیں۔ جیسے وہ جہانگیر رضا کی نظروں کو رخ بدلتے محسوس کرتی جھٹ سے پاس بیٹھی ثمینہ سے سرگوشیاں کرنے لگتی۔ جہانگیر رضا مسکرا پڑے۔ وہ بھی ایک گھاگ آدمی تھے۔ دنیا گھوم کر آئے تھے۔ ثمرہ کی اس ایکٹنگ پر دل ہی دل میں ہنس رہے تھے۔ پھر جب سب لوگ ان سے جی بھر کے بول لیے تب وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ثمینہ نے بہت کھینچا تانی کی مگر وہ اس کے ساتھ ان کے کمرے میں نہ گئی۔

لالہ زار میں وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی یہ عمارت کسی محل سے کم نہ تھی۔ شیشے ... سے آئینے کی طرح چمکتے نظر آتے اور رات کو جب چہار دیواری پر ہر دو دو گز کے فاصلے پر لگی ہوئی بتیاں جل اٹھتیں تو شیشوں پر سے ان کا عکس جھلملا کر بڑا خوب صورت چراغاں سا منظر پیش کرتا۔ بڑے سے گیٹ پر شیشوں کے موزیک میں لکھا ہوا ''لالہ زار'' ہر وقت چمکتا رہتا تھا۔ سفید پتھروں سے جدید طرز پر بنی ہوئی یہ خوب صورت کوٹھی اپنے مکینوں کی شان و شوکت کا منہ بولتی شاہکار تھی جس کی بڑی فرانسیسی طرز کی بنی کھڑکیوں پر بھاری بھاری پردے پڑے خوب صورت لان رنگا رنگ پھولوں سے ڈھکے رہتے تھے اور گھر میں ہر وقت زینت بیگم کے پوتوں، نواسوں اور نواسیوں کے قہقہے گونجا کرتے۔

نواب ملک یار جنگ عرصہ ہوا انتقال کر چکے تھے اور اب ان کی بیگم زینت مہارانیوں کی طرح اپنی سب اولاد کو سمیٹے اس محل نما کوٹھی میں رہتی تھیں۔ ان کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ سب کی شادیاں خاندان میں کی تھیں اور اب پانچوں کی اولادوں سمیت بڑے دبدبے اور وقار کے ساتھ رہتی تھیں۔

ان کی سب سے بڑی صاحبزادی عاتکہ تھیں، جب کہ بیٹے جہانگیر رضا اور بیٹیاں ثمینہ اور فوزیہ تھیں پھر دونوں بیٹے نواب صدر ملک اور نواب منصور ملک تھے۔ ثمرہ، احمر اور عامر نواب صفدر ملک کے تینوں بچے تھی۔ نواب منصور کے صرف ایک صاحبزادے فیصل تھے۔ عائشہ منجھلی صاحبزادی تھیں۔ ان کے دو بیٹے فراز اور شہریار اور بیٹی عظمیٰ تھی اور صبیحہ سب سے چھوٹی تھیں اور جن کی ایک دس سال کی بیٹی نادیہ تھی۔

ثمرہ ایک ہی پوتی تھی۔ اس لیے زینت بیگم کی بے حد لاڈلی ہونے کے علاوہ سب پھوپھیوں کی



آنکھ کا تارا تھی۔ یہ پورا خاندان بڑے خلوص اور چاہت سے رہتا تھا۔ سب بچے آپس میں بڑے اچھے دوست تے اور بہو بیٹیاں ایک ہو کر رہتی تھیں۔ زینت بیگم بہت روشن خیال تھیں۔ اس لیے گھر کا ماحول خاصا آزادانہ تھا۔ سب لڑکیاں پڑھ رہی تھیں اور لڑکے بڑے قابل اور ہونہار تھے۔ جہانگیر رضا سات سال کینیڈا میں رہ کر کامیاب آرکیٹیکٹ بن کر لوٹے تھے اور اب اپنی ذاتی فرم کھولنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ عامر ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کرنے لندن گئے ہوئے تھے۔ احمر اور فیصل انجینئرنگ کالج میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ فراز میڈیکل کے فائنل ائیر میں تھے اور شہریار نے ائیرفورس جوائن کر لی تھی۔ ثمینہ اور ثمرہ جو ہم عمر بھی تھیں اور راز دار سہیلیاں بھی۔ ایک ہی کالج میں، ایک ہی کلاس میں پڑھ رہی تھیں۔

عظمیٰ اور نادیہ کی گاڑی چھنتی تھی، دونوں کی عمروں میں بہت کم فرق تھا۔

ایک ہاتھ میں گلاس تھامے دوسرے ہاتھ میں سگریٹ لیے ایک طرف کو تنہا کھڑے وہ ہر ایک کا طائرانہ نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔ اب تک انہیں کوئی بھی شناسا نہ دکھائی دیا تھا۔ یہ تقریب ان کے بہت پرانے اور جگری دوست شہزاد نے اپنی شادی کی سالگرہ کے موقع پر کی تھی جس میں ان کا شامل ہونا ازحد ضروری تھا، کیوں کہ وہ اس کی شادی کے موقع پر کینیڈا میں تھے اور اب ان کو واپس آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا۔ شہریار دوسرے مہمانوں میں مصروف تھا۔ انہیں تنہا کھڑا دیکھ کر ان کی طرف مسکراتا ہوا آیا۔

”بور تو نہیں ہو رہے۔“

’’فی الحال تو نہیں۔‘‘ وہ ہنس پڑے۔
’’یقیناً ہو رہے ہوں گے۔ اصل میں تمہارا کوئی شناسا بھی تو نہیں۔‘‘ وہ ایک پل کو رکا۔
’’اچھا ٹھہرو، تمہیں ایک بہت اچھی دوست سے ملواتا ہوں۔‘‘
وہ شہزاد کے ساتھ چلتے ہوئے لان کے دوسرے سرے تک آ پہنچے۔
’’وکی۔‘‘
شہزاد کی آواز پر ایک نازک سی لڑکی ان کی طرف مڑی تو جہانگیر اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گیا۔ ایسا ملیح حسن تو انہوں نے پورے یورپ اور امریکا میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے گہرے بھورے بال جو کچھ کچھ سرخی مائل بھی تھے، بڑے خوب صورت انداز میں سیٹ کیے ہوئے تھے اور اس کی نیلی نیلی آنکھیں کچھ ایسی بھیگی ہوئی تھیں کہ لگتا تھا جیسے ابھی شفاف آنسو نکل پڑیں گے۔ اس کے چمکیلی براؤن لپ اسٹک لگے ہونٹوں پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ تھی۔ ایک نظر میں وہ جہانگیر کو اداسیوں کا مجسمہ لگی مگر دوسرے ہی لمحے جب وہ ہنستی ہوئی ان لوگوں کی طرف بڑھی تو وہ اپنا نظریہ بدلنے پر مجبور ہو گئے۔

’’وکی! میرے بہت اچھے دوست سے ملو۔ جہانگیر رضا شاہ۔ ابھی کچھ دن ہوئے کینیڈا سے لوٹے ہیں اور جہانگیر! یہ وکی ہیں۔ میری اور اسما کی بہت اچھی دوست۔ بہت پر بہار شخصیت ہیں۔ ہمارے گھر کے سامنے والے گھر میں ان کا مستقل قیام ہے۔‘‘ شہزاد نے بڑی روانی سے ان کا تعارف کرایا۔
جہانگیر نے رسمی جملے کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بڑی شستہ اردو میں ان سے مخاطب ہوئی۔
’’آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی جہانگیر! امید ہے آپ بھی ایسا ہی محسوس کریں گے۔‘‘
وہ اسے اتنی روانی سے صاف اردو بولتے دیکھ کر حیرانی میں کوئی بات ہی کرنا بھول گئے۔ شہزاد انہیں اس طرح دیکھ کر زور سے ہنس پڑا۔

’’ارے بھئی جہانگیر! وکی پندرہ سال سے پاکستان میں ہے اور اب ہم لوگوں کی طرح ہی اتنی اچھی اردو بول سکتی ہے کہ اسے دیکھ کر کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا کہ یہ آئرش ہے۔‘‘
جہانگیر اپنی حیرانی پر قابو پا کر مسکرا دیے۔
’’واقعی! مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ میں نے پہلی دفعہ کسی فارنر کو اتنی رواں اردو بولتے دیکھا ہے۔ بہرحال آپ کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزرے گا۔‘‘ وہ وکی سے بڑے متاثر نظر آ رہے تھے۔
جہانگیر اسے ساتھ لیے ایک طرف بیٹھ گئے اور رسمی باتوں کے بعد ان میں باتوں کا جو سلسلہ چلا تو وہ دونوں آپس میں اتنے بے تکلف ہو گئے، جیسے ان کی کئی برسوں سے جان پہچان ہو۔ اس ملاقات میں وکی ان کو اپنے متعلق سب کچھ بتا گئی۔
وکی کے ڈیڈی آئرش اور مما سوئیڈش تھیں۔ اس کے ڈیڈی ایک انگلش فرم میں جنرل منیجر کی پوسٹ پر تھے۔ وکی کو پاکستان بہت پسند تھا اور اس کی مما کو بھی۔ وہ چھ سال کی تھی جب وہ لوگ پاکستان آئے تھے پھر اس نے امریکن اسکول سے سینئر کیمبرج کرنے کے بعد آرٹس کونسل جوائن کر لی تھی۔ اسے پاکستانی لباس بے حد پسند تھا۔ اکثر وہ اسے پہنتی بھی تھی۔ اسے یہاں کے گیت اور موسیقی سے عشق تھا۔ پاکستانی گھرانوں کے ساتھ میل جول رکھتی تھی اور ان میں گھل مل کے بالکل ان جیسی ہو جاتی تھی۔
جہانگیر اس سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ وہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ پرخلوص اور ملنسار بھی تھی۔ وہ بڑی اچھی مصور تھی۔ وکی نے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ جسے انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے قبول کر لیا تھا پھر وہ اس سے جلد ملنے کا وعدہ کر کے گھر لوٹ آئے تھے۔

☆☆☆

آج ’’لالہ زار‘‘ میں روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ لان میں ہر طرف خوشبو اور قوس قزح کے

رنگ بکھر ہوئے تھے۔ گیٹ سے باہر سڑک کے اطراف گاڑیوں کی لمبی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ سرخ قمقموں کی سجاوٹ قابل دید تھی۔ کتنے ہی مہمان آچکے تھے۔ سریلے قہقہوں سے بار بار فضا گونج اٹھتی۔ یہ تقریب زینت بیگم نے اپنے لاڈلے نواسے سے جہانگیر رضا کی شاندار کامیابی کی خوشی میں کی تھی۔ جہانگیر رضا بہترڈنر سوٹ میں ملبوس اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ زیادہ تر مہمان آچکے تھے مگر انہیں جس کا انتظار تھا، وہ اب تک نہیں آئی تھی۔ وہ بار بار گھڑی دیکھتے۔اب تک اسے آجانا چاہیے تھا۔فراز ان کے ساتھ کھڑا تھا۔ کچھ کچھ ان کی بے تابی بھانپ گیا۔

''کیا کوئی خاص مہمان آنے والا ہے؟'' وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

''آں......نہیں تو۔'' وہ ایک دم گڑ بڑا گئے۔

فراز پھر کچھ شرارت سے کہنے ہی والا تھا کہ وہ کسی کو آتا دیکھ کر اچانک سیڑھیاں اتر کر اس کی طرف بڑھ گئے اور جب وہ پلٹے تو وکی ان کے ساتھ تھی۔ بلیو بلیک اور ریڈنگ کے چیک کے پینٹ پر سرخ جرسی اور بلو ہاف کوٹ پہنے وہ ان کے بازو میں ہاتھ ڈالے بڑی بے تکلفی سے ہنستی ہوئی چلی آرہی تھی۔تھوڑی دیر کو تو فراز بھی اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ واقعی اتنی حسین اور پرکشش تھی کہ ایک ہی نظر میں بری طرح متاثر کردیتی تھی۔

جہانگیر اور وکی سیڑھیاں طے کرکے فراز کے نزدیک آگئے۔ جہانگیر نے وکی کا فراز سے تعارف کرایا۔ وہ اس وقت اتنے خوش تھے کہ جیسے دونوں جہاں مل گئے ہوں۔آنکھوں کی چمک اس قدر بڑھ گئی تھی کہ فراز انہیں دیکھ کر چونک گیا اور اس کے دل میں فوراً ایک خیال نے سر ابھارا مگر وہ جلد ہی سر جھٹک کر کسی مہمان کو ریسیو کرنے بڑھ گیا کیوں کہ جہانگیر تو وکی کو ساتھ لے کر فوراً اندر لاؤنج میں چلے گئے تھے۔

''اتنی دیر کیوں کردی۔'' انہوں نے شکوہ کیا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں جہانگیر! تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ دراصل مجھے آرٹس کونسل میں دیر ہوگئی۔ میں گھر بھی نہیں گئی، سیدھی یہاں آرہی ہوں۔'' اس نے دلنشیں انداز میں معذرت کی کہ وہ خفگی بھول کر خوش دلی سے مسکرادیے۔

''اچھا چلو...... تمہیں اپنے گھر والوں سے ملواؤں۔''

پھر جب جہانگیر نے اسے سب سے ملوانا شروع کیا تو وہ ان کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔ جہانگیر کی نانی زینت بیگم اس قدر باوقار اور حسین عورت تھیں کہ وہ ان سے مرعوب ہوکر رہ گئی پھر ان کی ساری کزنز اور بہنیں ایسی پیاری شکلوں کی تھیں اس پر ان کے بات کرنے کا دلنشین انداز ہ دھیمی ہنسی، دل موہ لینے والی ادائیں۔ بے تحاشا قیمتی اور خوب صورت کپڑوں میں لپٹی وہ بہت جلد وکی سے گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔

وکی کتنے ہی لوگوں سے ملتی جلتی چلی آئی تھی مگر اتنے پیارے اور پرخلوص لوگوں سے ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ یہاں آکر اسے بالکل اجنبیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ خاطور پر ثمرہ اور ثمینہ نے اس سے اتنی مہمان نوازی برتی کہ وہ ان کے اخلاق کی گرویدہ ہوگئی۔ جہانگیر نے اس کی بے حد خاطر کیں۔ وہ اس کے آگے پیچھے جارہے تھے اور وکی ہی دل میں شرمندہ ہوتی جارہی تھی۔ دراصل اس کو یہ گمان نہ تھا کہ جہانگیر اتنے اعلیٰ خاندان کی چشم، چراغ ہوں گے۔ اب تک اس کا ملنا جلنا اونچی سوسائٹی میں ہی تھا مگر کسی نواب خاندان کی شان وشوکت اور ٹھاٹھ باٹھ پہلی دفعہ دیکھنے میں آئے تھے۔ وہ سب کو حیران ہو ہو کر دیکھتی رہی۔

پھر وہ تینوں کھانا کھا رہی تھیں۔ جب ہی جہانگیر ان کی طرف چلے آئے۔

''وکی! تم تکلف کررہی ہو اور یہ بہت غلط بات ہے۔''

پھر وہ منع ہی کرتی رہ گئی اور جہانگیر نے اس کی پلیٹ میں کئی چیزیں ڈال دیں۔ ثمرہ کو انہوں نے بری

طرح نظر انداز کر دیا تھا۔ ثمرہ نے اس بات کو بری طرح محسوس کیا اور پہلی دفعہ نظر اٹھا کر بڑے غور سے ان کی طرف دیکھا مگر وہ وکی میں محو تھے۔ تب ہی اس نے ان کی آنکھوں اور چہرے پر وہ خوشی لرزتی دیکھی جیسی خود اس کے چہرے پر جہانگیر کو دیکھ کر لرزتی تھی۔ اس کو شدت کی پیاس محسوس ہوئی اور وہ معذرت کر کے مڑ گئی۔

کھانے کے بعد قوالیوں کا پروگرام تھا مگر وکی ٹھہر نہ سکی کیوں کہ اس کا گھر خاصا دور اور سنسان علاقے میں تھا اور اسے اکیلا جانا تھا۔ جہانگیر اسے باہر تک چھوڑنے آئے۔ اس نے انہیں اپنے گھر آنے کی پرزور دعوت دی جسے وہ رد نہ کر سکے اور اس سے جلد ملنے کا وعدہ کر کے مہمانوں میں آ گئے۔

پھر جب قوالیاں شروع ہوئیں اور وہ اور ثمینہ بیٹھنے لگیں تو جہانگیر بھی آ کر ثمرہ کے برابر میں بیٹھ گئے مگر وہ ان سے نہ کوئی بات کر سکی اور نہ ہی انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ثمینہ کی باتوں کا ہاں ہوں میں جوب دیتی رہی اور جہانگیر اپنے ہی خیالوں میں کھوئے بیٹھے خالی خالی نظروں سے ہر ایک کو دیکھتے رہے۔

وکی سے جلد ملنے کا وعدہ تو انہوں نے کر لیا تھا مگر پھر ایسا ہوا کہ وہ اپنی فرم کی اسٹیبلشمنٹ کے سلسلے میں اس قدر مصروف ہو گئے کہ دو تین ہفتے گزرنے کے باوجود بھی وہ اتنا وقت نہ نکال سکے کہ ذرا دیر کو ہی وکی سے ملنے جا سکتے۔

اس دن بھی وہ بالکل سورج ڈھلنے کے بعد گھر میں داخل ہوئے تھے۔ ملازم کو چائے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے آنے کے تھوڑی دیر بعد میں ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

وکی کا فون تھا اور وہ ان سے بہت شکایت کر رہی تھی کہ اب تک اس کے ہاں ملنے نہیں آئے۔ انہوں نے اس سے معذرت کی اور تھوڑی دیر میں ملنے کا وعدہ کر لیا۔

وہ تیار ہو کر نیچے اترے تو سیڑھیوں پر ہی ثمرہ اور ثمینہ منہ پھلائے ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

''خیریت؟'' وہ باری باری دونوں کی طرف ان کے تے ہوئے موڈ کو دیکھ کر ہنس پڑے۔

''آپ نے صبح کیا وعدہ کیا تھا؟'' ثمینہ نے فوراً پھٹ پڑی۔

''یاد نہیں۔'' وہ انہیں چڑانے کے لیے لاپروائی سے بولے حالاں کہ انہیں خوب یاد تھا کہ انہوں نے پکچر دکھانے اور سینڈوچز کھلانے کا عدہ کیا تھا۔

''صبح آپ نے نہیں کہا تھا کہ تم دونوں کو پکچر دکھاؤں گا۔'' ثمینہ مارے غصے اور ضبط کے لال ہو رہی تھی اور ثمرہ چپ کھڑی تھی۔ دونوں لڑکیاں بے چاریاں ایک گھنٹے سے تیار ہو کر بیٹھی ان کا انتظار کرتی رہی تھیں۔

''اوہو'' وہ تاسف سے بولے ''فیصل کے ساتھ چلی جاؤ۔'' وہ کچھ سوچ کر بولے۔

''نہیں...... اس سے ہماری لڑائی ہے۔'' ثمرہ نے جھٹ انکار کر دیا۔

''ارے وہ کیوں؟'' وہ ہنس پڑے۔

''نہیں۔ اس کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ جانا ہوتا تو ہم آپ سے کیوں کہتے؟'' ثمینہ بھی کسی طرح راضی نہ تھی۔

''اچھا تمہاری دوستی کرا دیں پھر تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟'' وہ دونوں کو کسی طرح ٹالنا چاہ رہے تھے مگر وہ تھیں کہ ٹلنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

''نہیں ہم نہیں جائیں گے اس کے ساتھ۔ وہ اتنی بدتمیزی کرتا ہے۔'' ثمرہ نے ناک چڑھائی۔

''ہاں نہیں تو ساری پکچر کا مزا خراب کر دے گا اور سینڈوچز تو بالکل نہیں کھلائے گا۔'' ثمینہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اب تو وقت بھی نہیں رہا۔ کل سہی'' وہ گھڑی دیکھ کر جلدی سے اترنے لگے۔

''کل تو کبھی آئے گا ہی نہیں۔'' ثمینہ جل کر بولی۔ وہ سنی ان سنی کر کے باہر نکلتے چلے گئے۔

''اب کیا کریں؟'' ثمرہ بے چارگی سے بولی''

ایک گھنٹے سے تیار بیٹھے ہیں۔ سچ میں بڑی بور ہو رہی ہوں اس وقت۔''
''آج تو مجھے ہر صورت میں جانا ہے۔'' ثمینہ بھی ضد میں آ گئی۔ ''اب بھیا سے بالکل بات نہیں کرنا۔ ایسے ہی اڑاتے رہتے ہیں۔ میرا نہیں تو تمہارا ہی کچھ خیال لیتے۔'' ثمینہ نے جو اسے جتایا تو اسے بھی اپنے نظر انداز کیے جانے پر بڑی انسلٹ محسوس ہوئی مگر وہ کچھ نہ بولی۔ ثمینہ نے اب دیکھا کہ اس کا موڈ بری طرح آف ہونے والا ہے تو دھیمے لہجے میں پوچھنے لگی۔
''چلو فیصل سے دوستی کر لیں۔'' لڑائی تو ثمرہ سے ہوئی تھی۔ بیچ میں ثمینہ بھی آ کودی تھی کیوں کہ جب ثمینہ کی کسی سے لڑائی ہوتی تھی تو ثمرہ کا بولنا لازمی تھا۔ یوں دونوں کا فرض تھا کہ لڑائی بھی ساتھ مل کر کریں۔
دونوں بہت سوکھے منہ بنائے فیصل کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ سامنے ہی کرسی پر بیٹھا میز پر ٹانگیں پھیلائے کوئی میگزین دیکھ رہا تھا۔ ریڈیو کی تیز آواز سے پورا کمرا گونج رہا تھا۔ ان دونوں کو آتا دیکھ کر وہ میگزین منہ پر رکھ کر ٹانگیں پھیلا کر سوتا بن گیا۔
ثمینہ نے ثمرہ کو ٹھوکا دیا کہ وہ پہلے بات کرے کیوں کہ لڑی تو وہی تھی۔
''فیصل!'' اس نے بڑے پیارے سے پکارا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔
''پیارے بھائی! ایک بات سنو۔'' ثمرہ پھر لجاجت سے بولی۔ ثمینہ کو ہنسی آ گئی۔ فیصل نے تھوڑا سا اٹھ کر ریڈیو کی آواز فل کر دی اور پھر پہلے کی طرح لیٹ گیا۔
ثمینہ نے پہلے ریڈیو بند کیا اور پھر جو دونوں نے مل کے خوشامدیں شروع کی ہیں تو فیصل کو ہنسی روکنا دشوار ہو گیا۔ وہ دونوں مستقل بولے جا رہی تھیں اور اس کا ہر وہ کام کرنے کا وعدہ کر رہی تھیں جو وہ ان سے کبھی کہتا بھی نہ تھا اور اسے ہنستا دیکھ کر تو دونوں اور بھی زور شور سے منت سماجت میں لگی تھیں۔

''بس...... بس میری رانیوں بس۔'' وہ بے تحاشا ہنسی روکتا ہوا ہاتھ اٹھا کر بولا۔
''اتنے بڑے دعوے مت کرو۔ ابھی جو سزا دوں گا تو بھڑک اٹھو گی۔''
''نہیں نہیں تم جو کہو گے ہم کریں گے۔'' ثمینہ بول پڑی۔ ''بس تم ہمیں لے چلو۔''
''اچھا...... ایک شرط۔'' وہ بہت اکڑ کر بولا۔
''کیا؟'' دونوں سوالیہ نشان بنی کھڑی تھیں۔
''پہلے وعدہ کرو جو کہوں گا وہ کرو گی۔''
''ہاں...... ہاں!'' دونوں اثبات میں سر ہل گئیں۔
صبح ثمرہ نے لڑائی کی تھی اور آپ نے ان کا ساتھ دیا تھا۔'' وہ ثمینہ سے مخاطب ہوا۔
''اس لیے۔'' ثمرہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''آپ سزا کے طور پر اسی وقت میرے جوتے پالش کیجیے۔''
ثمرہ فوراً چلا پڑی۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ثمینہ سے بولا۔ ''آپ کی سزا تھوڑی نرم سی ہے حالاں کہ ہونا نہیں چاہیے تھی بہرحال میرے کپڑوں پر استری کیجیے۔ میں ذرا نہا کر آؤں۔'' وہ نوابوں کی سی شان سے کرسی سے اٹھا اور کھٹ سے غسل خانے کا دروازہ بند کیا۔ ثمینہ نے اتنی سزا پر شکر کیا مگر ثمرہ نے تو نہ جانے کتنی گالیاں دے ڈالیں۔ ثمینہ نے اسے دلاسا دیا۔
''بس ایک برش مار دو۔ ورنہ نہیں لے جائے گا۔ کیا فائدہ۔'' دونوں مل کر کوستی رہیں۔ وہ اپنے اگلے پچھلے بدلے اسی طرح نکالتا تھا۔
پھر وہ بڑی شان سے تیار ہو کر دونوں پر خواہ مخواہ کا رعب جماتا رہا۔
''اپنے پیسے نکالو۔ میں ایک پائی بھی خرچ نہیں کروں گا اور خبردار جو سنیما ہال میں کچھ کھانے پینے کی بات کی۔ ندیدیاں ہر وقت رال ٹپکاتی رہتی ہیں ہر چیز پر۔'' دونوں غصے سے لال پیلی چپ چاپ اس کی بکواس برداشت کرتی رہیں۔
ادھر جہانگیر وکی کے یہاں پہنچے تو وہ سراپا انتظار

بنی کھڑی تھی۔انہیں دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھ آئی۔
''تم اتنے دن سے آئے کیوں نہیں؟ میں روز انتظار کیا۔'' وکی نے بڑے ناز سے شکوہ کیا۔
''سچ؟'' وہ بے یقینی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا دیے۔
''ہوں۔'' اس کی بھیگی بھیگی نیلی آنکھیں اور چمک اٹھیں۔
''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم میرا انتظار کرتی رہیں تو میں آج بھی نہ آتا۔'' وہ شرارت سے بولے۔
''کیوں۔'' وکی فوراً ناراض ہوگئی۔
''اس لیے کہ.....'' وہ ذرا جھجکے۔ ''اس لیے کہ تم اور شدت سے انتظار کرتیں اور پھر مجھے اچانک دیکھ کر تمہاری آنکھوں میں جو چمک اٹھتی تو تم اتنی حسین لگتیں کہ.....'' وہ رک کر ہنس پڑے۔ ''تم اس وقت بھی اتنی حسین لگ رہی ہو کہ مجھے کوئی تشبیہ سمجھ میں نہیں آرہی۔''
ان کی بات سن کر وکی دھیمے سے مسکرادی۔
''کیا تمہیں اب بھی اندازہ نہیں کہ میں تمہارا کتنا شدت سے انتظار کرتی رہی؟''
''وکی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑے ناز سے شکوہ کرتی رہی اور جہانگیر اپنی کوتاہی پر بڑے دلنشین انداز میں معذرت کرتے رہے تھے۔
''آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ اپنی اس لاپروائی پر سخت پشیمانی ہے۔
وہ شوخی سے اس کے سامنے جھکے۔ مسکراتے ہوئے اتنے اچھے لگ رہے تھے کہ وہ سب شکوہ شکایت بھول گئی۔ ان کے اس انداز پر زور سے ہنس پڑی اور پھر ان کا بازو تھامے انہیں اندر لے گئی۔
اس دن وہ وکی کے ڈیڈی اور ماما سے ملے۔ وکی کی مما بہت خوب صورت تھیں بالکل وکی طرح۔ اس عمر میں وہ اتنی اسمارٹ اور چاق و چوبند تھیں کہ وکی کی بڑی بہن لگتی تھیں۔ انہوں نے بھی جہانگیر کو بے حد پسند کیا اور بڑی دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے پھر وکی انہیں اپنے اسٹوڈیو میں لے گئی۔ وہ اس کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ بڑی اچھی آرٹسٹ تھی حالاں کہ ابھی اسٹوڈنٹ تھی مگر پھر بھی اس کے فن میں بڑی پختگی تھی اور ایک انفرادیت بھی پائی جاتی تھی۔ وہ اس کی ایک ایک تصویر کو دیکھتے رہے۔ سراہتے رہے اور وکی مارے خوشی اور جوش کے سرخ ہوتی رہی۔
پھر وہ دونوں آؤٹنگ کے لیے نکل گئے۔ ان دن انہوں نے ڈھیر ساری باتیں کیں۔ وکی میٹھے پان بڑے شوق سے کھاتی تھی جہانگیر نے سنا تو انہیں بڑی ہنسی آئی وہ دیر تک ہنستے رہے۔
''میں روز ایک میٹھا پان کھاتی ہوں۔ سچ جب میرے ہونٹ اور زبان لال ہوجاتے ہیں مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔'' وہ اتنی معصومیت سے کہہ رہی تھی کہ انہیں بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔
پھر جب وہ دو تین گھنٹے وکی کے ساتھ گزار کر گھر لوٹے تو وہ دونوں فیصل کے ساتھ پکچر دیکھنے گئی تھیں۔ وہ یہ سوچ کر ہی ہنس دیے کہ فیصل نے انہیں کتنا پریشان کیا ہوگا پھر انہیں لے گیا ہوگا۔ وہ اس کی فطرت سے واقف جو تھے پھر انہوں نے سوچا کہ وہ کل ان دونوں کو ضرور پکچر دکھائیں گے اور جہاں وہ کہیں گی وہاں لے جائیں گے۔
دوسرے دن اتوار تھا اور صبح سے وہ دونوں فیصل اور احمر کے ساتھ بیٹھی کیرم کھیلتی رہیں۔ لاؤنج میں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا کیوں کہ وہ دونوں مستقل بے ایمانی کرر ہے تھے۔ وہ دونوں لڑکیاں مسلسل ہار رہی تھیں اور ان سے لڑے جا رہی تھیں پھر بھی اسی امید میں جمی بیٹھی تھیں کہ اس بورڈ میں ان شاء اللہ ضرور ہرادیں گے۔ وہ دونوں فیصل اور احمر سے اس قدر برابری سے زبان چلا رہی تھیں کہ جہانگیر حیران رہ گئے کیوں کہ وہ دونوں ان سے تین چار سال بڑے تھے مگر وہ کسی کو بھائی وائی نہیں کہتی تھیں۔ ٹھاٹ سے سب کے نام لیتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا۔
''تم کوئی ہمارے نانا، دادا جتنے تھوڑی ہو جو ہم تمہیں بھائی جان کہیں۔ تین چار سال کی بڑائی بھی

کوئی برائی ہوتی ہے۔"

پھر سب لڑکے تھک ہار کر بیٹھ گئے کیوں کہ وہ اور زیادہ انہیں چڑاتی تھیں۔ انہوں نے ٹوکنا چھوڑ دیا تو وہ خود ہی راہ راست پر آ گئیں۔ فیصل چڑ کر کہتا تھا۔

"اصل میں ان سب کا دماغ دادی حضور نے خراب کیا ہے۔ کسی کو اپنے آگے کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ ہماری اماں بنی بیٹھی ہیں۔"

حقیقت بھی یہی تھی کہ اور لوگوں کے برعکس زینت بیگم لڑکوں کے بجائے لڑکیوں کو زیادہ چاہتی تھیں۔ انہوں نے سب کو یکساں آزادی دے رکھی تھی مگر ان کی تربیت اس ڈھنگ سے ہوئی تھی کہ وہ اس کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتی تھیں۔ اپنی من مانی کرتی تھیں اور لڑکوں کو تو بالکل گھاس نہیں ڈالتی تھیں اور اسی لیے سب لڑکوں کی متفقہ رائے تھی کہ وہ سب بہت منہ چڑھی، خود سر اور بدتمیز لڑکیاں ہیں۔ دوسروں پر اچھا تاثر دینے کے لیے بہت میٹھی بن جاتی ہیں۔ بن بن کے بولتی ہیں۔ بالکل میٹھی چھری ہیں اور ان سے زیادہ زبان دراز لڑکیاں سارے جہان میں چراغ لے کے ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملیں گی اور اس وقت تو یہ مثل ان پر بالکل صادق آ رہی تھی۔

"فیصل کے بچے تم نے میری گوٹ کھسکائی ہے۔" ثمرہ لڑ پڑی۔

"جھوٹ نہیں بولو۔ میرا ہاتھ نیچے تھا۔" فیصل بھی دھاڑا۔

"تم جھوٹے ہو۔ میری گوٹ بالکل صاف جا رہی تھی تم نے ادھر کھسکا کر اپنی گوٹ اٹکائی ہے۔" ثمرہ نے چلا کر اپنی گوٹ واپس رکھوا کر ہی دم لیا۔ کھیل پھر شروع ہوا۔ جہانگیر ان کے قریب آ گئے اور بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھتے رہے اور ان کی بے ایمانیوں اور لڑائیوں پر ہنستے رہے۔

پھر ایسا ہوا کہ احمر کی گوٹ پاکٹ ہوتے ہوتے رہ گئی کیوں کہ ثمینہ نے نیچے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں لڑ پڑے۔ فیصل سگریٹ سلگانے کو دوسری طرف جھک گیا۔ ثمرہ نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر بے ایمانی سے دوسری باری لے لی۔ تیسری بار لینے کے لیے اس نے پھر اسٹرائیکر رکھا ہی تھا کہ جہانگیر بول پڑے۔

"ارے..... ارے بے ایمانی کر رہی ہو۔ کتنی باریاں لوگی؟"

"آپ چپ رہیں۔ آپ کون ہوتے ہیں، دخل دینے والے؟" وہ تڑخ کر بولی اور پھر چھنگلی دکھاتے ہوئے بولی "آپ سے ہماری کٹی ہے۔"

جہانگیر کو اس کا طرز تخاطب بہت ناگوار گزرا۔ ثمرہ نے واقعی بہت بدتمیزی سے بات کی تھی۔ وہ تیز لہجے میں بولے۔

"تمیز سے بات کیا کرو ثمرہ ورنہ میں تمہارا دماغ صحیح کر دوں گا۔" اور تیز تیز قدموں سے لاؤنج سے نکلتے چلے گئے۔

وہ چاروں ایک دم سناٹے میں آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد فیصل نے یاد دلایا کہ کھیل ادھورا پڑا ہے مگر ثمرہ تیزی سے کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر سیڑھیاں پھلا اوپر چلی گئی اور تینوں ہونق بنے بیٹھے رہ گئے۔ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

پھر تھوڑی دیر بعد کپڑے بدل کر نیچے آئی اور کسی کی طرف دیکھے بغیر دادی حضور کے کمرے میں گئی اور پھر وہاں سے نکل کر اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور ان لوگوں سے قریب سے ہو کر گزر گئی۔

"ثمرہ!" ثمینہ نے اسے پکارا۔ اس کے پیچھے جانے لگی مگر فیصل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پھر بٹھا دیا۔

"جانے دو۔ اس وقت بہت زیادہ چڑی ہوئی ہے اور دماغ کھائے گی۔"

"مگر پتا تو چلے کہاں جا رہی ہے؟" ثمینہ بے چاری پریشان ہو گئی۔

"پوچھوگی تو تھپڑ ہی کھاؤ گی۔ اسے جانے دو۔ وہ کوئی غلط کام تو نہیں کرے گی۔" فیصل نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔

احمر بالکل چپ بیٹھا تھا۔ بہن کی بے عزتی اسے بھی شاق گزری تھی مگر ایک تو جہانگیر اس سے بہت بڑے تھے پھر ثمرہ کے منگیتر بھی تھے اور سب سے بڑی

بات یہ کہ ثمرہ نے اس وقت واقعی بدتمیزی کی تھی۔ وہ انہیں کسی طرح بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

ثمرہ اور ثمینہ تو ان سے چڑی بیٹھی تھیں کیوں کہ وہ ان کو پروگرام کے مطابق لے نہیں گئے تھے پھر دونوں مستقل ہار رہی تھیں۔ کچھ اس بات کا بھی غصہ تھا جو ثمرہ ان کے ٹوکنے پر یوں چیخ اٹھی۔ بہر حال اس وقت ثمرہ کے جانے کے بعد سب ہی اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

وہ سارا دن ثمرہ نے اپنی سہیلی نیٹو کے گھر گزارا۔

اور جہانگیر...... وہ وکی کو ساتھ لیے شہر سے باہر پر فضا مقام پر سارا دن گھومتے رہے۔

شام کو ثمرہ اور نیٹو پکچر دیکھ کر لوٹیں۔ وہ اسے چھوڑنے ڈرگ روڈ پر نکل آئی۔ نیٹو کا گھر ریسٹورنٹ کے ساتھ والی سڑک پر اندر کچھ دور جا کر تھا۔ ثمرہ نے جیسے ہی مین روڈ سے گاڑی اندر سڑک پر موڑی۔ اس کی نظر جہانگیر پر پڑی۔ وہ اپنی گاڑی سے اتر رہے تھے مگر وہ اکیلے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی۔ ثمرہ نے کار آہستہ کر لی پھر انہوں نے دیکھا کہ جہانگیر نے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر وکی کو سہارا دے کر اتارا تھا۔ وکی گہرے نیلے جینز اور زرد بلاؤز میں اپنے کندھے تک پڑے بالوں کو نیلے اور زرد پرنٹ کے بڑے خوب صورت اسکارف سے باندھے جہانگیر کا ہاتھ پکڑے پکڑے اتری اور پھر جہانگیر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اسے ریسٹورنٹ کے اندر لے گئے۔

''ارے سامنے دیکھ ثمرہ!'' نیٹو کے یکا یک چیخنے پر وہ گھبرا کر زور سے بریک دبا بیٹھی اور گاڑی کے سامنے اچانک آنے والا بچہ بال بال بچ گیا۔

نیٹو کو گھر پر چھوڑ کر واپس آتے وقت شدت سے اس کا دل چاہا کہ وہ بھی اتر کر اندر جائے اور جہانگیر کو اپنی موجودگی جتا دے مگر پھر اسے دادی حضور کا خیال آ گیا جو اتنی زیادہ آزادی کی قائل نہیں تھیں کہ اکیلی لڑکیاں اس قسم کے پوش ریسٹورنٹ میں جا جا کر کافی پیالیاں اڑائیں اور پھر خود اس کی کیا وقعت رہ جاتی جہانگیر کی نظروں میں۔ جن کے خیال میں وہ بگڑی ہوئی مغرور اور بدتمیز لڑکی تھی۔

پھر وہ مغرب ہونے سے پہلے گھر میں داخل ہوئی تھی اور اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی تھی اور جہانگیر کی واپسی بارہ بجے رات کو ہوئی تھی۔

کئی دن گزر گئے۔ ثمرہ آپ ہی آپ ٹھیک ہو گئی۔ وہی ہنسی مذاق اور کھیل تماشے پھر شروع ہو گئے۔ ثمرہ اور جہانگیر آپ ہی آپ بالکل غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ دونوں میں بات چیت بالکل بند تھی۔ جہانگیر گھر میں ٹکتے ہی کب تھے۔ ان کی فرم نے کئی دن ہوئے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ کافی جم چکے تھے اور ان کا معمول بن گیا تھا کہ آفس سے آ کر ایک ڈیڑھ گھنٹا آرام کرتے اور پھر بن سنور کر نکل جاتے۔ رات کا کھانا بھی گھر پر شاذ و نادر ہی کھاتے تھے۔ سب ہی سمجھتے تھے کہ نئی نئی فرم ہے ابھی کام شروع ہوا ہے اس لیے انہیں بہت لوگوں سے ملنا پڑتا ہوگا۔

حقیقت ثمرہ کو معلوم تھی کہ ان کی شامیں کہاں گزرتی ہیں۔ صرف وہی جانتی تھی کہ اس کی شامیں وکی کے ساتھ گزرا کرتی ہیں۔

☆☆☆

جہانگیر اور وکی کی ملاقاتوں کو چھ مہینے گزر گئے۔ وہ ہر دوسرے دن اس سے ملا کرتے تھے۔ ان دن بھی وہ بڑے اہتمام سے تیار ہو کر گھر سے نکلے تھے۔ وکی نے انہیں اپنے گھر رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ وہ وکی کے یہاں پہنچے تو بڑی خاموشی تھی اور اس خاموشی کو پیانو کی ہلکی سی آواز توڑ رہی تھی۔ گاڑی پورچ میں روک کر وہ ورانڈے میں آ گئے۔ اندر سے پیانو پر پیاری دھن کی آواز آ رہی تھی۔

وہ کال بیل بجائے بغیر ہی بڑی بے تکلفی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ان کے قدم بے اختیار رک گئے۔ اس قدر فسوں خیز ماحول تھا۔ بڑی بڑی موم بتیاں جل

رہی تھیں اور ان کی روشنی نے خواب ناک ماحول پیدا کر دیا تھا۔ جس نے ان کے حواسوں پر عجیب سا تاثر چھوڑا تھا اور اب سے بڑھ کر خود کا وجود۔

وہ نارنجی سی سادی سی ساری پہنے تھی۔ پیانو پر رکھی بڑی سی موم بتی کی پوری روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ جس سے اس کے چہرے کی رنگت میں لالیاں سی گھل رہی تھیں اور نیلی آنکھیں چمک کر اور بھیگی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے نارنجی لپ اسٹک لگے ہونٹوں پر اتنی پیاری مسکراہٹ تھی کہ جہانگیر اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ وہ مسلسل اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی اور پیانو بجاتی رہی۔ ہونٹوں پر وہی پیاری سی مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ وہ از خود رفتہ حالت میں اس کی طرف بڑھ گئے اور اس کے بالکل سامنے جا کر پیانو پر ہاتھ ٹیک کر اس کی طرف جھک گئے۔ اس نے دھن ختم کر کے اپنے دونوں ہاتھ جہانگیر کے ہاتھوں پر رکھ دیے۔ جہانگیر نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

''یہ کینڈل پارٹی کس خوشی میں ہے؟'' وہ چاروں طرف دیکھ کر بولے۔

''آج میری برتھ ڈے ہے۔'' وہ آنکھیں بند کر مسکرا دی۔

''سچ؟...... تم نے مجھے کل کیوں نہیں بتایا؟'' جہانگیر نے شکایت کی۔

''اس لیے کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم میرے لیے کوئی تحفہ لاؤ۔'' وہ آنکھیں کھول کر ہنس دی۔

''کیوں؟'' جہانگیر کی پریشانی شکنیں پڑ گئیں۔

''میں اپنا تحفہ تم سے خود مانگوں گی۔'' وہ ان سے قریب ہو گئی۔

جہانگیر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وکی نے اپنا ہاتھ ان کے منہ پر رکھ دیا۔

''بس...... باقی باتیں کھانے کے بعد۔'' وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ چھوٹی گول میز پر دو بڑی خوب صورت برتھ ڈے کینڈلز جل رہی تھیں اور ایک چھوٹا سا برتھ ڈے کیک......

کھانا انہوں نے بے حد خوشی سے کھایا۔ جہانگیر بے حد کوشش کے باوجود کوئی بات نہ کر سکے۔ وکی بھی سر جھکا کر کھاتی رہی۔ اس کی مختصر باتوں کا وہ ہاں ہوں میں جواب دیتے رہے۔

کھانے کے بعد وہ دونوں لان میں نکل آئے۔ وکی خاموش تھی اور جہانگیر اس کی خاموشی سے الجھ رہے تھے۔

''کیا کسی بات پر ناراض ہو یا......؟'' وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھی۔

''میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔''

''پھر اتنی خاموشی کیوں ہے؟''

''میں اپنے آپ کو اس بات کے لیے تیار کر رہی ہوں کہ تم اگر وہ چیز مجھے نہ دے سکے جو میں تم سے مانگوں گی تو......!''

''تم مانگ کر تو دیکھو۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولے۔ ''تم میری جان بھی مانگو گی تو میں انکار نہیں کروں گا۔''

''جہانگیر!'' وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ ''تمہاری جان اتنی ازراں نہیں کہ اسے مجھ جیسی ہستی مانگے۔ تم جو میرے لیے جانے کیا بن گئے ہو۔'' وہ ان کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں تک لے گئی۔ اس کی آنکھوں کی نمی جہانگیر کے ہاتھوں میں آ گئی۔

وہ شدت جذبات سے کچھ بول نہ سکے۔ وکی نے سر اٹھا کر ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے دھیمے انداز میں مخاطب کیا۔

''میں تم سے تمہیں مانگ رہی ہوں جہانگیر! میں صرف تمہیں چاہتی ہوں۔''

جہانگیر جو پہلے ہی شدت جذبات سے مغلوب تھے اب دلی مراد بر آتے دیکھ کر مارے خوشی سے گنگ رہ گئے۔ کچھ جواب نہ دے سکے۔

''تم شاید یہ سوچ رہے ہو کہ ہم دونوں کے درمیان مذہب کی دیوار حائل ہے مگر یقین کرو یہ بالکل کھوکھلی دیوار ہے ہم ایک جھٹکے میں گرا سکتے ہیں۔ میں تمہاری خاطر اپنا مذہب بدلنے کا فیصلہ کر چکی

ہوں۔ میں تمہارے لیے مما ڈیڈی کو بھی چھوڑ سکتی ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی مگر وہ برابر بولتی رہی۔

"پچھلے ایک ہفتے سے میری مما اور ڈیڈی سے مستقل بحث اور لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ وہ دونوں مجھ سے سخت ناراض ہیں کیوں کہ وہ دونوں کٹر مذہبی ہیں مگر میں ان کو اپنا اٹل فیصلہ سنا چکی ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جہانگیر! کیا تم اب بھی مجھ کو ٹھکرا دو گے؟" اس کی نیلی آنکھوں سے آنسو پھسل پھسل کر جہانگیر کے ہاتھوں میں جذب ہوتے رہے۔

"تم نے ایسا کیوں سوچا۔ ایسا کیوں کہا کہ میں تمہیں ٹھکرا دوں گا۔" جہانگیر نے اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا تو وہ ان کے سینے سے لگ کر سسک پڑی۔

"تم میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہو وکی! کیا تم اتنے دنوں میں میرے جذبات کا اندازہ نہیں لگا سکیں۔ جب تم میرے لیے اتنا کر سکتی ہو تو میں اس سے بڑھ کر تمہارے لیے کر سکتا ہوں۔ کیا تمہیں مجھ پر ذرا اعتماد نہیں تھا؟ انہوں نے شکایت کی تو وہ آنسوؤں کے درمیان مسکرا دی۔

"اسی اعتماد کے سہارے تو اتنا بڑا قدم اٹھانے کی جرأت کی ہے۔ تم دیکھ لینا۔ اعتماد کچے دھاگے کی طرح نہیں ہوگا۔ ہم اسی اعتماد سے اپنی منزل پالیں گے۔" جہانگیر اسے یوں ہی سینے سے لگائے رہے اور سوچتے رہے کہ اب انہیں بہت ثابت قدمی سے طوفان سے نمٹنا ہوگا جو ثمرہ سے ان کی آٹھ سال پرانی منگنی ٹوٹنے پر برپا ہوگا۔

پھر انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کل ہی خود زینت بیگم سے بات کریں گے۔

☆☆☆

پھر دوسرے دن تنہائی میں موقع پا کر جب جہانگیر نے بہت ہمت کر کے زینت بیگم سے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ شیرنی کی طرح دھاڑ اٹھیں۔

"تم کو اتنی جرأت کیسے ہوئی تم نے کیا سمجھ کر یہ بات کی ہے؟ تمہاری اتنی خودسری کہ تم ہمارے اتنے پرانے فیصلے کے خلاف آواز اٹھاؤ۔ یاد رکھو جہانگیر! ہم اپنے لاڈ و پیار میں خودسری برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم سونے کا نوالہ کھلاتے ہیں مگر شیرنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تم نے ہماری بے عزتی کی ہے۔ ثمرہ ہماری ایک ہی پوتی ہے۔ تم نے اس کی بے عزتی کی ہے۔ یہ ہمارے خاندان کے وقار کا مسئلہ ہے۔ تم نے ہماری بیٹی کو ٹھکرا دیا ہے۔ ہم اپنے خاندان کی یہ تذلیل برداشت نہیں کر سکتے۔" وہ گرجتی دھاڑتی رہیں۔ انہیں سخت سست کہتی رہیں مگر وہ ان سب کے لیے اپنے آپ کو اچھی طرح تیار کر کے آئے تھے۔

"گستاخی معاف نانی حضور! مجھے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق ہے اور میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔" ان کے خاموش ہوتے ہی جہانگیر بڑے آہستہ سے بولے تو وہ ان کے بات پر بری طرح بھڑ گئیں۔

"آٹھ سال پہلے بھی تم نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا فیصلہ کیا تھا۔ ثمرہ تمہاری پسند تھی۔ تم نے خود ہی اسے اپنانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ہم نے تمہاری پسند کو ملحوظ خاطر رکھ کر تم دونوں کو انگوٹھیاں پہنائی تھیں۔"

"اس وقت کی بات دوسری تھی۔ اب میں۔" وہ ان کی بات کاٹ کر بولیں۔

"اب تم ساری دنیا گھوم آئے ہو اس لیے تمہاری پسند کا معیار بھی بدل گیا ہے مگر یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اور نہ اتنی آسان جتنی تم سمجھ رہے ہو۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ سات سال دیار غیر میں رہ کر تم جب سنہرے جالوں سے بچتے رہے ان میں یہاں آ کر کیسے گرفتار ہو گئے؟"

"نانی حضور! آپ کی سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں مگر اب میرا ذہن اور دل بندھن کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔" جہانگیر رضا اپنی بات پر اڑے رہے۔

"بہر حال یہ ہمارے پورے خاندان کا معاملہ ہے۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارے اس قدم سے خاندان کے تعلقات پر اثر پڑ سکتا ہے۔ اس حویلی میں جو پیار اور خلوص تمہیں ملا ہے وہ اور کہیں نہیں ملے گا اور تمہارے

اس فیصلے سے اس حویلی کا سارا سکون تباہ ہو جائے گا۔ جاؤ، ایسا کوئی قدم نہ اٹھانا جو یہاں کے سکون کو تباہ کرے۔" وہ ان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولیں۔

"میں نے اسی لیے کسی کا سہارا لیے بغیر آپ سے بات کی ہے کیوں کہ آپ کے فیصلوں پر ہی سب منحصر ہے۔ رہی کشیدگی کی بات تو یہ سب وقتی بات ہو گی۔ کچھ دن ماحول میں ضرور کشیدگی رہے گی مگر یہ تو سوچیں کہ میں اور ثمرہ زندگی بھر ایک دوسرے کے بن کر بھی ایک نہ بن سکیں گے کیوں کہ میں اسے کچھ نہ دے سکوں گا۔ میں اپنا سب کچھ وکی کو دے چکا ہوں۔ آپ نے فیصلہ نہ بدلا تو ہم دونوں کے ساتھ ساتھ وکی کی زندگی بھی تباہ ہو جائے گی اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔" ان پر کسی بات کا اثر نہیں تھا۔

زینت بیگم مارے غصے کے لرز گئیں مگر بڑی جہاندیدہ عورت تھیں۔ اپنے جذبات پر قابو پا کر بولیں۔

"جہانگیر! ہم تمہیں وقت دیتے ہیں۔ ایک ہفتے تک سوچو خوب اچھی طرح ساری باتوں کو مدنظر رکھ کر سوچو۔ امید ہے کہ تم کچھ مناسب فیصلہ کر سکو گے۔"

"میرے فیصلے میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں۔" وہ اکڑے کھڑے رہے۔

"اب تم جا سکتے ہو۔ یہ بات صرف ہمارے درمیان رہے گی۔ ہم نہیں چاہتے کہ ثمرہ کو کوئی صدمہ پہنچے۔ ہم تمہارے فیصلے کا انتظار کریں گے۔" جہانگیر ایک لفظ کہے بغیر دروازے سے باہر نکلتے چلے گئے اور زینت بیگم جو ان کی اس قدر بے ادبی کی متحمل نہ ہو پا رہی تھیں۔ تھکے تھکے انداز میں سوچ میں ڈوب گئیں۔

"ثمرہ کا کیا ہو گا؟"

"اس کو جب پتا چلے گا تو کیا سوچے گی؟"

مگر وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ ثمرہ ان کی کمرے کی بالکونی میں کھلنے والی کھڑکی کے نیچے بیٹھی سب کچھ سن چکی ہے۔

لیکن وہ یہ سب کچھ سن کر نہ تو سکتے میں آئی نہ اسے ہسٹریا کا دورہ پڑا۔ وہ اس کے لیے اپنے آپ کو بہت پہلے سے تیار کر رہی تھی۔ وہ بہت گہری تھی۔ سوچ سوچ کر پاگل ہو گئی تھی۔ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی تھی مگر آخر کار اپنے آپ کو اس بات کے لیے تیار کر چکی تھی۔ جہانگیر کے رویے سے اور سب سے بڑھ کر خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لینے کے بعد اسے اپنی قسمت کے پلٹ جانے کا پورا یقین ہو گیا تھا مگر وہ زبردستی ان کی زندگی میں داخل ہونے کی قائل نہیں تھی۔ اس چھ سات ماہ کے عرصے میں اس نے کیسے کیسے اپنے جذبات پر پہرے بٹھائے تھے اور اسی لیے اتنے لوگوں میں سے کوئی بھی اس کی کسی بات سے کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ حتیٰ کہ ثمینہ بھی جس کا اس کے ساتھ چوبیس گھنٹے کا ساتھ دیا۔

اتنی بڑی بات ہو گئی تھی مگر ان تینوں کے سوا کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ جہانگیر کو زینت بیگم سے بات کیے پورا ہفتہ گزر گیا تھا۔ وہ یہ پورا ہفتہ اڑے اڑے پھرے۔ نہ کسی سے بات کرتے نہ کسی کے پاس بیٹھتے۔ گھر میں بہت کم نظر آتے۔ زینت بیگم ان کی ساری مصروفیات دیکھ رہی تھیں اور انہیں جہانگیر کے کسی انداز سے بھی یہ نہ لگتا تھا کہ وہ جھک جائیں گے اور جہانگیر کو تو کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کیوں کہ وہ تو اٹل فیصلہ کر ہی چکے تھے اور یہ پورا ہفتہ وکی کے ساتھ گھوم پھر کے ان کا فیصلہ بالکل چٹان کی طرح ہو گیا تھا۔

اس دن وہ خلاف معمول دس بجے رات کو ہی گھر لوٹ آئے۔ اس وقت ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ سب لوگ نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کپڑے بدل کر باہر نکلے تو اس وقت تک خاصی تیز بارش ہو رہی تھی۔ وہ بارش دیکھنے یوں ہی گیلری میں چلے آئے۔ تب ہی ان کی نظر ثمرہ پر پڑی۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ تیز روشنی باہر آ رہی تھی اور وہ خود اپنے کمرے کے سامنے درانڈے میں ریلنگ پر جھکی ہوئی باہر جھانک رہی تھی۔ جہانگیر آہستہ آہستہ قدموں چلتے ہوئے اس کے پاس جا کھڑے ہوئے اور پھر انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ پوری طرح بھیگ چکی تھی مگر بالکل بے خبر سی کھڑی تھی حتیٰ کہ اسے ان کے آنے کا علم بھی نہ ہوا۔

☆☆☆

''ثمرہ!...... یہاں کھڑی کیوں بھیگ رہی ہو؟ بیمار پڑ جاؤ گی۔ اندر جاؤ۔'' اسے اس طرح بھیگتے دیکھ کر وہ نرمی سے بولے۔

''بہتر تھا کہ مجھے کہنے کے بجائے آپ خود چلے جاتے۔ ناحق کھڑے بھیگ رہے ہیں۔'' وہ مڑ کر ان کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔

جہانگیر بھی خاصے بھیگ چکے تھے۔ ثمرہ کی بات پر کچھ نہ بولے۔ اسے ایک نظر دیکھا۔ گلابی شلوار اور کرتا بھیگ کر جسم سے چپک گئے تھے اور ٹھنڈی ہوا لگنے سے وہ ہولے سے کانپ رہی تھی۔ انہوں نے سر جھکا کر نیچے لان میں ایک نظر ڈالی۔

''کل دادی حضور کی دی ہوئی مہلت ختم ہو رہی ہے۔'' وہ سیدھی ان کی آنکھوں میں دیکھتی کہتی گئی۔

جہانگیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔

''فیصلہ تو یقیناً نہیں بدلا آپ کا کیوں؟''

''تو تم سب کچھ سن چکی ہو۔'' جہانگیر نے گہری سانس لی۔

''نہ بھی سنتی تو کیا فرق پڑتا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ مجھے پہلے ہی سب کچھ معلوم تھا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

جہانگیر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

''آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کی جاسوسی کرتی رہی ہوں۔ آپ کے رویے نے مجھے بہت پہلے ہی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور پھر میں نے اتفاق سے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ آپ کو وکی کے ساتھ دیکھا تھا اور جس انداز میں دیکھا تھا وہ مجھ پر ساری حقیقت آشکار کرنے کے لیے کافی تھا۔'' وہ مطمئن سی کھڑی بولتی رہی۔

جہانگیر منہ پھیرے کھڑے تھے۔ وہ کچھ نہ بولے تو پھر اس نے بڑے چبھتے ہوئے لہجے میں ان سے پوچھا۔

''کیا آپ دادی حضور کا سامنا کرتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔''

اس کے لہجے اور جملے پر جہانگیر بھنا گئے۔

''مجھے نانی حضور کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ میں انہیں پہلے ہی اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں۔''

''اور فیصلے میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں۔'' وہ بات کاٹ کر بولی تو وہ پھر بھنا گئے۔

''یقیناً۔''

''پھر کس بات پر جھجک رہے ہیں آپ؟'' وہ انہیں پوری طرح زچ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

''مجھے صرف دوسرے گھر والوں سے اندیشہ ہے۔''

''آپ کو ان سے اندیشے کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے تیزی سے بولی۔

''جہانگیر چپ کھڑے رہ گئے۔ وہ تھوڑ سا آگے آ کر ان کے مقابل ہو گئی اور ان کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بے باکی سے بولی۔

''اگر میں آپ سے پہلے ہی سب کے سامنے اس رشتے سے انکار کر دوں تو آپ کو کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہو گی اور رہی میں تو مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں سب سے ٹکرا سکوں۔ اب آپ اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیے۔ جا کر اطمینان سے سو جایئے اور ذرا مجھے بارش کا لطف اٹھانے دیجیے۔''

جہانگیر ایک دم مڑ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔ ان کے جاتے ہی وہ ریلنگ پکڑ کر اسی طرح جھک گئی کہ جیسے اس سے خود اپنا وجود سنبھالنا مشکل ہو رہا ہو۔ وہ بھیگتی رہی اور بارش کے قطروں کے ساتھ ساتھ آنسو اس کے گالوں سے بہتے ریلنگ کے ساتھ لگی کیاری میں گرتے رہے۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔ جہانگیر کہیں نہیں گئے۔ صبح سے ہی وہ نیچے لاؤنج میں سب کے ساتھ بیٹھے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ تاش کھیلتے رہے اور چائے کے دور چلتے رہے۔ وہ انتظار کرتے رہے کہ ثمرہ اب آئے گی، اب آئے گی مگر اس انتظار میں صبح سے دوپہر ہو گئی۔ وہ نیچے ہی نہ اتری نہ اپنے کمرے سے نکلی۔ انہیں فکر ہوئی کہ کہیں وہ بیمار نہ پڑ گئی ہو۔

انہوں نے کیرم کھیلنے کے بہانے سے نادیہ کو اسے بلانے بھیجا مگر وہ اکیلی واپس آ گئی۔

"ثمرہ آپی تو آرام سے لیٹی کتاب پڑھ رہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں ختم کر کے ہی اٹھوں گی۔"

اور جہانگیر کھول کر رہ گئے۔ وہ تو اس قدر بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے کہ کسی طرح ان کی مشکل آسان ہو۔ اور وہ بے نیاز آرام سے پڑی کتابیں پڑھ رہی تھی۔ انہوں نے دل میں سوچا۔ رات کو جھوٹ بول رہی ہوگی۔ بڑا کر کہہ رہی تھی۔ اب تھوڑی ہمت ہوگی انکار کرنے کی۔ خواہ مخواہ ہی سارا دن اس کے پیچھے خراب کیا۔

دوپہر کے کھانے پر بھی ثمرہ نہ آئی۔ زینت بیگم نے اسے بلوالیا تو اس نے کہہ دیا کہ کتاب بہت دلچسپ موڑ پر ہے وہ اسے نہیں چھوڑ سکتی۔ زینت بیگم نے اس کا کھانا کمرے میں ہی بھجوادیا۔

"کتابوں کا کیڑا ہے۔ دیکھ لو صبح سے چپکی بیٹھی ہے۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا ہوش۔"

زینت بیگم ایسے دلار سے کہہ رہی تھیں جیسے وہ کوئی ننھی سی بچی ہو جو کھانے سے نخرے دکھاتی ہو۔ جہانگیر ان سے تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھے سر جھکائے کھانا کھاتے رہے۔ دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتے رہے اور اپنے آپ پر لعنت ملامت کرتے رہے کہ رات انہیں کیا ہو گیا تھا جو وہ اس کی الٹی سیدھی بکواس سنتے رہے اور اسے کوئی منہ توڑ جواب بھی نہ دیا۔

شام کو موسم ایسا پیارا ہو رہا تھا۔ بادل جھکے ہوئے تھے اور رات کو کھل کر بارش ہونے سے سبزہ نکھر گیا تھا۔ مالی نے شاید صبح ہی گھاس کاٹی تھی۔ ہموار نکھری دھلی گھاس آنکھوں کو ٹھنڈک بخش رہی تھی۔ سب کے اصرار پر شام کو لان میں چائے منگوائی گئی۔

"یہ ثمرہ نے صبح سے شکل ہی نہیں دکھائی۔" فیصل کو بڑی حیرت تھی۔

"یہ کہو لڑنے کو کوئی نہیں ملا۔" فراز نے فیصل کو چھیڑا۔

"اور کیا یہ جب تک اس سے دو چار گالیاں نہ کھالیں ان کا دن تھوڑی گزرتا ہے۔" ثمینہ نے بھی فیصل کو چڑایا۔

"واقعی میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ اسے لڑائی نہیں ہوئی تو کھانا ہضم نہیں ہوا۔" فیصل نے ان سب کی ایک ساتھ ہی کچی کر دی۔

"صبح میرے پاس آئی تھی۔" زینت بیگم نے ثمینہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا تو جہانگیر ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ چور نظروں سے زینت بیگم کی طرف دیکھا وہ بڑی مطمئن سی بیٹھی تھیں۔

"بس سلام کر کے چلی گئی۔" جہانگیر پھر ڈھیلے سے ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

زینت بیگم نے ملازمہ کو اسے بلانے بھیج دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہنستی مسکراتی بڑے خوب صورت نارنجی کپڑے پہنے زینت بیگم کے پاس چلی آئی۔ انہوں نے بڑے پیار سے اس کی پیشانی چوم لی۔ سب نے فرداً فرداً اسے پوچھا۔ وہ بڑی تروتازہ بیٹھی چہکتی رہی۔ اس وقت جہانگیر کو اندازہ ہوا کہ وہ سارے گھر کی بہت چہیتی ہے اور خصوصاً زینت بیگم کی تو وہ دلاری ہے۔ وہ ان کی کرسی سے لگی گھاس پر بیٹھی تھی اور ان کی پلیٹ سے میوہ اٹھا اٹھا کر منہ میں ڈالتی جا رہی تھی۔ جہانگیر نے اس پر گہری نظر ڈالی۔ اتنا تروتازہ نظر آنے کے باوجود اس کی آنکھوں کا بھاری پن نہیں چھپ سکا تھا جس پر اس نے یہ جواز دیا تھا کہ وہ سارا دن لیٹ کر پڑھتی رہی ہے۔

سب اپنی اپنی باتیں کر رہے تھے کہ وہ زور سے بول پڑی۔

"دادی حضور! آپ مجھے بہت چاہتی ہیں نا؟"

"میری چاند کو کچھ شک ہے کیا؟" وہ ایسے دلارے سے بولیں کہ سب ہنس پڑے۔

"میں نے آپ سے آج تک کچھ نہیں مانگا۔ کوئی بات نہیں منوائی۔ آج آپ میری ایک بات مان لیجیے۔" وہ ٹھنک رہی تھی۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ کوئی بچپنے کی ضد کرنے والی ہے۔ ماں نے اسے آنکھوں آنکھوں میں تنبیہ کی مگر اس نے دوبارہ ان

کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔'' زینت بیگم ایسا ہی کچھ سمجھیں۔ ''پہلے سب کے سامنے پکا وعدہ کریں۔ میری بات سے انکار نہیں کریں گی۔''

اب سب بڑے اشتیاق سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے جہانگیر کی طرف مسکرا کر ایک نظر ڈالی۔ ان کی کھلی کھلی آنکھوں میں حیرت کی سوا کچھ بھی نہ تھا۔ سمجھ تو وہ گئے تھے کہ وہ کیا منوانا چاہتی ہے مگر اتنی ہمت اور جرأت کی انہیں قطعی امید نہ تھی۔ اس نے جو کہا تھا وہی کر دکھانے والی تھی۔ وہ خود ایسا کر سکتے تھے۔ کبھی بھی نہیں۔

''چلو پکا وعدہ کیا۔ اب بولو تو سہی۔''

''تو پھر یہ......'' اس نے دھیرے دھیرے منگنی کی انگوٹھی انگلی سے اتاری اور زینت بیگم کے سامنے کر دی۔ ''منگنی کی انگوٹھی عاتکہ پھوپھو کو واپس کر دیجیے۔''

''ارے۔''

''یہ کیوں؟''

''یہ کیا بات ہوئی بھئی؟''

''سب ہی کچھ نہ کچھ بول پڑے۔

بڑی بہو بیٹی کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئیں اور عاتکہ بے یقینی سے کبھی بھتیجی کو اور کبھی اپنے بیٹے کو جس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک اٹھی تھیں۔

''ثمرہ! ہم صرف اس کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔'' زینت بیگم کا لہجہ یکسر بدل گیا تھا سب دم بخود بیٹھے تھے۔

''اس کی کوئی وجہ نہیں۔'' ثمرہ آہستہ سے بولی۔

''بغیر کسی وجہ کے ہم تمہارا کوئی عذر، کوئی فیصلہ قبول نہیں کر سکتے۔''

انہوں نے اتنے سخت لہجے میں کہا کہ ثمرہ برداشت نہ کر سکی۔ ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رو دی۔

''دادی حضور! آپ نے سب کے سامنے وعدہ کیا تھا۔ آپ کو میری بات ماننا پڑے گی۔ پلیز دادی حضور! مان لیجیے۔'' وہ سر اٹھائے اتنی التجا سے ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ سسک رہی تھی کہ ان کا دل لرز گیا۔ اس کی آنکھوں میں انہیں اس کے ٹوٹے سپنوں کی کرچیاں نظر آ گئیں اور وہ اس لمحے جان گئیں کہ وہ ایسا کرنے پر کیوں مجبور ہو گئی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''جب اتنی جرأت سے سب کے سامنے انکار کیا ہے تو پھر اسی ہمت سے کام لے کر یہ بھی بتا دو کہ تم نے اپنے بارے میں اور کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''مجھے کچھ عرصے کے لیے عامر بھیا کے پاس بھیج دیجیے۔'' وہ تھوڑا سا رک کر بولی۔

''اور جہانگیر کو شادی کی اجازت دے دیجیے۔''

وہ اتنا کچھ کہہ گئی تھی کہ صورت حال سب پر واضح ہو گئی۔ جہانگیر کسی سے نظریں ملانے کی ہمت نہ پا رہے تھے۔ ملازمت بھری نظریں ان پر گڑی تھیں اور وہ پانی پانی ہوئے جا رہے تھے۔

''آج تک مجھے تمہارے اوپر فخر تھا جہانگیر! مگر آج میرا دل رو رہا ہے۔ کاش تم میرے بیٹے نہ ہوتے۔'' عاتکہ ندامت کے مارے رو پڑیں۔

''دادی حضور! پھوپھو سے کہیے جہانگیر کو کچھ نہیں کہیں۔ شادی کی تیاریاں کریں اور اسی دھام دھام سے وکی کو دلہن بنا کر گھر لائیں۔ میرے جانے سے پہلے یہ نیک کام کر دیجیے۔'' ثمرہ اس استقلال سے بولی مگر کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف عاتکہ کی سسکیاں خاموشی کو توڑتی رہیں۔

پھر اس کے لندن جانے کی تیاریاں، جہانگیر کی شادی کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ ہوتی رہیں۔ ثمرہ نے ٹھیک کہا تھا۔ جہانگیر سے کسی نے باز پرس نہ کی۔ عاتکہ بھی سب کچھ بھول کر شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔ وہی پرخلوص اور پرسکون ماحول لوٹ آیا۔

پھر ایک شام جہانگیر وکی کو دلہن بنا کر لے آئے۔ اس کا اسلامی نام مریم رکھا گیا۔ ثمرہ کے جانے کے دن قریب آ گئے۔

صبح ہی صبح اس کی فلائٹ جانا تھی۔ رات سب اس کے کمرے میں جمع رہے۔ ثمینہ بے تحاشا اداس ہو رہی تھی۔

''ثمرہ! تم چلی جاؤ گی پھر میں کیسے رہوں گی؟''

تو کیا ہوا؟ کچھ دن کی بات ہے پھر میں تمہیں بھابی بنا کر لے جاؤں گی۔" ثمرہ زور سے بولی تو سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور ثمینہ کٹ کر رہ گئی۔

وہ سب بے تحاشا بول رہے تھے اور اسے جلد سے جلد واپس آنے کی تاکید کر رہے تھے پھر رات گئے وہ سب شور مچاتے ہوئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ثمینہ وہیں رہ گئی۔

ثمرہ! مجھے اب تک یقین نہیں آتا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔" ثمینہ کو اس بات کا بے حد صدمہ تھا۔

"پھر تمہیں کیڑے نے کاٹا۔" ثمرہ نے اس کی بات اچک لی۔

"تم اس موضوع پر بات کرتے کیوں گھبراتی ہو؟" ثمینہ چڑ گئی۔

"کیا فائدہ ہوگا تمہیں اس سے؟" وہ بیزاری سے بولی۔

"تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی۔ ثمرہ! تم نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ تم نے مجھ سے پوچھا تک نہیں اور اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔"

"فیصلہ میں نے نہیں میری قسمت نے کیا تھا۔" ثمرہ اطمینان سے بولی۔

"سب بکواس ہے۔ ہم خود اپنی قسمت بناتے ہیں۔ منزلیں ڈھونڈتے ہیں۔ انہیں ٹھکراتے ہیں۔ اتنے پرانے بندھنوں کو توڑ دیتے ہیں۔" اس نے ڈائریکٹ ثمرہ پر چوٹ کی تو وہ بلبلا اٹھی۔

"کس بندھن کی بات کر رہی ہو؟ جو کچے دھاگے ہوتے ہیں۔ میرا اور جہانگیر کا عناد اور محبت کا بندھن تھا اور یہ بندھن ایسے ہوتے ہیں کہ ذرا سا جھٹکا بھی نہیں سہار سکتے۔ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ مجھے بتاؤ ایسے بندھنوں میں جکڑ کر انسان کہاں جائے؟" ثمینہ کچھ نہ بولی تو وہ تھوڑی دیر چپ ہو کر پھر بولی۔

"جہانگیر میری منزل نہیں تھے۔ میں نے انہیں نہیں ٹھکرایا ہے۔ انہوں نے پہلے اس بندھن کو ٹھیس لگائی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ بزرگوں کے سامنے میں نے پہل کی ہے کیوں کہ وہ ڈرتے تھے۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ بزرگوں سے ٹکر لے سکتے۔" پھر جذبات کی روانی میں آ کر وہ سب کچھ ثمینہ کو بتا گئی۔

جہانگیر کی وکی سے ملاقاتیں، ان کا اس کے ساتھ برتاؤ اور زینت بیگم سے بات چیت کا رتی رتی حال اس نے ثمینہ کو بتا دیا۔

"اور اب میں جا رہی ہوں اس لیے کہ میرے سامنے کوئی منزل نہیں ہے۔ میں جہانگیر تو بھولنا چاہتی ہوں کہ آئندہ زندگی میں اس شخص کے ساتھ ناانصافی نہ کروں جو مجھے سہارا دے گا۔ آٹھ سال کی ذہنی رفاقت معمولی بات نہیں ہوتی۔ میں نہیں چاہتی کہ میں کسی دوسرے انسان کو دھوکا دوں۔ مجھے پتا ہے دادی حضور کیا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں میں اتنے لوگوں میں سے کسی ایک کا ہاتھ تھام لوں مگر تم خود سوچو ثمینہ! میری جگہ پر اپنے آپ کو رکھ کر سوچو۔" وہ بے چارگی سے بولتی رہی۔

"میں جہانگیر کو پوری طرح بھلا دوں گی۔ ان کی ایک یاد، ایک ایک بات اپنے ذہن سے کھرچ کر نکال دوں گی اور جب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گی تو اس شخص کا ہاتھ تھام لوں گی جو سب سے پہلے میری منزل بن کر آگے آئے گا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ کچے دھاگوں سے بندھے رشتوں کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہے۔ خدا کرے تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے ہمیشہ دعا کروں گی کہ تم جلد سے جلد اپنی منزل پا لو۔ ایسے بندھن میں بند جاؤ جو کچے دھاگے نہ ہوں۔"

ثمینہ رو رہی تھی اور وہ دریچے سے باہر تاریکیوں میں جھانک رہی تھی جہاں اس کی نظر بھٹک بھٹک کر جہانگیر کے کمرے کی طرف اٹھ جاتی۔ اس نے تھک کر آنکھیں موند لیں اور دریچے سے سر ٹکائے ثمینہ کو روتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اس کے اپنے آنسو خشک ہو چکے تھے پھر اس نے آگے بڑھ کر ثمینہ کو اپنے بازوؤں میں اس طرح لے لیا جیسے اسے کبھی نہ جدا ہونے دے گی۔

☆☆

کچھ عشق تھا کچھ مجبوری

بشریٰ مسرور

شجر آسمانوں کو چھونے لگیں تو ان کے سائے زمین پر نہیں پڑتے۔ اولادیں جوان ہوجائیں تو ماں باپ ان کے لیے بوجھ بن جاتے ہیں۔ ایسے ہی ستم رسیدہ بوڑھوں کی کہانی، انہیں کسی گوشئہ عافیت کی تلاش تھی۔

گھر گھر کی کہانی، معاشرے میں موجود یہ کردار آپ کو ہر جگہ نظر آئیں گے

انہوں نے توتے کا پنجرہ بجھے دل کے ساتھ اپنی پڑوسن کو پکڑایا۔

''لو بھئی! سنبھال لو اسے، ہم تو چل دیے۔ بس زندگی باقی رہی اور خدا لایا تو پھر آئیں گے، ورنہ آج کے بعد ان بے زبانوں کے ساتھ تمہارا بھی اللہ نگہبان۔'' بسم اللہ بیگم نے ٹوکرے میں بیٹھی اپنی لال اور سفید مرغیوں پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور لگیں پڑوسن کے گلے لگ کر آنسو بہانے۔

''اور سنو سکینہ بی! قسم سے میرا مری کا ہی منہ دیکھو جو میرے مٹھو اور لالو، چندوں کا خیال نہ رکھ سکو تو۔'' انہیں اس طرح روتے دیکھ کر پڑوسن کا بھی دل بھر آیا اور وہ بھی لگیں اپنے آنسو پونچھنے۔

''تم فکر ہی نہ کرو بہن! تمہاری لالو اور چندو تو بالکل میری اپنی مرغیوں کی طرح انہی کے ساتھ رہیں گی اور تمہارے مٹھو میاں کو بھی کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔''

''اللہ تمہارا بھلا کرے بہن!'' بسم اللہ بیگم نے دل سے دعا دی اور دفعتاً یاد آجانے پر جلدی سے آنسو پونچھ کر اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چابی برآمد کی اور سکینہ کی جانب بڑھادی۔

''یہ رکھ لو۔ میرے گھر کی چابی ہے۔ ہوسکے تو کبھی کبھار وہاں کی صفائی ستھرائی کروادیا کرنا اور گملوں میں لگے پودے بھی یوں پڑے کہیں سوکھ ہی نہ جائیں لہٰذا تم سارے گملے اٹھوا کر اپنے ہاں رکھوالینا۔'' پھر اپنے بڑے سے آنچل کا پلو کھول کر اس میں سے ہرے رنگ کا ایک مڑا تڑا نوٹ نکالا اور سکینہ بی کی مٹھی میں دبادیا۔

''اوئی...... یہ کیا......؟'' سکینہ بی یوں بدکیں جیسے ہتھیلی پر کسی سانپ بچھو نے ڈنک مارلیا ہو۔

''ارے رکھو لو......'' بسم اللہ بیگم نے اصرار سے ان کی مٹھی دبائی۔ ''بس میرے مٹھو کو کبھی کبھار امردو اور ہری مرچ منگوا کر ڈال دیا کرنا۔ بڑے ہی شوق سے ایسی چیزیں کھاتا ہے۔ نامراد، میں نے خود ہی اس کی عادتیں بگاڑ رکھی ہیں اور یہ کمبخت لالو......!'' انہوں نے ٹوکرے میں اطمینان سے بیٹھی ہوئی مرغی پر پیار بھری نظر دوڑائی۔

''کبھی کبھار تو اس کے نخرے ہی نہیں لیے پڑتے، بچی کچھی روٹی کے ٹکروں یا آٹے کی مروڑیوں پر تو منہ ہی نہیں مارتی کمبخت! تب میں اسے بازار سے گندم کے دانے منگوادیتی ہوں۔''



”ارے تو کیا ہوگیا پھر؟...... میں کرلوں گی ناں سب، تم کیوں فکر کرتی ہو؟“ سکینہ نے نے روپے لوٹانے چاہے۔

”نہیں...... مگر تم یہ بھی رکھ لو۔ بلکہ اگر کم سمجھو تو بے شک اور مانگ لو۔“ انہوں نے دریا دلی دکھائی تو سکینہ بی خوامخواہ شرمسار ہوگئیں۔

”کیسی باتیں کررہی ہو؟“ لوتم ناراض ہوتی ہو تو یہ رکھ لیے۔“ کہہ کرانہوں نے نوٹ اپنے گریبان کی گہرائی میں منتقل کرلیا۔

”ارے خالہ! سحری بھی کرلی تھی ناں اچھی طرح سے؟“ سکینہ بی کی بہو نے مرغیوں کو آٹے کی مروڑیاں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بھئی اور تمہارے بجھوائے ہوئے سوجی کے حوالے نے تو سحری میں پراٹھوں کے ساتھ خوب ہی مزا دیا۔“ انہوں نے خوش دلی سے تعریف کی تو بی سکینہ کی بہو مسکرادی۔

”وہ سحری وافطاری کے اوقات والا کیلنڈر تو سنبھال لیا تھا ناں؟“ سکینہ بی نے ان سے یاددہانی کی خاطر پوچھا۔

”اے لو...... وہ بھی کوئی بھولنے والی شے تھی۔ صندوق میں سب سے اوپر رکھا ہے۔“

”تو بس وہاں قیصر میاں سے لندن اور پاکستان کے اوقات کا فرق نکوا کر اسی حساب سحر وافطار کرلیا کرنا۔“ سکینہ بی نے ہدایت دی۔

”ہاں قیصر خود بھی تو خیر سے روزے رکھتا ہی ہوگا۔ پاکستان میں جب تک رہا کبھی میرے بچے نے نماز قضا نہ کی، نہ کوئی روزہ چھوٹا۔“ بسم اللہ بیگم نے فخر سے گردن تانے جواب دیا۔

''اے خالہ! اگر مولوی بصیر الدین تمہارے بارے میں پوچھ بیٹھیں تو بھلا کیا بتائیں ہم ان کو؟'' بی سکینہ کی بہو نے شرارت سے انہیں چھیڑا۔

''ارے خاک، اس منحوس کی صورت پر، وہ بھلا میرا خصم ہے جو مجھے پوچھے گا۔ مل گیا کہیں تو دیکھنا......'' وہ جانے کیا کہنے جارہی تھیں کہ قیصر نے لکڑی کے دروازے پر لگی زنجیر کھٹکھٹائی۔

''اب آبھی جایئے نہ اماں! ابھی تو لاہور ایئر پورٹ تک بھی جانے میں کافی وقت لگ جائے گا۔ گلی میں قیصر کی بیزار سی آواز گونجی تو بسم اللہ بیگم جلدی سے اپنا کہا سنا معاف کراتیں اپنے بند گھر پر حسرت بھری نظر ڈال کر شٹل کاک برقعے کے دونوں پٹ گرائے اور ہاتھ میں ٹین کی صندوقچی تھامے بیٹے کے پیچھے گلی میں نکل آئیں۔

سامنے ہی مولوی بصیر الدین برکاتی کی کریانے کی دکان تھی اور وہ دکان کے اندر لپٹن کی پڑیوں کے ہار تلے حسرت بھری نگاہوں سے بسم اللہ بیگم کو دور جاتا دیکھ رہے تھے۔

بسم اللہ بیگم نے بھی یکدم انہیں دیکھا تو نجانے کیوں بے اختیار دل دھڑک سا اٹھا اور برقعے میں آنکھوں کے آگے بنی جالی تلے، وہ نظریں جھکائے تیزی سے گلی کی نکڑ پر کھڑی بیٹے کی گاڑی کی جانب پیچھے بڑھ گئیں۔

☆☆☆

لندن کی حوالات میں آہنی سلاخوں کے پیچھے شدت غم سے نڈھال بسم اللہ بیگم نے مرے مرے قدموں سے آتے ہوئے اپنے بیٹے کو دیکھا تو گرم آنسوؤں کا لاوا جیسے گالوں پر بہہ نکلا۔

اس بڑھاپے میں شاید اسی ذلت کا سامنا کرنے کے لیے تو وہ ہزاروں میل سفر طے کر کے بیٹے کے ساتھ لندن آئی تھیں ورنہ تو کیسی عزت و آبرو سے اپنے گھر میں رہتی تھیں۔ بطور خاص رمضان المبارک میں تو اس وقت وہ اپنے لیے افطاری بنایا کرتی تھیں اور آج یہاں بند اپنے نصیب کو کوس رہی تھیں۔

پھر قیصر نے آکر انگریزی زبان میں جانے ان پولیس والوں سے کیا کٹ پٹ کی کہ وردی میں ملبوس ایک لمبے تڑنگے آفیسر نے آخر اپنی کمر کی پیٹی سے منسلک چابی سے لاک اپ کا تالا کھول کر انہیں باہر نکالا اور اپنے ہمراہ لیے قیصر کے پاس چلا آیا۔

قیصر کو دیکھ کر وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں اور دوڑ کر بیٹے سے لپٹ گئیں اور لگیں بھوں بھوں رونے۔ آخر قیصر نے مشکل سے انہیں چپ کرایا اور نرمی سے انہیں اپنے سے الگ کرتے ہوئے پولیس افسروں سے معذرت کرتے ہوئے ہاتھ ملایا اور آنسو بہاتی ماں کو ساتھ لے کر باہر چلا۔

کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بھی وہ سسکیاں بھرتی اور دوپٹے کے پلو سے اپنی ناک اور آنکھیں رگڑتی رہیں اور قیصر جبڑے بھینچے چپ چاپ ڈرائیو کرتا رہا۔

کافی آگے جاکر بالآخر اس نے کار ایک ریسٹوران کے سامنے روک لی۔

''آیئے اماں! ...... آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی، پہلے کچھ کھا پی لیں پھر بعد میں گھر چلتے ہیں۔'' قیصر نے دوسری طرف سے آکر ان کے دروازے کا لاک اور وہ چپ چاپ بیٹے کے پیچھے۔ ریسٹوران میں چلی آئیں جہاں ٹرکش برگرز، اٹالین کباب اور چاکلیٹ کافی کی ملی جلی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو ناک میں پہنچی تو بھوک کا احساس از خود انگڑائی لے کر پیدا ہوگیا ویسے بھی وہ روزہ دار تھیں۔ اس لیے وہ خود ہی اندازے سے سحری کے وقت بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے باورچی خانے میں جاکر جو مل جاتا کھا پی کر خدا کا شکر ادا کرتیں اور روزے کی نیت کر لیتیں اور کل رات بھی محض دو سوکھے سلائس، ایک پیالہ دودھ کے ساتھ نگل کر انہوں نے روزہ رکھ لیا تھا مگر افطار کا وقت گزرے بھی کافی وقت گزر گیا تھا اگرچہ روزہ اپنے وقت پر افطار نے کی نیت بڑھ چکی تھیں مگر اس کے بعد محض تھوک نگل کر رہ گئی تھیں چوں کہ سلاخوں کے پیچھے بند انہیں کیا ملتا۔

کچھ ہی دیر میں جب ویٹرس اٹالین برگرز، سر کے میں ڈوبی ہری مرچوں کے ترکی اچار اور سپینش چکن لیگز کافی کے بڑے بیگ کے ساتھ لے کر آئی تو ان کی آنکھیں دوبارہ جل تھل ہونے کو تیار تھیں۔

''اتنا کچھ کیوں منگوالیا قیصر؟ میں کہاں کھاسکوں گی یہ سب۔ میرے لیے تو بس ایک چائے کا پیالہ اور بن کافی ہوتا۔'' انہوں نے سادگی سے کہا۔

''جتنی بھوک ہو آپ اتنا کھالیں باقی کا آپ کی سحری کے لیے پارسل بنوالیں گے۔'' اس نے ہولے سے کہہ کر سگریٹ سلگالی اور جیب سے کوئی کاغذ نکال کر اس پر کچھ نوٹ کرنے لگا۔

اور پھر کچھ ہی دیر بعد جب وہ دوبارہ کار میں بیٹھی بیٹے کے ہمراہ اس کے گھر جارہی تھیں تو قیصر نے ہی سکوت توڑا۔

''آپ ابھی تک یہاں کے ماحول کی عادی نہیں ہوئیں شاید'' جواباً انہوں نے سسکی بھری اور اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور ناک رگڑی جو پہلے ہی رونے دھونے کے باعث لال ٹماٹر ہورہی تھی۔

حالانکہ ابھی تو انہیں لندن آئے مہینہ بھر بھی نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی انہوں نے اپنے حساب سے تو مزاج میں بے پناہ تبدیلیاں پیدا کرلی تھیں، اپنی تمام عادات کو از سر نو ترتیب دیا تھا۔ ان کی انگریز بہو نامناسب لباس پہنتی۔ وہ چپ چاپ دیکھتی رہ جاتیں۔ پوتا ان کے سامنے اپنی گرل فرینڈ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پھرتا۔ وہ کچھ نہ کہتیں۔ گھر میں ڈانس پارٹیاں ہوتیں اور بستر پر کان لپیٹے پڑی رہتیں۔ ہائے کیسے طمطراق وہ بیٹے کے ساتھ لندن آئی تھیں۔ سوچا تھا فرمانبردار بیٹا خدمت کرے گا۔ پوتا پوتی ان کے آگے پیچھے گھوم کر نت نئی کہانیوں کی فرمائش کریں گے۔ نیک سیرت بہو ان کا خیال رکھے گی۔ بھلا اس سے بڑھ کر اور حسین بڑھاپا اور کیا ہوگا کہ جب قیصر کو سالانہ وار چھٹیاں ہوں گی تو وہ لگے ہاتھوں بیٹے اور بہو کے ساتھ عمرے کی ادائیگی کو چلی جائیں مگر لندن آکر ان کی تمام توقعات پر پانی پڑ گیا تھا کیوں کہ ان کی بہو اور بیٹا دونوں علی الصباح کام پر نکل جاتے تو پھر دن ڈھلے ہی گھر لوٹتے، قیصر کے علاوہ کسی کو گھر میں اردو نہیں آتی تھی۔ دو عدد پوتا پوتی بھی اپنی ماں کے نقش قدم پر گامزن تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے۔ ایسے میں بسم اللہ بیگم کو گویا قید تنہائی کاٹا کرتیں چوں کہ قیصر بھی بس نپی تلی بات کرتا، البتہ ماں کو گھریلو مشینوں کا استعمال پہلی فرصت میں سکھا دیا تھا تاکہ وہ اپنے کام خود انجام دے سکیں اور کپڑے دھونے اور چائے بنانے جیسے معمولی نوعیت کے کاموں کے لیے کسی کی محتاج نہ ہوں مگر وہ رشتوں کی محبت دل میں جگائے باقی گھر والوں کے کام بھی اپنے ذمے لیتی گئیں، برتن، کپڑے دھونے کے علاوہ صفائی ستھرائی اور گھر کی جھاڑ پونچھ تو وہ کر ہی دیا کرتیں مگر اس کے علاوہ بھی کچن کے کئی کام چابکدستی سے نمٹا لیتیں۔ تبھی تو ان کا وجود ان کی یورپین بہو کو غنیمت لگا کرتا۔

چوں کہ لندن جیسی جگہ پر گھریلو ملازم افورڈ کرنا ناممکن ہی تھا اور ابھی بھی بیٹے کو شکایت تھی کہ وہ نئے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کرپائی تھیں۔ یہ ان کی بدنصیبی ہی تو تھی...... تبھی وہ بس روئے گئیں۔

''دیکھیے اماں!'' قیصر نے نرمی سے سمجھایا۔'' یہاں کوئی بات بری نہیں سمجھی جاتی اور نہ ہی یوں کھلے بندوں لڑکے اور لڑکیوں کا آپس میں میل جول کوئی معیوب بات سمجھی جاتی ہے پھر اگر سارہ کا کوئی بوائے فرینڈ گھر آہی گیا تھا اسے ملنے کے لیے تو اس میں آپ کے اتنے شدید ردعمل کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔''

بسم اللہ چورسی بن گئیں...... ''مگر قیصر...... وہ...... وہ...... وہ لڑکا...... سارہ کے ساتھ......'' ان کی پیشانی عرق ندامت سے تر ہوگئی۔ چہرہ سرخ پڑ گیا اور زبان نے اس سے آگے ساتھ دینے سے انکار کردیا۔ اب وہ بیٹے کو کیسے سمجھاتیں کہ انہوں نے پوتی کو کس حالت میں دیکھا تھا۔ وہ بے چاری تو شامت کی ماری صرف سارہ کے کمرے میں سے دھونے کے

لیے میلے کپڑے اٹھانے کے لیے گئی تھیں مگر وہاں جو سین چل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر تو گویا ان کی رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہو گیا۔ اتنی جرأت سارہ کی کہ دادی کی موجودگی ہی میں کمرہ بند کیے اس لفنگے کے ساتھ گلچھرے اڑا رہی ہے۔ کوئی لحاظ و شرم کا پاس نہیں؟

''ٹھہر جا کمبخت ابھی بتاتی ہوں تجھے۔ مسٹنڈا کہیں کا، ہمارے ہی گھر میں ہماری ہی عزت سے کھیلنے آیا ہے۔ ہماری بھولی بھالی بچی کو پھنسا لیا......''

انہوں نے اتاری جو جوتی اور لگائیں دو چار اس لڑکے کے۔ وہ تو الٹے پاؤں واپس بھاگ لیا مگر سارہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ان کے آگے آ کھڑی ہوئی اور انگلی اٹھا اٹھا کر لگی انہیں کچھ تنبیہ کرنے۔ وہ اس وقت سخت غصے میں تھی۔

''ٹھہر جا ابھی تیرا عشق کا بھوت اتارتی ہوں۔'' انہوں نے پھر اپنی آستینیں چڑھائیں اور سارا پر پل پڑیں۔

''نامراد! ...... بے حیائی! ...... خاندان کی عزت خاک میں ملانے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ صلہ دیا ہے باپ کے لاڈ پیار کا؟ آ لینے دے باپ کو، جو شام تک تیرا نکاح نہ پڑھوا دیا کسی اچھے مسلمان لڑکے سے تو کہنا......''

سارا کون سا کم تھی، اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے دادی کو نوچ کر رکھ دیا۔ وہ انگریزی میں چلا رہی تھی اور یہ اردو میں چیخ رہی تھیں۔ بوڑھا دم تھا کب تک جوان اور مستی کے نشے میں چور خون سے مقابلہ کرتیں......؟ ناچار بے دم ہو کر صوفے پر جا گریں اور سارہ ان کی گرفت ڈھیلی پا کر جو نکلی تو سب سے پہلے دادی کو کمرے کے اندر ہی لاک کیا اور پھر پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بھاگتی ہوئی گیلری میں آئی اور کانپتے ہاتھوں سے پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

باہر کے ملکوں کا قانون اٹھارہ سال سے کم عمر بچوں کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کرتا ہے، اتنا کہ ان کی مرضی کے بغیر کوئی ان کو انگلی بھی نہیں لگا سکتا اور یہاں تو دادی نے چودہ سالہ سارہ پر جوتیوں کی بارش کر دی تھی، نتیجتاً میں پولیس پلڑ کر لے گئی۔

بیٹے کے پیچھے تقریباً چھپ کر چلتی ہوئیں جب وہ اس کے فلیٹ میں داخل ہوئیں تو پوتی کمر پر ہاتھ رکھے کھا جانے والی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی اور ان کی ڈچ بہو کے تیور بھی کچھ کم خطرناک نہیں تھے لہٰذا وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے ایک کونے میں لگے اپنے بستر کی جانب بڑھ گئیں اور لحاف میں منہ چھپا کر پڑ رہیں جب کہ بیٹا اور بہو کے تیز تیز بولنے اور جھگڑنے کی آواز ان کے کانوں کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ بہو تو جارحانہ انداز میں حملہ آور ہو رہی تھی اور بیٹا دفاعی پوزیشن سنبھالے ہوئے تھا۔

انہیں اپنے کیے پر پچھتاوا ہونے لگا۔ خواہ مخواہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا اور جذبات میں آ کر بچے کے لیے مصیبت کھڑی کر دی۔ پہلے ہی بیچارا پرائے دیس میں غیر لوگوں کے درمیان ایسے رہ رہا تھا جیسے بتیس دانتوں تلے زبان، اوپر سے یہ نئی مصیبت آ گئی میری بدولت۔ ان کا دل بجھ گیا اور آنکھیں جلنے لگیں۔

''اماں! آج اپنا سامان پیک کر لیجیے گا، سہ پہر تین بجے والی فلائٹ سے آپ واپس پاکستان جا رہی ہیں۔'' صبح کام پر جاتے ہوئے قیصر نے انہیں اطلاع دی۔

''مگر میں اکیلی کیسے جاؤں گی قیصر......؟ مجھے تو راستوں کا بھی علم نہیں......'' وہ جہاز کا اکیلے سفر کرنے سے گھبرا گئی تھیں۔

''آپ فکر مت کیجیے۔ میرا ایک دوست اسی فلائٹ سے پاکستان جا رہا ہے۔ وہ آپ کا پوری طرح سے خیال رکھے گا۔'' قیصر نے تسلی دلائی۔ بحث کا نہ موقع تھا نہ کوئی گنجائش، سو چپ ہو رہیں۔ ویسے بھی کل کے واقعے کے بعد اب انہیں یہاں پر رہنا خود بھی بہت اذیت ناک لگ رہا تھا۔ سو واپس جانے میں ہی عافیت تھی۔

جب چلتے وقت ایئر پورٹ پر قیصر نے جیب

سے ہزار پاؤنڈ نکال کر ان کی مٹھی میں تھمائے اور نظریں جھکا کر دھیرے سے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔

''اماں! مجھے معاف کر دینا۔ میں آپ کی کوئی بھی خدمت نہیں کر سکا۔'' تو ایک بار پھر ان کا دل بھر آیا۔ بیٹے کی بے بسی تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی چکی تھیں چناں چہ ایڑیاں اٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

''مجھے بھی معاف کر دینا میرے لعل! میں اس تنگ نظر معاشرے میں بسنے والی ایک ایسی بیوہ عورت ہوں جو اگر ایک بار سر پر بیوگی کی چادر ڈال لے تو دوبارہ سہاگ کا آنچل اوڑھنا ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بھی تو......'' نجانے کیسے بے خیالی میں ان کی زبان سے یہ فقرہ پھسل گیا۔

قیصر چونک پڑا اور وہ خود نظر چرا گئیں۔

جہاز کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا۔ قیصر کا دوست بھی پہنچ چکا تھا لہٰذا وہ اپنے پر الوداعی نظریں ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

لاہور پہنچ کر وہ اپنی بیٹی قدسیہ کے ہاں دو روز بمشکل رہیں۔

''بس قدسیہ اب اماں کو جھمرہ نہیں جانے دینا۔ یہیں رہیں گی ہمارے ساتھ۔'' ان کا داماد محبت سے کہتا اور وہ مسکرا دیتیں۔

یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ وہ داماد کے گھر پڑی رہتیں۔ ''پھر کبھی آجاؤں گی۔'' وہ سب کا دل رکھنے کو کہتیں۔

''نانی اماں۔ عید تو ہمارے ساتھ ہی کیجیے گا۔'' ان کی نواسی ضد کرتی۔

''نہیں چندا! تم اپنے ممی پاپا کو لے کر آنا میرے پاس۔ میں تمہارے لیے چوڑی دار پاجامہ اور گوٹے والا کرتا تیار کر کے رکھوں گی۔'' وہ اسے محبت سے ساتھ لگا کر پیار سے تھپکتیں۔

''سچ نانی اماں؟'' اس کی آنکھیں خوشی سے دمک اٹھتیں۔

''ہاں میری گڑیا!'' وہ پیار سے اس کے بال سنوارتیں۔

پھر جب وہ سر پر برقع ڈلائے۔ اپنی ٹین کی صندوقچی ہاتھ میں اٹھائے داماد کے ساتھ موٹر سائیکل پر بس اسٹینڈ جانے کو تیار کھڑی تھیں تو قدسیہ جھجکتے ہوئے کہہ ہی بیٹھی۔

''اماں! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ عید کے بعد آپ ہمارے پاس ہی مستقل طور پر آجائیں؟ ویسے بھی وہاں جھمرے میں اب کون ہے آپ کا؟...... کسی دکھ بیماری میں خدانخواستہ بھلا کون بیٹھا ہے جو آپ کا خیال رکھے گا۔ یہاں تو ہم سب آپ کی خدمت کے لیے موجود ہیں اور پھر...... پھر وہ چک جھمرے والا مکان ویسے بھی خالی پڑا کس کام کا ہوگا اگر آپ اجازت دیں گی تو اسے بیچ کر عارف اپنے کاروبار میں پیسا لگالیں گے۔ آج کل کام مندہ ہی چل رہا ہے۔''

تب ان کی سمجھ میں آیا کہ ان کا سعادت مند داماد کیوں ان کے اتنا آگے پیچھے پھر رہا ہے اگرچہ قدسیہ کی مکان بیچنے والی بات سن کر ان کے دل پر گھونسا پڑا تھا مگر وہ ضبط کر کے مسکرا دیں۔

''اچھا بیٹی! واپس جا کر اس نگوڑے مکان کا بھی کچھ کرتی ہوں۔'' انہوں نے قدسیہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا تسلی دے ڈالی۔

میکا ہی تو کسی لڑکی کے لیے آس و امید کا مرکز ہوا کرتا ہے اور والدین کے گھر کا ہی دیا لیا بیٹی کو سسرال والوں کی نظروں میں بلند مقام عطا کرتا ہے، یہی سوچ کر تو انہوں نے قیصر کے دیے ہوئے پیسے عیدی کا نام کر کے پہلے ہی قدسیہ کو دے دیے تھے اور اب دل ہی دل میں مکان فروخت کرنے کا حتمی فیصلہ کر کے وہ بوجھل دل سے باہر نکل آئیں۔

چک جھمرہ جانے والی بس میں سیٹ کی پشت پر ٹیک لگائے۔ بیتے سمے کی یادیں ایک فلم کی طرح ان کی نظروں میں گھومنے لگیں۔ جب فقط تیرہ برس کی عمر میں بیاہ کے وہ حمید صاحب کے گھر آگئی تھیں

اور سترہ سال کی عمر میں وہ دو بچوں (قدسیہ اور قیصر) ماں بن چکی تھیں۔ اچھی بھلی، خوب صورت زندگی گزر رہی تھی کہ ان کی ساڑھے بائیس برس کی بہاروں بھری جوانی میں ایک دم بیوگی کی خزاں چھا گئی۔ ان کا سسرال اور میکے میں کوئی پرسان حال نہ تھا۔ چوں کہ حمید صاحب تو ویسے ہی سقوط ڈھاکا کے بعد تن تنہا ہی پاکستان آئے تھے اور بسم اللہ بیگم کے ابا نے اپنے دوست کا فرزند ہونے کے ناتے انہیں گلے سے لگا لیا تھا اور اب والدین کی وفات کے بعد بہن بھائی بھی جیسے پرائے ہو گئے تھے۔ تبھی بیوی کے بعد ننھے منے بچوں کی دیکھ بھال کی تمام تر ذمے داری، بسم اللہ بیگم پر آ گئی۔ ہمارے معاشرے میں غریب آدمی ایک بار مرتا ہے اور اس کے پسماندگان ہر روز ایک نئی موت کا مزا چکھتے ہیں چناں چہ بسم اللہ بی تو گھبرا ہی اٹھیں مگر خدا بھلا کرے ان محلے داروں اور خصوصاً مولوی بصیر الدین صاحب کے گھرانے کا جنہوں نے اس مصیبت کے عالم میں بسم اللہ بیگم کے گھرانے کا بھرپور ساتھ دیا۔

مولوی بصیر الدین مسجد کے پیش امام تھے اور اس کے علاوہ مسجد کے مدرسے میں بچوں کو قرآن پاک پڑھانے پر مامور تھے مگر اب انہوں نے کہہ دیا کہ بھئی بچے تو بے شک مدرسہ میں ہی دینی تعلیم حاصل کریں گے مگر بچیاں البتہ بسم اللہ بیگم کے پاس گھر میں جا کر پڑھا کریں۔

اگر چہ بسم اللہ بیگم نے محلے کی بچیوں کو قرآنی تعلیم دینے کی کوئی فیس یا کوئی ہدیہ مقرر نہیں کیا ہوا تھا مگر محلے والے اپنی استطاعت کے مطابق اتنا ضرور کرنے لگے کہ ان کی گزر بسر عزت سے ہونے لگی۔

مولوی بصیر الدین کی بیگم جو بی ملانی کے نام سے مشہور تھیں بڑی ہی نیک اور خدا ترس خاتون تھیں جب بھی جمعرات کے روز مولوی صاحب کے مدرسے کے بچے اہل محلہ سے جمعرات کا کھانا لے کر آتے تو وہ فوراً ٹرے میں پلیٹیں سجائے بسم اللہ بی کے ہاں ان کا حصہ دینے پہنچ جاتیں۔

''کیوں بلاوجہ تکلیف کی؟'' وہ شرمندہ سی ہو جاتیں۔

''بھئی کھانا ہماری ضرورت سے کافی زیادہ تھا۔ مدرسے کے بچوں نے بھی پیٹ بھر کے کھا لیا اور تب بھی بچ رہا تو مولوی صاحب کہنے لگے کہ جا کر بسم اللہ بی کے ہاں دے آؤ۔ وہاں بھی چھوٹے بچے ہیں۔ خوشی سے کھا لیں گے۔'' وہ سادگی سے تفصیل بتاتیں اور تب بسم اللہ بیگم جلدی جلدی برتن خالی کرتیں اور رنگ برنگ زردہ، حلوہ، پلاؤ نان اور نجانے کیا کیا اپنی پلیٹوں میں الٹتیں اور دل ہی دل میں اس پاک ذا کا شکر ادا کرتیں کہ جس نے انہیں بغیر کسی مشقت کے گھر بیٹھے رزق فراہم کیا تھا۔

مگر جاڑوں کی ایک صبح جیسے ہی مولوی بصیر الدین وضو کے لیے اپنے گرم بستر سے نکلے فالج کے حملے کا شکار ہو گئے البتہ یہ بھی غنیمت تھا کہ حملے کی شدت اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ہاتھ پاؤں بالکل ہی رہ جاتے بس ایک ٹانگ میں معمولی سا لنگڑا پن اور زبان میں ہلکی سی لکنت آ گئی تھی۔ چناں چہ بچوں کو قرآن پاک پڑھانے سے خود ہی دستبردار ہو گئے کہ اب زبان کی لکنت کے باعث صحیح تلفظ نہیں کرا پائیں گے۔ کسی زمانے میں کہیں ٹیلر ماسٹر کے پاس کام سیکھا تھا۔ وہ اب آڑے وقت میں کام آیا۔ محلے والے ان سے مردانہ کپڑوں کی سلائی بخوشی کرانے پر تیار تھے۔ بس اب کوئی ایسی جگہ درکار تھی جہاں وہ چار مشینیں رکھ کر دو شاگردوں کو بٹھا کر اپنا کام شروع کر سکتے۔ ان کا اپنا تو ایک ہی کمرے کا مکان تھا جس میں وہ خود مع بی ملانی اور ایک عدد بیٹی کے ہمراہ رہا کرتے تھے۔ تب یہ مسئلہ بسم اللہ بیگم نے انہیں اپنی بیٹھک معمولی کرائے پر دے کر حل کر دیا۔ یوں بھی باہر کی طرف کا یہ کمرا فالتو ہی پڑا تھا۔ بیٹھکیں تو مردوں کے دو قدم سے آباد ہوا کرتی ہیں۔ اب حمید صاحب کے بعد بھلا بیٹھک میں کس کے مہمانوں کو آنا تھا۔ چلو اسی بہانے بیٹھک آباد تو ہو گی، مشینوں کے شور سے ہی سہی۔ اس گھر کا سناٹا تو ٹوٹے گا۔ بسم

اللہ بیگم نے سوچا حالاں کہ سناٹا تو ان کے پورے وجود میں رچ بس گیا تھا۔

یوں مولوی صاحب نے اپنا جمع جتھہ نکال اور اللہ کا نام لے کر بسم اللہ بی کی بیٹھک میں اپنے کام کا آغاز کردیا۔ چند ہی روز میں ان کا کام اچھا بھلا چل نکلا تو بسم اللہ بی نے بھی قیصر کے ہاتھ مکان میں پیغام بجھوادیا کہ اگر مناسب سمجھیں تو کپڑے کی کٹائی کرکے اندر بجھوادیا کریں میں سلائی کرکے دے دیا کروں گی اور جو اجرت بنے دیا کیجیے۔ یوں محنت اور صلاحیت کے دو چراغ روشن ہو گئے۔

اور ایک دن جب وہ ایک مردانہ واسکٹ سلائی کرنے کے بعد استری سے کریز جما کر بیٹھک کا دروازہ اندر سے بجا کر مولوی صاحب کو دینے کے لیے گئیں تو مولوی صاحب نے دروازے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر واسکٹ تھامی اور ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ان کو یہ پیشکش کی کہ اگر وہ چاہیں تو قیصر کو بھی ان کے پاس ٹیلرنگ کا کام سیکھنے بھیج سکتی ہیں۔ بس اسکول سے آکر دو تین گھنٹے ان کی دکان میں لگالیا کرے تو قیصر کو اس کام کا محنتانہ بھی ملا کرے گا۔

مگر ان کا دل نہ مانا، قیصر کے تو ابا مرحوم کی دلی خواہش اسے ڈاکٹر سرجن بنانے کی تھی تاکہ لوگوں کے کھلے ہوئے زخم سیا کرے، نہ کہ تیرے میرے چاک گریبان سیتا پھرے، لہٰذا انہوں نے صاف منع کردیا۔

''نہ مولوی جی! میرا قیصر تو ڈاکٹر بنے گا نہ کہ ٹیلر ماسٹر۔'' اور مولوی بصیر الدین خاموش ہو گئے۔

پھر جانے خدا کو کیا منظور ہوا جو بی ملانی کا ٹائیفائیڈ بگڑا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے چٹ پٹ ہو گئیں۔ اچھے بھلے مولوی بصیر الدین رنڈوے ہو کر مسکرانا بھی بھول گئے۔ دکان پر آتے تو پیچھے جان بچی کے گھر پر اکیلے ہونے کا دھڑکا لگا رہتا۔ کبھی کبھار بسم اللہ بیگم سے درخواست کرتے کہ وہ گھر کا کام کاج ختم کرکے ان کی بیٹی کی طرف چکر لگا ئیں۔

اب وہ کوئی سلا ہوا کپڑا پکڑنے کو بیٹھک کے دروازے سے ہاتھ باہر نکالتے تو بسم اللہ دیکھتیں کہ ان کی لمبی لمبی مضبوط انگلیاں ایسے مرجھائی ہوئی دکھائی دیتیں جیسے ٹوکری میں پڑے پڑے بھنڈیا سوکھ گئی ہوں، آواز کا کرارا پن رخصت ہو گیا اور انہی دنوں انہوں نے اپنی چودہ سالہ زیب النسا کا سادگی سے نکاح کرکے اسے رخصت کردیا اور خود چھڑوں کی سی تنہا زندگی گزارنے لگے۔ تیز مرچ مسالوں والے بازاری کھانے کھا کھا کر معدے میں السر کی شکایت رہنے لگی اور وہ زیادہ تر ڈاکٹر کے کلینک پر نظر آتے۔

''اماں! اس خبیث مولوی سے فوراً ہی اپنی بیٹھک خالی کرالو۔'' ایک دن قیصر اسکول سے واپس آیا تو بستہ ایک طرف پھینک کر منہ پھلائے بیٹھ گیا۔ بسم اللہ بیگم کا دل دھک سے رہ گیا۔

یااللہ خیر، کہیں بچے کے کان میں کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں پڑ گئی۔'' ہوا کیا بیٹا آخر؟'' انہوں نے اپنے آنچل کے پلو سے استے ہوا جھلتے ہوئے کہا۔

''اماں......لوگ کہتے ہیں کہ......کہ......'' قیصر کو سمجھ میں نہ آیا کہ بات کیسے شروع کرے۔ ''بس اماں لوگ آپ کے اور مولوی صاحب کے بارے میں بڑی عجیب وغریب باتیں کرتے ہیں۔'' جذبات کی شدت سے اس کا منہ سرخ ہو گیا۔

''کیا کہتے ہیں لوگ......؟'' انہیں خود اپنی آواز کسی کنویں سے آتی سنائی دی۔

''یہی کہ......آپ اور......مولوی بصیر الدین صاحب......آپس میں نکاح کرنے والے ہیں۔'' قیصر نے جیسے تیسے اپنا فقرہ پورا کیا۔ بسم اللہ بی سن ہو کر رہ گئیں۔

''اگر ایسا ہوا نا اماں!......تو میں......میں زہر کھالوں گا۔'' قیصر نے کہا اور دوڑتا ہوا گلی میں نکل گیا اور وہ گھنٹوں چولہے کے پاس بیٹھی روئے گئیں اور ساتھ ہی قدسیہ پیڑھے پر بیٹھی اپنی حیران نظروں سے انہیں تکتی رہی۔ یہ آج اماں کو کیا ہوا وہ سوچنے لگی۔ بیٹھک خالی کرنے پر مولوی بصیر الدین صاحب کو ذرہ

برابر کوئی اعتراض نہ تھا اور اب تو ویسے بھی بیٹی کی شادی کے بعد ان کے گھر کا اپنا کمرا خالی تھا۔ جسے وہ اپنے مصرف میں لا سکتے تھے چناں چہ اگلے دو چار روز میں انہوں نے بسم اللہ بیگم کی بیٹھک خالی کر دی۔

☆☆☆

اس روز ہانڈی چولہے سے فراغت کے بعد بسم اللہ بیگم سیدانی جی کو بہو کے لیے کروشیے کی شال بن رہی تھیں کہ بی سکینہ آ گئیں اور کچھ دیر بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اصل مدعا زبان پر لے ہی آئیں۔

''آخر کب تک یوں سسک سسک کر اپنی بیوگی کا سوگ مناؤ گی ابھی تو خیر سے جوان ہی ہو اور سامنے اتنی لمبی زندگی پڑی ہے۔ تن تنہا بھلا کیوں کر بسر ہو گی؟ میری مانو بسم اللہ! کسی بھلے مانس انسان سے نکاح کر لو اور یہ اپنے مولوی بصیر الدین صاحب سے بڑھ کر زیادہ شریف اور بامروت آدمی تمہیں کہاں ملے گا۔ ان کا بھی گھر بس جائے گا اور تمہارے بچوں کو بھی باپ کی شفقت میسر آ جائے گی۔ کہو تو آپس کے صلاح مشورے سے نکاح کے لیے کوئی نیک دن مقرر کر لیں۔'' بسم اللہ بیگم کو تو سنتے ہی پتنگے لگ گئیں۔

''اچھا تو اس موئے نے بھیجا ہے تمہیں!...... غیرت نہ آئی ذرا بھی اسے اپنا نکاح کے پیام ایک بچوں والی عورت کو بھجواتے؟...... نظر تو آ جائے ایک بار یہ لنگڑا مولوی کہیں، دوسری ٹانگ بھی توڑ کر ہاتھ میں نہ پکڑا دی تو کہنا...... اور...... سکینہ بی!...... تم تم بھی اس کی ایلچی بنی پیام لیے دوڑی چلی آئیں گویا کسی کنواری حسینہ کے لیے گلفام کا رشتہ لائی ہو۔ صاف کہے دیتی ہوں کہ ایسا ہی پسند ہے مولوی بصیر الدین تو اپنے رشتہ داروں سے کوئی لڑکی بیاہ لاؤ۔'' سکینہ بی تو اس عزت افزائی کے بعد سر پر پاؤں رکھ کر واپس گھر کو بھاگیں۔

مگر وقت کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ اس کا بھلا کسی کو پتا ہے؟ بسم اللہ بی اپنے دھیان میں بیٹھی توے پر روٹی ڈال رہی تھیں کہ اچھی بھلی سیڑھیاں اترتی قدسیہ نجانے کس طرح ٹھوکر کھا کر زمین پر گری اور اس کی پیشانی سے چیتے جاگتے، گاڑھے لہو کا فوارہ سا ابل پڑا، وہ گھبرا کر اٹھیں اور توے پر پڑی روٹی چھوڑ کر بچی کی طرف دوڑیں جس کے تمام کپڑے خون سے رنگین ہو چکے تھے۔ وہ جلدی سے اسے پانی کے نل پر لے گئیں اور زخم پر ٹھنڈا پانی ڈالا۔ برف کی ڈلی رگڑی اس کے علاوہ اور بھی جتنے ٹوٹکے آتے تھے آزما لیے۔ مگر خون تھا کہ بند ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ سکینہ بی بھی ادھر شور و غل سن کر گھر سے پھٹکری کی ڈلی لیے دوڑی آئیں تاکہ چھوٹا موٹا زخم ہو تو مل دیں مگر کہاں......؟

تب بسم اللہ بی نے کھونٹی سے اپنا شٹل کاک برقع اٹھا کر سر پر ڈال اور خون میں تقریباً نہائی ہوئی بچی کو کندھے سے لگائے قریبی ڈاکٹر کے کلینک کی طرف دوڑیں۔ تبھی مولوی بصیر الدین نیکی کا فرشتہ بن کر نجانے کہاں سے اپنی سائیکل پر اس طرف آ نکلے۔

''ارے......!'' قدسیہ کو اس طرح خون میں لت پت دیکھ کر ان کے منہ سے نکلا اور انہوں نے سائیکل روک لی۔

''آؤ قدسیہ بیٹی! جلدی سے سائیکل پر بیٹھ جاؤں میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔'' انہوں نے ایک ہاتھ سے قدسیہ کو اٹھا کر اپنی سائیکل پر آگے بٹھا لیا اور پھر نظریں نیچی کیے بسم اللہ بی سے مخاطب ہوئے۔

''قدسیہ کی ماں! تم چل کر اطمینان سے گھر بیٹھو اور اللہ سے خیر کی دعا مانگو، ہم بس یوں گئے اور یوں آئے۔'' انہوں نے تیزی سے سائیکل پر بیٹھتے ہوئے پیڈل مارا اور لمحے بھر میں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

بسم اللہ بی کو بھلا کہاں قرار آتا؟...... ماملتا کی ماری، برقع سر سے اتارے بغیر وہیں گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر رونے لگیں۔ ''ہائے ...... ! قدسیہ کے ابا خود چلے گئے اور اور مجھے ان ننھے منے پودوں کو سینچنے کے

لیے آزمائش میں ڈال گئے۔" سکینہ بھی ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے انھیں تسلی دے رہی تھیں۔

تب ذرا ہی دیر بعد کیا دیکھتی ہیں کہ مولوی صاحب کی سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھی قدسیہ ہنستی مسکراتی ماتھے پر پٹی بندھوائے، ہاتھ میں نمک پارے بوندی کا لفافہ تھامے آرہی ہے۔

"لو بھئی قدسیہ! اترو اور جا کر اپنی ماں کی تسلی کراؤ، دیکھو تو بے چاری تمہاری وجہ سے کتنا پریشان ہو رہی ہے۔" انہوں نے ہاتھ کا سہارا لگا کر بچی کو سائیکل سے اتارا۔

"بھئی ماشاء اللہ بڑی ہی بہادر بیٹی ہے ہماری ("ہماری" پر بسم اللہ بیگم کا دل دھڑک اٹھا) چار ٹانکے یوں ہنستے کھیلتے لگوا لیے کہ پتا تک نہیں چلا۔ تم ایسے ہی گھبرا رہی تھیں۔" پھر سائیکل کے کیریئر میں سے دواؤں کا لفافہ بسم اللہ بی کو پکڑایا اور نصیحت کی۔ "یہ لال شربت ابھی گھر جاتے ہی بچی کو دو چمچے پلا دینا اور باقی دوائیں صبح دوپہر ایک ایک چمچہ کر کے دینا ہیں۔"

وہ برقعے کی اوٹ بنائے۔ اپنی انگلی کی پوروں سے آنسو صاف کرتے مولوی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بچی کو ساتھ لگائے گھر کے اندر چلی آئیں جہاں توے پر پڑی روٹی جل کر سیاہ ہو چکی تھی پھر کچھ بعد جب سکینہ بھی گھر چلی گئیں تو بچی کو دوائیں پلا کر سلانے کے بعد وہ دوبارہ روٹی پکانے بیٹھیں۔ قیصر بھی اسکول سے آتا ہی ہوگا بس، انہوں نے جلدی جلدی آٹے کا پیڑا بناتے ہوئے سوچا۔

رات کو دیر تک کپڑوں کی بچی کھچی کترنیں جوڑ کر قدسیہ کی گڑیا کے کپڑے سینے کے بعد جب بسم اللہ بیگم دن بھر کے تھکے ہارے وجود کے ساتھ بستر پر آ کر پڑیں تو دل جیسے کسی پشیمانی کے بھاری بوجھ تلے آ دبا۔ اگر سکینہ نے مولوی بصیر الدین کے نکاح کا پیام ڈال ہی دیا تھا تو کون سی کوئی گناہ والی بات کر دی تھی؟ بسم اللہ بی کی بھلائی کے لیے ہی مشورہ دیا تھا اور پھر مولوی نصیر الدین کوئی چور اچکے یا آوارہ لفنگے تو تھے نہیں بلکہ ایک زمانہ ان کی عزت کرتا تھا اور خود مولوی صا[illegible] نے کٹھن حالات میں بسم اللہ کے گھرانے [illegible] سنا خیال رکھا تھا۔ ابھی تک بھی قیصر اور قدسیہ اگر کبھی اردو کے اشعار کی تشریح کرانے یا حساب کے سوال سمجھنے اور انگریزی پڑھنے مولوی صاحب کے پاس جاتے تو وہ دیر تک بڑی محبت اور توجہ سے ان کو پڑھایا کرتے۔ اب تند و تیز جذبات کی عینک اتاری تو بسم اللہ بی کو اپنے کیے پر تاسف ہونے لگا کیسے منہ بھر کر انہوں نے مولوی صاحب کو کوسنے دیے تھے اور انہیں لنگڑا تک کہنے سے گریز نہیں کیا تھا حالاں کہ لنگڑے پن کے باوجود وہ برے حالات میں بسم اللہ بیگم کے گھرانے کے لیے بیساکھی بنے رہے۔ وہ نادم ہو کر بستر پر اٹھ بیٹھیں۔

کیا انہیں مولوی صاحب کے نکاح کا پیام منظور کر لینا چاہیے؟ مگر اب تو انہوں نے بات ہی ختم کر دی تھی اور سکینہ بی نے بھی دوبارہ نہیں کہا تھا۔

کتنے ہی عرصے سے اس گھر میں کسی مرد کے قہقہے نہیں گونجے تھے۔ انہوں نے شوہر کی وفات کے بعد اپنے گرد خود ساختہ پابندیوں اور بندشوں کی دیواریں چن، خوشی کی ہر درز بند کر دی تھی اب گویا سناٹوں کے اس تابوت میں بند ان کا دل، تازہ ہوا کے خوش گوار جھونکے کو ترس رہا تھا۔ دفعتاً ان کی نظر سامنے دیوار پر لگے میلے سے آئینے پر پڑی تو وہ اپنا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئیں، رخصت ہوتی ہوئی جوانی، آنکھوں کے نیچے پڑے حلقوں اور جلد کی شکنوں کی صورت الوداعی تحائف ان کی جھولی میں ڈال کر جانے کو تیار کھڑی تھی۔

تب انہیں مولوی صاحب کے سفید، چکنے اور ملائم ہاتھ یاد آگئے جن کی جوت بجھ چکی تھی اور وہ خود بھی تو دو بچوں کی ماں ہونے کے باعث گویا کیڑوں بھرا ایسا کباب تھیں جنہیں مولوی صاحب اب بھی اپنے خلوص کی بنا پر نگلنے کے لیے تیار تھے تب ان کا دل انہیں ایک انوکھے فیصلے پر اکسانے لگا۔

قدسیہ تو خیر ایک مصلحت پسند بچی تھی مگر اصل

مسئلہ قیصر کا تھا، خیر اسے بھی سمجھانے کی کوشش کروں گی، انہوں نے سوچا۔

''ہرگز نہیں۔'' قیصر نے سنا تو بپھر گیا۔ ''میں اپنے ابا کے سوا کسی دوسرے شخص کو تصور میں بھی باپ بنانے کا نہیں سوچ سکتا اگر ایسا ہوا تو میں مولوی کے بچے کو قتل کر کے خوسولی پر چڑھ جاؤں گا۔'' اس کی آنکھوں میں گویا خون اتر آیا۔ نویں جماعت کا طالب علم یکا یک ایک قد آور مرد کا روپ دھار کر گھر کی باگ دوڑ گویا اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور کبھی ننھے بچے کی صورت ان کی گود میں سر رکھے التجا سی کیا کرتا۔ ''تمہیں نہیں پتا اماں! میرے کلاس فیلوز مجھے کیسے طعنے دیں گے۔ لوگ ہمدردی کے بہانے مذاق اڑاتے ہیں آج کل، اور کوئی مذاق میں بھی میری ماں کے بارے میں کچھ کہے۔ گردن نہ مروڑ کے رکھ دوں اس کی۔'' وہ جوش سے کہتا تو بسم اللہ بی کی آنکھیں جھلملا اٹھتیں، واقعی اب انہیں نکاح کی کیا ضرورت تھی، جس شجر تلے انہیں سکھ کے دن بتانے تھے اس کی شاخیں اب اس قابل ہو رہی تھیں کہ وہ اس کے سائے تلے آرام سے بیٹھ سکتیں۔

چناں چہ اپنی خواہشوں اور حسرتوں کو میٹھی نیند سلا کر وہ دوبارہ زندگی کی دوڑ میں شامل ہو گئیں۔ نکاح کی بات گویا خواب گئی۔

مولوی صاحب نے بسم اللہ بیگم کی بیٹھک چھوڑی تو اپنے گھر میں بھی جی نہ لگا کبھی محلے میں ایک دکان لے کر پرچون فروش بن بیٹھے۔ بسم اللہ کے گھر بھی زیادہ تر سامان انہی کے کریانہ اسٹور سے آیا کرتا۔ چند برس اور آگے سرک لیے۔ قیصر ڈاکٹر تو نہ بن سکا البتہ دسویں پاس کر کے ریفریجریشن کا کورس کیا اور کسی کے توسط سے باہر چلا گیا۔ گھر میں چار پیسے آئے تو میٹرک کرتے ہی قدسیہ کی بھی شادی ہو گئی اور وہ بیاہ کر لاہور چلی گئی، بسم اللہ بی کے دن رات تنہائی کے زہر میں بیتنے لگے۔ دن بھر پڑھنے والے بچے آجاتے یا وہ ادھر ادھر پڑوس میں گھوم آتیں۔ مگر جیسے ہی گھر آتیں، سناٹے ان کے استقبال کو موجود ہوتے اور ان کا کلیجا منہ کو آنے لگتا۔ تب جانے کتنے ہی خط انہوں نے سکینہ کی بہو سے قیصر کو لکھوائے کہ وہ بہو بچوں کو لے کر پاکستان آجائے یا انہیں اپنے بلا لے۔ بہو اپنے ہاتھوں بیاہ کر لانا تو ان کے نصیب میں نہیں تھا مگر انہیں مقدر سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ قیصر نے کچھ اچھا ہی دیکھ کر اسے شریک حیات بنایا ہوگا۔ وہ مطمئن تو تھیں مگر جلد از جلد بہو اور پوتا پوتی کو دیکھنے کے لیے بے تاب بھی تھیں مگر قیصر کو تو جیسے وہاں کی زمین نے پکڑ لیا تھا۔ پلٹ کر ہی نہ دیا۔

''خالہ! نکاح کر لو۔ اب بھی وقت ہے۔'' سکینہ بی کی بہو مشورہ دیتی۔

''ہٹاؤ بھی۔ اب قبر میں ٹانگیں لٹکی ہیں اور نکاح پڑھوالوں، جوانی میں تو کیا نہیں اب سفید چونڈے کے ساتھ لال دوپٹا اوڑھوں گی۔'' وہ ہنس دیتیں۔

بات آئی گئی ہو جاتی اور پھر ایک دن اچانک قیصر آیا اور ماں کو اپنے ساتھ ہی لے گیا جہاں سے وہ ٹھپ کھائی گیند کی طرح پلٹی تھیں۔ بس اڈے سے سالم تانگا کروا کر اپنی ٹین کی صندوقچی کے ہمراہ جب وہ گلی کے موڑ پر اتریں تو محلے بھر کے بچوں نے انہیں پہچان لیا اور ہر طرف آپا جی آ گئیں کا غل مچ گیا انہی بچوں کے ہمراہ وہ جلوس کی صورت میں اپنے گھر کی طرح چل دیں۔ مولوی صاحب کی دکان کے آگے سے گزرتے ہوئے جانے کیوں انہیں وہم سا ہوا کہ انہیں واپس آتے دیکھ کر مولوی بصیرالدین کے اجڑے منہ پر بہار سی آ گئی تھی اور وہ دھیرے سے اپنی کالی سفید مونچھوں تلے مسکرا دیے۔

بسم اللہ بی کا قافلہ بالآخر سکینہ بی کے گھر کے سامنے جا کر ٹھہر گیا تاکہ وہاں سے اپنے گھر کی چابی لے سکیں، مگر سکینہ بھی ایسے ہی فوراً کہاں آنے دیتی تھیں۔ دیر تک ساتھ چمٹا کر روتی رہیں۔ ''اے بسم اللہ! میرے سر کی قسم جو اگر اب محلّہ سنسان کر کے کہیں جاؤ۔'' اور وہ سر ہلا کر آسودگی سے مسکرا دیں۔ انہیں

یکا یک یوں لگا گویا وہ اپنوں کے درمیان پہنچ گئی ہوں۔ آج انیسواں روزہ تھا اور افطار کا وقت بھی ہونے ہی والا تھا۔ سکینہ بی نے انہیں وہیں دستر خوان پر بٹھالیا۔ اسی دوران محلے کا ایک بچہ ہاتھوں میں ڈھکی ہوئی پلیٹیں لیے چلا آیا۔ ''یہ مولوی صاحب نے بھجوائے ہیں۔ بس جلدی سے پلیٹیں خالی کر دیں۔'' بچہ ابھی تک کھڑا تھا۔

سکینہ بی نے دیکھا۔ خوشبودار مٹر پلاؤ کے اوپر شامی کباب سجے تھے۔ انہوں نے فوراً پلیٹیں خالی کر کے جواباً ان میں دہی بڑے ڈال کر مولوی صاحف کی طرف بھجوادیے۔

''یہ اپنے مولوی صاحب نے کیا نکاح کر لیا؟'' وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

''نہیں خالہ! تمہارے لیے اب بھی سیٹ خالی ہے۔'' سکینہ بی کی بہو پوری پٹاخہ تھی، شرارت سے باز نہ آئی۔

وہ شرمندہ سی ہوگئیں...... ''پھر یہ......؟'' انہوں نے پلیٹوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ارے کہاں......؟ بے چارے خود ہی آج کل ہانڈی روٹی پکایا کرتے ہیں حالاں کہ سبھی نے کہا کہ آپ تکلیف نہ کیا کریں ہم افطاری اور کھانا باری باری بجھوادیا کریں گے مگر وہ نہیں مانے۔'' سکینہ بی نے تفصیل بتائی تو وہ چپ رہ گئیں۔

افطار اور نماز مغرب کے بعد انہوں نے اپنی صندوقچی سے وہ تحائف نکال کر سکینہ بی اور ان کی بہو کے حوالے کیے جو وہ لاہور سے ان کے لیے لے کر آئی تھیں پھر اپنے مٹھو کو آ کر دیکھا جو ان کی خوشبو پا کر پنجرے میں خوب پھدک رہا تھا۔ لالو اور چندو بھی انہیں سکینہ بی کی مرغیوں کے ساتھ زیادہ خوش باش اور صحت مند نظر آئیں۔

اسی اثناء میں عید کا چاند نظر آنے کا اعلان ٹی وی پر ہونے لگا تو وہ سکینہ بی اور ان کی بہو کے ساتھ چھت پر چاند دیکھنے چلی آئیں۔ کافی تلاش کے بعد دور کسی مسجد کے گول گنبد کے ساتھ کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ میں بالآخر انہیں باریک سا ہلال عید نظر آہی گیا۔

تو بے ساختہ ان کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے۔

یکدم ہی ہر طرف چہل پہل ہونے لگی تب وہ اپنے گھر کی چابی مٹھی میں دبائے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

گھر بالکل اسی حالت میں موجود تھا۔ جس طرح وہ جانے سے پہلے چھوڑ کر گئی تھیں۔ شاید سکینہ بی روزانہ صفائی کرایا کرتی تھیں پودے بھی ہرے بھرے تھے۔

وہ اپنے بستر پر جا کر سکون سے لیٹ گئیں۔ اپنا گھر بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ وہ سوچنے لگیں۔ نجانے کب ہلکی سی غنودگی نے انہیں آلیا۔ تھکی ہاری تو تھیں آنکھ لگ گئیں۔

شاید رات کے دس بج رہے تھے۔ اچانک بسم اللہ بی پیٹ کے شدید درد سے بے چین ہو کر جاگ اٹھیں۔ نجانے کیوں رہ رہ کر مروڑ اٹھ رہے تھے حالاں کہ انہوں نے تو افطاری کے بعد کھانا بھی برائے نام ہی کھایا تھا مگر شاید افطاری میں بنی چھولوں کی چاٹ نے اپنا کام دکھادیا تھا۔

اب کیا کریں......؟

گاؤں میں تو ویسے بھی لوگ رات کو جلدی سو جاتے ہیں اور سردیاں شروع ہو جانے کے باعث سبھی لوگ اپنے اپنے کمروں میں دروازے سے مقفل کیے نیند کے مزے لے رہے ہوں گے ایسے میں وہ سکینہ بی کو بھی کیوں کر بلا پائیں گی۔

جب درد ناقابل برداشت ہو گیا تو ناچار برقع سر پر ڈالا اور مکان کو تالا لگا کر باہر نکل آئیں۔

گلی یہاں سے وہاں تک سنسان پڑی تھی البتہ سامنے مولوی صاحب کی دکان کھلی ہوئی تھی اور وہ بھی سامان اندر رکھ کر دکان بند کرنے ہی والے تھے۔

بسم اللہ بی کو اس وقت اچانک اس طرح اپنے سامنے پایا تو پلکیں تک جھپکنا بھول گئے۔

''مولوی جی! سیون اپ کی بوتل ہوگی آپ کے پاس؟'' وہ پیٹ کی تکلیف سے بے حال ہو رہی

تھی، چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

''ہاں کیوں، ابھی لو۔'' وہ چونک کر مڑے اور بوتل نکال کر لگے جو اوپنر سے کھولنے تو ٹھاہ کی آواز کے ساتھ ہی بوتل پھٹ گئی، شیشے کے کئی ٹکڑے مولوی صاحب کے ہاتھ میں گھس گئے۔ یہاں سے وہاں تک سارا خون ہی خون پھیل گیا۔

واہ کیا قسمت پائی تھی۔ بسم اللہ بی نے جہاں قدم رکھ دیتیں بن بلائی مصیبت ساتھ چلی آتی۔

خون دیکھ کر تو وہ ہمیشہ سے ہراساں ہو جایا کرتی تھیں۔ اس وقت بھی سب کچھ بھول بھال کر اپنے سفید برقعے کا کونہ ان کے ہاتھ کے گرد لپیٹ دیا۔

مگر بات نہ بنی تب مولوی صاحب تو بھاگے ڈاکٹر کے کلینک کی طرف وہ بھی اخلاقاً ساتھ ہی چل دیں ساری مصیبت تو انہی کی وجہ سے آئی تھی۔ نہ وہ بوتل مانگتیں نہ یہ نوبت آتی۔ ہاتھ کی پٹی کروا کر مولوی صاحب کو کچھ یاد آیا۔

''ارے قدسیہ کی ماں! تمہارے بھی تو پیٹ میں درد تھا۔ اپنی بھی دوا لے لیتیں'' (ڈاکٹر تو جا چکا تھا اب ڈسپنسر بیٹھا چھوٹے موٹے کام نمٹا رہا تھا)

''اب کہاں رہا وہ منحوس درد دفع کرو۔'' وہ نقاب سے آدھا منہ ڈھانپے مولوی صاحب کے ساتھ ہی واپس ہو لیں اور جب وہ اپنے گھر کی طرف بے دلی سے مڑیں تو مولوی صاحب نے پکار لیا۔

''کل صبح شیر خرمہ کی تیاری کے لیے دکان سے کچھ نہیں لو گی؟......دودھ، سویاں، چاول، بادام، پستہ اور چاندی کے ورق...... کچھ بھی نہیں چاہیے کیا؟''

''آہ......اب کون کھانے والا بیٹھا ہے وہاں'' انہوں نے سرد آہ بھر کے سر جھکا لیا۔

''کیسا عجب اتفاق ہے کہ تمہارے گھر میں کھانے والے نہیں ہے اور میرے گھر میں کوئی پکانے والا نہیں۔'' وہ زہر آلود سی ہنسی ہنس دیے۔ بسم اللہ بیگم نے چونک کر اوپر دیکھا جہاں مولوی بصیر الدین کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

زندگی کا کوئی ایک لمحہ بھی کبھار انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہو جاتا ہے۔ بسم اللہ بی بھی آج ایسے ہی کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آ گئیں اور لپک کر آگے بڑھیں اور مولوی بصیر الدین کا ہاتھ تھام لیا اور کچھ ہی دیر بعد دو زندگی کی خوشیوں کو ترسے ہوئے اور بال بچوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہائی کا عذاب جھیلنے والے وجود، ایک دوسرے کے گلے لگے۔ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

آدھی رات کو مولوی صاحب ساتھ گاؤں میں رہنے والے دوست قاضی امیر علی (نکاح خوان) کے ہاں سے چار گواہوں کی موجودگی میں نکاح پڑھوا کر بسم اللہ بی کو گھر لائے تو وہ نئی نویلی دلہن کی طرح لجا کر رہ گئیں۔

دونوں نے مل کر شیر خرمے کی تیاری کے لیے چھوارے بھگوئے۔ کشمش صاف کی اور ناریل کاٹ کر رکھا پھر مولوی صاحب کا کلف لگا کرتا شلوار انہوں نے اسی وقت استری کر کے الماری میں لٹکایا تاکہ وہ صبح بروقت تیار ہو کے عید کی نماز کو جا سکیں۔ اس گھر کی دیواروں نے ایک طویل عرصے کے بعد گھر میں چہل پہل کا سماں دیکھا تھا۔

بچے اگر انہیں بھول کر اپنی زندگی کی خوشیوں میں مگن ہو گئے تھے تو انہوں نے بھی زندگی کے بچے کچھے رنگ چرانے کو اپنا حق سمجھ لیا تھا۔

اب ان کا اصل گھر یہی مولوی صاحب کا ٹھکانا تھا اور یہیں انہیں باقی زندگی کے دن پورے کرنا تھے اور ابھی تو اپنے گھر کے باہر انہیں ''برائے فروخت'' کی تختی بھی لٹکانا تھی۔

مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اذان فجر بلند ہو رہی تھی اور بسم اللہ بی بڑے پیار سے بالوں میں انگلیاں پھیر کر مولوی صاحب کو جگا رہی تھیں کیوں نہ جگاتیں آخر آنے والی عید کی نئی صبح ان دونوں کے لیے ہی اپنے دامن میں نئی امیدوں اور مسرتوں کا پیغام لا رہی تھی۔

☆☆

دلوں کے بادباں سمٹے

صدف حسین

اپنی اچھی چیزوں کو دوسروں کی خوشی اور بہتری کے لیے دان کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ بھی ایسے ہی لوگوں کو پسند فرماتا ہے۔ جو دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیں۔ ایک وفا شعار کا قصہ، اس نے قربانی کا خنجر اپنے وجود میں اتار لیا تھا۔

ان لوگوں کے لیے بطور خاص جو دل کی سرگوشیوں پر کنکناتے ہیں



میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بساط زندگی اس طرح الٹ جائے گی۔ میں نے ایسا تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا شاید یہ قسمت تھی جس نے مجھے اس دوراہے پر لا کھڑا کیا۔ زبیر ابھی جو کچھ کہہ کے گیا تھا تو وہ اپنی جگہ درست تھا لیکن اس حادثے کے بعد میں بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ ایک وقت میں اس کی ہمراہی کی تمنائی تھی۔ لیکن پھر میں نے خود اسے اپنے ہاتھوں سائرہ کے نام کر دیا تھا اور اب سائرہ کی موت کے بعد اسے میری ضرورت تھی میں نے سوچنے کے لیے دو دن مانگے تھے...... سچ ہے انسان جو کچھ سوچے وہ خدا کے فیصلوں کے آگے انتہائی مجبور ہوتا ہے میں نے تو خلوص دل سے زبیر اور سائرہ کی کامیاب زندگی کی دعا مانگی تھی مگر اس طرح ہوگا کسے معلوم تھا۔ زبیر کے سوال سے میں جس مشکل کا شکار رہی ہوں اس کے سمجھنے کے لیے میں اپنی زندگی کی کہانی آپ کو سناتی ہوں۔

میرا نام ندا ہے۔ میرا تعلق ایک متوسط طبقے سے ہے۔ جب میں چار سال کی تھی تو میرے والد کا انتقال ہو گیا اور ہم نانا کے گھر آ گئے۔ چھ مہینے کے بعد امی کی شادی اکرام اللہ شیخ سے ہوگئی جو ایک خوش حال بزنس مین تھے۔ ان کی حیثیت نانا کی فیملی کے مقابلے میں کئی گنا اچھی تھی جس نے ان کی ایک بچی سائرہ کا باپ ہونے کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ ایک بچی کی ماں تو میری امی بھی تھیں اور نانا کے نزدیک یہ اہم بات تھی کہ انہوں نے میری ذمے داری بھی قبول کر لی تھی۔ امی مجھے اپنی شادی کے ایک ماہ بعد اپنے گھر لے گئیں۔ نانا کے گھر کے مقابلے میں ان کا گھر بہت اچھا تھا۔ امی کی سوتیلی بیٹی سائرہ نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا اور مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سائرہ نہ صرف مجھ سے اکھڑی رہتی بلکہ امی سے بھی بہت لیے دیے رہتی۔ یہ امی تھیں جنہیں زندگی کی آسودگی اور آرام بہت دیر سے میسر آیا تھا اور وہ کسی قیمت اسے کھونا نہیں چاہتی تھیں لہٰذا وہ سائرہ کی بدتمیزی اور بدسلوکی پر کچھ نہ کہتیں۔ اکرام اللہ شیخ نے پہلے دن واضح کر دیا تھا کہ وہ سائرہ کو ماں کا پیار اور توجہ تو دیں گی مگر وہ اس پر کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کر سکتیں اور ساتھ ہی میری پوزیشن بھی واضح کر دی تھی کہ میں بھی سائرہ سے کسی قسم کی منفی بات نہیں کروں گی۔ امی نے اس بات کو گرہ میں باندھ کر فرماں بردار بیوی اور سائرہ کے لیے خلوص بھرے پیار کی انتہا کر دی۔ لیکن وہ اپنی بیٹی کو اور اس کے جذبات کو یکسر فراموش کر گئیں۔

میں نے بھی بہت جلدی اس ماحول میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیا۔ میں سائرہ سے کچھ بولتی اور نہ اکرام اللہ شیخ سے۔ میں نے اپنی ضرورتوں اور خواہشات کو کافی محدود کر لیا تھا۔ ان حالات میں زبیر میرا بڑا اخلاقی سہارا تھا۔ وہ میرا ماموں زاد ہے۔ ممانی کا جلدی انتقال ہو گیا تھا ماموں کی جاب حیدر آباد میں تھی وہ وہیں رہتا تھا۔ لیکن جب وہ کراچی آتا تو میں نانا کے گھر جا کر اس سے ضرور ملتی۔ وہ بچپن ہی سے بہت ذمے دار تھا ہم میں بہت انڈراسٹینڈنگ تھی اور یہ ذہنی ہم آہنگی وقت کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طریقے سے محبت کا تناور درخت بن چکی تھی۔

زبیر تعلیم مکمل کر کے بینک کی ملازمت اختیار کر چکا تھا۔ میری بھی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ سائرہ بھی یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کر کے اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ تفریحی مقامات کی سیر کر کے آئی تھی۔

زبیر نے کہا تھا کہ وہ میرے سلسلے میں امی سے بات کرنے والا ہے۔ اس لیے میں پہلے ہی امی سے یہ بات کرنا چاہ رہی تھی لیکن موقع نہیں مل رہا تھا کیوں کہ اب زیادہ وقت امی اور سائرہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے نظر آتیں۔ میرے سوتیلے والد شیخ صاحب بزنس کے سلسلے میں جرمنی گئے ہوئے تھے ایک روز جب میں بات کرنے کی غرض سے امی کے کمرے میں آئی تو سائرہ اور وہ باتوں میں مصروف تھیں مجھے آتا دیکھ کے خاموش ہو گئیں وہ دونوں ابھی ابھی کہیں سے آئی تھیں۔ میرے کمرے میں آنے سے سائرہ خاموشی سے وہاں سے چلی گئی۔ آج مجھے اس کے چہرے پر بہت پریشانی دکھائی دی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔

''کیا ہوا کوئی کام ہے؟'' امی مجھے مخاطب کرتے

ہوئے بولیں۔ ''جی وہ آپ کہاں چلی گئی تھیں اس طرح؟''
انہوں نے گہرا سانس لیا اور اپنے پاس بیڈ پر میرے لیے جگہ بناتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
''کیا بات ہے آپ کچھ پریشان ہیں۔'' میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے مجھے اک نظر دیکھا اور پھر سر جھکا کے، بنا کسی تمہید کے ایک دھماکا سا کر دیا۔
''سائرہ نے شادی کر لی تھی۔''
''لیکن کب، کیسے آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' میں نے حیران پریشان ہو کر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔
''بتاتی ہوں!'' انہوں نے آہستہ سے بات شروع کی۔
''سائرہ اپنے ہم جماعت کو پسند کرتی تھی یہ سلسلہ کافی دنوں سے چل رہا تھا وہ لڑکا حیثیت میں سائرہ سے کہیں اچھا ہے جب سائرہ اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے گئی تو وہیں انہوں نے شادی کر لی۔ محبت واقعی اندھی ہوتی ہے، دونوں نے شادی تو کر لی لیکن محض چند دنوں کے ساتھ کے بعد ہی انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ دونوں کا زندگی بھر ساتھ رہنا مشکل ہے اور اس لڑکے نے سائرہ کو طلاق دے دی۔ چوری چھپے سہی لیکن دونوں نے نکاح کیا تھا مگر اب سائرہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے میں تو صرف یہ سوچ رہی ہوں کہ شیخ صاحب کو کیا کہوں گی، میں جانتی ہوں کہ وہ سائرہ کو بے پناہ چاہتے ہیں اور مجھے ہی الزام دیں گے کہ میں نے لڑکی کا خیال نہیں رکھا۔ جب کہ وہ میری سنتی ہی کب تھی۔ لیکن وہ ان کی بیٹی ہے وہ اسے بے قصور ہی سمجھیں گے تم تو ان کے مزاج سے واقف ہو اب بتاؤ میں کیا کروں؟''
امی نے میرے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا میں نے ان کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے جواب دیا۔
''اس میں آپ کی کوئی خطا نہیں یہ سراسر بے جا آزادی کا نتیجہ ہے، کیا وہ یہ بات نہیں جانتے؟''
''لیکن انہوں نے شادی کے بعد سائرہ کی تربیت کی ذمے داری مجھ پر ڈالی تھی میں نے ہر ممکن طریقے سے اپنی ذمے داری نبھائی، یہ الگ بات ہے کہ سائرہ نے آج تک میری ایک نہ سنی اور اب اتنا کچھ ہو جانے کے بعد وہ مجھ سے اس مسئلے کے حل کے لیے کہہ رہی ہے میں کیا کروں؟'' ان کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔
میں نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کر لیں گے۔''
''اس طرح مسئلہ حل نہیں ہوگا بیٹا!'' ابھی ان کے آنے میں ایک ہفتہ ہے۔ آپ نے کیا سوچا ہے؟'' میں نے کہا۔
''بیٹا! اب تک تو میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ جتنی جلدی ممکن ہو ہم سائرہ کی کہیں بات طے کر دیں۔''
''لیکن امی اب اس بات کے بعد یہ کیوں کر ممکن ہے کیا آپ نے سوچا سائرہ کی شادی اس طرح کیسے ممکن ہے؟''
''ہاں!'' امی نے ہلکے سے کہا۔
''سائرہ کیا کہتی ہے؟''
''وہ اب کیا کہے گی بس خاموش ہے۔''
''تو کیا وہ دوسری شادی پر رضامند ہے۔''
''میں نے اس سے پوچھا تھا تو اس نے سر جھکا دیا۔ بیٹا اب اس کے پاس کوئی اختیار نہیں رہا۔ اب وہ حالات کے رحم و کرم پر ہے بیٹا! کچھ سوچو!'' چند لمحے رک کر وہ بولیں۔ ''میں جانتی ہوں تم نے بہت صبر کیا کبھی کچھ نہیں کہا مجھ سے۔ لیکن اب تم زبیر سے بات کرو...... یہ سمجھو کہ تمہیں اپنی ماں کی مدد کرنا ہے کیوں کہ شاید تم ہی یہ بات سمجھ سکتی ہو کہ میں آج اتنے عرصے بعد بھی مجبور ہوں۔ بیٹا عورت زندگی بھر اپنے سائبان کی تلاش میں ہی رہتی ہے۔''
''امی آپ فکر نہ کریں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا اللہ تعالیٰ آپ کا ایسا امتحان نہیں لے گا۔ اب آرام کریں صبح بات کریں گے۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔ میں نے انہیں تو آرام کا کہا مگر اب میری نیندیں اڑ گئیں تھی۔
سائرہ نے جو کچھ کیا اس کی ذمے دار امی کیسے ہیں؟ عمر کے اس حصے میں اکرام اللہ شیخ کس طرح امی کو بے اماں کر سکتے ہیں وہ بھی اپنی بیٹی کی غلطی پر امی کا یہ کہنا کہ جلد از جلد سائرہ کی شادی کر دی جائے یہ

ساری باتیں میرے ذہن کو الجھا رہی تھیں۔ امی ہمیشہ سے ہی سمجھتی رہیں کہ اکرام اللہ شیخ نے ان سے شادی کر کے اور ان کی بیٹی کی ذمے داری قبول کر کے ان پر احسان کیا ہے اس کے بدلے میں انہوں نے ان کے لیے اور ان کی بیٹی کے لیے مکمل طور پر اپنی اور میری ذات کی نفی کی۔ حالاں کہ اس ایثار کو کبھی انہوں نے محسوس کیا اور نہ سائرہ نے۔ اب بھی اتنی بڑی بات ہو جانے پر وہ خوف زدہ تھیں اور سائرہ کی بہتری کا سوچ رہی تھیں۔ اب ایسا کون سا شخص یا خاندان ہو سکتا ہے جو سائرہ کو اس طرح قبول کر لے گا؟ اگر زبیر سائرہ سے شادی کر لے، ایسا کس طرح ممکن ہے؟ لیکن زبیر تو مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے تو کیا وہ میری بات نہیں مان سکتا۔ میں اب مستقل اسی بات کو سوچ رہی تھی اور آخر کار میں نے امی کے خوف زدہ چہرے کو یاد کر کے زبیر سے اس سلسلے میں بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور سوچ لیا کہ زبیر سے کوئی بات طے ہو جانے پر میں امی سے بات کروں گی۔

صبح اٹھتے ہی ضروری کاموں سے فارغ ہو کر میں نے زبیر کو بینک فون کیا زبیر کو میں نے چار بجے ایک ریسٹورنٹ میں بلایا تھا اور چار بجے تک میں اپنے آپ کو اس سے بات کرنے کے لیے تیار کرتی رہی۔ ریسٹورنٹ میں میرے سامنے بیٹھتے ہی اس نے کہا۔ ''ایسی بھی کیا ایمر جنسی تھی کہ صبح فون پر اس طرح ملنے کے لیے کہا۔''

''صبر......صبر!'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے آہستہ سے کہا اور بڑی ہمت کر کے اس سے پوچھا۔ ''زبیر ایک بات بتاؤ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟''

وہ مسکرانے لگا۔ ''آج یہ بات پوچھنے کی کیا ضرورت پڑ گئی اور یہی پوچھنے کے لیے تم نے اس طرح ادھر بلایا ہے؟''

''زبیر پلیز! بتاؤ نا!'' میں نے اصرار کیا۔

''شاید تم جانتی ہو تمہیں پوچھنے کی ضرورت کیا ہے؟''

''میں اگر تم سے کچھ کہوں تو تم مانو گے؟'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''بھئی یہ تو بات پر منحصر ہے کہ تم کیا کہتی ہو!''

اس نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم شادی کر لو۔''

میرے مزید کچھ بولنے سے پہلے اس نے کہا۔ ''تمہیں مجھے یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہیں میں تو یہ بات کرنے والا ہوں تو پھر پریشانی کی کیا بات ہے۔''

''نہیں میں چاہتی ہوں کہ تم سائرہ سے شادی کر لو۔'' میں فوراً بات مکمل کر کے ٹیبل کو گھورنے لگی۔

''کیا تم نے یہ مذاق کرنے کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے۔'' اس نے تھوڑی خفگی سے جواب دیا۔

''زبیر! یہ قطعی مذاق نہیں ہے میں زندگی میں شاید پہلی بار اس قدر سنجیدہ ہوئی ہوں میں بخدا دل سے یہ چاہ رہی ہوں کہ تم سائرہ سے جلد از جلد شادی کر لو میری خاطر میری محبت کی خاطر۔'' میں نے التجائیہ لہجہ اختیار کیا۔ ''ندا تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو، اور کس سے کہہ رہی ہو۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور سائرہ کو میں خوب جانتا ہوں اور تم تو مجھ سے بہت بہتر جانتی ہو تم نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی اور اکیلے فیصلہ کر کے اس میں مجھے کیسے شامل کر لیا۔'' وہ بہت خفا ہو رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''پہلے تم میری بات سن لو پھر کچھ کہنا اور پھر تمام بات شروع سے آخر تک اسے سنا دی۔ ''اب مجھے یہی حل نظر آیا ہے۔'' میں نے آخر میں کہا۔

''تو تم مجھے قربان ہونے کے لیے کہہ رہی ہو۔ تم خود غرض ہو رہی ہو۔ سائرہ اپنی مرضی سے سب کچھ کر کے بھی فائدے میں ہے اور پھوپھی نے دوسری شادی کے بعد صرف اپنے لیے سوچا اور سائرہ اس نے کبھی تمہیں بہن نہیں سمجھا اور تم وہ سب بھلا کر انسانیت کی کون سی مثال قائم کرنا چاہتی ہو اور میں اس سلسلے میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔'' اسے غصہ آ رہا تھا۔

''زبیر! تمہاری باتیں اپنی جگہ درست ہیں مگر امی نے جو کچھ کہا وہ اپنے لیے کہا لیکن وہ میری ماں ہیں میں کس طرح ان سے نفرت کر سکتی ہوں۔ زبیر حقیقتاً عورت محبت میں خود غرض ہوتی ہے بس اس کی خود غرضی کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں امی کو اپنی ازدواجی

زندگی عزیز تھی۔ سائرہ کو اپنی محبت اور مجھے ماں کی بقا عزیز ہے لیکن محبت ہمیں دوسروں کے لیے جینا بھی سکھاتی ہے، دوسروں کے لیے کچھ کرنے کا درس بھی دیتی ہے۔ زبیر میں نے زندگی میں بہت سمجھوتے کیے ہیں ایک اور کرلوں گی اور مجھے کوئی نہ کوئی ساتھی زندگی گزارنے کے لیے مل جائے گا لیکن سائرہ کی ایک غلطی نہ صرف اس کی بلکہ میری ماں کی زندگی کو جہنم میں بدل دے گی وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی بیزاوار کہلائے گی میں اگر ان کا بیٹا ہوتی تو بات الگ تھی میں تم سے التجا کر رہی ہوں کہ تم سائرہ سے شادی کرلو۔ میری ذات پر یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا۔ امی سائرہ سے بات کرلیں گی۔ وہ اب کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہے خدا کرے گا تمہاری زندگی اچھی گزرے گی۔ زبیر! میری زندگی کی یہ سب سے بڑی خوشی ہوگی۔ سمجھنے کی کوشش کرو!" میں اپنی بات منوانے کی پوری سعی کر رہی تھی۔

"اب چلیں کافی وقت ہوگیا۔" زبیر نے کہا۔ باتوں کے دوران ہم نے تھوڑا کھانا بھی کھایا۔ "چلو میں تمہیں ڈراپ کردوں گا۔" اس نے میری باتوں کا جواب دیے بغیر کہا۔

"نہیں پہلے میری بات کا جواب دو۔"

"ندا! تم نے مجھے دوراہے پر کھڑا کردیا ہے تم میری محبت کو آزما کر میرا امتحان لینا چاہ رہی ہو۔ ندا! جب تم مجھ سے الگ ہونے کا فیصلہ کرہی چکی ہو تو مجھے بھی اس کے متعلق سوچنے کا وقت چاہیے۔"

گھر آکر جانے کیوں میرے دل کو اطمینان سا ہوگیا تھا شاید اسی کا نام زندگی ہے! انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ زبیر نے میرا مان رکھ لیا تھا میں نے امی سے بات کرلی تھی سائرہ کو بھی بتادیا تھا۔ اس واقعے نے اس کی شخصیت میں کافی تبدیلیاں پیدا کردی تھیں۔ لیکن میرے دل میں کچھ کھوجانے کا احساس بھی تھا مگر اپنی اچھی چیزوں کو دوسروں کی خوشی اور بہتری کے لیے دان کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے جس کا احساس مجھے اب ہو رہا تھا مجھے امید تھی کہ اللہ تعالیٰ سب ٹھیک کردے گا۔

آخر کار زبیر اور سائرہ کی شادی ہوگئی سب ہی خوش تھے۔

زبیر ایک اچھا انسان تھا۔ میں زبیر کا جتنا احسان مانتی کم تھا مگر اب وہ مجھ سے بات نہیں کرتا تھا۔ کبھی کبھار سامنا ہوتا تو بس علیک سلیک رہتی۔ البتہ امی اور سائرہ کی نظروں میں مجھے تشکر کی پرچھائیاں نظر آتیں۔ مجھے عجیب سا محسوس ہوتا میں نے یہ سب کسی لالچ میں یا اونچا بننے کے لیے نہیں کیا تھا اپنی سی کوشش کی تھی کسی کے کام آنے کی۔

سائرہ کی ڈلیوری کے دن قریب آرہے تھے۔ ہاسپٹل جانے سے ایک دن پہلے اس نے مجھے بلا کر کافی باتیں کیں۔ بچپن سے جوانی تک کی اور آخر میں میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔

"میں تمہاری مجرم ہوں میں زبیر اور تمہارے درمیان آگئی میں نے غلطی بھی کی اور یہ بھی چاہا کہ مجھے کوئی خمیازہ نہ بھگتنا پڑے۔ تم عظیم اور منفرد لڑکی ہو۔ امی بھی عظیم ہیں اور زبیر بھی۔ انہوں نے مجھے کوئی احساس نہیں ہونے دیا کہ میں نے کیا کیا۔ میں ہی خود غرض ہوں مجھے بڑی دیر میں احساس ہوا کہ میں نے صرف اپنی لیے ہی سوچا، ندا! مجھے معاف کردو میں دنیا سے جاتے ہوئے کوئی بوجھ اپنے سینے پر لے کر نہیں جانا چاہتی۔"

"نہیں سائرہ پلیز! ایسی باتیں نہ کرو، تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔" میں نے اسے تسلی دی۔ شاید خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نہ سائرہ جانبر ہوسکی اور نہ اس کا بچہ۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کے آگے انسان بے بس ہوتا ہے کسی نے ایسا نہیں سوچا تھا۔

زبیر ابھی ابھی یہی کہہ کے گیا تھا کہ اس نے میری بھی تو بات مانی تھی اور اب مجھے اس کا ساتھ دینا تھا۔ ہمارا ساتھ قسمت میں لکھا تھا لیکن اس امتحان کے بعد۔ میں نے زبیر کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ زبیر نے کہا تھا کہ "کچھ لوگوں کی زندگی کا مقصد دوسروں کے کام آنا ہوتا ہے۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہوتی ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتا ہے جو دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیں اور اللہ کا یہ انعام بھی میں اب کھونا نہیں چاہتا۔"

☆☆

صبا کا در کھلا

شازیہ ظہیر

عورت تو ہمیشہ سے ہی قربانی دیتی چلی آئی ہے گھر کے لیے، حالات کی خاطر بہن بھائی، ماں باپ...... سب کے لیے۔ لیکن ممتا کی قربانی دینا سب سے مشکل کام ہے۔ لیکن جب انسان سمجھوتوں کی چادر اوڑھ لے، جو ہے جیسا ہے کی بنیاد پر قبول کرلے اور قسمت پر شاکر ہو تو زندگی بہت حد تک سہل ہوجاتی ہے۔

عورت ماں بن کر معتبر ہوجاتی ہے۔ یہ بات اس عورت کی سمجھ میں نہیں آئی جس کے دامن میں قدرت نے کوئی کرن نہیں رکھی تھی۔

خواہشوں، خوابوں اور خراشوں سے گندھی دل گداز کہانی





انسان کا دل اداس ہو تو ہر شہر کی شامیں اداس، ویران، اور سنسان ہو جاتی ہیں۔ جب دل آباد نہ ہو تو دن بھی آباد نہیں ہوتے۔
سارے موسم ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ گرم، حبس زدہ، ساون بھادوں مگر بات یہ تھی کہ اب رونا بھی نہیں تھا۔
"روئے تو کس کے لیے۔ سب کچھ تو طے شدہ تھا۔"
اگر غبار نکالنے کے لیے روتی تو فضول تھا کیوں کہ قسمت اب اس نہج پر تھی جہاں غبار، دھند تیزی سے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔
اب تو اسے اپنے اندر صبر و برداشت و تحمل، استقامت جیسے اوصاف پیدا کرنا تھے۔
بعض اوقات چھوٹی سی احتیاطیں بڑے مرحلے طے کر دیتیں ہیں اور مرحلہ کوئی بھی ہو آخر طے ہو ہی جاتا ہے۔
آہستگی سے نبیلہ شفیع نے سر اٹھا کر چہار جانب دیکھا۔ جیسے غیر محسوس سا سناٹا اس کے وجود سے نکل کر پھیل گیا ہو۔
درخت سر جھکائے افسردہ تھے۔ خاموش تھے۔ اس ننھی سی لڑکی کے دکھ پر ماتم زدہ۔ ماتم کوئی بھی ہو شام غریباں ضرور بین کرتی ہے۔
ملگجا سا اندھیرا تھا۔ ملگجا سا اجالا۔
دوراہے پر کھڑی ہر چیز بے یارو مددگار ہوتی ہے۔
یقینی اور بے یقینی کے درمیان ہوتی ہے۔
آسمان سے پرندے نیچے اترنے شروع ہو گئے تھے۔ اپنے ٹھکانوں پر رات کچھ پرے لان کے کونے میں لگے برگد کے درخت پر ٹھہر گئے۔
کتنی صدیوں سے اس نے کتنے نشیب و فراز دیکھے ہوں گے۔
زمانے کے اطوار، اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیا ہو گا۔
کاش وہ جان سکتی پرانے لوگوں کے دکھ کیسے ہوا کرتے ہوں گے کیا اس جیسے...... اس کی ماں جیسے یا۔
یا پھر تمام غریبوں کے ایک جیسے ہی دکھ ہوتے ہیں۔ پیسے کا دکھ، روپے کا غم، دولت کا احساس کمتری مل جائے تو امیر و غریب میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔
یہ ہی تو امتیاز ہوتا ہے ان کے درمیان اسی سے تو غریب ہار جاتا ہے۔ جیسے اس کی ماں ہار گئی۔
چاروں اطراف سے نظریں بھٹک کر اپنی ہی ہتھیلیوں پر آ کر ٹھہر گئی۔ مہندی سے مزین نقش و نگار جواب ہلکے ہو کر مٹنے کے قریب تھے۔ اس کے جسم پر قیمتی سبز کلر کا لباس تھا۔ پیروں میں مہنگی سی جوتی بالکل ایسی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔
ہاتھوں میں کھن کھن کرتیں چوڑیاں۔
کانوں میں ہلکے ہلکے موتیوں کے آویزے۔
لمبے گھنے بال جو پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔
اس کا معصوم حسن اس وقت جہاں سوز تھا
اس کا نصیب ہار گیا تھا دولت جیت گئی تھی۔
کسی کی ضرورت بن گئی تھی وہ اس کے خواب جیت گئے خواب ہی تو دیکھے تھے منزل تو نہیں سمجھا تھا۔ پھر لوگ اس کی معصومیت کے کیوں درپے ہو گئے۔
گیٹ سے باہر کوئی گاڑی تیزی سے گزری وہ چونک کر حال میں واپس آ گئی۔ اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔
اٹھ کر لان کی لائٹیں آن کیں۔ دل میں خیال آیا کہ اندر جائے۔
شور شرابے کے عادی وجود کو خاموشی سے وحشت ہوتی ہے اور وحشت کے راگ بہت اذیت ناک ہوتے ہیں۔
اذیت ناکی کا پہلا راؤنڈ تھا۔
وہ اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ سادہ سا کمرا تھا۔ ایک بیڈ، الماری، ڈریسنگ ٹیبل، سادہ فرنیچر غالباً کم قیمت پر لے کر رکھا گیا تھا۔ بہر حال پتا نہیں تھا اس کی قسمت کی اداسی شاید اسی کے گھر کی فضا میں

حلول کر گئی تھی۔
یا پھر اداس لوگوں کے ساتھ اداسی ساتھ ساتھ سفر در سفر کرتی ہے۔
وہ دھیرے سے بیڈ پر لیٹ گئی۔
وہ اداس نہیں تھی اور نہ اداسی اس کی ذات کا حصہ تھی۔ بلکہ ایک ماہ پہلے تک تو بہت شوخ و چنچل قسم کی لڑکی تھی۔ گرین، اورنج، سرخ، شوخ رنگوں میں جس کی جان ہوا کرتی تھی۔ اداسی پر تم تو شاہد ہو۔
اس نے دھیرے سے پلکیں موند لیں۔

☆☆☆

ہنسی، مذاق، شوخی، شرارتیں کوئی بھی محفل ہو ہنسنے ہنسانے کا موقع چاہیے ہوتا تھا۔ آواز بہت اچھی تھی، انداز بہت پیارا..... ذہین اتنی کہ ہر کلاس میں ٹاپ کیا۔
اس کا گندمی پرکشش حسن، چمکدار جلد، سلکی چمکیلے بال، نازک بدن۔
حسن غربت میں ڈھل جائے تو ہر کسی کی نگاہ ٹھہر جاتی ہے۔
اور جب کمزوری ''غالب'' ہو تو ''رہنمائی'' کے لیے بہت سے ہاتھ بڑھتے چلے آتے ہیں۔ بیگم آفندی کی نگاہ انتخاب یوں ہی تو اس پر نہیں پڑی تھی۔ کچھ ان کی ضرورت بھی تو حائل تھی۔ کون اپنی دولت کو یوں ہی خرچ کیا کرتا ہے اور پھر اب تو وہ زمانہ ہی نہیں رہا شاید۔ خواہ مخواہ کسی کی مدد کی جائے۔
لڑکی ذات پر الزام لگ جائے تو وہ تمام عمر کے لیے ''چور'' بن جاتی ہے۔ بیگم آفندی نے اس کے اغوا کی کوشش اپنے ڈرائیور کی مدد سے ناکام کروا دی تھی اور اسے بخیر و عافیت اس کے گھر پہنچایا تھا۔ ساری صورت حال بتائی تو اس کی یاں حاجرہ بی بی زار و قطار روتے ہوئے احسان مند تھیں مگر شکریہ ادا کرتے زباں سوکھ گئی تھی کہ کسی طرح۔ سے ان کے گھر کی عزت بچ گئی۔
پھر غریبوں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے.....سفید پوشی کا بھرم اور عزتوں کی چادر۔ تیز ہوا انہیں اڑا کر لے جائے تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے۔
''میں یہ احسان تمام عمر نہ بھولوں گی بیگم صاحبہ۔''
''کتنے بچے ہیں تمہارے؟'' بیگم آفندی نے ساری کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے سر جھکائے بیٹھی نبیلہ کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی ماں سے پوچھا۔
''نو بچے ہیں، چار بیٹے پانچ بیٹیاں۔''
''اس کا نمبر کون سا ہے؟''
''یہ جی دو بیٹیاں اور دو بیٹوں کے بعد۔'' اسی اثنا میں سدرہ چائے لے آئی۔ ساتھ میں بسکٹ بھی تھے۔
''کتنے بچوں کی شادیاں کی ہیں؟''
''ایک بیٹی کی شادی کی ہے بھائی کے گھر.....'' دوسری کا رشتہ طے ہے خالہ کے گھر۔ سراج کی نوکری پکی نہیں ہوتی، منیر کو ملتی ہی نہیں، ابا ان کا ریٹائرڈ ہو چکا ہے۔ اب ایک کھوکھا لگا کر رکھا ہے پان سگریٹ کا۔''
مصائب و مشکلات کا ایسا منہ بند آتش فشاں تھا جو ذرا سی توجہ پاتے ہی پھٹ پڑا۔
''باقی بچے! کیا کرتے ہیں؟''
''پڑھتے بھی ہیں اور دہاڑیاں بھی لگاتے ہیں پیٹ کا دوزخ تو بھرنا ہی ہے۔''
''یہ کون سی کلاس میں ہے؟''
''یہ میری سب سے ذہین لڑکی ہے۔ اپنی محنت سے بارہ کلاسیں پڑھیں ہیں جی..... ٹیوشن پڑھا کر سلائی کر کے۔ بہت محنتی ہے پر اب کہتی ہے کہ ڈاکٹر بنوں گی۔ بہت شوق ہے اسے پڑھنے کا۔ پر بیگم صاحبہ ہم غریبوں کے پاس اتنے پیسے ہوں تو اکبری کی شادی نہ کردوں۔''
اماں یوں ہی حالات کا رونا روتی جاتیں تھیں۔
''اچھا اب میں چلتی ہوں۔'' بغور اس کا جائزہ لیتی ہوئی بیگم آفندی کھڑی ہو گئیں۔ ''میں پھر آؤں گی۔''
''جم جم آجائیں جی۔ محسن ہیں جی آپ

ہماری۔'' اماں کی خوشی قابل دید تھی اور نبیلہ کو اس خاتون کی نظروں سے الجھن ہو رہی تھی۔ بے شک انہوں نے اسے کڑی نظروں سے بچایا تھا۔
سچ اگر ان غنڈوں کی مراد بر آتی تو اس کا کیا حال ہوتا۔
اسے جھرجھری سی آ گئی۔ پھر کتنے دن تک وہ اس واقعے کو فراموش نہ کر سکی۔ ایک ہفتے بعد ہی وہ بیگم صاحبہ پھر آ گئیں۔
وہ اماں کے کان میں جانے کیا سرگوشیاں کرتی رہیں۔
وہ گئیں تو اماں ایسی تھیں جیسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔
ابا کے آنے پر اماں نے یہ خوش خبری گویا ٹرے میں رکھ کر پیش کی۔ ''ان امیر خاتون نے اپنی نبیلہ کا رشتہ مانگا ہے۔ میری نبیلہ کی تو قسمت ہی کھل گئی۔ راج کرے گی۔ گاڑیوں میں گھومے گی۔''
اماں تو اس رشتے پر واری صدقے ہوتے نہ تھک رہی تھیں۔
اس کا حلق خشک ہو گیا، جان سوکھ گئی۔
''بھلی مانس اپنی ہی کہے جائے گی، کچھ دوسروں کی بھی سن۔ دیکھتی نہیں دنیا میں دھوکا، فراڈ کتنا ہو رہا ہے۔'' ابا نے چپ کروایا۔
''مگر وہ اتنی نیک خاتون ہیں۔ پہلے نبیلہ کی مدد کی۔ اب انہیں نبیلہ اتنی پسند آ گئی ہے کہ اس کا رشتہ مانگا ہے۔''
اماں کی آنکھوں کی چمک ہی اور تھی۔
''سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا منیر کے ابا۔ اچھا ہے میری کسی......'' اماں تو فیصلہ کیے بیٹھی تھیں۔
''ذات، برادری، خاندان؟''
''سنے گی تو جل جائے گی۔ بیٹی ہماری ہے فیصلہ بھی ہم کو ہی کرنا ہے۔ بس میں نے کہہ دیا اس رشتے کو قبول کر لو۔ دیکھنا ہمارے گھر کے بھی دن پھر جائیں گے۔''
معلوم نہیں اماں کے دن پھریں یا نہیں مگر میرے دن...... ایک آنسو آنکھوں کے کنارے سے نکل کر تکیے میں جذب ہو گیا۔
مائیں بیٹیوں کا سکون اور خوشیاں تو دیکھتی ہیں۔ اس کے دن پھرنے سے اماں کے دن کیسے پھریں گے۔
پہلے ہی مرحلے پر اس نے سوچا تھا سمجھ نہیں آئی تھی۔
دکھ، اذیت، تکلیف کی ایک لہر نے اسے بھگو دیا۔
اماں نے ابا کی ناراضی مول لے کر اقرار کیا تھا۔ کس قدر استحقاق تھا ان کے انداز میں۔ اس کے جھکے ہوئے سر نے اس کے وجود کو قربان گاہ بنا دیا۔
عورت تو ہمیشہ سے ہی قربانی دیتی ہے۔ گھر کے لیے، حالات کی خاطر، بہن، بھائی، ماں باپ...... سب کے لیے۔
عورت کے لغوی معنی شاید قربانی کے ہیں۔
اور واقعی اس کے گھر کے حالات بدل گئے۔
سراج منیر بھائی کو پکی نوکری مل گئی۔ ابا کی پینشن بحال ہو گئی۔
''دیکھ نبیلہ مجھے تو ظالم مت سمجھنا میں تیری ماں ہوں اور ماں اولاد کا برا نہیں چاہتی۔ یہ غربت جو ہوتی ہے نا نسل در نسل چلتی ہے۔ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ہاں کبھی قسمت مہربان ہو جائے یا پھر خدا کو ہی ترس آ جائے تو دن پھر جاتے ہیں۔ اس نیلی چھتری والے کو شاید ہم پر بھی ترس آ گیا ہے اور میں چاہتی ہوں میری کوئی تو بیٹی پیسوں میں کھیلے۔ بیگم آفندی بہت اچھی خاتون ہیں، تیرا بہت خیال رکھیں گی۔ ان کا بیٹا بہت بڑا بزنس مین ہے۔''
''پر اماں......''
''بس نبیلہ خدا کے کرم پر ناشکرہ پن نہیں کرتے۔'' انہوں نے دھیرے سے اسے گلے لگا لیا۔
''اماں میں آپ سب کے بغیر کیسے رہوں گی۔''
''تو اتنی خوش رہی گی کہ ہم سب کو بھول جائے

گی۔"

"اماں میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔ میں بھی تو اس گھر کے دکھ سمیٹ سکتی ہوں۔"

"ہم غریبوں کے دکھ صرف مہربان لمحے اور خوش قسمت ساعتیں ہی سمیٹ سکتے ہیں۔ تو ہمیشہ خوش رہے گی۔"

پتا نہیں اماں کو کیوں یقین تھا۔

جب کہ اسے تو لمحہ بھر کو بھی یقین نہیں تھا۔

تمام بہن بھائی اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔

"اچھا پھر ایک شرط ہے۔"

معلوم نہیں کیوں اور کیسے اسے عقل آ گئی تھی۔

"کیا؟" اماں نے حیرانی سے دیکھا۔

"میں پڑھنا چاہتی ہوں۔ مجھے میڈیکل میں ایڈمیشن مل جائے۔"

"ارے وہ سب پڑھے لکھے لوگ ہیں اگر تیری خواہش ہوگی تو کیوں نہیں تجھے پڑھائیں گے۔"

اماں تو خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔

اس بار بیگم آفندی تاریخ لینے آئیں تو انہوں نے کہہ دیا۔

"ضرور، حاجرہ بہن۔ کیوں نہیں۔ اگر اس کے نمبر اچھے ہیں تو میں خود اسے میڈیکل میں ایڈمیشن دلواؤں گی۔" بیگم آفندی نے یقین دہانی کرائی۔

یوں بہت ساری مراعات لینے کے بعد اس کا عقد پچاس ہزار حق مہر کے عوض حارث آفندی سے پڑھا دیا گیا۔

چند ہی لوگ آئے تھے۔ اماں نے تمام شگن پورے کیے تھے۔ مایوں، ابٹن، مہندی سادگی سے رخصت ہو کر وہ بیگم آفندی کے گھر میں آ گئی۔

وہ خواتین نے اسے دائیں بائیں سے تھام رکھا تھا۔ بیگم آفندی برابر میں چل رہی تھیں۔

اف! اتنا شاندار گھر دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔

اس میں کیا نظر آیا۔ بیگم آفندی اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔

"تم بہت سمجھ دار، باشعور، عقل و فہم رکھنے والی لڑکی ہو۔ حالات کو جلد سمجھ لوگی۔ ہو سکتا ہے تمہاری ماں نے بتایا ہو مگر اب تم میرے گھر میں ہو۔ تمہیں آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔"

"اس گھر میں دو بہوئیں ہیں اور دونوں ہی اولاد سے محروم ہیں۔" اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"حارث کی شادی کو آٹھ سال ہو گئے ہیں مگر اس گھر کو اس جائیداد کو وارث کی ضرورت ہے۔"

"تم ہمیں اولاد کی خوشیاں دکھانا بدلے میں تمہیں منہ مانگی خوشیاں دیں گے۔ گھر، آسائشات تمہارے خوابوں کی تعبیر...... جو...... جو تم چاہو۔"

"میں ماں ہوں مجھے خود غرض مت سمجھنا۔ بس ترسی ہوئی ماں کی یہ آخری خواہش سمجھ لو۔"

دھیرے سے اپنا دامن پھیلا دیا۔

"حارث آج تمہارا نہیں ہے۔ کل ضرور تمہارا ہوگا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہ ساکت و جامد بیٹھی تھی۔

ذرا سی جو کشش محسوس ہو رہی تھی شادی سے وہ بھی یکسر غائب ہو گئی۔

ضرورت، قربانی، خواہش......

دھیرے سے انہوں نے اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا۔

وہ اس درجہ بحر استعجاب میں تھی کہ آنسوؤں نے بھی ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

"میں تمہیں حارث کے ساتھ اسلام آباد بھیجوں گی۔"

میں یہاں بھی رہتی ہوں امریکا میں بھی۔ بس بچوں کی وجہ سے آتی جاتی رہتی ہوں۔ تمہیں کبھی شکایت نہیں ہوگی۔ حارث کی بیوی نگار نے بھی وعدہ کیا ہے۔ تمہیں تکلیف نہیں دے گی۔ اولاد اس کی بھی خواہش ہے۔"

وہ سر جھکا کر سوچ رہی تھی اس زندگی میں اس کے لیے کہاں سکون ہوگا۔ خوشی کہاں اس کی

منتظر ہوگی۔
سب کے سب فائدے میں رہے۔ اماں کے دن پھر گئے۔
ان کو اولاد مل جائے گی۔
عمر بھر کا خسارہ تو اس کے حصے میں آیا۔
دلوں میں کون جھانکتا ہے۔
کمرا خالی ہو گیا۔ بیگم آفندی جا چکی تھیں۔ اپنا فرض پورا کر کے۔
تھوڑی دیر بعد ان کا بیٹا آ گیا۔ اپنا فرض پورا کرنے۔ حق کی تو اسے ضرورت ہی نہیں تھی۔
"معلوم نہیں یہ مائیں قسمت پر شاکر کیوں نہیں ہوتیں۔"
وہ شاید اس سے ہی مخاطب تھا۔ منہ کھڑکی سے باہر تھا۔ گھور اندھیرے میں جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔
"ضرورتیں محبتوں میں کبھی نہیں بدلتیں۔ ہاں محبتوں کے درمیان ضرورتیں آ جاتی ہیں۔ نگار...... میری بیوی، میری محبت، چاہت، خواب سب کچھ ہے وہ اتنی مکمل ہے کہ اس نے مجھے مکمل کر دیا ہے مگر ماں کا دل مطمئن نہیں حالاں کہ اولاد اتنی ضروری بھی نہیں مگر ماں کو کون مطمئن کرے۔"
نبیلہ نے دھیرے سے سر جھکا لیا۔
میں وہ لڑکی ہوں
جس کا گھونگھٹ اٹھا کر
یہ کہہ دے
میرا سب کچھ تمہارا ہے
سوائے دل کے
اور دل کے سوا رہ کیا جاتا ہے مگر اب اس کے ہاتھ بندھ چکے تھے۔ اب اسے کچھ نہیں سننا تھا اس کے بعد کہ......
میرا سب کچھ تمہارا ہے
سوائے دل کے
حقوق کی جنگ لڑنے سے پہلے ہی یاس اس کا نصیب بن گئی۔
"یہ ممی نے دی ہے۔" ایک انگوٹھی اس کے پیروں کے پاس رکھ دی گئی۔ "میں تمہیں کبھی تکلیف نہیں دوں گا۔"
"ہاں تم مجھ سے ایسا کچھ مت مانگنا جو میں تمہیں دے نہ سکوں...... باقی میں تمہیں نوازتا رہوں گا۔"
وہ اٹھ کر باتھ روم میں بند ہو گیا۔
اور وہ یوں ہی سر جھکائے بیٹھی رہ گئی۔
معلوم نہیں قسمت نے اسے اس نہج پر کیوں آزمایا تھا۔
وہ تو بہت کمزور، نازک سی جوہی کا پھول تھی۔
اتنی پریشانیوں میں پھول کملا جاتے ہیں۔
پھر وہ پورے دو ہفتے آفندی ہاؤس میں رہی۔
اس کی دونوں نندوں نے اسے خوش رکھا ابراہیم بھائی کی بیگم حنا بھابی نے اسے تسلی دی۔
اماں بہن بھائی اس سے ملنے آتے رہے۔
حارث کا سلوک اس سے مہربان تھا نرم لہجہ، خوب صورت الفاظ ایک دو بار باہر بھی لے کر گیا مگر...... اس سے زیادہ کی امید مت رکھنا۔

☆☆☆

حارث کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ اس کو واپس اسلام آباد جانا تھا۔ بیگم آفندی خود اسے ساتھ لے کر اسلام آباد آئیں۔
اتنا وسیع و عریض گھر اگر خواب بھی بنتی تو ایسا گھر نہ تراش سکتی تھی۔
وہ نگار کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔
جیسے کوئی مومی مجسمہ......
اتنی خوب صورت سپید...... سیاہ موٹی موٹی غزالی آنکھیں، بوٹا سا قد...... گھنے سیاہ گھنگھریالے بال...... موتیوں کی مانند ہموار سفید دانت...... رخسار کا ڈمپل، سیاہ تل، حارث کی وارفتگی لازمی تھی۔
وہ کیسے اپنے مدار سے ہٹ سکتا تھا۔
اس کے آگے تو وہ معمولی اور قبول صورت تھی۔
ضرورتیں انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتی ہیں۔ اس نے سر جھکا لیا۔

دو دن تک بیگم آفندی اس کے ساتھ رہیں۔
زمانے کی اونچ نیچ بتائی، وقت کے اسرار و رموز سے آشنا کیا۔
''یہ تمہارا اکاؤنٹ نمبر ہے۔ جب چاہو رقم نکلوا سکتی ہو۔''
''یہاں کے میڈیکل کالج میں تمہارا ایڈمیشن ہوگیا ہے۔ کلاسز کی تاریخ دیکھتی رہنا جب کسی چیز کی ضرورت ہو مجھ سے کہنا۔''
''یہ میرا امریکا کا اور یہ کراچی کا فون نمبر ہے۔''
میڈیکل میں ایڈمیشن تو اس کا خواب تھا۔ اس خواب کی تکمیل یوں ہوگی اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔
اس عورت نے اسے کس کس طرح نوازا تھا۔
تبھی وہ اسے قصوروار بھی نہیں ٹھہرا سکتی تھی۔
''انسان اگرچہ اپنی غرض کے لیے خودغرض ہو جاتا ہے لیکن ہم نے تمہارے احساسات کا بھی پاس کیا ہے اور ہاں اگر درمیان میں تم راستہ بدلنا چاہو تو کہہ دینا ہم تمہیں روکیں گے نہیں۔''
وہ سر جھکائے سنتی رہی۔
''ہماری خواہشوں کی تکمیل شاید اسی سود و زیاں کے ذریعے ہونا تھی مگر خسارے میں تم رہو گی اور نہ ہم۔''
اس میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ اس عورت کو سر اٹھا کر دیکھ لے جو اسے ایک ایسی منزل کے راستے تک لے آئی تھی جو سیراب بھی اور سراب دونوں ہی تھی۔
حد سے زیادہ سیرابی بھی انسان کو مدہوش کر دیتی ہے۔
اور کیا وہ مشرقی عورت نہیں تھی۔ اسے مشرقی روایات کا پاس نہیں تھا۔
اور اس کو بھی چھوڑو۔
کیا وہ اپنے گھر والوں کو دی ہوئی خوشیاں چھین سکتی تھی۔
قربان گاہ میں کوئی بھی قربان ہو جائے تو واپسی کا راستہ بھول ہی جاتا ہے۔

میری وسعت کی طلب نے مجھے محدود کیا
میں وہ دریا ہوں جو موجوں سے ساحل مانگے

اس کے ہونٹوں پر ایک گہری اور جامد چپ تھی۔ ایسی چپ جسے کوئی نہیں توڑ سکتا تھا۔
بولے تبھی تو کیا بولے۔ لفظ سب ختم ہو چکے تھے۔
کہے بھی تو کس سے تمام ناتے صرف ناتے رہ گئے تھے۔
گویا اب اس کی ذات اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی تھی۔
''میں جانتی ہوں بیٹا اس عمر کے خواب کیسے ہوتے ہیں لیکن خواب ہی تو سب کچھ نہیں ہوتے نا۔ ہمیں خوابوں کی تعبیر تلاش کرنا پڑتی ہے۔ بعض اوقات عمر بیت جاتی ہے مگر چاہ نہیں ملتی۔ تم خوش قسمت ہو جب اس زندگی سے تھک جاؤ تو مجھے آواز دے لینا۔ میں تمہیں اپنے پاس بلالوں گی۔''
اس کا سر شانوں سے لگائے، بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرتے ہوئے سمجھا رہی تھیں۔ بلکہ اس کی برین واشنگ کر رہی تھیں۔
''حارث دل کا برا نہیں ہے، جب تم اس کو اولاد کی خوشی دو گی تو تمہارا ہو جائے گا لیکن اس کے لیے تمہیں ذرا انتظار کرنا ہوگا۔''
''مرد کبھی اپنے بچوں کی ماں کو دھتکار نہیں سکتا اور پھر یہ تو طے ہے نا ہم زندگی سے بھاگ نہیں سکتے۔''
''خود کو بدنصیب مت سمجھنا۔ تمہاری زندگی میں شاید تقسیم شدہ مرد ہی لکھا تھا۔ تقسیم شدہ مرد ہمیشہ ہی برا نہیں ہوتا۔''
تقسیم شدہ مرد...... اس کے دل میں دھکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ پھر بہت دیر تک اسے سمجھاتی رہیں۔ انا کا مضبوط خول محبت توڑتی ہے، ان کی ساری گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ زندگی کا سب سے آسان کام خود کو دھوکا دینا ہے۔ خرگوش کی طرح آنکھیں

بند کرلیں، کچھوے کی طرح اپنی گردن اپنے اندر چھپالیں، آنکھیں بند کرلیں......اور......اور۔

ضبط کرتے ہیں تو ہر زخم لہو دیتا ہے
آہ کرتے ہیں تو اندیشہ رسوائی ہے

گھڑی ساڑھے بارہ بجارہی تھی۔ گیٹ تیزی سے کھلا پھر بند ہوگیا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی ہوگئی۔

حارث اور نگار اس کے کمرے کے آگے سے گزرے۔ ہنستے باتیں کرتے ہوئے اس سے بے پروا۔

شاید انہیں تو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوگا کہ کوئی تیسرا فرد بھی اس گھر میں موجود ہے۔

ابھی ابھی یہ لوگ ایئرپورٹ سے آرہے تھے۔ آج ممی واپس چلی گئی تھیں۔

وہ جو ایک آسرا، ہمت، احساس تھا، آج وہ سہارا بھی ہاتھوں سے نکل گیا۔

اب آج کے بعد کل سے اسے اپنے پیروں پر خود کھڑا ہونا تھا۔ اپنی جگہ خود بنانا تھی۔

تغیر، انسانی زندگی اور کائنات کا پہلا اصول ہے۔

اس کی زندگی میں تغیر ہی نہیں بلکہ تغیرات کا طوفان امڈ آیا تھا۔ المیہ کیا ہے؟

المیہ یہ نہیں ہوتا کہ سماج کی زنجیر کاٹنے کے لیے اپنے پیروں کو لہولہان کریں بلکہ المیہ یہ ہوتا ہے کہ آپ زخمی پیروں سے کھڑے ہوں اور کوئی راستہ آپ کو اپنی طرف نہ بلائے۔ اب اپنا خیال اور دھیان خود رکھنا تھا۔

اس کا خیال دھیان رکھنے والے لوگ بہت دور رہ گئے تھے۔

☆☆☆

صبح وہ اخبار دیکھ رہی تھی۔

سکھاں نے ابھی ابھی چائے لاکر دی تھی۔

اپنے گھر میں اتنی صبح وہ کبھی چائے نہیں پیتی تھی بلکہ عادت نہیں تھی۔

جہاں بہت کچھ بدل جائے وہاں عادتیں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔

ہر شہر کے لوگوں کی طرح اخباروں کی خبریں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ تاہم یہ ضرور تھا کہ کراچی کے اخباروں کے مقابلے میں یہاں کی خبریں پرسکون منظر پیش کرتی تھیں۔ ابھی اندرونی صفحات کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ حارث آگئے۔

''صبح بخیر!'' ایک نگاہ اٹھا کر دوسری نہ اٹھائی۔

جہاں ضرورتوں کی آماجگاہ ہو وہاں پر دلوں میں احساس کیسے پیدا ہوسکتے ہیں۔

''ٹھیک تو ہو؟'' سرسری سا لہجہ تھا۔

''جی!''

''کوئی پرابلم، کوئی پریشانی ہو تو کہہ دینا۔''

اس نے سر اوپر اٹھایا۔ ''جی؟''

''حارث۔ پلیز جلدی آیئے، دیکھیں تو آپ کی پسندیدہ نیوز۔''

اندر سے نگار کی آواز آئی۔ حارث آفندی اخبار دیکھتا ہوا پلٹ گیا۔

استحقاق کا کوئی لمحہ بھی تو اس کے پاس نہ تھا کہ وہ روکتی۔

وہ تو جب بھی نہیں روک سکی۔

جب......جب انسان محبت سے، نرمی سے، خلوص سے دلوں میں اترتا ہے اور پھر بالکل نئے لوگوں کو تو بہت زیادہ نرم رویے کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنوں سے بچھڑ کر آتے ہیں مگر یہاں...... یہاں تو صرف استحقاق تھا۔ جب کہ اس کی رضا......؟

حالاں کہ کسی عورت کو اس کی رضا کے بغیر حاصل کرلینا اس پر فتح کے جھنڈے گاڑنا ایسے ہی ہے جیسے کسی زندہ وجود کو زنگ آلود چھری سے ذبح کردیا جائے۔ اس کی رضا کسی بھی معاملے میں تھی ہی کہاں۔

اس نے سرخ عروسی جوڑا نہیں پہنا......سرخ سمجھوتوں کی چادر اوڑھی تھی۔ خون آشام آنچل۔

ہاں ٹھیک ہی تو ہے بام عروج ہو، جذبوں کا دور دورہ ہو، ہر چیز کے نئے اسلوب میں بیان کرنے کا

موسم ہوتو اس پر صبر وضبط کا موسم آجائے زندگی یوں ہی ٹھنڈی شاموں جیسے ہوجایا کرتی ہے۔

اور وہ تو تھی بھی ایسی ......سوال تو یہ تھا اب زندگی کو کس نہج پر رواں رکھنا ہے؟ کیوں کہ زندگی سے جوش وخروش، ولولہ انگیزی اور جذبوں کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

ابھی کل ہی کی تو بات تھی جب وہ ایف ایس سی کے رزلٹ پر کس قدر خوش تھی۔ اس کا جوش وخروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

اب وہ میڈیکل میں جاسکتی تھی ایک اچھی اور قابل ڈاکٹر بن سکتی تھی۔ اس کا خواب......اس کا عشق...... اس کا جنون......کون نہیں واقف تھا اس سے......اور تو اور......اس نے بچوں سے مل کر جو بھی کھیل کھیلا اس میں ایک ڈاکٹر ضرور موجود ہوتا تھا اور ڈاکٹر وہ خود بنتی تھی۔

اس کے خواب ڈاکٹر سے شروع ہو کر ڈاکٹر پر ختم ہوتے تھے۔

اس کی اکثر باتیں میڈیکل سے شروع ہو کر میڈیکل پر ہی ختم ہوتیں۔

اس نے تو بہت سے منصوبے بنالیے تھے کہ کیا کرنا ہے۔ روپیہ بہت چاہیے تھا۔ فیس کتابیں اور دوسری چیزیں۔ وہ خوب محنت کرے گی۔ ٹیوشن زیادہ سے زیادہ کرے گی تو ضرور اس کے خواب رنگ لائیں گے۔

مگر......!اس کے خوابوں کی تعبیر کس طرح ہوئی۔ تمام منصوبے دھرے رہ گئے۔ اس کا میڈیکل میں ایڈمیشن ہوگیا۔ بس صرف اتنا ہی تو ہوا تھا تمام زندگی کے لیے خود کو رہن رکھ دیا تھا۔ اپنے جذبات، بصارتوں کو دار پر چڑھا دیا تھا۔

کسی جیتے جاگتے وجود میں سے دل نکال لیا جائے تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟

☆☆☆

ابھی تک اس کی نگار سے زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتی تھی۔ بہت ہوا تو لان میں نکل گئی۔ کھانے کے ٹائم پر، ڈرائنگ روم میں چلی گئی یا کبھی کچن میں چائے بنالی جاکر......یا پھر اگر لاؤنج میں کوئی موجود نہ ہوا تو ٹی وی پر پروگرام دیکھ لیے۔ ایک کل وقتی ملازمہ تھی اس کا نام سکھاں تھا مگر وہ پورا دن پاؤں جلی بلی کی مانند ادھر ادھر گھومتی رہتی تھی۔ حارث تھا اس سے اتنی بات چیت ہوتی تھی جتنی وہ ضرورت محسوس کرتا تھا۔ خیریت پوچھ لی......بس۔

ممی کی موجودگی تک نگار آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرتی تھی باقاعدہ لفظوں کا سہارا ابھی نہیں لیا۔

یہ جملے وہی ہوسکتے تھے جو ایک سوکن دوسری سوکن سے کہہ سکتی تھی۔ ایک چوکیدار تھا۔ پس گھر کی شامیں سونی ویران تھیں۔ دونوں میاں بیوی کو گھومنے پھرنے کا کریز تھا۔ جانے اسلام آباد کی سڑکیں انہوں نے کتنی ہزار دفعہ ناپ لی تھیں اور اگر گھر پر موجود ہوتے تو لان یا لاؤنج آباد ہوتا۔

دونوں نے اسے بلانے کا تکلف کبھی نہیں کیا اور نہ ہی اس نے کبھی سوچا کہ اسے ان دونوں کے درمیان بیٹھنا چاہیے۔

اس کی کلاسز ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ جب تک دن کسی نہ کسی طرح سے گزرنا ہی تھے۔ اس کے بعد......اس کے بعد وہ مصروف ہوجائے تو زندگی سہل ہوجائے گی۔

کتنی عجیب بات تھی اس گھر میں دو فون تھے اس کا کبھی فون نہیں آیا۔ نہ اماں ابا نے اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے کیا۔ وہ کہاں کرتیں۔ نہ ممی نے امریکا جاکر ضرورت محسوس کی۔ یوں لگتا تھا جیسے سب اسے اس ''خاص'' جگہ پر بھیج کر مطمئن، فرحاں ہوں۔ سب کی بس یہی رضا تھی۔

محبت......محبت، اس کے لیے سہانا خواب بن کر رہ گئی تھی۔

اس شخص کے افلاس پر رحم آتا ہے
جس کو ہر چیز ملی صرف محبت نہ ملی!

☆☆☆

اس روز بھی وہ لان میں ٹہل رہی تھی کہ نگار ادھر آ گئی۔

"سنو! تم زیادہ اپنے بیڈ روم کی پچھلی سائیڈ پر رہا کرو۔" اپنی سوچوں سے چونک کر اس نے سر اٹھایا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ہمارا کوئی ملنے والا آ سکتا ہے۔ ہم نے کسی کو تمہارے بارے میں نہیں بتایا۔"

"تو بتا دیجیے گا چھپانے والی کوئی بات نہیں۔ اب تو ہر چیز بازار میں مل جاتی ہے۔"

"لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز ہم خریدیں اس کی تشہیر بھی کریں۔"

"کیا ہوا نگار......" حارث بھی ادھر آ گیا۔ تولیے سے سر کے بال رگڑتا۔ اس کی وجاہت، دراز قد نمایاں تھا۔

"سن لیا نا۔" جواب میں وہ سینے پر بازو لپیٹے ان پر ایک نگاہ ڈال کر پلٹ گئی۔

"کیا ہوا؟"

"نخرے دیکھو نوابزادی کے، مالکن سمجھ رہی ہے خود کو۔" نگار اس کی خاموشی پر کھول کر رہ گئی۔

"ہوا کیا آخر!"

"میں نے کہا پچھلے لان میں بیٹھا کرو۔ اب ہم نے کسی اور کو تو نہیں بتایا نا کہ......" وہ بولتے بولتے جھجک کر چپ ہو گئی۔

"کیا......کہا......!" حارث شرارت سے جھکا۔

نگار کا لہجہ کمزور ہو گیا۔ کمزوری اس کی بھی تو تھی نا۔

"بولو نا......" شرارت ہنوز جاری تھی۔

"کچھ نہیں چلیں اندر......" وہ اسے دھکیلتی اندر لے گئی۔

نگار بے حد خوب صورت اور ایک باوقار سی عورت تھی جو حارث سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ اپنے گھر والوں سے بغاوت کر کے اس نے یہ شادی کی تھی۔ اس کا حسن چاند کو شرماتا تھا اور مردوں کا یہ وصف ہے کہ یہ چکور بنیں۔ حارث نے تو عشق و عاشقی کے تمام ہی ریکارڈ توڑ دیے تھے اور جب وصل ہو گیا تو وہ کسی قیمت پر اس سے جدا ہونے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

ان کی شادی کو آٹھ سال ہو چکے تھے۔ نواں چل رہا تھا۔ جانے اس میں خدا کی کیا رضا تھی دنیا کا علاج کرا لیا مگر گود ہری نہ ہوئی۔

ایک ماں کے لیے انتظار کے آٹھ سال بہت ہوتے ہیں۔ ہر سال بیگم آفندی جب بھی آتیں حارث کی دوسری شادی کا ذکر کرتیں۔ انہیں ہر قیمت پر ننھی منی خوشیاں چاہیے تھیں۔

"آپ تو اتنی دور ہوتی ہیں پھر کیوں بضد ہیں۔" حارث زچ ہو جاتا۔

"ماں کتنی بھی دور کیوں نہ ہو، اولاد کے دکھ سکھ کی ساتھی ہوتی ہے۔ ہر لمحہ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔" انہوں نے تاسف سے حارث کو دیکھا۔

"لیکن ممی ابھی ہم نہیں سمجھتے کہ ہمیں اولاد کی ضرورت ہے، پھر اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اللہ کو دینا ہو گی تو نگار سے ہی ملے گی۔"

"انتظار کے لیے نو سال کم تو نہیں ہوتے کیا میں یہ حسرت لیے ہی......"

"اللہ نہ کرے ممی کیسی باتیں کرتی ہیں۔"

"بس تو اس بار میں تمہاری دوسری شادی کروا کر ہی جاؤں گی۔ ایک تم نے اپنی پسند سے کر لی ایک میری پسند سے کر لو۔"

"ممی آپ دوسری شادی کا مطلب جانتی ہیں۔ یعنی مرد آدھا تیتر رہے نہ آدھا بٹیر میرے اندر اتنا حوصلہ نہیں ہے۔"

"لیکن میں نے تمہارے لیے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔ وہ لوگ ضرورت مند ہیں۔ ان کی تو گویا لاٹری نکل آئی ہے۔" بیگم آفندی نے اطلاع فراہم کی۔

"گویا آپ نے بات بھی طے کر لی ہے۔" حد

درجہ حیرانی ہوئی۔
''ہاں!'' اطمینان قابل دید تھا۔
''پلیز ممی میں اپنی پرسکون زندگی میں ہلچل نہیں چاہتا۔ آپ نہیں جانتی کہ......''
''میری بات سنو حارث...... مجبوریوں کے سودے بڑے پائیدار ہوتے ہیں۔ بازار سے ہر چیز کو خریدا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ غربت بھی...... غربت ہر دام میں بکتی ہے۔ ضرورت مند ہر طرح سے اسے خرید لیتے ہیں بس میں نے بھی ایک سودا کیا ہے اور یقیناً خسارے کا نہیں ہوگا۔ اگر تم میرا ساتھ دو۔''
حارث ہکا بکا ان کی باتیں سن رہا تھا۔
''میری خواہش ناجائز تو نہیں ہے نا اولاد کی خواہش تمہیں بھی ہوگی۔ بچوں کے بغیر گھر سونا اور ویران ہوتا ہے۔ ان کے دم سے ہی تو رونقیں ہیں۔''
''ممی ابھی ہم اور انتظار کر سکتے ہیں جب کہ آپ جانتی ہیں کہ......''
''وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اب میرے اندر بھی حوصلہ نہیں ہے۔''
''ممی نگار کسی صورت راضی نہیں ہوگی۔ اپنی اور میری جان ایک کر دے گی۔''
کمزور سا عذر تراشا گیا۔
''اس کو سمجھاؤ حارث یہ اس کی بھی ضرورت ہے اور ہم کوئی ناجائز کام نہیں کر رہے۔ کسی دوسرے کے بچے کو اڈاپٹ کرنے سے بہتر ہے، ہماری ضرورت صحیح طریقے سے پورے ہو جائے۔ جب اس لڑکی کی مرضی ہوگی تو اسے چھوڑ دیں گے اور نہیں تو پھر اسے میں اپنے پاس لے جاؤں گی۔'' ان کا لہجہ حتمی تھا۔
''ممی کیا کسی لڑکی کی زندگی اتنی سستی ہو سکتی ہے؟''
''ہاں! ہو سکتی ہے غریبوں کی زندگی اتنی ہی سستی ہوتی ہے۔ وہ اپنی غربت کو کبھی ختم نہیں کر سکتے۔ قسمت انہیں ایک موقع فراہم کرتی ہے۔ وہ اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھائیں۔ فائدہ اٹھانے کا حق تو ہر کسی کو ہے نا۔''
''انہوں نے بھی اپنی خواہشات، اپنے بیٹوں کی بے روزگاری اور بیٹی کے خواب بیچے ہیں۔ خوشحالی پر ان کا بھی حق ہے۔''
حارث حیران تھا۔
''نبیلہ کو میڈیکل میں جانے کا شوق ہے ایف ایس سی میں اس کی فرسٹ کلاس آئی ہے اور ڈاکٹر بغیر پیسوں کے نہیں بنا جا سکتا۔ اگر تم چاہو تو ایک معاہدہ کر لو جب تک وہ ڈاکٹر بنتی ہے۔ جب تک وہ یہاں رہ کر ہمیں اولاد کی نعمت سے نوازے۔ اس کے بعد فیصلہ ہو سکتا ہے۔''
وہ ہر حال میں حارث کو راضی کرنا چاہتی تھیں۔
''نگار مر جائے گی۔ یہ ادھوری زندگی کیسے بسر ہوگی۔''
''کوئی نہیں مرتا کسی کے لیے۔ اس کام کو یوں ہی ہونا تھا۔ تمہاری جائز اولاد تو ہوگی نا...... کسی شک و شبہ کی گنجائش کے بغیر۔ پھر غریبوں کو حقوق لینے آتے بھی نہیں ہیں۔ تمہیں کوئی تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ تمہاری زندگی میں دخل اندازی نہیں کرے گی وہ۔''
''ممی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' حارث کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔
''اور...... کیا وہ لڑکی بھی راضی ہو گئی ہے؟''
''تمہیں ایک بات کو کتنی دفعہ سمجھایا جائے۔ ہر زاویہ سے سمجھا دیا گیا ہے۔''
''اور اگر یہ ہی صورت حال آپ کی بیٹی کے ساتھ ہوتی تو آپ کا کیا فیصلہ ہوتا۔'' آواز پر دونوں چونکے۔
دروازے پر نگار کھڑی تھی۔
''اوہ تم! آؤ...... ابھی تمہارے بارے میں ہی باتیں کر رہے تھے۔''
''میرے بارے میں یا...... اپنے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں۔'' اس کا لہجہ سنجیدہ اور تند تھا۔
''اس کا مستقبل بھی تو تم سے وابستہ ہے نا۔''

"پھر آپ کا یہ فیصلہ!"
"تمہاری بہتری کے لیے ہے۔ مرد کو اولاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیٹا وارث ہوتا ہے۔ اب ہم کتنے سال اور انتظار کر سکتے ہیں۔ کب آنے والا آئے۔ بڑا ہو تعلیم و تربیت کے مراحل سے گزرے۔ اس کے لیے ایک طویل انتظار چاہیے۔ کیا آٹھ سال کسی انتظار کے لیے کافی نہیں۔"
انہوں نے آسانی سے سمجھایا۔
"جب حارث نہیں چاہتے تو آپ کیوں بضد ہیں۔"
"یہ ایک ممتا کا تقاضا اور خاندان کا مسئلہ ہے۔ اسے راضی ہونا پڑے گا۔"
"مگر میں اسے دوسری شادی کی اجازت نہیں دے سکتی۔"
"ضد کرنے کا انجام تم جانتی ہو۔ کب تک یہ خالی ڈھول پیٹتا رہے گا۔" ان کا غصہ حد سے بڑھنے لگا۔
"میرے دامن میں آگ لگی تو کوئی بھی خوش نہیں رہ سکتا۔" نگار بھل بھل رونے لگی۔
"بہت دیکھ لیے ہیں یہ آنسو تم ان سے اب تک میدان نہیں جیت سکتیں۔ بہتر ہے کہ خاموشی سے پیچھے ہٹ کر وقت گزارنے کا انتظار کرو۔"
"حارث! سن رہے ہیں آپ......"
"پلیز نگار...... تم ٹھہرو، میں بات کر رہا ہوں نا ممی سے۔" حارث نے دھیرے سے اسے سمجھایا۔
"تم......! کیا بات کرو گے تم تو خود یہ چاہتے ہو۔ تمہاری یہی مرضی اور منشا ہے۔ دیکھنا تم ساری عمر خوش نہیں رہ سکتے۔" وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔
حارث نے اسے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔
بیگم آفندی کمرے سے باہر نکل گئیں۔
"پلیز نگار خود کو سنبھالو۔ ممی کی خواہش بھی تو ناجائز نہیں ہے نا۔ آخر وہ ماں ہیں...... جب میں تمہیں یقین دلا رہا ہوں کہ میں تمہارا ہوں۔ تمہارا ہی رہوں گا۔ اس بات کا یقین کرو۔"
"تم میری محبت ہو......میری چاہت ہو، میرے خوابوں کی تکمیل ہو۔ کیا میں تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں؟ چاند کی چاندنی جب تک نہ پھیلے چاند ادھورا ہوتا ہے۔" دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے سمجھاتا رہا۔
"خوشی خوشی اجازت دو اس گھر کو بھی خوشی کی ضرورت ہے۔ شور و ہنگامے کی ضرورت ہے۔ اس کے بدلے میں تم جو چاہو شرط لکھوالو۔" اس کی آنکھوں سے آنسو سمیٹتے ہوئے حارث نے تسلی کے پھاہے رکھے۔
"تمہاری مرضی یہی ہے نا۔"
"نہیں صرف ممی کی رضا ہے۔" وہ بولا۔
"شادی کے بعد سب بدل جاتے ہیں۔" نگار کا سر جھکنے لگا۔
"میں بدل جاؤں تو پھر کہنا۔" وہ دھیرے سے بولا اور اس نے کچھ سوچتے ہوئے سر جھکا لیا۔
تین دن بعد اس نے جواب دیا۔ اترے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ اس کے روبرو تھی۔
"میں راضی ہوں حارث...... یوں جیسے کسی نے سولی پر چڑھا دیا ہو مگر میری کچھ شرائط ہیں۔"
"کیا؟"
"سوائے اولاد کی خواہش کے تم اس سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے۔ دوسرا یہ کہ جب اس کی تعلیم ختم ہو جائے گی تو اس کو چھوڑ دو گے۔ تیسرا یہ کہ اس سے جذباتی لگاؤ نہیں پیدا کرو گے۔"
ویران ویران انداز تھا ......حارث کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔
"میری جان! جہاں غرض ہو خود غرضی ہو وہاں لگن کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ جذباتی لگاؤ وہاں ہوتا جہاں محبت ہوتی ہے۔"
"اور محبت عشق کی حد تک صرف تم سے ہے۔"

☆☆☆

انہی دنوں میڈیکل کالج کلاسز شروع ہو گئیں۔ انسان جب سمجھوتوں کی چادر اوڑھ لے، جو ہے جیسا

ہے کی بنیاد پر قبول کر لے اور قسمت پر شاکر ہو تو زندگی بہت حد تک سہل ہو جاتی ہے۔

سب سے زیادہ دکھ دوسرے سے توقعات دیتی ہیں۔ کیا، کیوں، کیسے، سوالات دکھوں میں اضافہ کرتے ہیں اور پھر جب اس بات کا احساس ہو کہ ہم کسی کے کچھ نہیں تو خود کو منوا کر، کر نا بھی کیا ہوتا ہے۔

زندگی جب رہن رکھ دی جاتی ہے تو پھر خوشیوں کا رس کشید کرنے کی خواہش بھی مفقود ہو جاتی ہے۔

اس کے سر پر بھی گھنے سایہ دار درخت کی چھتر چھایہ تن گئی مگر محبتوں کے معاملے میں یہ درخت بانجھ تھا اور بانجھ موسم کوئی سا بھی ہو بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ تاہم اب یہ ہوا کہ کتابوں کی مصروفیات میں الجھ کر اس نے بہت حد تک تکلیف دہ مراحل طے کر لیے تھے۔ کالج میں بھی اس کا لیے دیے والا انداز تھا۔ دعا سلام کی حد تک۔

''دل اس درجہ ٹوٹ گیا تھا کہ اب وہ کسی کو دوست بنانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ دوستی یعنی غمگساری ہمدردی تاسف...... کس کس کو اپنی داستان الم سناتی۔ کس کس کی ہمدردیاں وصول کرتی۔ یہ تو پھر شاید مشیت ایزدی تھی جو لکھا اس نے قبول کر لیا تھا۔''

اکاؤنٹ میں جمع کروانے کے علاوہ ممی اسے کافی رقم دے کر گئی تھیں، وہی ابھی تک چل رہی تھی۔

ابھی تک امریکا جا کر انہوں نے اس کی خیریت دریافت نہیں کی تھی۔ جب قریب کے لوگ...... اس کے ماں جائے بھول گئے وہ تو پھر غیر اور دور تھیں ان سے کیا شکوہ۔ ضرورت تو ان کی بھی پوری ہو گئی تھی۔ بس اب شاید انجام کا انتظار تھا۔

☆☆☆

اس نے دھیرے سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارے دل میں جو وسوسے اور واہمے ہیں انہیں نکال دو۔ حارث کبھی تم سے بے وفائی نہیں کرے گا۔''

''وعدہ!'' اس نے بے یقینی سے دیکھا۔

''اپنی جان کا۔'' بے ساختہ ہی انداز تھا۔

وہ بے یقینی کے درمیان تھی تاہم پھر بھی اعتبار کر لیا۔ حالاں کہ جو عزائم ممی کے تھے اس پر اس کا جارحانہ انداز ہو سکتا تھا مگر اسے اپنا گھر بھی بچانا تھا۔ اپنی محبت پر ثابت قدم بھی رہنا تھا۔

وہ ایک خوب صورت عورت تھی۔ خوب صورتی کے ساتھ اگر ذہانت بھی ہو تو خوب صورتی کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

اور......!

نبیلہ کو دیکھ کر نگار کو یقین آ گیا۔ یہاں صرف ضرورت ہے۔ وہ ایک واقعی غریب لڑکی تھی۔ سنجیدہ، غربت کی ماری...... اس سے کہیں کم صورت شروع سے ہی اس نے اپنا رویہ سخت رکھا تھا۔

نبیلہ کو یہاں بلانے کی شرط بھی اس نے رکھی تھی۔ وہ اپنے رویوں میں لچک نہیں پیدا کرنا چاہتی تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مرد ذات کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ اگر نبیلہ کو آفندی لاج میں رہنے دیتی تو حارث گاہے بگاہے ادھر جاتا اس کی غیر موجودگی میں وہ حاوی ہو سکتی تھی۔ ہمدردی محبت کا روپ دھار سکتی تھی۔ وہ اس کی جگہ لے سکتی تھی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ سامنے رہنے کا مقصد یہ تھا حارث نظروں کے سامنے رہتا۔ اس کی پہنچ میں اپنے قرب سے اپنے مسحور کن حسن سے اسے کہیں اور جانے ہی نہ دیتی۔

شوہر ایک ایسی چیز ہے جس میں عورت شراکت برداشت نہیں کرتی اور اگر مجبوری کے تحت کر بھی لے تو پاؤں جلی بلی بن جاتی ہے۔ اس مجبوری کو وہ بھی سمجھتی تھی مگر اب اس نے حارث پر کڑی نگاہ رکھی ہوتی تھی اور نبیلہ کو وہ خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

رات گئے تک اسٹڈی میں خود کو مصروف رکھتی۔ کتابیں واقعی بہت اچھی دوست اور ساتھی ہوتی ہیں۔ یادوں کے عذاب سے بچا لیتی ہیں۔

☆☆☆

حارث نے کسی ضرورت کے متعلق پوچھا ہی نہیں یا پوچھنے کے لیے اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اس روز لان میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ سکھاں پاس ہی

بیٹھی تھی۔ سکھاں سے باتیں کر کے وقت بہت اچھا گزر جاتا تھا۔
تبھی گیٹ کھلا اور دو خواتین اندر آ گئیں۔
''سلام بیگم صاحبہ!''
''وعلیکم السلام!''
''تمہاری بیگم صاحبہ ہیں؟'' اس کا جائزہ لیتے ہوئے سکھاں سے پوچھا۔
''جی میں بلا کر لاتی ہوں۔'' اندر چلی آئیں۔
''آپ بیٹھیں نا!'' اخلاقاً بٹھایا۔
''آپ کون ہیں مسز حارث کی......''
''جی۔'' وہ یک دم بوکھلا گئی۔ گو رشتہ جائز تھا مگر......
''میں، میں کزن ہوں حارث کی۔'' اسے یہی سوجھا۔
''اچھا......کب سے یہاں ہیں؟ حارث نے تذکرہ ہی نہیں کیا۔ اکثر آتے جاتے رہتے ہیں یہ لوگ......کبھی آیئے گا نا۔'' خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے کہا۔
سیدھی سادی، دوپٹا شانوں پر ڈالے ہوا سے بکھرتے بالوں کو سمیٹتی انہیں یہ لڑکی بہت اچھی لگی۔
''کیا نام ہے تمہارا؟''
''نبیلہ......نبیلہ شیخ۔''
''ہاں بہت خوب صورت نام ہے مگر میں تمہیں بیلا کہوں گی۔ مائنڈ تو نہیں کرو گی۔'' مسکرا کر انھیں دیکھا۔
''میرے ابو مجھے بیلا کہتے تھے۔''
''پڑھتی ہو؟'' دلچسپی سے دیکھا۔
''جی میڈیکل کے فرسٹ ایئر میں ہوں۔'' فخر سے بتایا۔
دوسری خاتون دلچسپی سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔
اچھی چارمنگ سی لڑکی تھی یک دم ہی انہیں پسند آ گئی بابر ان کا دیور تھا۔ برابر کا بنگلہ ان کا تھا۔
''وری گڈ جی......حارث نے اتنے ذہین لوگ کہاں چھپا رکھے ہیں۔'' انہوں نے اپنے برابر والی خاتون کو ذو معنی انداز میں دیکھا۔
''لگتا ہے تمہارا مسئلہ حل ہو گیا۔'' جواباً سرگوشی ہوئی۔
''ہوں!''
تبھی نگار آ گئی۔
''تم......یہاں......سکھاں کے ہاتھ چائے بھیجو۔''
''جی!'' وہ اندر مڑ گئی۔
''تمہاری کزن بہت پیاری ہے۔''
''اچھا!'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔
''بے چاری بہت مظلوم اور غریب ہے۔'' ترسی ہوئی نگاہ نبیلہ پر ڈالی۔
یک دم اس کے قدم رکے اور پھر آگے بڑھ گئے۔
اپنی آنے والی زندگی میں اسے ان لفظوں سے وحشت تھی۔ بے چاری مظلوم......لیکن......اس کا بس چلتا تو اپنی زندگی سے ان کو نکال دیتی۔ کیا اس کے چہرے پر لکھا ہے کہ وہ مظلوم ہے۔ اس پر ہمدردی کی بھیک ڈالو یا اس کے چہرے پر وہ کارڈ چھپا ہوا ہے جو کراچی کی بسوں میں عورتیں لے کر پڑھتی ہیں۔ جن پر لکھا ہوتا ہے۔ ہماری مدد کرو ہم مظلوم ہیں۔''
اف! اتنی قربانی کے باوجود یہ لفظ اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہ اپنے بیڈروم میں بند ہو گئی۔
''کوئی نہیں ہے اس کا اس لیے حارث اسے یہاں لے آئے۔ میں بھی اکیلی تھی۔ اب فکر کم ہوتی ہے۔'' دروغ گوئی سے کام لیا گیا۔
''بہت کیوٹ ہے، کہیں رشتہ وشتہ طے ہوا۔'' مسز مراد نے رازداری سے پوچھا۔ نگار ایک لمحہ سٹپٹا گئی۔
''آں......نہیں ابھی کہاں ابھی تو پڑھ رہی ہے۔ پڑھنے کا بہت شوق ہے بے چاری کو۔ دور بھاگتی ہے شادی کے نام پر۔''
''اچھا جب شادی کا ارادہ ہو تو مجھے مت بھولنا۔ مجھے اپنے بابر کے لیے یہ لڑکی بہت پسند آ گئی ہے۔

دکھادوں گی اسے ایسے ہی۔''
رعنا نے فوراً ہی اپنا مدعا بیان کر دیا۔
''نگار جل بھن کر کباب ہوگئی۔''
''آپ کیسے آئی تھیں؟'' موضوع تبدیل کیا۔
''ایسے ہی مسز نعیم کے گھر سے آ رہے تھے سوچا آپ سے مل کر گلہ دور کر دیں۔''
تبھی سکھاں چائے لے کر آ گئی۔
''اتنی دیر میں کام کرتے ہیں ہاتھ جلدی نہیں چل سکتے تھے۔ جاؤ یہاں سے ......'' اندر کی ساری کھولن اس پر نکال دی۔
وہ ہڑ بڑا کر پلٹ گئی۔
''تمہیں میں نے کتنی بار کہا ہے انیکسی سائیڈ میں رہا کرو تمہیں سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہارے متعلق ہم نے کسی کو نہیں بتایا۔ کس کس کو مطمئن کریں گے۔'' وہ اس کے سر پر کھڑے ہو کر چیخ رہی تھی۔
''وہ تو اچانک اندر آ گئی تھیں میں ہٹ ہی رہی تھی۔''
''زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ خیال رکھنا۔'' وہ سلگتی ہوئی نگاہ اس پر ڈال کر باہر نکل گئی۔
''یا اللہ......'' وہ سر ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئی۔
کتنی پابندیاں لگیں گی مجھ پر۔
رات وہ زار و قطار روتے ہوئے حارث کو بتا رہی تھی کہ آج مسز مراد نے اسے دیکھا اور بابر کا پروپوزل دیا ہے۔
''اچھا۔''
''تم نے بتایا نہیں۔''
''یہ ہی کہہ دوں۔''
''ہاں!''
''یہ بتا دوں کہ وہ میری سوکن ہے۔ سارا دن چھریاں چلاتی ہے میرے دل پر۔''
''میرا مطلب ہے!'' اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔
''یہ ہی مطلب ہے تمہارا ناں کہ لوگ مجھ پر ہنسیں۔''
''یار سمجھا کرو۔ تم یہ ورق ہی الٹا دیتیں کہ اس کا نکاح ہو چکا ہے۔''
''رخصتی ڈاکٹر بننے کے بعد ہے۔''
وہ روتے روتے اسے دیکھنے لگی۔
''روز روز کے سوالوں سے بہتر ہے یہ کہہ دو......وہ کوئی بے جان چیز تو ہے نہیں کہ اسے چھپا دیا جائے۔ اس نے فی الحال ادھر ہی رہنا ہے۔ پڑھنا ہے۔ روز گھر سے باہر نکلنا ہے۔''
حارث نے تفصیل سے سمجھایا۔ نگار نے آنسو صاف کیے بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔
''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' اس نے تائید کی۔
''کیسا!''
''بہت اچھا......'' اس کی چہک کے جواب میں اس نے مسکرا کر کہا۔
''خواہ مخواہ ہی میں نے رو کر خود کو ہلکان کیا۔''
''حارث میں آپ کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔ آپ اسے میری مجبوری سمجھ لیں۔'' وہ دھیرے سے اس کے ساتھ لگ گئی۔
''معلوم نہیں یہ مجبوریوں کے فیصلے کیسے ہو جاتے ہیں۔''
''کیا میں کرنا چاہتا ہوں۔'' اسے سمیٹ لیا اور اسے حارث کے اس بے ساختہ اظہار پر یقین آ گیا کہ حارث اس کا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔
محبتوں کو کوئی جدا نہیں کر سکتا۔
اس روز کئی دنوں کے بعد حارث اس کے کمرے میں آیا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ بیٹھی رہی۔
''کیسی ہو؟''
''ٹھیک ہوں۔''
وہ جانتی تھی استحقاق نہیں ہے نگاہ اٹھانے کا۔
''پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔''
''ٹھیک......'' سر ہلا کر جواب دیا۔
پھر وہ کافی دیر تک بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا

رہا۔ وہ کرسکتا تھا آخر پیسوں سے خریدا تھا۔ خریدی ہوئی چیز پر حق، استحقاق ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ جھٹک نہیں سکتی تھی۔

آخران کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ مرد کسی بھی موڑ پر ہو، خواہ کیسی ہی محبت کیوں نہ ہو، اپنے حق کو نہ چھوڑتا ہے، نہ بھولتا ہے۔ پھر اس کی ضرورت بھی تھی اور صبح تک کند چھری کی اذیت سے تڑپاتی رہی۔

☆☆☆

انھی دنوں جب خزاں رسیدہ موسم عروج پر تھا، لان میں خشک پتوں کا ڈھیر شام تک جمع ہو جاتا۔ وہ کتنی دیر تک ان پر چلتی۔ ان کے ٹوٹنے کو محسوس کرتی۔ موسم کی اداسیاں بہت بڑھ گئی تھیں کہ اسے اپنے اندر تبدیلی کا احساس ہوا۔

کتنی دیر تک وہ گم صم رہی۔ آج...... آج بے اختیار رودی۔ یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا۔ ختم ہوگا تو کیا ہوگا۔

کس سے کہے، کیا کہے کہ، کہ وہ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ گویا گناہ کا بوجھ ہو جیسے۔

کتنے دن گزر گئے کالج مسلسل جا رہی تھی۔ نگار سے گریزپا تھی۔ حارث مل نہیں رہا تھا، ممی کا فون نہیں آیا تھا۔ کس سے کہے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

نگار نے اس کی گری ہوئی طبیعت کو دیکھا، محسوس کیا۔ یک دم ہی اس کے اندر آگ سی بھر گئی۔ جانے خدا نے کیسی یہ آزمائش کی گھڑیاں رکھی تھیں جن کلیوں کی مالا پرونے کی اس نے دعائیں مانگی تھیں، وہ کسی اور کے بطن سے کھل رہی تھیں۔

یاخدا! سرخ آنکھوں کو سنبھالتی وہ انگارہ ہو رہی تھی۔ جل کر حارث کو مبارک باد دی۔

''کس بات کی؟'' وہ سمجھا نہیں۔

''باپ بننے والے ہو۔''

''کیا؟'' خوشی بے ساختہ تھی۔

''تمہیں نبیلہ نے بتایا نہیں۔'' بے یقینی سے دیکھا اور خود کو سنبھالا۔

''قطعی نہیں......''

''ہاں یہ سچ ہے۔'' اس نے یقین دہانی کروائی۔

حارث نے بے ساختہ آنے والی خوشی کو اندر ہی روک لیا۔ ظاہر نہ ہونے دیا۔ سامنے کھڑی ہستی اس کی محبوبہ تھی۔ محبوبہ ہر دور میں عزیز ہوتی ہے لیکن یہ خوشی بھی کم نہ تھی۔ مکمل ہونے کا احساس ہی حد سے ماورا تھا۔

ننھا منا...... روئی ایسے گالوں والا وجود...... تصور کا پردہ مہکا، شدت سے دل اس کے پاس جانے کو چاہا مگر حدیں مقرر تھیں۔

''ڈاکٹر سے کنسلٹ کیا؟'' خود کو سنجیدہ رکھا۔

''ہاں ڈاکٹر عمرانہ کو فون کیا ہے۔ آج شام کو آئیں گی۔'' اس کا لہجہ ذرا شکستہ تھا۔

''تم کیوں اتنی ہرٹ ہو رہی ہو۔'' بے ساختہ شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بولا۔

نگار نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

''ریلیکس یار!'' اس نے اسے دھیرے سے تھپکا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو۔''

''حارث جس خوشی کی ہمیں تلاش تھی جس کے لیے میں نے منتیں مرادیں مانگیں، وہ کسی اور کے حوالے سے کیوں ملی؟ ایسا کیوں ہوا؟ میں کتنی بدنصیب ہوں نا......''

اس کی ہچکیاں نہیں تھم رہی تھیں۔

حارث صرف اسے دلاسا ہی دے سکتا تھا۔ یہ خدا کی قدرت تھی...... اس کے کام وہ بہتر جانتا ہے۔

جہاں محبت عشق برابر ہوئی وہاں خواہشوں کا حاصل نہ ہوا۔ جہاں خواہشیں ٹھہریں وہاں محبت نہ ہوئی۔

ڈاکٹر عمرانہ نے تصدیق کردی۔ ساتھ ہی ادویات دیں، آرام کا مشورہ دیا، غذائی چارٹ بنا کر دیا اور پابندی سے مفصل چیک اپ کروانے کے لیے کہا۔ ہر مرحلہ خود بخود طے ہو جاتا ہے۔ وقت جیسے

خود بخود رواں ہے۔ دن رات کا چکر۔
"اب تم کھانا ہمارے ساتھ کھایا کرو گی۔" پہلی بار حارث نے گویا آرڈر دیا۔
"میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ میں یہاں ہی ٹھیک ہوں۔"
"سنو! یہ بہت ضروری ہے۔ تنہائی تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"
کچھ پس وپیش کے بعد وہ مان گئی حالاں کہ اندر سے بالکل راضی نہ تھی۔
"تم وین سے کالج نہیں جاؤ گی۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیا کروں گا۔" حارث نے ایک اور حکم دیا۔
"میں بالکل نارمل ہوں...... خدانخواستہ۔"
"پلیز بیلا!" اس نے سنجیدہ ہو کر اسے دیکھا۔
نگار پاس ہی کھڑی تھی۔
حالاں کہ دل چاہ رہا تھا اسے بانہوں میں بھر کے بے تحاشا اپنی خوشی کا اظہار کرے۔ کیسا انمول خزانہ ملنے کو تھا۔
"جو کہہ رہا ہوں وہ کرو یہ بہت نازک موقع ہے۔ خیال ہمیں ہی رکھنا ہے۔"
"نگار تم میڈیسن کا خیال رکھا کرو۔" ساتھ ہی اسے بھی آرڈر دیا۔
"ہوں۔" وہ اندر سے خاکستر تھی۔ وہ جانتی تھی یہ سب وقتی ہے۔ صرف حال کے لمحوں تک...... بعد میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ ذرا سی توجہ جو اسے مل رہی ہے واپس اس کی گود میں آ جائے گی، مگر وہ ازلی جلن، حسد، رقابت وہ کیا ہوگی۔ سوکن سوکن ہی ہوتی ہے۔ ذرا سی توجہ بھی کیوں...... اس کا اندر باہر خاکستر ہو رہا تھا۔
عورت محبتوں کے معاملے میں بہت پچی ہوتی ہے۔ ذرا سا گریز روح تک جلا دیتا ہے۔ وہ رقابت کا شکار ضرور تھی مگر جاہل عورتوں کی طرح اس نے خود کو چھوڑا نہیں بلکہ مضبوطی سے اپنے قدم جما کر کھڑی تھی۔
یہی ذہین اور طرح دار خاتون کی نشانی ہوتی ہے۔

☆☆☆

صبح حارث خود کالج چھوڑنے کے لیے نکلا۔ درمیان میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مبارک سلامت کے الفاظ دھیرے رہ گئے۔ اس کے چہرے پر بہت سنجیدگی تھی۔
بیک مرر سے نظر آتا چمکدار چہرہ دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا اسے دیکھتا رہے دیکھا رہے۔ کیسی تخلیق کار تھی وہ خدا نے کس درجے پر اسے وسیلہ بنایا تھا۔ کیسا عکس چہرے پر ٹھہر گیا تھا۔

☆☆☆

اس روز کالج جلدی آف ہو گیا کوئی پیریڈ نہیں تھا۔ جلدی کالج سے نکل آئی۔ رکنا فضول ہی تھا۔
وین گھر سے ذرا فاصلے پر اتارا کرتی تھی۔ وہاں سے اتر کر پیدل گھر تک جانا ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے چادر کا پلو تھامے بیگ لٹکائے وہ آگے بڑھ رہی تھی کہ......
"ایکسکیوز می۔" کہہ کر کسی نے روک لیا۔
سر اٹھایا، سامنے ایک خوش شکل سا لڑکا کھڑا تھا۔
"جی......!" اسے حیرانی ہوئی۔ آج تک ایسا اتفاق ہوا تو نہیں تھا۔
"مجھے بابر آفاق کہتے ہیں۔ آپ کے برابر والے گھر میں رہتا ہوں۔"
"جی۔" حیرانی سے دیکھا۔
"آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ کون سے کالج میں پڑھتی ہیں۔"
غصے سے اس کا خون کھول گیا۔
"کوئی کام ہے؟" اس نے تیکھے ابرو اٹھائے۔
"جی!"
"فرمائیے؟"
"جو میرا کام تھا میں نے کر لیا۔ باقی کام بھابھی کر لیں گی۔ شکریہ۔" زیر لب مسکراتا، گہری نگاہ ڈالتا آگے بڑھ گیا۔
"خواہ مخواہ!" کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

''اتنا مت پڑھا کرو، تمہیں سکون، اطمینان اور خوش خوراکی کی ضرورت ہے۔'' اس روز بھی حارث اس کے کمرے میں آ گیا۔ اب دھیان و گیان کی خاطر اکثر آجاتا تھا۔

حارث کا آنا، باتیں کرنا۔ اسے یہ سب بہت عجیب لگا کرتا تھا مگر وہ حق رکھتا تھا۔ روکنے کی کوئی طناب اس کے ہاتھ میں نہ تھی۔

''ممی مبارک باد دے رہی تھیں۔'' انکشاف کیا۔

''اچھا ان کا فون آیا ہے۔''

''ہاں اکثر آتا رہتا ہے۔''

''اچھا.....'' اسے عجیب سا لگا۔ اس سے ہی بات نہ کی۔

''تمہارا بہت پوچھ رہی تھیں۔''

''بات کرنے کی خواہش نہیں تھی۔ وہ تو......وہ تو......''

''کہیں باہر جانے کو دل چاہ رہا ہے۔'' حارث اب ایسی چھوٹی چھوٹی نوازشیں کرنے کے موڈ میں رہتا تھا۔

نگار پاؤں جلی بلی کی طرح ادھر سے ادھر حارث کی واپسی تک چکر لگاتی رہتی تھی۔

سکھاں ایک واحد عورت تھی جو اس راز سے واقف تھی۔ اسے بھی منع کر دیا گیا تھا کہ وہ کسی پر ظاہر نہ کرے۔

ظاہر کر کے اس نے کہاں جانا تھا۔ اس کا کون سا در، گھر تھا۔

☆☆☆

اس کی اسٹڈی جاری تھی۔ اس کے گھر سے کوئی اس کو ڈھونڈنے، پوچھنے نہیں آیا۔ گزرتے دنوں کے ساتھ وہ سردسی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی حالت اسے ان دیکھے جہاں کی سیر کراتی رہتی۔

سردیوں کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ گیلے موسموں کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھی بھر بھر آتیں مگر کچھ کہنے سننے کی تاب نہ تھی۔

میڈیسن کا حد سے زیادہ استعمال تھا۔ جب اس سرد موسم کی سرد صبح کے اجالوں میں پرائیویٹ اسپتال میں اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔

حارث کی خوشی دیدنی تھی۔ پورے ہاسپٹل میں مٹھائی بانٹی گئی، سب کچھ بھول کر نگار نے ننھے سے گلابی وجود کو سینے سے لگا لیا۔ شرط یہ بھی تو تھی۔ بچہ اس کا ہوگا، اس کی گود میں آنکھ کھولے گا۔ اس کو سیراب کرے گا۔ اس کی خالی جھولی بھرے گا۔ اسے تو معاوضہ مل گیا۔ ممتا کی ساری پیاس اس کے اندر اتر گئی۔

وہ ہاسپٹل سے ہی بچے کو لے گئی۔

آنکھ کھلی ہوش آیا تو موسم کی ساری ٹھنڈک پت جھڑ کی خزاں رسیدگی اس کے وجود کو بنجر کر گئی۔ بنجر نگار کب تھی بانجھ تو وہ تھی۔ اتنا کڑا سفر طے کیا۔ اتنی ذیت، دکھ، تکلیف برداشت کی پھر بھی تہی دامن کھڑی تھی۔ ایسا بھی بدنصیب ہوگا کوئی؟ ایک عمر تک پھول کی کاشت کرتا رہا، فصل کاٹنے کا وقت آیا تو کانٹے ہاتھ میں تھے۔

یہ تو طے تھا، دکھ کے شدید احساس سے آنکھیں بند کیں تو آنسو چھلک پڑے۔ بدنصیبی یہ بھی تو ہے۔ ایک عمر چلتے رہے اور گھر نہیں آیا۔ لیکن گھر کا راستہ طے کب ہوا تھا۔ ان راستوں پر تو عمر بھر بھٹکتے ہی رہنا تھا۔

منزل کا تعین ہی نہ ہوا تھا۔ کم مائیگی کا شدید ترین احساس یہ بھی تو ہے۔ کوئی لفظ شائستگی نہیں، نہ کوئی تصدیقی کلمات ادا ہوئے۔ نہ احساس شکر گزاری۔ بس جیسے وہ امانت دار تھی، امین کو چیز پہنچا دے۔

اف......احساس شکستگی تھا یا احساس شرمندگی۔

☆☆☆

''تھینک یو......تھینک یو بیلا۔ تم میرے لیے بہت عظیم ہو۔ تم نے مجھے وہ خوشی عطا کی ہے جس کا میں ساری عمر احسان نہیں اتار سکتا۔ جو مانگو دوں گا۔''

دھیرے دھیرے سرگوشیاں اس کے گرد پھیل رہی تھیں۔گلاب کی پتیاں اس کے آنسوؤں کو سمیٹ رہی تھیں۔ بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔ حارث......قریب بہت قریب تھے۔

اسے اپنے سارے دکھ ختم ہوتے محسوس ہوئے۔ آنسوؤں کی رفتار تیز ہو گئی۔''ہم لوگ خود غرض ہیں ہماری خود غرضی کو معاف کر دو۔''

آنسوؤں کو پوروں پر سمیٹ لیا۔

''خوشی اور سکون کی کس منزل پر تھا۔''

''تم ماں ہو، ساری عمر ماں ہی رہو گی۔ وہ بانجھ ہے اسے تم نے سیراب کر دیا ہے۔ میں تمہیں سیراب کر دوں گا۔''

اسے خود بھی اپنے لفظوں کی گہرائی کا اندازہ نہ تھا۔

''آج جو کہو گی پورا کروں گا۔'' اس کی خوشی دیدنی تھی۔

''صرف یہ......'' بے ساختہ ہی وائیٹ شرٹ کے کالر مضبوطی سے تھام لیے۔

''بولو......حوصلہ ہے۔'' آنسوؤں نے دامن تھام لیا۔ اس کا زرد چہرہ اور زرد ہو گیا۔

''مجھے جدائی سے خوف آتا ہے۔ مجھے کبھی الگ مت کیجیے گا۔ مجھے طلاق نہیں چاہیے۔ میں ساری عمر اس بچے کے سامنے رہنا چاہتی ہوں۔'' اس کا حوصلہ قیامت کا تھا۔ ضبط و صبر انتہا کا۔ پل استقامت پر کھڑی تھی۔

''مجھے منظور ہے۔'' حارث نے بے ساختہ ہی اس کی پیشانی چوم لی۔ اسے گویا قرار مل گیا۔

☆☆☆

نگار کو زبردست کھلونا مل گیا۔ گھر میں رونق آ گئی۔ سارے کام نگار خود کرتی۔ اس کا صبر و ضبط قیامت کا تھا۔

اپنا وعدہ نبھا دیا۔ زبان پر حرف نہ لائی۔ ماں کی ممتا کو ویران کر دیا۔

تاہم دن میں ایک بار دیکھ ضرور لیتی۔

اس نے پھر سے خود کو کتابوں میں گم کر لیا تھا۔

اس روز لان میں آئی تو چونک گئی۔ لان میں بیگم صاحبہ اور رعنا کھڑی تھیں اور بچے کے متعلق استفسار کر رہی تھیں۔ نگار فخر سے بتا رہی تھی کہ......

''میرے جیٹھ کا بچہ ہے۔ انہوں نے ہمیں دے دیا ہے۔ اب میں پالوں گی۔ اپنا بیٹا بناؤں گی۔'' چہرے پر فخر تھا۔

گلابی گلابی معصوم بچے کو بانہوں میں بھینچ لیا۔ چہرے سے خوشی چمک رہی تھی۔ نبیلہ کاریڈور کی طرف بڑھ گئی۔

''آپ کیسے آئیں؟''

''ہم اپنی مراد لے کر آئے ہیں۔ ہمارے بابر کو نبیلہ بہت پسند آ گئی ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''جی!'' وہ یک دم ہی ہونق رہ گئی۔

''آئندہ پوچھیں تو کہہ دینا کہ نکاح ہو چکا ہے۔''

''لیکن اس کا تو!'' زبان کہتے کہتے رک گئی۔ یک دم ہی دماغ کہیں اور چلا گیا۔

''آپ نے جواب نہیں دیا۔ کیا وہ کہیں انگیج ہے۔''

''آں......ہاں......کچھ ایسی ہی بات ہے مگر ابھی کچھ فائنل نہیں ہے۔ مطلب ہاں یا ناں کے درمیان ہے۔''

اس گول مول بات کا مطلب ان عورتوں کی سمجھ نہیں آیا اور نہ ساکت ہو جانے والی نبیلہ سمجھ سکی۔ صاف صاف کیوں نہ کہہ دیا کہ......یہ کون سی چال ہے؟

''میں آپ کو حارث سے پوچھ کر جواب دوں گی۔''

''پلیز ہمارا خیال رکھیے گا۔ ہم لوگوں کی فیملی آپ کے سامنے ہے۔ کچھ ڈھکا چھپا نہیں ہے۔'' وہ لوگ بضد تھے۔

''جی میں جانتی ہوں مگر......'' اس نے انہیں

اب وہ کھل کا سانس لے سکتی ہے۔ اولاد کا سکون مل گیا، خالی جھولی بھرگئی۔ ماں کی پوتے کی خواہش پوری ہوگئی ہے۔

اب نبیلہ کو یہاں سے رخصت ہوجانا چاہیے۔ اب اس کا یہاں کیا کام...... انتہائی خودغرضی سے نگار نے سوچا۔

نگار کی بات سن کر اس کے دونوں جہاں قسمت کی زد پر تھے۔

''کیا؟''

''کیا تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟'' حارث تو سنتے ہی اچھل پڑا۔ ''تمہیں کہا تھا کہ ان لوگوں سے کہہ دینا کہ اس کا نکاح ہوچکا ہے۔ پھر تم نے کیوں نہیں کہا۔'' آج پہلی بار وہ تلخ ہوا۔

''کیسے کہہ دیتی میں۔ یہ معاہدے میں شامل تھا۔ آپ نے میری شرط مانی تھی کہ بچے کے بعد آپ اسے طلاق دے دیں گے۔''

''شرط میں یہ بھی شامل تھا کہ اس کا میڈیکل پورا ہوگا۔ اس کے بعد اگر وہ چاہے گی پھر...... اس کا کوئی مستقبل ہوجائے۔''

آج حارث کا لہجہ بھی تندوترش تھا۔

''جو کام کل ہونا ہے وہ آج بھی ہوسکتا ہے...... آخر اس نے اس گھر سے جانا ہے تو پھر دیر کیوں۔ اس وقت رشتہ بھی موجود ہے۔ وہ لوگ پسند بھی کرتے ہیں۔ پھر کیا مضائقہ ہے؟''

''تم اتنی خودغرض ہوسکتی ہو، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

''آپ اتنے بدل جائیں گے، مجھے اندازہ بھی نہیں تھا۔'' نگار بھی دوبدو تھی۔

''تمہیں اس سے کوئی تکلیف ہے تو بتاؤ۔ تمہارے حقوق اس نے غصب کیے ہیں، کیا کسی کام میں ٹانگ اڑائی ہے؟ اس نے تو کسی معاملے میں اف تک نہ کی۔''

نبیلہ کے آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے۔

حارث...... حارث! اس کے لیے بول رہا تھا۔

''وہ بول بھی نہیں سکتی تھی۔ پیسے دیے ہیں ہم نے...... غربت خریدی تھی۔ غریبوں، مسکینوں کو ہمارے آگے بولنے کا حق بھی نہیں ہے۔'' نگار شدید غصے میں تھی۔

''پھر جو معاہدہ ہوا ہے اس پر قائم رہو اس کا میڈیکل پورا ہونے دو۔ پورا کیریر تباہ ہوجائے گا اس کا۔''

''آپ کو اتنی ہمدردی کیوں ہورہی ہے۔''

''اصول...... اصول ہے۔'' حتمی انداز اختیار کیا اس کا انداز دیکھ کر نگار نے بات یہیں روک دی۔ مرد کے غصے کو ہوا دینے کا مطلب ہے اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا اور وہ یہ جذباتی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔

اتنی ارزاں تھی وہ...... یہ قیمت تھی اس کی؟ بس یہ چند سال ...... چند ہزار، چند لاکھ...... اس کی اذیت، دکھ، تکلیف، تنہائی کا ہرجانہ ہیں؟ اس کے لخت جگر و خون جگر کی قیمت کڑی تپسیا کا انعام؟

اماں...... اماں کس جگہ رول دیا۔

ابا...... ابا اپنی بیٹی کا دکھ دیکھو۔

مت اپنی غربت بیچو...... غریب ہے تو کیا ہوا سکون تو ہے نا...... چھت تو اپنی ہوتی ہے نا! ویران صحرا میں کھڑے ہونے کا ڈر تو نہیں ہوتا۔ مدت معاہدہ ختم ہوگی تو میں کیا کروں گی۔ میرا سائبان کیا ہوگا۔

اماں، ابا آپ لوگوں نے یہ کیوں نہیں سوچا تھا۔ وہ سسک سسک کر تڑپ تڑپ کر روئی۔ بےبسی سی بےبسی تھی۔ دکھ اذیت کا نیا باب اس کی قسمت میں رقم ہونے کو تھا۔

یہ امیر لوگ، یہ پیسے والے دولت مند خاندان کس کس طرح اپنی خواہشوں کی تکمیل کرلیتے ہیں۔

بس سکھیاں تھی، جو اس کے ساتھ اس کے دکھ پر نوحہ کناں تھی۔ ''بی بی جی آپ نے تو بہت بڑی قربانی دی ہے۔ بھلا یہ بھی کبھی ہوتا ہے۔''

بس دکھ کی اذیت کو محسوس کرتی، رجسٹر کے صفحے پلٹاتی رہی۔

☆☆☆

''آج سنو! میری بات کا یقین رکھنا، جب تک تم نہیں چاہو گی میں کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ نگار اس وقت جذباتی ہو رہی ہے۔ اس کی باتوں کو مائنڈ مت کرنا۔ عورت محبت میں شراکت برداشت نہیں کرتی۔''

آج پھر وہ کتنے دنوں بعد اس کے کمرے میں آیا تھا۔ اپنی مرضی سے بے ساختہ ہی نگاہ اٹھائی تھی۔

وہ بھی تو عورت تھی وہ بھی شراکت برداشت نہیں کر سکتی تھی مگر بہت فرق تھا۔ نگار جیسی عورت اور اس جیسی عورت کے درمیان۔

دولت کا فرق، غربت کا امتیاز۔ آج اس کے پاس اتنی دولت ہوتی تو۔ اگر اس کے پاس اتنی دولت ہوتی تو پھر یہ سب تو نہیں ہوتا۔ اس کی سوچوں کے زاویے بکھرنے بننے لگے۔

''تم سکون سے اپنی اسٹڈی کی طرف دھیان دو۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر یقین دلایا۔

ایک چپ کا خزانہ تو اس کے پاس تھا لیکن حارث کے انداز میں بہت تبدیلی آ گئی۔ حارث کی تسلی کافی تھی۔ اس کے اندر سکون اتر گیا۔

تاہم اب یہ ہوا کہ نگار اس کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ہر وقت ایک کھولن اسے جلاتی تڑپاتی رہتی تھی۔

اکثر وہ طنز وغیرہ کرنے سے بھی باز نہ آتی۔

ہاں بچے سے وہ بہت محبت کرتی تھی۔ اس کی کمزوری بنتا جا رہا تھا۔ بس یہ تھا سنی نے (سنی نام رکھا تھا اس نے) اس کے بطن سے جنم نہیں لیا تھا۔

اس حسد و رقابت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اسے خدشات و واہمے ڈراتے رہتے تھے کہیں کہیں...... حارث کا جھکاؤ نبیلہ کی طرف نہ ہو جائے۔ کہیں یہ دونوں مل کر اسے تہی دامن نہ کر دیں یا پھر سنی کو اس سے کوئی چھین نہ لے۔

نبیلہ کی ممتا بیدار نہ ہو جائے اور وہ سنی کو اس سے دور نہ لے جائے۔ اس کے اپنے خدشے تھے جن کی حقیقت بہت کڑوی تھی۔

☆☆☆

انہی دنوں میں جب وہ کڑی دھوپ میں سفر کر رہی تھی کہ اس کے گھر والوں کو اس کا خیال آیا۔ اس شام سراج بھائی اس کے روبرو تھے۔

''آپ!'' وہ انہیں دیکھ کر سکتے کی کیفیت میں تھی۔ انہوں نے بڑھ کر سینے سے لگا لیا۔

''کیسی ہے بیلا؟''

''ٹھیک بالکل ٹھیک......'' اپنے آنسوؤں کو مسکرا کر خوشی کا رنگ دیا۔

''آپ کیسے ہیں؟''

''بالکل ٹھیک...... اماں ابا سب تجھے بہت یاد کرتے ہیں۔ ہمارے گھر کے حالات اب بہت بدل گئے ہیں۔ اب ہم بھی سفید پوش گھرانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اکبری کی بہت اچھی جگہ شادی ہوئی ہے۔ میری بھی شادی ہوگئی ہے۔ اب تو منیر اور صدف رہ گئے ہیں۔'' وہ تفصیل بتا رہے تھے۔

اور وہ ساکت تھی۔ اس کے گھر والوں کو اس کی یاد نہ آئی۔ اسے کسی موقع پر یاد نہیں رکھا گیا۔ جب کہ اس نے لمحہ لمحہ ان کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ اس کی قیمت کا تعین کرنے والوں نے کیا حد بندی کی شرط بھی لگائی تھی۔

''پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟''

''تیسرا سال ہے بھائی۔ بس ڈاکٹر بننے میں تھوڑا ٹائم رہ گیا ہے۔ پھر میں گھر آؤں گی۔''

اس نے خود ہی کہا۔

''ہاں...... ہاں ضرور آنا۔ ابا تیرے لیے بہت اداس رہتے ہیں۔ اکثر اماں سے تیری باتیں کرتے ہیں۔ تو خوش تو ہے نا......''

''ہاں! ہاں سراج بھائی میں بہت خوش ہوں۔ اتنا بڑا گھر ہے، ہر طرح کی آسائش ہے مجھے بس

صرف پڑھنا پڑتا ہے۔بس......"
"اللہ تجھے خوشیاں دے، خوش رکھے۔"
"حارث بھائی کدھر ہیں۔"
"وہ تو اس وقت آفس میں ہوتے ہیں۔شام کو آئیں گے۔"
"اچھا میں چلتا ہوں......رات کو آیا تھا آفس کے کام سے ابھی واپس جا رہا ہوں فلائٹ ہے میری۔"
"اتنی جلدی......"
"ان شاء اللہ پھر آؤں گا۔" تسلی دی۔
اور وہ اسے جاتے دیکھتی رہ گئی۔
ملنے کی اتنی خوشی کہ وہ اپنے تمام دکھ بھول گئی جو اس کے جانے پر ایک بار پھر رس رس کر اپنے ہونے کا پتا دینے لگے۔یہ دکھ تو اب زندگی کے ساتھ ساتھ تھے۔

یہ اندھیرا، یہ روشنی کیا ہے
آؤ سوچیں یہ زندگی کیا ہے

اس کے پاس تھا بھی کیا فقط زندگی کا اندھیرا۔ زندگی کے رنگ، گلاب، خوشبو، خواب سب وقت کے ساتھ بکھرتے لے گئے تھے۔
وقت کے ساحل پر لمحوں کی طنابیں بکھر جائیں تو ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا بس تتلی کے رنگ رہ جاتے ہیں۔اس کے پاس بھی نہیں تھے۔بس روشن مستقبل کی آس تھی۔
دوسروں کے دکھ بھی تو دکھی انسان سمیٹتا ہے۔

☆☆☆

"کیا آپ میرے بارے میں سوچ نہیں سکتیں؟"
آج پھر وہی اس کے روبرو تھا۔
"آپ......" پہچان کے عکس جاگے۔
"ہاں میں! کیا آپ کی زندگی میں میرے لیے گنجائش نہیں نکل سکتی۔" اس کی آنکھیں لو دے رہی تھیں۔
"زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی کہ دوسروں کی زندگیوں میں گنجائش نکالی جائے۔"
آج وہ اس شخص کو جس کی آنکھیں اس کو دیکھ کر جگنوؤں کی طرح دمک اٹھتی تھیں، جو اکثر اس کی راہوں میں کھڑا ہوتا تھا، غور سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اسے حقیقت بتادے۔
"لیکن میں آپ کی محبت میں بہت آگے نکل گیا ہوں۔"
"سفر کوئی سا بھی ہو ہم سفر ضروری ہے۔تنہا سفر کوئی سا بھی ہو، نہیں ختم ہوتا۔ہم سفری مانگی تھی آپ نے انکار کردیا۔"
اس کی شہ پہ دل کا راز کہہ دیا۔
لحظہ بھر کو اس کی صاف گوئی پر وہ جھجک گئی۔
"میں زندگی کی راہ میں آپ کا ہاتھ تھامنا چاہتا ہوں آپ کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔جیسی ہم سفر میں چاہتا ہوں وہ آپ جیسی ہے۔"
وہ ذومعنی انداز میں مسکرایا۔
عرصہ ہوا مسکرانا بھول گئی تھی۔اب تو مزاحیہ ڈراموں، لطیفوں پر بھی ہنسی نہیں آتی تھی۔
"زندگی میں وہ سب نہیں مل جایا کرتا جس کی ہم تمنا کرتے ہیں اور پھر ہم وہ سب خود بخود ہی قبول کرنے پر راضی ہوجاتے ہیں جو ہمیں مل جاتا ہے۔"
"کیا......کیا آپ میرے ساتھ چل نہیں سکتیں۔ میں اچھا شریف، برسرروزگار ہوں۔آپ کو خوش رکھنے کی گارنٹی دے سکتا ہوں۔"
اس کی آنکھیں پرشوق انداز میں اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔
"میں انگیج ہوں۔"
"جی!" وہ حیران ہوا۔
"لیکن بھابھی تو بتا رہی تھیں کہ آپ......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
اچنبھے کے انداز میں دیکھا۔
"جی!"
"میرا مطلب ہے اس منگنی میں آپ کی رضا بھی شامل ہے۔"

اس کے چہرے کی چمک مندمل ہونے لگی۔
''نہیں یہ گھر والوں کا فیصلہ ہے۔''
''اس فیصلے میں ترمیم نہیں ہوسکتی۔''
''اس رشتے کو میرے ماں باپ نے اپنی مرضی سے طے کیا ہے۔ اگر ترمیم کی گنجائش نکلی تو میرا کیریر تباہ ہوجائے گا۔''
''اوہ!'' با بردم بخود تھا۔
''ہم لڑکیاں جو ہوتی ہیں نا قناعت پسند ہوتی ہیں۔ اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ ہم فیصلوں کے خلاف بغاوت کریں۔''
''اگر میں کہوں کہ آئندہ کسی راہ میں......''
''اچھا اس کو چھوڑیں پہلے یہ بتائیں آپ کی پسند، آپ کی رضا۔'' اسے یقین نہیں آرہا تھا۔
''میں نے کہا تو ہے یہ سراسر میرے والدین کا فیصلہ ہے۔''
''زندگی میں اگر آپ کا فیصلہ بدلا تو میرے بارے میں سوچیں گی۔''
وہ اب بھی بضد تھا۔
''بہت مشکل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ والدین کی رضا اپنالیں۔ زندگی میں وہ سب کچھ ہی نہیں مل جایا کرتا جو ہم مانگنا یا لینا چاہتے ہیں۔''
''حسب حال مل جائے تو کیا بات ہے۔'' دھیرے سے مسکرادی۔
اس کا چہرہ دھواں ہونے لگا۔
''اوکے......میں چلتی ہوں۔ میری وین آگئی۔'' نبیلہ آگے بڑھ گئی اور وہ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔
محبت کھیل نہیں ہوتی
دن ڈھلے جس سے دل بھر جائے
محبت کوئی تھکا دینے والا عمل نہیں
کہ! تھک کر سوئیں تو ذہن سے محو ہوجائے
محبت تو ایک آب جو ہے
جذبوں کی
جو ہماری شریانوں میں دوڑتے خون کے ساتھ چلتی ہے
ہمارے جذبوں کو امر کرتی ہے
اے لڑکی
میں تمہیں ساری عمر اپنے جذبوں میں جواں رکھوں گا
کبھی تو میرا اور تیرا سامنا ہوگا
اس وقت شاید......وقت مہربان ہوجائے

☆☆☆

اس کے نرم رویے صبر و برداشت کی حدیں، ٹھہراؤ، توازن، تہذیب گفتار نے حارث آفندی کے دل میں گھر کرلیا۔ پھر اس نے برسوں کے تشنہ خواب کی تکمیل کی تھی۔ اس کے دل کا گوشہ نرم ہوکر ہمدرد ہو گیا تھا۔
عمر بھی کوئی بڑی نہیں تھی۔ اس پر یہ برداشت کی زندگی۔ لوگ تو ذرا سی تکلیف پر مچل اٹھتے ہیں مگر یہاں پر غضب کی استقامت تھی۔
تاہم نبیلہ نے کوئی امید نہیں باندھی تھی۔ اس نے دل و جذبوں پر صبر و برداشت کے پہرے بٹھالیے تھے۔ اپنے بچے کی رونے کی آواز پر اس کا دل تڑپ اٹھتا۔ اس کے ننھے سے وجود کو بانہوں میں لے کر سینے سے لگانے کو مچلنے لگتی۔
ایسے میں برداشت کی قوت آزماتے ہوئے ٹہلتی رہتی۔ میوزک کی آواز بلند کرلیتی۔ اپنے بڑھتے خدشوں کو روک لیتی مگر فریاد نہ کرتی۔ آنسو اس کا دامن بھگوتے رہتے۔ یا اللہ یہ آزمائش کی کون سی منزل ہے۔ کس جرم کی سزا ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے۔ چہرہ، ہتھیلیاں آنسوؤں میں بھیگ جاتیں مگر اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے اس کے چہرے پر وہی سنجیدگی کی گہری چھاپ ہوتی۔ ماں کا دل گویا پتھر ہو جاتا۔ وہ ماں تھی ہی کب......اس نے تو صرف جنم دیا تھا۔ ماں تو پالنے والی......سینے سے لگانے والی......چھوٹے چھوٹے کام کرنے والی......راتوں کو بچے کے لیے جاگنے والی ہوتی ہے۔
اس نے تو رقم کے عوض بچے کو جنم دیا ہے۔ رقم کے عوض! اس کا دل اچھل کر حلق میں آجاتا۔

کل ......کل کو اگر اسے معلوم ہو گیا اس کی ماں کون تھی ......کیا تھی ......کتنی شقی القلب تھی تو کیا ہوگا۔
اسے عورت سے، ماں سے نفرت ہو جائے گی۔
نہیں، نہیں وہ ایسا نہیں ہونے دے گی۔ وہ نگار کو حارث کو سمجھا دے گی کہ اسے زندگی میں کبھی کچھ نہ بتائیں۔ بس میرے لیے یہ اتنا ایثار کر دیں۔
وہ اپنی کسی قربانی کا صلہ نہیں مانگے گی۔ خود سے باتیں کرتی، سمجھاتی رہتی۔
اس روز کالج سے واپس آئی تو سنی واکر میں لان میں بیٹھا تھا۔ بے ساختہ اس کے قدم رک گئے۔
پیارا گول مٹول......سفید پنک گال ہو بہو حارث کی شکل ......وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ اس بچے کی تخلیق کا ذریعہ تھی۔
کتنا خوب صورت مقام بندگی تھا۔ سنی اسے دیکھ کر کھیلنے لگا۔ رشتہ اپنائیت تھا۔ دھیرے سے اس کے رخسار کو چھوا۔ نرم نرم سنی نے کھلکھلاتے ہوئے ہاتھ تھام لیا۔
ننھا منا سا لمس اس کے وجود میں عجیب سی لہر دوڑ گیا۔
اس کے ہاتھ کو منہ پر رگڑنے لگا۔ آنکھوں میں شوخ سی چمک تھی۔ مسکراتے ہوئے گلابی ہونٹ ...... کپڑوں کا بلو کلر چہرے پر چمک رہا تھا۔ کائنات کی سب سے حسین تخلیق، ننھا منا فرشتہ، بے ساختہ جھک کر چوم لیا۔
پہلا بوسہ، پہلا پیار، پہلا لمس۔ اس کا دل ہواؤں کی زد پر تھا۔
سنی نے اس کا دوپٹا پکڑ لیا تھا۔ اس کی گود میں آنے کی ضد کرنے لگا۔ بیگ اور جرنل گھاس پر رکھ کر بے ساختہ ہی اس کو واکر سے نکال کر بانہوں میں بھر لیا۔ بے ساختہ ہی وارفتگی سے چومتی چلی گئی۔
آنسو اس کے وجود کو بھگوتے چلے گئے۔ یہ وہ لمحہ تھا جہاں انسانی آزمائش کی طنابیں وقت کے ساحل پر بکھرنے۔ سر پٹخنے لگی ہیں۔ دل کہیں دور بھاگنے کے لیے مچل جائے۔ بانہوں کا حصار تنگ کر دیا اور ادھر ٹیرس پر کھڑا حارث آفندی ماں بچے کے اس ملن کو دیکھتے ہی آبدیدہ ہو گیا۔ بے شک یہ ظلم تھا، زیادتی تھی مگر یہ زیادتی اس کی آزمائش بھی تو تھی۔ اس کی ضرورت بھی تو تھی۔
آنکھوں کو پوروں سے صاف کیا۔ کیا ہے حارث اگر دونوں کو ایک گھر میں ایک جیسا ماحول دے دو۔ وہ تو تمہاری محسن ہے۔ اسے آزمائش میں مت ڈالو۔
اس کے اندر کا مرد حساس آدمی ابھی زندہ تھا۔ یہ گھر، یہ گھر پھر دوزخ بن جائے گا۔ نگار پاگل ہو جائے گی۔ اس عورت کی فطرت میں ملنساری نہیں بلکہ ایک طرح کی حاکمیت رعونت ......صبر برداشت کی کمی ہے۔ وہ کبھی بھی سمجھوتے کی چادر نہیں اوڑھے گی۔

☆☆☆

تبھی ایک اور دل شکستہ منظر ہوا۔ سکھاں اور نگار باہر آئیں۔ نگار نے سنی کو اس کی گود میں سے لے کر جانے کیا کہا۔ وہ بس پہلے ساکت کھڑی رہی، دوسرے لمحے اپنی کتابیں اور بیگ اٹھا کر اندر چلی گئی۔
نگار کا اس طرح چھیننے کی زیادتی کو حارث نے بھی محسوس کیا۔ اس کے دل کو بھی لگا، نگار کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انسان کو اتنا احسان فراموش نہیں ہونا چاہیے۔
بلندی محبت کا گراف انسان کے رویے، انداز اور جذباتی اتار چڑھاؤ نیچے اوپر کرتے ہیں۔ یہ مقام مسیحائی تھا۔ دھیرے سے اتر کر وہ چپکے سے نبیلہ کے بیڈ روم میں آ گیا۔ اس کی چادر دوپٹا کتابیں، بیگ بستر پر پڑے ہوئے تھے۔ بال بکھر کر شانوں پر ڈھکے ہوئے تھے۔ شاید اس نے خود پر ظلم کیا تھا۔ بین کیا تھا۔ شدت گریہ ......صبر و استقامت نے اس کے وقار، استقلال میں اضافہ کر دیا۔ آنکھیں سوج کر انگارہ ہو رہی تھیں۔
بیڈ پر دونوں ہاتھ گود میں رکھے ہارے ہوئے

جواری کی طرح بیٹھی تھی۔ جیسے اس کا سب کچھ داؤ پر لگ چکا ہو۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

''بیلا!'' اس نے دھیرے سے پکارا۔

بے ساختہ متورم پلکوں کو اٹھایا۔ آنسو جذبہ مسیحت دیکھ کر بھل بھل بہنے لگے۔

کسی دکھ کے اظہار کے لیے بعض اوقات کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور کبھی مسیحائی کے لیے، دل کی چاؤگری کے لیے لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انداز، رویے، بے ساختہ جذبے، لفظوں کا دکھ بتا دیتے ہیں اور بے ساختہ اندازہ، دکھ سمیٹ لیتے ہیں۔

اس میں کسی شعوری کوشش کا عمل دخل نہیں تھا۔ بے ساختہ ہی حارث نے بانہوں کو پھیلایا اور نبیلہ اس میں سما گئی۔

یہ کوئی خیانت تھی نہ دھوکا۔ اس کا حق تھا اور حارث کا فرض اور وہ سسک سسک کر روتی اس کا گریبان بھگوتی رہی۔

پاس وہ آئے تو یہ اس کی عقیدت ہوگی
شاید اس شخص کو بھی مجھ سے محبت ہوگی
یوں نہ چپ چاپ میرے پاس چلا آیا کر
بڑھ گیا پیار تو اک روز مصیبت ہوگی

اس نے کوئی چوری نہیں کی تھی۔ ڈاکا نہیں ڈالا مگر...... کتنے دنوں بلکہ ہفتوں تک وہ حارث سے نگاہ نہ ملا سکی۔

وہ کیا سوچتا ہوگا۔ اس قسم کی بے ساختگی کی تو اس کے تعلق میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ وہ سراسر خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی۔ اسے خود پر کنٹرول رکھنا چاہیے تھا۔ ایسی بھی کیا بے صبری۔

لیکن میاں بیوی کا جو تعلق ہوتا ہے اسی بے ساختگی کا مظہر ہوتا ہے۔ بنا کہے جذبوں کا اظہار ہو جائے۔

عورت جب ماں بن جاتی ہے تو بہت با اعتماد بھی ہو جاتی ہے۔ حالاں کہ وہ تو بے اختیار تھی مگر......

اس اگر مگر کے پیچھے بہت سے سوال، ملال تھے۔ اس نے ان سب سے پیچھا چھڑانے کے لیے خود کو کتابوں میں گم کر لیا۔

انہی دنوں جب وہ تیسرے سال کا امتحان دے رہی تھی کہ اسے ایک بار پھر خود میں تبدیلی کا احساس ہوا۔

ہائے! حیرت سے وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر رہ گئی۔ یہ کیا ہو گیا۔ یہ غلط ہو گیا۔ ایک شرمندگی سی...... اک احساس جرم غالب آ گیا۔

نگار کو جب علم ہوا تو وہ ساکت رہ گئی۔

''یہ، یہ......'' وہ حارث کے سامنے گنگ تھی۔

''تم، تم جانتے ہو اس کا مطلب......''

''نگار...... یہ کوئی گناہ تو نہیں ہے نا۔ آخر وہ میری بیوی ہے۔'' حارث کا لہجہ دھیما او دلیل مضبوط تھی۔

''تو، تو...... نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ اسے بیوی تسلیم کیا جائے۔ تم تو کہتے تھے کہ اس کو چھوڑ دو گے۔ اس کی پڑھائی مکمل ہو جائے۔ تمہیں اس سے کوئی لگاؤ، لگن نہیں تو یہ، یہ......''

حارث چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

''بتاؤ حارث یہ کیا ہے؟ مجھے ٹارچر کرنے کی کون سی چال ہے۔'' سلگ کر چیخی۔

''بی ایزی نگار تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا یہ تو ایک وقتی......''

''میری محبت میں کہاں کمی تھی جو تمہیں وقتی سہاروں کی ضرورت پڑ گئی۔ کیا میں بدل گئی ہوں یا میرے جذبے...... اور اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ تمہیں۔ تم پر استحقاق کی نگاہ ڈالی۔ غریبی کو سر اٹھانے کی جرات کیسے ہوئی۔''

''بات بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے بات کو سمجھو تم!''

''اور کیا سمجھاؤ گے تم...... میری محبت کی یہ قدر ہے۔'' اس کا لہجہ شکستہ ہو گیا۔

''پلیز نگار......'' وہ خود بھی شرمندہ ہو گیا۔

''تم خود اسے ہاسپٹل لے کر جاؤ...... اور......''

اس نے وارننگ دینے والے انداز میں بات مکمل کی۔
''ورنہ میں یہ گھر چھوڑ دوں گی۔ اس سے تو میں نمٹ لوں گی۔ آج آجائے۔'' وہ باہر نکل گئی۔
اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کسی زنجیروں میں جکڑی وحشی عورت کا ہوسکتا ہے۔ جلی بھنی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔

☆☆☆

''تم! تم اس گھر میں قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہی ہو۔ تم سمجھتی ہو کہ حارث کو مجھ سے چھین لوگی تو یہ قیامت تک نہیں ہوسکتا۔ وہ میری زندگی ہے اور تم صرف ضرورت تھیں۔ جو ہم نے پیسے خرچ کر کے خرید لی۔ اب تمہارا اس گھر میں کوئی حق نہیں ہے۔ تمہارے حق میں بہتر یہ ہے فوراً سے پیشتر اس کو......''
اس کا انداز تیور لفظوں کی تلوار...... وہ ہکا بکا تھی۔ کسی شائستہ مزاج عورت سے اتنے ننگے لفظوں کی امید کی جاسکتی ہے بھلا۔ وہ تو ابھی کالج سے آخری پیپر دے کر لوٹی تھی کہ......
''تم نکل جاؤ یہاں سے بوریا بستر سمیٹو۔''
اس نے وارننگ دی۔ نبیلہ چپ تھی۔
ایک سیل رواں تھا جو اس کے وجود میں بہہ رہا تھا۔
اتنی ہتک ...... اتنی تذلیل...... لامحدود آرزوئیں زندگی کو عذاب بنا دیتی ہیں۔ اس نے تو کبھی کوئی آرزو بھی نہیں کی۔ سب کچھ تو برخلاف ہی ملا۔
پھر یہ کیسے عذاب میں گھر گئی تھی، اس کی زندگی تشنگی بے چارگی، مظلومیت اس نے تو ہمیشہ ہی دل کے خلاف کیا تھا یہ کیوں اس کی زندگی میں گھر کر کے بیٹھ گئیں۔ گھر میں ایک محاذ بن گیا تھا۔ رات پھر نگار ہنگامہ آرام پر اتر آئی۔
''تم اسے بسانا چاہتے ہو...... مجھے اجاڑنا چاہتے ہو۔''
''یہ تم نے کیسے سمجھ لیا جانم!''
''جس طرح تم نے یہ سب کرلیا تم کیا سمجھتے ہو میری آنکھوں میں دھول جھونک دوگے۔ نہیں قطعاً نہیں۔ میں تمہیں یہ کھیل کھیلنے نہیں دوں گی۔ میں نے اگر سب کچھ برداشت کیا تھا تو ممی کی وجہ سے ان کی تشنگی کی وجہ سے...... اب تو سب کچھ مل گیا ہے۔ ب کیا چاہیے۔''
پاگل عورت...... محبت میں دیوانی یہ نہیں سمجھ سکتی تھی، عورت جب مرد کے بچے کی ماں بن جاتی ہے تو معتبر ہوجاتی ہے۔ اولاد مرد کی عزت، زینت، محبت، بازو ہوتی ہے۔ اس عورت نے اسے کیا دیا۔ صرف محبت، عاشقی، گھریلو زندگی کا سکھ۔ اولاد دوسری عورت نے دی۔ اسے اس نے کیا دیا؟
احساس جرم، تنہائی، اکیلا پن، خود فریبی۔ حق تو نگار کا ہے۔ وہ تو صرف اضافہ تھی۔
کیا عزت رہ جاتی اگر نبیلہ اٹھ کر کہہ دے، میرے بچے میرا شوہر یہاں ہے۔ کیا قدر ہوگی اس عورت کی جس کا شوہر کہہ دے کہ وہ میرے بچوں کی ماں ہے میں اسے نہیں چھوڑتا۔
اس کے پاس تو صرف استحقاق کا پرچم تھا۔ مرد کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ لیکن حارث ایک باشعور، سمجھ دار، فہم و فراست رکھنے والا شخص تھا۔ نہ وہ جذباتی تھا، نہ جلد باز۔ ہر مسئلے کا باریک بینی سے جائزہ لے کر پھر کسی حتمی نتیجے پر پہنچتا تھا۔
یہاں تین فریق تھے۔ تینوں ہی جائز، حقدار استحقاق رکھتے تھے۔ وہ تینوں کے ساتھ زیادتی نہیں کرنا چاہتا تھا۔
اس کو خدا کی نظروں میں بھی سرخرو ہونا تھا۔ تین فریقین میں ایک نبیلہ...... دوسری نگار...... تیسرا اس کی اولاد یا خود اس کی ذات۔
نگار کا یہ جواز بے بنیاد تھا کہ وہ آنے والے بچے کو ختم کردے۔ اولاد آزمائش سے ملتی ہے اور اگر خدا نے اسے اس آزمائش میں ڈال دیا تھا تو اسے ہر حال میں پورا اترنا تھا۔
نگار سے اسے محبت تھی، ہے اور رہے گی۔ نبیلہ

دوسری اولاد کے حوالے سے عزیز ہوتی جا رہی تھی۔
اس کی خاموشی، مظلومیت نے دل میں جگہ کر لی تھی۔ اگر اسے چھوڑ دیتا تو اس کا مستقبل کیا ہوتا۔ سوچوں کا گرداب بننے لگا۔ رات اس نے ڈاکٹر عمرانہ کو فون کر دیا۔ شاید قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ آ نہ سکیں۔ رخصت پر تھیں۔
''میں تمہیں سیڑھیوں سے دھکا دے دوں گی مگر اب یہ نہیں ہونے دوں گی۔'' نگار بہت جنونی ہو رہی تھی۔
اور اسے کوئی حفاظتی بند نظر نہیں آ رہا تھا جس کے پیچھے جا کر چھپ جائے۔ کس سے جا کر مدد مانگے۔
حارث کا سہارا بھی کمزور تھا۔
پھر اس نے ارادہ کر لیا، پکا، مضبوط...... وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گی۔ جب اللہ ایک بار پھر اس کی جھولی بھر رہا ہے تو وہ بے مراد کیوں رہے۔ اگر ان کو ضرورت نہیں تو اسے تو ہوگی نا۔
زندگی اس کو بھی گزارنا ہے۔ وہ خود پال لے گی۔ یہاں سے چلی جائے گی۔ اس طرح سسک سسک کر جینے سے بہتر ہے وہ باعزت اعتماد کے ساتھ زندگی گزارے۔
ہر رشتہ کچا ہوتا ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی، شوہر اولاد۔
لیکن پھر بھی ہم دوسروں کی خاطر جیتے ہیں۔ زندگی ہوتی ہی دوسروں کے لیے ہے۔ شادی ہو جاتی ہے۔ عورت پرسکون ہو جاتی۔ اولاد ہو جاتی ہے۔ تو مطمئن وشاکر رہتی ہے۔ شوہر برا ہو تو اولاد کے سہارے زندگی گزر جاتی ہے۔
اب اولاد کا سہارا ہی سہی۔ باقی سب رشتوں کو تو آزما لیا تھا۔ سب نے ہی بے وفائی کی راہ دکھائی تھی۔ ایک راہ اور سہی...... خود کو مطمئن کیا۔
اب وہ ہار نہیں مانے گی۔ وہ جیتی ہوئی عورت ہے۔ نگار ایک ہاری ہوئی عورت ہوتے ہوئے بھی ہار نہیں مان رہی تو وہ کیوں جھکے۔ اس کے دل میں ایک نیا ارادہ تناور درخت بننے لگا۔

☆☆☆

لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ حارث حیران پریشان بیٹھا تھا۔ یہ کایا کیسے پلٹ گئی۔
''ہاں حارث ایک اکیلا بچہ کیسے رہے گا۔ اس کا ساتھی ہونا چاہیے۔ اکیلے بچے بہت تنہا ہو جاتے ہیں۔ احساس محرومی کا شکار ہوتے ہیں۔ میں یہ بچہ بھی لے لوں گی۔ دونوں کو پالوں گی۔''
پھر...... پھر تم اسے چھوڑ دینا۔ جو مانگتی ہے دے دینا۔ میں اپنی الگ دنیا بسانا چاہتی ہوں اب......
اس کا لہجہ نرم...... انداز شرمندہ اور سر جھکا ہوا تھا۔
''مجھے عقل آ گئی ہے کہیں دیر تو نہیں ہوئی۔'' دھیرے سے اس کے شانوں پر سر رکھا۔
''نگار!'' حارث نے دھیرے سے اس کے بالوں پر ہاتھ رکھا۔
''تم نے اسے! اتنے سخت لفظ کہے۔ اس کی انسلٹ کی...... اتنے طعنے دیے اسے...... کیا اب وہ مان جائے گی؟''
''اس کے ماننے یا نہ ماننے کا کیا سوال بات تو میرے ماننے کی تھی۔''
اس درجہ ہٹ دھرمی پر وہ حیران رہ گیا۔
''جو ہمارے ٹکڑے کھاتا ہے وہ ہماری بات کیوں نہیں مانے گا اور اگر اس نے ہماری بات نہ مانی تو اسی وقت ہمارے گھر سے نکل جائے۔'' نگار نے بازی کا پانسہ ہی پلٹ کر رکھ دیا تھا۔
''میں بات کروں گا۔''
''آپ کے بات کرنے کا کوئی مطلب نہیں۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ میں ایسا کروں گی۔'' اس کا لہجہ بہت مضبوط اور پختہ تھا۔
حارث صرف اسے دیکھتا رہ گیا۔
نگار تو مکمل طور پر ہاری ہوئی عورت تھی مگر اسے اپنی ہار کا احساس نہ تھا۔ واقعی دولت انسان کو کیا سے کیا بنا ڈالتی ہے۔ وہ بات بھی یوں کر رہی تھی گویا یہ اس کا حق ہو۔
کاش وہ اسے اس کی اوقات یاد دلا سکتا۔ یہ عورت اسے عزیز بھی تو تھی۔ سوئی ہوئی نگار کو دیکھا۔

اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔ کبھی مسکرا دیتی۔ کبھی چہرے کی رگیں کھنچ جاتیں۔

آج اس نے سنی کو بھی اپنے پاس سلایا تھا۔ وہ ماں نہیں بنی تھی مگر ماں بن چکی تھی۔ اس کے اندر اعتماد تھا۔

جو ماں کا رتبہ پا چکی تھی وہ خالی ہاتھ تھی، کمزور تھی۔ یہ کیسی قدرت تھی۔ عورت کے پاس اولاد کا مان نہ ہو تو خالی بنجر ویران ایسی زمین کی طرح ہوتی ہے۔ جس پر سیم وتھور نے گھن لگا دیا ہو اور خوف سے اس کا چہرہ سفید رہتا ہے۔

''یہ کیسا مقام تھا۔ اولاد ہو بھی تو عورت بنجر زمین ہوتی ہے اگر امتیاز امارت کا ہو تو!''

یا اللہ میں تیرا گناہ گار بندہ ہوں۔ ان دونوں عورتوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھلائی کا راستہ دکھا۔ انصاف کا راستہ دکھا۔ رات کے سیاہ گھور اندھیروں میں لان میں ٹہلتے ہوئے حارث نے صدق دل سے دعا کی۔

ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی......!

☆☆☆

اسے گھر بدری کا حکم سنا دیا گیا اور ایک بار پھر اس کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ ہمیشہ دوسرے ہی اس کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں، وہ خود کیوں نہیں اپنے بارے میں سوچتی۔ تعلیم نے اسے آگہی وشعور دیا ہے۔ وہ کیوں جیسا ہے اسے ویسے کی بنیاد پر قبول کرے۔

ہر انسان کے اندر ایک باغی شخص چھپا ہوتا ہے۔ وہ اگر سر اٹھائے تو فرد ہیرا بن جاتا ہے یا پھر ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں بات سیدھی راہ چلنے کی ہے۔ بس اب وہ خود سے کسی کو کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

ایک عزم سے سر اٹھا کر دیکھا باہر نئے دن کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ موسم بدلنے کا وقت آ جائے تو وقت کا موسم بھی بدل جاتا ہے۔ اب اسے آدھی زندگی نہیں جینا۔ مشروطیت کسی سے نہیں کرنی۔ اس کا جیون اس کی کہانی ہوگی۔ مشروطیت نہیں۔

اس کے اندر ایک نیا عزم، ولولہ اور جوش پیدا ہو گیا۔ زخمی عورت بہت خطرناک ہو جاتی ہے۔ وہ بس اب نگار کی جانب سے کسی شدید ردعمل کی منتظر تھی۔ وہ کسی ڈاکٹر کو ملاتی...... یا گھر بلاتی...... یا ہاسپٹل لے جانے کی بات کرتی۔ آگے وہ خود نمٹ لیتی۔ لیکن بڑی حیرت انگیز بات تھی۔ اس کی جانب سے غیر معمولی خاموشی...... غیر معمولی خاموشی بہت خطرناک بلکہ طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

وہ خود ڈاکٹر بننے کے آخری مراحل میں تھی۔ اپنی کیفیت کا خود ہی جائزہ لے رہی تھی۔ اب یہ تھا کہ حارث آتے جاتے خود ہی اکثر پوچھ لیتا تھا۔ ان کے درمیان اب اکثر جذباتی لمحے آ جاتے۔ خود پر پہرے بٹھانے کے باوجود اب وہ اکثر اس کے خیالوں میں آ جاتا۔ خوشبو بن کر اس کے ہمراہ ہوتا۔ ہوتی ہے ایک عمر ایک احساس یہ بھی۔ پھر وہ تو اس کا جائز حق تھا۔ خود کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتی تھی۔

اس روز موسم بے حد سرد تھا۔ اس کی طبیعت بھی خراب تھی۔ سرد ہواؤں کا شور اس کی سماعتوں میں انگارے گرا رہا تھا۔

اس وقت شدت سے کسی مسیحا کی، کسی ہمدرد، مونس، غمگسار کی ضرورت تھی۔

اپنے کمرے میں آج حارث بھی بے چین تھا۔ نگار اور اس کے درمیان گہری سرد خاموشی تھی۔ ایسا برفیلا گلیشیئر جو کبھی بھی نہیں پگھل سکتا مگر آواز دینے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

آج سکھاں بھی نہیں تھی۔ صبح تک وہ جاگتی رہی تڑپتی رہی۔ محبتیں ہی محبتوں کا مان رکھتی ہیں۔ گلہ فضول تھا۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' صبح ایکسرسائز کر کے حارث اس کے کمرے میں آ گیا۔

بے ساختہ ہی کمبل سے چہرہ نکال کر دیکھا۔ سرخ انگارہ آنکھیں شدت گریہ سے سرخ تھیں۔ ساری رات کی تھکن اذیت آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔

اس کے دل کو کچھ ہوا۔ بے اختیار کھنچتا چلا آیا۔

''کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا......''
اس نے کمبل میں منہ چھپالیا۔ ''چلے جائیں یہاں سے، مجھے کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔''
''بیلا، بیلا تم ٹھیک تو ہو ناں۔'' کمبل چہرے سے ہٹایا۔ بے حد زرد ہو رہی تھی۔ اس کی کسی پیش قدمی کو روک نہ سکی۔ اپنی کم نصیبی پر بس رو سکتی تھی۔ اس روز بھی جی بھر کے روئی اور جب سردیوں کا موسم عروج پر تھا اس نے اسی اسپتال میں ایک اور بیٹے کو جنم دیا۔
درد، اذیت، تکلیف سہہ کر ایک اور خوشی حارث کو دی۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ بے اختیار اسے چوم لیا۔ ایک بار پھر ڈھیروں ڈھیر مٹھائی بانٹی۔
''میں، میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔''
''ہاں کیوں نہیں۔'' نگار نے اپنی گود میں سے اٹھا کر دیا۔ اس سے اٹھا ہی نہیں گیا۔ اس نے ذرا سا سر اٹھا کر محبت سے دیکھا بالکل ویسا ہی گلابی، سفید، نرم و نازک۔
بے اختیار ہی بانہوں میں بھرنے کے لیے ہاتھ پھیلائے۔ نگار نے اسے پیچھے کر لیا۔ ''میں اسے لے کر گھر جا رہی ہوں۔ اسپتال کا ماحول بچوں کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔'' کہتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ باہر نکل گئی۔
''حارث......'' وہ ششدر رہ گئی۔ ''وہ، وہ لے گئی۔ کیوں؟ سنی تو ہے اس کے پاس۔'' رو دینے کو تھی۔ تکلیف بھول گئی۔
''ریلیکس ......ریلیکس وہ تمہارا ہی ہے۔ گھر چلو تمہیں مل جائے گا۔''
''چلیں، چلیں ابھی چلیں۔'' جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ یوں جیسے چیل اس کا بچہ لے گئی ہو اور وہ چھیننے کے لیے بے قرار۔ ''چھٹی لے لیں۔''
''ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''
''نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ پہلی بار یوں ضد میں آئی۔ حارث کو ہار ماننا پڑی۔

☆☆☆

اور گھر میں ایک گھمسان کا رن تھا۔ نگار کسی صورت بچہ اس کے حوالے کرنے کو تیار نہ تھی۔ ''یہ ہمارا ہے۔ ہم نے تمہیں اس کی قیمت دی ہے۔''
''وہ میں نے سنی دے دیا تھا تمہیں۔''
''جب تک تم حارث کے نکاح میں ہو ہماری مقروض ہو۔ اس کی اولاد صرف ہماری ہے۔''
''اتنی شقی القلب مت بنو ماں کی ہائے مت لو، تمہاری جھولی میں نے بھر دی ہے۔ میری جھولی خالی مت کرو۔ روز محشر میں ان کو کیا جواب دوں گی؟ کیوں میں نے انہیں اپنا دودھ نہیں پلایا؟ کیوں اکیلا چھوڑ دیا؟ مجھے ماں نہیں ڈائن کے نام سے پکارا جائے گا۔ دیکھو......دیکھو مجھ پر یہ ظلم مت کرو۔ میں مر جاؤں گی۔'' وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے سسک سسک کر رو دی۔
مگر اس وقت وہ سنگدل ہو رہی تھی۔ ''تم حارث کا پیچھا چھوڑ دو۔''
''میں ان کے پیچھے نہیں آئی تھی۔ ممی لے کر آئی تھیں۔ میرا کیا اختیار تھا۔ میری ہائے مت لو۔ دے دو۔ میری ممتا کو سیراب کر دو۔''
مگر اس پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ اس نے خود کمرے میں بند کر لیا۔
حارث آوازیں دیتا رہا مگر اس نے دروازہ نہیں کھولا۔
اس کی ممتا بلکتی، بین کرتی رہی۔
ان لمحوں میں حارث نے اسے سنبھال لیا۔ سمیٹ لیا اور وہ سر پٹخ پٹخ کر روتی رہی۔
ہفتہ گزر گیا۔ نگار بچوں کو لے کر اپنی ماں کے گھر چلی گئی تھی۔ اس کی قیمت بہت کڑی تھی۔ حارث نبیلہ کو طلاق دے اور حارث کسی قیمت پر یہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب اسے ایک ضد سی ہو گئی تھی۔ بالکل کملا کر رہ گئی تھی۔
انہی دنوں ممی کا فون آیا گھر میں نگار نہیں تھی۔ اس نے ہی اٹینڈ کیا دوسرے بیٹے کی مبارک باد دے رہی تھیں۔ میں تو اکثر فون کرتی ہوں مگر تم گھر پر نہیں ہوتی تھیں۔ نگار بتاتی تھی۔''
''وہ کہاں میری بات آپ سے کروا سکتی تھی۔''
''تم کیسی ہو......میرا پوتا کیسا ہے؟''
''پتا نہیں!'' آنسوؤں سے لہجہ بھر گیا۔
''کیوں؟'' اچنبھے سے انداز میں پوچھا۔

''وہ...... وہ نگار لے گئیں ہیں۔ کہتی ہے اب میری ضرورت نہیں ہے۔ حارث مجھے طلاق دے دیں۔''

''کیا!''

''ہاں ممی...... میں نے تو ان سے کچھ نہیں مانگا تھا میں تو صرف ان بچوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں مگر ...... مگر وہ......'' وہ سسک کر رو دی۔ ''آپ نے مجھے خریدا کیوں تھا۔ کیوں میری مجبوریوں کا سودا کیا تھا۔ میں روز محشر کیا جواب دوں گی اپنی ممتا کی تسکین کیسے کروں۔''

اس نے فیصلے کا اختیار انہیں دیا۔

انہوں نے دھیرے سے بین کرتی ہوئی اس ماں کی آواز سنتے ہی فون بند کر دیا۔

☆☆☆

انہی دنوں اس کا ہاؤس جاب مکمل ہو گیا۔ اذیت کے دن تھے۔ حکومت اسے ہائر اسٹڈی کے لیے باہر بھیج رہی تھی۔ نگار ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ حارث کی ہر کوشش بے کار گئی۔ جانے کیسی ضد اس میں سما گئی تھی۔ حارث کے لیے اس ترسی تڑپتی عورت کو چھوڑ دینا اپنے بچے کے لیے جو ہلکان ہو رہی تھی۔ اس نے حارث کو بتا دیا کہ وہ پڑھنے کے لیے باہر جا رہی ہے اور یہاں......

''یہاں میری ضرورت نہیں ہے۔ جتنی ضرورت تھی پوری ہو گئی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب تو آپ کو زیادہ معلوم ہے جب زندگی سے دلوں سے لوگ اتر جائیں تو وہاں سے کوچ کر جانا چاہیے۔ پھر میری گنجائش اب گھر میں نہیں تو دلوں میں کہاں سے ہو گی۔ اب میں اتنی باشعور تو ہو گئی ہوں کہ اپنی زندگی خود گزار سکوں۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤں۔ زندگی نے مجھے بڑے کڑے امتحانوں میں ڈالا ہے اب کسی اور امتحان کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس کا چہرہ ساکت تھا۔ حارث اسے دیکھ رہا تھا۔

''یہ سب مقدر کے کھیل ہیں اور میں مقدر سے ہار گئی ہوں۔ نگار کو بلوا لیں۔ میں جلدی چلی جاؤں گی۔''

دونوں کے درمیان گہری خاموشی تھی۔

''غربت بہت آزمائشوں میں ڈالتی ہے۔ میرے خوابوں نے مجھے رسوا کیا۔ ڈاکٹر بننے کی خواہش نے مجھے سنگریزوں پہ گھسیٹا ہے اب...... اب میں بہت تھک چکی ہوں۔ اس بار کو اٹھاتے اٹھاتے۔ جو بھی فرض ہے مجھ پر واپس لے لیں۔ مجھے ان زنجیروں سے آزاد کر دیں۔ میں سکھ کا سانس لینا چاہتی ہوں۔'' آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

کمزور لمحوں میں ہی آنسو کیوں نکلتے ہیں؟

آتش دان میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ باہر بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ ''میں ساری عمر اس خوف میں نہیں رہ سکتی کہ اب مجھ سے کوئی میری ذات نہ چھین لے۔'' اس نے گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔

آج پہلی بار حارث کا دل نرم ہو گیا۔ نگار کی جگہ نبیلہ نے لے لی۔

''بیلا!'' بے اختیار اس کے وجود کو سمیٹ لیا۔

اپنی امان دے دی۔ اپنی محبت کی برسات کر دی۔ اپنے ہونے کا یقین دلایا۔

اسے تمام قرضوں کے بوجھ سے آزاد کر دیا۔

''تمہارا فیصلہ اب میں کروں گا۔''

صبح کے پرنور اجالوں میں اس کی پیشانی چومتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

اس کی نظروں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ محجوب ہو کر رہ گئی۔

پھر اس کی سیٹ کنفرم ہو گئی۔ حارث نے نگار کو اس کے جانے کی اطلاع دے دی۔ نگار لوٹ آئی۔ اس نے دونوں بچوں کو جی بھر کر پیار کیا۔

نگار کا دکھ وہ بھی جانتی تھی۔ وہ بھی تو اس کا دکھ سمجھنے کی کوشش کرتی۔ کیا عورت بھی عورت کا دکھ نہیں جان سکتی۔

''یہ مت سمجھنا کہ میں میدان چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ نہیں، میں کمزور ہوں مگر اولاد کے لیے نہیں۔''

''میں اپنا دوسرا بیٹا تمہیں نہیں اس کے بھائی سنی کو دے رہی ہوں۔''

''سنی اکیلا رہتا تو بہت اکیلا ہو جاتا۔ اکیلے بچے نفسیاتی ہو جاتے ہیں۔ دونوں بھائی ہمیشہ اکٹھے

رہیں گے۔" آنسو رخساروں پر بہہ نکلے۔ "جتنا بھی قرض تھا سود کے ساتھ واپس کر دیا۔ بس میری اتنی سی خواہش ہے زندگی کے کسی موڑ پر انہیں یہ مت بتانا کہ ان کی سگی ماں کون ہے؟"

آگہی کی طنابیں جب ٹوٹتی ہیں تو انسان پورا بھسم ہو جاتا ہے۔ ہر کسی کا حوصلہ نبیلہ شیخ جیسا نہیں ہو سکتا۔ سنی کے گھنے سیاہ بادلوں میں ہاتھ پھیرا۔ آنسو گھنے بالوں میں گر رہے تھے۔

"مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ والدین نے جس طرح کہا میں نے نبھا دیا۔ اب اور نہیں چل سکتی۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"آپ لوگوں کو آپ کی خوشیاں مبارک ہوں۔"

اپنے بیٹے کے لیے اس نے دل پر پتھر رکھ لیا۔

☆☆☆

آج اس گھر میں اس کی آخری رات تھی۔ ساری رات جاگتی رہی۔ کتنے موسم، کتنی راتیں، کتنے دن یہاں گزارے تھے۔ سب کے سب اس درجے تلخ تھے کہ یاد کرنا بھی نہیں چاہتی۔

زندگی نے معلوم نہیں کیوں! اسے آزمایا تھا۔

وہ کون سی ایسی قابل قدر نامی گرامی ہستی تھی۔ ان گزرے ماہ و سال نے کچھ نہیں دیا۔ خوشی کا کوئی لمحہ بھی تو اس کے پاس نہ تھا۔ بلکہ، بلکہ اپنے قلب گوشوں سے بچھڑنے کے خیال سے دل چھلنی ہو رہا تھا۔

مجھے معاف کر دینا میرے بچو! میرا کوئی دوش نہیں۔ یہ ہی سمجھ لینا کہ تمہاری ماں مر گئی ہے۔ دنیا میں بہت سے بچے ہوتے ہیں جن کی مائیں نہ ہوتیں۔ تم بھی ان میں سے ہو گے۔ تمہیں ماں کا پیار ضرور ملے گا۔ تم لوگ باپ کے زیر سایہ تو رہو گے۔ اپنی ماں کا یہ گناہ معاف کر دینا۔

اس پل اسے وہ شخص بھی یاد آیا جو اس سے محبت کرنے کا دعویدار تھا۔ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اذیتیں سہہ سہہ کر بارہا دل نے چاہا کہ بغاوت کر دے مگر اس کے خون میں سرکشی نہیں تھی۔ وہ تو نرم و نازک سی لڑکی تھی۔ وقت نے جسے توڑ دیا تھا۔ وہ کیسے خود کو توڑ دیتی۔ بے شک اس کے ماں باپ نے اس پر ظلم کیا مگر وہ کیسے ان کی عزتوں پر حرف لے آتی۔ اسے حارث بھی یاد آیا۔ جو اس سے محبت کرنا بھی چاہتا تھا۔ دور بھی رہنا چاہتا تھا۔ جذب بھی چاہتا تھا۔ نگار سے محبت کا احساس بھی تھا۔

اس کے حق میں برا نہیں تھا۔ جب نواز اخلوص نیت سے نوازا تھا۔ اس کی بھی مجبوری تھی۔ یہاں رہنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ ہر دم بچوں کی نظریں، ان کے چہرے سامنے رہیں گے۔ وہ کہیں بغاوت نہ کر دے۔

بغاوت تو کبھی بھی کسی بھی لمحے ہو سکتی ہے۔ اداسی کی طویل ترین سیاہ رات گزر گئی۔

☆☆☆

صبح طلوع ہو گئی۔ پھیکی، بے رونق، ویران، خزاں رسیدہ لیے ہوئے لیکن اب دن و رات کی بے رونقی سے کیا لینا تھا۔

اس کا دانہ پانی تو اٹھ ہی گیا تھا۔ کوچ کرنے کا ارادہ تو کر لیا۔ حارث اسے ایئر پورٹ چھوڑنے جا رہا تھا۔ اس نے حارث سے ایک لفظ نہ کہا۔ آخری بار بچوں کو ڈھیر سارا پیار کر کے وہ الوداعی نگاہ ان در و دیوار پر ڈال کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ حارث نے سامان رکھ دیا۔

تیزی سے گاڑی پر گزرتے بابر نے رک کر اسے دیکھا تھا۔ شناسائی کے رنگ نمایاں تھے۔

"اتنا اہم فیصلہ کر لیا اور مجھے علم تک نہ ہوا۔"

"کیا فائدہ تھا، سود و زیاں تو ہو گیا۔"

"میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ میں تمہیں کبھی چھوڑنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ تم نہ چاہو۔"

"میں کیوں چاہوں گی۔ مجھے کون سا اب کہیں اور جانا ہے۔ بس اب زندگی ختم ہو گئی ہے۔ بچوں کا بہت خیال رکھنا۔ انہیں کبھی یہ آگہی مت دینا کہ......"

"وہ میرے بھی تو بچے ہیں ناں!"

"اب کب آؤ گی؟"

"کبھی نہیں......" گلاسز آنکھوں پر لگائے۔ "میرے اندر پل صراط سے گزرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔

اب میں صرف دولت جمع کروں گی اور ایک امیر عورت بنوں گی لیکن کسی کی مجبوریاں نہیں خریدوں گی۔''

''میں تمہارے ساتھ انصاف نہ کرسکا مجھے......''

''انصاف محبت کا مرہون منت ہوتا ہے۔''

حارث اسے دیکھ کر رہ گیا۔ ایئرپورٹ آ گیا۔

''اس نے بے چینی سے ہاتھوں کو مسلا۔ ایک بات کہنی تھی۔''

''کہو......''

''زادراہ کے طور پر میں نے کچھ لیا ہے۔ بتانا اس لیے ضروری ہے کہ میری حرمت، شرافت، پاکیزگی پر الزام نہ آئے۔ پہلے اس لیے نہیں بتایا کہ کوئی چھین نہ لے۔'' حارث سمجھا نہیں۔

''میں ایک امانت لے کر جارہی ہوں۔ مجھے اتنا تو حق ہے کہ میں پال سکوں۔ زندگی کے کسی موڑ پر زندگی نے وفا نہ کی تو آ کر لے جائے گا۔''

حارث نے گاڑی ادھر ہی روک دی۔

''بیلا!'' کیسی محرومیت تھی اس کے لہجے میں۔

''تم کو اختیار ہے لے جاؤ۔ بلکہ میری محبت، میری چاہت بھی لے جاؤ۔ میں تمہارا حق ادا کرتا رہوں گا۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ خوشی کے آنسوؤں نے چہرہ بھگو دیا۔

کتنا معتبر کر دیا تھا اس کی ذات کو۔

تیرے دل کی زمین ہی نہ ملی۔

ورنہ ہم آسمان ہو جاتے۔

دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام کر یقین دلایا۔ ''نگار ایک مظلوم و مجبور عورت ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ تم میرے بچوں کی ماں ہو۔ بچوں کی خاطر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ امریکا والا اپارٹمنٹ تمہارا ہوا۔ میں وہیں آتا رہوں گا۔ نگار کو کبھی خبر نہ ہو گی۔''

اور وہ خدا کے اس انعام و شکرانے پر بے اختیار رو دئے گئی۔ کب اس کا یقین تھا بلکہ اس نے توقع بھی نہیں کی تھی۔

فلائٹ میں تھوڑا ٹائم تھا گاڑی آگے بڑھالی۔

بقیہ سارا راستہ امید یقین کے سہارے گزرا۔ محبوبی انداز...... عشق کی نگاہ نے اللہ حافظ کے مرحلے طے کیے۔

☆☆☆

ایک بار پھر نیویارک کے جدید ترین اسپتال میں اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ سسٹر نے نومولود کو اس کی آغوش میں دیا تو وہ فرط مسرت سے رو پڑی۔ اب کوئی نہیں جو اس سے چھین سکے۔ وہ استحقاق رکھتی ہے۔ بے ساختہ ہی بانہوں میں بھینچ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

پچھلے تمام دکھ بھول گئے۔ اولاد کی کشش نے اس کی ہر تکلیف، مصائب کو راحت میں بدل دیا۔

''بیٹیاں تو پھول ہوتی ہیں۔ خود بخود خوشبو بکھر جاتی ہے۔ اپنی بیٹی کو خود سے زیادہ خوشیاں دے گی۔ اے اللہ میرے جیسا نصیب نہ دینا اس کو۔'' اس نے اپنے بھیگے ہوئے رخسار صاف کیے۔

تبھی بے آواز دروازہ کھلا اور حارث اندر آ گیا۔ ہاتھوں میں ڈھیر سارے پھول تھے۔ آہٹ پر چونک کر سر اٹھایا۔ دروازے میں حارث کھڑا تھا۔ آنکھوں میں محبتوں کی قندیلیں روشن کیے۔ ذرا سی جنبش پر ڈھیروں پھول، پتیاں اس کے اوپر اچھال دیے اور اس کے چہرے پر سجی مسکراہٹ تھی۔ نبیلہ بے ساختہ ہی ہنس دی۔ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ حارث آ گے آیا۔ اس کی بانہوں میں چھپی گڑیا کو چوم لیا۔

دکھوں کا در بند ہو گیا۔ نبیلہ نے گلدستے سے لگا کارڈ کھولا۔

محبت کے نام!

میرے ہم سفر!

ہیں تیری نظر، میرے جذب دل کی یہ شدتیں

میرے خواب، میری بصارتیں

میری دھڑکنیں، میری چاہتیں

میرے روز شب کے نصاب میں

میرے پاس اپنا تو کچھ نہیں

تیرا فرض ہے میری زندگی

میری سانس تیری امانتیں

یہی اشعار تو وہ وہاں چھوڑ کر آئی تھی۔

☆☆

دل نادان

نویرا زبیر

ایک غیر ملکی سپر اسٹار جو اداکاری ترک کرکے اپنے وطن واپسی جانا چاہتی تھی کہ اچانک اس کا قتل ہوجاتا ہے۔ شواہد کی بنیاد پر قاتل اس شخص کو قرار دیا جارہا تھا جو اس کی حفاظت پر معمور تھا جو خود بھی قتل ہوچکا تھا کیس بظاہر سادہ تھا لیکن ایک سراغ رساں نے اس کی کہانی کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

دہرے قتل سے شروع ہونے والی تحیر اور سنسنی خیز واقعات سے بھرپور کہانی



فون کی بیل مستقل بج رہی تھی اور اٹھے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے سر اوپر اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا باہر کی فضاء تاریک تھی جس کا مطلب تھا کہ ابھی رات کا سفر جاری تھی۔ اس نے سر جھٹک کر نیند کا خمار کم کرنے کی کوشش کی اور بڑبڑاتے ہوئے فون کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"ہیلو! لہجے میں خمار کے ساتھ ناگواری کا عنصر بھی شامل تھا۔"

"میں لورین بول رہی ہوں، فوراً یہاں چلے آؤ، تمہارا وہ آدمی شاید پاگل ہوگیا ہے وہ......" جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ریسیور پر فائر کی آواز سنائی دی اور بولنے والی کی آواز ڈوبتی چلی گئی، اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہوگئی۔ لیڈل کے ذہن پر طاری نیند کا خمار غائب ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی ریڑھ ہڈی میں سردی کی ایک لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ ہیلو ہیلو چیختے ہوئے کریڈل پر ہاتھ مارنے لگا۔ اس کوشش کے نتیجے میں کلک کی ہلکی سی آواز سنائی دی جیسے دوسری طرف سے کسی نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر سلسلہ منقطع کیا ہو۔ لائن کٹ جانے کے باوجود لیڈل فون لے کر یڈل پر ہاتھ مارتا رہا۔ چند سیکنڈ بعد ایکسچینج کے آپریٹر کی آواز سنائی دی۔

"آپ کس نمبر پر بات کرنا چاہتے ہیں جناب؟"

"میں کوئی نمبر ملانے کی کوشش نہیں کر رہا، کسی نے مجھے فون کیا تھا لیکن بیچ میں لائن کٹ گئی۔ کیا تم دوبارہ رابطہ قائم کرا سکتے ہو؟"

"اس کے لیے متعلقہ نمبر معلوم ہونا ضروری ہے جناب۔" آپریٹر کی آواز سنائی دی۔

"تمہارے پاس سی ایل آئی کی سہولت نہیں ہے کیا؟"

"جی نہیں۔"

"کوئی بات نہیں اس زحمت کے لیے شکر گزار ہوں، شاید وہ دوبارہ فون کریں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا، پھر اس نے کپڑے پہنے ریوالور ساتھ لیا اور دس منٹ کے بعد وہ کار اسٹارٹ کر رہا تھا۔

☆☆☆

لانگ آئی لینڈ کے علاقے میں نارتھ بولیوارڈ پر واقع لورین کی رہائش گاہ تک پہنچنے کے لیے لیڈل نے چالیس منٹ کا فاصلہ تیس منٹ میں طے کیا۔ مکان ہائی وے سے قدرے ہٹ کر سدا بہار کے درختوں کے جھنڈ میں واقع تھا، لیڈل نے گاڑی مکان کی طرف جانے والی بجری کی سڑک پر موڑ دی، بل کھاتی ہوئی اس سڑک پر جب وہ عمارت کے قریب پہنچ تو گیراج کے سامنے پہلے ہی دو گاڑیاں دیکھ کر اس نے اپنی کار کا رخ عمارت کے سامنے پورچ کی طرف موڑ دیا۔ کار روک کر وہ نیچے اترا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔ سامنے کا ہال تاریک نظر آ رہا تھا۔ پہلے اس نے مکان کے عقبی راستے سے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا لیکن پھر کچھ سوچ کر دروازے پر دستک دینے لگا۔ اسے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دستک کے فوراً بعد ہی دروازہ کھلا اور ایک بھاری بھرکم آدمی کا ہیولا دکھائی دیا۔

"میرا نام جونی لیڈل ہے اور میں مس لورین سے ملنا چاہتا ہوں۔" لیڈل نے تعارف کرتے ہوئے کہا۔

دروازہ پوری طرح کھل گیا۔ وہ آدمی لیڈل کو اندر داخل ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے راستے سے ہٹ گیا، لیڈل محتاط انداز میں اندر داخل ہوا۔

"سیدھے چلے جاؤ، اسٹڈی روم میں۔" وہ شخص لیڈل سے ایک قدم پیچھے چلتے ہوئے بولا۔

ہال میں کھلنے والے ایک دروازے سے روشنی جھلک رہی تھی۔ لیڈل اسی طرف چل دیا، دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ رکا اور کمرے کے اندر موجود ان دو آدمیوں کی طرف دیکھنے لگا جو ناگواری اور تعجب کی ملی جلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے لمبے قد والا جس کے جسم پر نیلے رنگ کا شکن آلود سوٹ نظر آ رہا تھا، لیڈل کے پیچھے آنے والے کو مخاطب کرتے ہوئے ناگوار لہجے میں بولا۔

''ایلین یہ کون ہے؟''
''اپنا نام لیڈل بتاتا ہے اور مس لورین سے ملنے آیا تھا۔''
''میں سمجھتا ہوں کہ میزبانی کے فرائض مس لورین کے بجائے مجھے ہی ادا کرنے ہوں گے۔'' لمبے قد والے نے کہا اور آگے بڑھ کر وہ کمبل اٹھا دیا جس سے فرش پر پڑا ہوا ایک آڑھا ترچھا وجود ڈھکا ہوا تھا۔ مس لورین پشت کے بل پڑی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ سر پر تھا۔ بال قالین پر بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں نیم وا تھیں اور ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ سینے کے وسط میں سوراخ سے بہنے والا خون اس کے سفید ریشمی نائٹ گون کو تر کر چکا تھا۔ لمبے قد والا چند لمحوں تک لیڈل کی پیشانی پر سمٹ آنے والی شکنوں کو دیکھتا رہا۔ پھر کمبل لاش پر ڈالتے ہوئے بولا۔
''تم نے اپنا نام لیڈل بتایا تھا؟''
''پرائیویٹ سراغ رساں جونی لیڈل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جیب سے پیکٹ نکالا کر سگریٹ سلگایا اور کش لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہاں میں لیڈل ہوں، تم کون ہو؟''
استری سے بے نیاز نیلے سوٹ میں ملبوس لمبے قد والے نے پہلے اپنی ناک کو چٹکی سے مسلا اور پھر اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز نکلی۔ ''ہومی سائیڈ سے لیفٹیننٹ مورے، لیکن کیا میں اس وقت تمہاری آمد کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں۔''
''مس لورین، میری موکلہ تھی اور مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔''
لیفٹیننٹ کے ہونٹ سکڑ گئے۔ وہ چند لمحے لیڈل کی بات پر غور کرتا رہا۔ پھر جیب سے ایک چھوٹی سی ڈائری نکال کر اس پر کچھ لکھا اور لیڈل سے مخاطب ہوا۔ ''تو یہ تھی تمہارے یہاں آنے کی وجہ۔'' یہ کہہ کر اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر لیڈل کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم دیر تک کام کرنے کے عادی ہو۔''
''وہ کسی اہم معاملے پر بات کرنا چاہتی تھی۔ غالباً اسی لیے اس نے مجھے فوراً یہاں آنے کے لیے کہا۔''
''ایسی کیا اہم بات تھی جس کے لیے وہ صبح تک انتظار بھی نہیں کر سکتی تھی۔'' لیفٹیننٹ کہتے ہوئے پنسل کی نوک زبان سے تر کرنے لگا۔
''اس نے فون پر کوئی وضاحت نہیں کی تھی۔'' لیڈل کندھے اچکا کر رہ گیا۔
''شاید میں اس کی وضاحت کر سکوں کہ اس نے تمہیں یہاں کیوں بلایا تھا۔'' لیفٹیننٹ اسے اشارہ کرتا ہوا اس دروازے کی طرف بڑھ گیا جو مکان کے عقبی برآمدے میں کھلتا تھا۔
''ٹارچ روشن کرو ایل۔'' اس نے بارعب لہجے میں اپنے ایک ماتحت کو مخاطب کیا۔ لیڈل لیفٹیننٹ کے پیچھے چلتا ہوا دروازے سے نکل کر کھلی فضا میں پہنچ گیا، جہاں زمین پر ایک آدمی اوندھے منہ آڑا ترچھا پڑا ہوا تھا۔ پہلی نظر دیکھنے سے ہی یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ لیڈل لاش کے قریب جھک گیا اور منہ پر رکھا ہوا ہیٹ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ چہرے پر نظر پڑتے ہی دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔
''اسے جانتے ہو؟'' لیفٹیننٹ نے سوال کیا۔
''اس کا نام ٹیٹ مور ہے اور یہ میرا ایک ماتحت تھا۔'' لیڈل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ تمہارا یہ ماتحت اس وقت یہاں کیا کر رہا تھا، یا یہ سمجھ لیا جائے کہ رات گئے موکلوں سے ملاقات کرنا بھی تمہارے ادارے کے معمولات میں شامل ہے۔''
''ٹیٹ ...... مس لورین کی حفاظت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔'' لیڈل سیدھا کھڑا ہو کر لیفٹیننٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ ''کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ یہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''
''میں تو سمجھتا تھا کہ جس انداز سے تم دندناتے

ہوئے یہاں آئے ہو ہمیں بہت سی باتیں بتاسکوگے۔'' لیفٹیننٹ کے ہونٹوں پر بے معنی سی مسکراہٹ آگئی۔

''میں تو خود اندھیرے میں ہوں۔'' لیڈل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے سگریٹ کا کش لگایا لیکن بدمزدگی محسوس کرتے ہوئے سگریٹ زمین پر پھینک کر پیر سے مسل دیا اور لیفٹیننٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ممکن ہے مس لورین پر ہونے والے فائر کی آواز سن کر ٹیٹ اس طرف دوڑا ہو اور......''

''بات کو الجھانے کی کوشش مت کرو۔'' لیفٹیننٹ کے منہ سے ہلکی سے غراہٹ نکلی۔ لاش کا رخ دیکھ کر کوئی جاہل بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ مس لورین کی مدد کو پہنچنے کے لیے نہیں بلکہ مخالف سمت میں دوڑ رہا تھا۔'' اس نے کورٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر رومال میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا پستول نکالا اور لیڈل کو دکھاتے ہوئے بولا۔

''یہ پستول جس سے صرف ایک فائر کیا گیا ہے مس لورین کے ہاتھ کے قریب پڑا ہوا تھا، مجھے یقین ہے کہ تمہارے ماتحت کی پشت سے برآمد ہونے والی گولی اسی پستول کی ثابت ہوگی۔''

''احمقانہ بات ہے، کیا یہ سیدھی سادی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی کہ مس لورین اس شخص کو گولی کا نشانہ کیوں بنانے لگی جو اس کی حفاظت کر رہا تھا اور اگر میرے ماتحت کو اس نے مارا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مس لورین کے سینے میں گولی کس نے اتاری؟''

''تمہاری آدمی۔'' لیفٹیننٹ کے حلق سے غراہٹ سی نکلی پھر وہ اپنے ماتحت سے مخاطب ہوا۔ ''ایل اسے دکھاؤ شاید یہ کچھ سمجھ سکے۔''

ایل نے جیب سے کاغذ کی ایک تھیلی نکال کر اپنے ہاتھ پر الٹ دی، ہتھیلی پر چمکتے ہوئے پتھروں کو دیکھ کر لیڈل چونک گیا۔

''ہیروں کی یہ تھیلی ہمیں ٹیٹ کی لاش کے قریب پڑی ہوئی ملی تھی۔ غالباً گولی لگنے کے بعد جب وہ گرا تو تھیلی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی، یہ میرا اندازہ ہے جو کبھی غلط ثابت نہیں ہوسکتا۔'' لیفٹیننٹ کہتے ہوئے برآمدے کی طرف مڑ گیا۔

''تمہاری یہ قیاس آرائی حماقتوں کے پلندے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، کیا تمہاری کھوپڑی میں یہ بات نہیں آتی کہ اس واردات کو ایسا رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے جو بہت سطحی ہے اور معمولی عقل رکھنے والا ایک عام آدمی بھی اس کی تہ تک پہنچ سکتا ہے۔'' لیڈل نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا کسی کا ذہن اس بات کو قبول کرسکتا ہے کہ مس لورین نے ایک ہی فائر میں ٹیٹ کو نشانہ بنالیا ہوگا جبکہ خود اس کے سینے میں بھی گولی پیوست ہو۔ مس لورین کو جس جگہ گولی لگی ہے اس کے بعد وہ ایک سیکنڈ بھی زندہ نہیں رہی ہوگی۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ٹیٹ مس لورین سے پہلے ختم ہو چکا تھا۔''

''تمہارے خیال میں اگر یہ کسی اور کی حرکت ہے تو اسے یہ سارا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی۔'' لیفٹیننٹ مورے نے ناگوار لہجے میں کہا۔

''ہیرے، اس سے بڑی وجہ اور کیا ہوسکتی ہے۔''

''تب تو پھر وہ دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف ہوگا جو قتل کرنے کے بعد ہیرے وہیں پھینک گیا ہو، نہیں دوست تمہاری بات بے وزن ہے۔'' لیفٹیننٹ نے نفی میں سر ہلایا۔

''اور تمہاری بات اس سے بھی زیادہ بے معنی ہے، ٹیٹ انہی ہیروں کے لیے مس لورین کی حفاظت کر رہا تھا مس لورین کے پاس ایک لاکھ پچاس ہزار ڈالر سے زیادہ مالیت کے غیر تراشیدہ ہیرے موجود تھے۔ اگر ٹیٹ نے انہی ہیروں کے لیے اسے قتل کیا تھا تو باقی ہیرے کہاں گئے؟''

''یہ ایک نیا انکشاف ہے، میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔'' لیفٹیننٹ کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی

اور وہ اپنا نچلا ہونٹ چبانے لگا۔ لیڈل نے سگریٹ سلگایا اور ایک کش لگاتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں کیا معلوم ہے کہ مس لورین اپنے پیشے سے ریٹائر ہونے والی تھی۔“

لیفٹیننٹ مورے نے نفی میں سر ہلایا۔ اس دوران وہ لوگ دوبارہ کمرے میں پہنچ چکے تھے، دروازے کی گھنٹی بجنے کی آواز سن کر مورے نے اپنے ایک ماتحت کو اشارہ کیا پھر لیڈل کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔

”میں اسٹیج یا فلم سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ اخبارات کے توسط سے مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ اپنے پیشے کی سپر اسٹار سمجھی جاتی تھی۔“

”ہاں وہ اپنے دور کی سپر اسٹار رہی تھی۔ لیکن گزشتہ دو تین برسوں سے وہ اس طرز زندگی سے کچھ اکتا سی گئی تھی اور اس سال اس نے اپنے وطن واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تمہیں شاید معلوم ہو کہ وہ غیر ملکی تھی۔“

لیفٹیننٹ مورے جواب دینے کے بجائے معذرت کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا جہاں سے پستہ قامت ایک شخص بیگ اٹھائے اندر داخل ہو رہا تھا، وہ چند لمحے سرگوشیوں میں کچھ گفتگو کرتے رہے۔ پھر نووارد نے مس لورین کی لاش کے قریب پہنچ کر اس پر سے کمبل اتار دیا۔ اور جھک کر معائنہ کرنے لگا۔ لیفٹیننٹ پھر لیڈل کے قریب پہنچ گیا۔

”میڈیکل ایگزامیز“ اس نے نووارد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تعارف کرایا پھر اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ ”تو وہ اپنے ملک واپس جا رہی تھی، پھر۔“

”ہر چیز کو نقدی میں تبدیل کر رہی تھی۔“ لیڈل نے کش لگا کر دھواں اگلا اور سگریٹ کے سلگتے ہوئے سرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”کئی برس پہلے اس نے ہیرے جمع کرنے شروع کیے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح زیادہ بچت ہو سکے گی اور انہیں چھپانا بھی آسان ہوگا۔ اب ان ہیروں کو فروخت کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ہماری خدمات حاصل کی تھیں تاکہ جب تک سودا نہیں ہو جاتا اس کی اور ان ہیروں کی حفاظت کی جائے۔“ اس نے آخری کش لگا کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔

اسی دوران اسپتال کے دو آدمی اسٹریچر لیے ہوئے اندر داخل ہوئے، لیڈل گفتگو ادھوری چھوڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگا جو مس لورین کی لاش کو اسٹریچر پر منتقل کر رہے تھے۔

”مس لورین کا قاتل جو کوئی بھی ہے۔ اسے مس لورین کے پاس ہیروں کی موجودگی کا علم تھا اور اس نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے یہ واردات ٹیٹ نے کی تھی۔“

”ہو سکتا ہے۔“ لیفٹیننٹ نے پہلی مرتبہ اس سے اتفاق کیا۔

”کیا اس کے علاوہ تم کوئی اور اندازہ قائم کر سکتے ہو؟“ لیڈل نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اندازے تو بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن ضرورت ایسے ثبوت کی ہے جو ان میں سے کسی ایک کی تصدیق کر سکے۔ یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ تمہارے آدمی نے مس لورین کے قاتل کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ اسے بھی گولی مار کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ ہاتھا پائی میں ہیروں کی ایک تھیلی قاتل کی جیب سے گر گئی جبکہ باقی ہیرے اس کے پاس موجود رہے ہوں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ہیروں کے بارے میں کس کس کو علم تھا۔“ لیفٹیننٹ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ جیسے اس کے جواب کے جھوٹ یا سچ ہونے کا اندازہ لگانا چاہتا ہو۔ لیڈل کی پریشانی پر لکیریں ابھر آئیں۔ ہونٹ سکڑ گئے اور جبڑوں میں کھنچاؤ پیدا ہو گیا۔ وہ دانت بھینچتے ہوئے بولا۔

”سب سے پہلے تو میں مس لورین کے پرسنل منیجر مائیک مرفی کا نام لوں گا چونکہ ہیروں کا بیمہ نہیں

ہوا تھا۔ اس لیے اس نے مس لورین کو ہماری ایجنسی کی خدمات حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔“

”کوئی اور۔“

”لوئس آرمز۔“ لیڈل اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”ہیروں کی فروخت کے سلسلے میں اسی سے بات چیت چل رہی تھی۔“

”لوئس۔“ لیفٹیننٹ کی بھنویں سکڑ گئیں ”کوئی اور......“

”ان کے علاوہ میں کسی کو نہیں جانتا لیکن ممکن ہے مس لورین اور مرفی نے کسی اور سے بھی بات کی ہو۔“

”اس فہرست میں تمہارا اور ٹیٹ کا نام بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔“ لیفٹیننٹ نے اپنی پنسل سے اس کی جانب اشارہ کرتا ہوا بولا۔ ”کیا تم آج شام کے بعد اپنی مصروفیات کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟“

”میں گھر پر ہی تھا۔“

”کوئی ثبوت یا شہادت۔“

”کوئی نہیں، اتفاق سے کوئی ملاقاتی بھی نہیں آیا۔“

”لیکن بقول تمہارے تم نے مس لورین کی فون کال ریسیو کی تھی جس نے تمہیں فوراً یہاں آنے کی ہدایت کی تھی۔“

”ہاں یہ درست ہے۔“ لیڈل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیفٹیننٹ اسے گھورتا ہوا کمرے کے کونے میں میز کے قریب چلا گیا، جس پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا، وہ فون کا ریسیو اٹھا کر لیڈل کی طرف گھوم گیا۔ ”جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ اس علاقے میں ٹیلی فون کا ڈائریکٹ ڈائلنگ سسٹم نہیں ہے۔ آپریٹر کی مداخلت کے بغیر کوئی بھی نمبر نہیں ملایا جاسکتا۔ گویا آپریٹر شہادت دے سکتا ہے کہ کسی نمبر پر کوئی کال کی گئی تھی یا نہیں، اس سسٹم کے تحت ریسیو اٹھانے سے خود بخود ایکسچینج سے رابطہ قائم ہوجاتا ہے۔“ وہ فون کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ”ہیلو میں ہومی سائیڈ سے لیفٹیننٹ مورے بول رہا ہوں کیا تم بتا سکتے ہو تقریباً ایک گھنٹے پہلے مس لورین نے یہاں سے نیویارک کوئی کال کی تھی...... نمبر......“ وہ خاموش ہوکر سوالیہ نگاہوں سے لیڈل کی طرف دیکھنے لگا۔ لیڈل نے اپنا نمبر بتایا لیفٹیننٹ نے آپریٹر کو وہ نمبر دیا اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر جواب کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً ایک منٹ کی خاموشی کے بعد بولا۔

”کیا تمہیں یقین ہے؟“ وہ ریسیور کھ کر لیڈل کی طرف متوجہ ہوگیا اور بھنویں اچکاتے ہوئے بولا۔ ”اس فون سے نیویارک کے کسی نمبر پر بات نہیں کی گئی۔“

”ممکن ہے مجھے یہ کال کسی اور فون سے کی گئی ہو۔“ لیڈل نے کہا۔

”اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ تمہیں سرے سے کوئی کال ہی نہ کی گئی ہو۔“ لیفٹیننٹ نے اسے گھورا۔

”شاید تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں خود یہاں آیا تھا تاکہ ٹیٹ کی مدد سے مس لورین کے ہیرے ہتھیا سکوں، ایسی صورت میں باقی ہیرے کہاں گئے؟“

”اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ تم اس سے پہلے بھی یہاں آچکے ہو، عین اس وقت جب تمہارا ماتحت مس لورین کو گولی مارنے کے بعد ہیرے لے کر فرار ہو رہا تھا یا ممکن ہے تم اس وقت یہاں پہنچے ہو جب ٹ یٹ بھی ختم ہو چکا تھا، اندھیرے میں جتنے ہیرے تمہارے آئے تم لے کر واپس شہر پہنچ گئے اور انہیں ٹھکانے لگانے کے بعد دوبارہ یہاں آگئے تاکہ ہمیں ایک دلچسپ کہانی سنا سکو۔“

”تمہاری منطق بھی نرالی ہے۔“

”میری منطق نرالی ہی سہی، لیکن تم اس کے جواب میں کیا کہو گے؟“

”میرا جواب یہ ہے کہ میں بہت جلد اصل قاتل کو پلیٹ میں سجا کر تمہارے سامنے پیش کردوں گا تاکہ میرے بارے میں تمہارے شبہات رفع ہوسکیں۔“

”کیا اس سے زیادہ آسان یہ نہ ہوگا کہ تمہیں آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا جائے۔“

”کس جرم میں ...... کوئی بھی عدالت محض تمہارے احمقانہ اندازوں کی بناء پر کسی کو مجرم قرار نہیں دے سکتی، میں جا رہا ہوں، اگر میری ضرورت ہو تو مجھ سے رابطہ قائم کر لینا۔“ لیڈل کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ہیکسمین پیلس پر واقع اس شاندار عمارت کی لابی میں دیوار سے دیوار تک دبیز قالین بچھے ہوئے تھے، اندر داخل ہوتے ہی لیڈل کی نظریں استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف اٹھ گئیں، جہاں ادھیڑ عمر کا ایک شخص بیٹھا اکتاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ لیڈل کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ آ گئی۔

”فرمائیے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”میرا نام جونی لیڈل ہے، مرفی سے ملنا چاہتا ہوں اسے اطلاع کر دو۔“ لیڈل نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”کیوں نہیں، ایک منٹ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔“ استقبالیہ کلرک نے سفید دانتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور اپنے سامنے نصب ایک چھوٹے سے سوئچ بورڈ پر سلسلہ ملانے لگا۔ اس دوران لیڈل گہری نظروں سے لابی کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ عمارت دراصل ایک اپارٹمنٹ ہاؤس تھی اور مس لورین کے پرسنل منیجر مائیک مرفی کی رہائش بھی اسی عمارت کے ایک اپارٹمنٹ میں تھی استقبالیہ کلرک سلسلہ ملانے کے بعد چند سیکنڈ تک کسی سے گفتگو کرتا رہا، پھر پلگ نکالتے ہوئے لیڈل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”آپ کی آمد اگرچہ بے وقت ہے، لیکن وہ ملاقات کے لیے تیار ہے۔ پینٹ ہاؤس کی طرف تشریف لے جائیں۔“

لیڈل جواب دینے کے بجائے لابی کے آخری حصے کی طرف بڑھ گیا، جہاں لفٹس لگی ہوئی تھیں، ایک لفٹ کے دروازے پر پینٹ ہاؤس کا نام لکھا ہوا تھا۔ لیڈل نے اندر داخل ہو کر بٹن دبا دیا۔ ایک غیر محسوس جھٹکا لگا اور لفٹ اوپر اٹھنے لگی، لفٹ رکنے کا احساس اس وقت ہوا جب آٹومیٹک دروازہ خاموشی سے کھل گیا۔ لفٹ سے باہر آ کر لیڈل مختصر سا ہال عبور کرتا ہوا دروازے کے سامنے رک گیا۔ اور تین مرتبہ بزر کا بٹن دبا دیا، چند سیکنڈ کے بعد اندر سے چابی گھومنے کی آواز سنائی دی اور دروازہ کھل گیا، مرفی سامنے ہی کھڑا تھا، اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس نصف سے زیادہ خالی ہو چکا تھا۔ وہ لانبے قد اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ سر کے بال گھنے اور گھنگریالے تھے، چہرے پر جا بجا لپ اسٹک کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ آنکھوں میں بہت خفیف سا بھینگا پن تھا جسے بغور دیکھنے سے ہی محسوس کیا جا سکتا تھا۔

”آؤ اندر آ جاؤ۔“ اس نے لیڈل کو اشارہ کیا پھر اندرونی دروازے کی طرف رخ کر کے قدرے اونچی آواز میں بولا۔

”تم بھی آ جاؤ ڈارلنگ یہ لیڈل ہے اپنا دوست۔“

اندرونی دروازہ کھلا اور ایک دراز قامت خوب صورت عورت سامنے آ گئی۔ سرخ بال بے ترتیبی سے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، جسم پر نیلے رنگ کا گون جو اس امر کی شہادت دے رہا تھا کہ اس کے نیچے اس نے کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا، وہ مٹکتی ہوئی آگے آ گئی۔

”یہ کلیسر ایڈن ہے۔“ مرفی نے تعارف کرایا۔ ”اور یہ عظیم سراغ رساں جونی لیڈل۔“

”اگر تم پہلے آ جاتے تو ایک زبردست قسم کی پارٹی سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔“ ایڈن نے کہا اس کی آواز قدرے لڑکھڑا رہی تھی،

”تمہیں اپنی مدد آپ کرنا ہوگی لیڈل، میں شاید آسانی سے وہاں تک نہ پہنچ سکوں۔ مرفی نے ایک چھوٹے سے بار کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا جس پر رکھی ہوئی خالی بوتلیں اور گلاس ایڈن کے اس بیان کی تصدیق کر رہے تھے کہ کچھ دیر پہلے یہاں ایک زبردست قسم کی پارٹی منعقد کی گئی تھی۔

لیڈل بار کاؤنٹر کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے

ایک گلاس میں برف کے چند ٹکڑے ڈالے اور اس میں چند گھونٹ شراب بھری پھر گلاس ہلاتا ہوا مرفی کی طرف گھوم گیا۔

"تم نے آخری بار مس لورین کو کب دیکھا تھا۔"

اس کے اس غیر متوقع سوال سے مرفی کی بھنویں تن گئیں۔

"آج شام جب میں ہیرے اس کے پاس لے کر گیا تھا۔ اس نے بڑا سا ایک گھونٹ بھرا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارا وہ ماتحت کیسا جا رہا ہے۔ اگر وہ ذہانت سے کام لے تو خوب صورت لورین اس کی آغوش گرم......"

"ٹیٹ مر چکا ہے اور لورین بھی اب اس دنیا میں نہیں رہی۔" لیڈل نے کہتے ہوئے پہلے گلاس میں شراب کو سونگھا اور پھر گھونٹ بھرا، خوشبو کی طرح وہ ذائقے میں بھی لاجواب تھی۔

"کیا کہہ رہے ہو، کیسے مر گئے؟" مرفی کا چہرہ دھواں ہو گیا اور وہ متوحش نگاہوں سے لیڈل کی طرف دیکھنے لگا۔

"انہیں قتل کیا گیا ہے۔ ہیرے بھی غائب ہیں میرا خیال ہے یہ ڈکیتی کی واردات تھی۔"

"ایک منٹ۔" مرفی نے کہا اور گلاس میز پر رکھ کر باتھ روم میں گھس گیا، چند سیکنڈ تک اندر پانی گرنے کی آواز سنائی دیتی رہی اور جب وہ باہر نکلا تو اس کی آنکھوں سے شراب کا خمار کسی حد تک کم ہو چکا تھا۔ "یہ واقعہ کب پیش آیا۔" اس نے حواس مجتمع کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرے اندازے کے مطابق تقریباً ایک بجے اس نے مجھے فون کیا تھا، مگر بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ریسیور پر فائر کی آواز سنائی دی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو پولیس مجھ سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔" لیڈل نے بچی ہوئی شراب حلق میں انڈیلی اور گلاس کاؤنٹر پر رکھ کر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"پولیس کے خیال کے مطابق یہ کیسی بھیدی کا کام ہے۔" "مس لورین کے پاس ہیروں کی موجودگی سے کتنے لوگ واقف تھے۔"

"میرے علاوہ لوئس آرمز کو بھی علم تھا کیونکہ ہیروں کی فروخت کے سلسلے میں اس سے بات چل رہی تھی۔"

"تم نے کسی اور سے تو اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا؟" لیڈل نے کہتے ہوئے کن انکھیوں سے ایڈن کی طرف دیکھا۔

"بالکل نہیں میں نے تو ایڈن کو بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے غلط تو نہیں کہا ڈارلنگ۔" مرفی تائید طلب نگاہوں سے ایڈن کی طرف دیکھنے لگا، ایڈن نے کوچ پر بیٹھے بیٹھے اس طرح پہلو بدلا کہ گون اوپر سمٹ گیا۔

"میں تو ابھی تک یہ بھی نہیں سمجھ سکی کہ تم لوگ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔" وہ لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "بہرحال مجھے اس سے کوئی غرض بھی نہیں ہے۔ میں تو یہاں پارٹی سے لطف اندوز ہونے کے لیے آئی تھی، کسی کاروباری گفتگو میں الجھنے کے لیے نہیں۔"

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ ہیروں کا بیمہ بھی نہیں ہوا تھا۔" مرفی بالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ "کیا پولیس کو ہیروں کے بارے میں علم ہو چکا ہے؟"

"ہاں۔" لیڈل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اب پولیس کی طرف سے بھی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ لوگ یقیناً یہ جاننا چاہیں گے کہ ہیرے خریدنے کے لیے اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی تھی اور اسے ڈکلیئر کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ کاش لورین میری بات پر کان دھرنے کو تیار ہو جاتی تو......"

"میں نے تو تمہاری بات پر کان دھرے تھے۔" ایڈین مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن مجھے تو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ شاید لورین مجھ سے بھی زیادہ ہوشیار تھی بہرحال......"

''نہیں۔'' مرفی نے اسے جملہ مکمل کرنے نہیں دیا۔ ''تم اس لحاظ سے لورین سے بہتر ہو کہ زندہ ہو۔''
وہ لیڈل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''مجھے لوئس شبہ ہے۔''
''لوئس پر۔'' لیڈل نے مزید شراب گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''تم لورین کے پاس ہیرے لے کر کب گئے تھے؟''
''ساڑھے دس بجے، ممکن ہے گیارہ بجے کا وقت رہا ہو، کیونکہ وہاں سے واپسی پر جب میں ایڈن کو لینے کے لیے تھیٹر کے دروازے پر پہنچا تو یہ شو سے فارغ ہو کر باہر آرہی تھی، یہ ان دنوں ڈرامے میں کام کر رہی ہے۔'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر ایڈن کی طرف متوجہ ہو گیا جو لیڈل کی طرف گلاس بڑھاتے ہوئے اس میں شراب انڈیلنے کا شارہ کر رہی تھی۔
''اتنی زیادہ مت چڑھاؤ کہ حواس کھو بیٹھو، ممکن ہے پولیس تحقیقات کے سلسلے میں یہاں پہنچنے ہی والی ہو۔''
''اگر پولیس آ بھی گئی تو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے میں اٹھارہ سال سے اوپر ہوں، اس کا تخاطب تو اگرچہ مرفی کی طرف تھا مگر نظریں لیڈل کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ جو گلاس میں مزید شراب انڈیل کر اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔
''گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ تم بارہ بجے کے لگ بھگ یہاں پہنچے ہو۔'' لیڈل مرفی کی طرف متوجہ ہو گیا۔
''ہاں یہی سمجھ لو۔''
''اور اس کے بعد باہر نہیں گئے۔''
''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جب یہ واقعی پیش آیا تو میں مس لورین کے مکان کے آس پاس ہی کہیں موجود تھا اور یہ کہ اس میں میرا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔ مرفی نے تیوری چڑھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
''تیور دکھانے کی ضرورت نہیں۔'' لیڈل ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''صرف چار پانچ افراد ایسے ہیں جو آج رات لورین کے پاس ہیروں کی موجودگی سے آگاہ تھے۔ میں اگرچہ تمہیں کوئی الزام نہیں دے رہا، لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ شبہ تحقیقات کی پہلی سیڑھی ہوتا ہے، اس کے بغیر تحقیقات کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی، میرا خیال ہے کہ اب میرے کسی سوال پر تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''
''لیکن میں اس چیز کو پسند نہیں کرتا۔'' مرفی نے ناگوار لہجے میں جواب دیا جیسے اسے یہ بات بہت بری لگی ہو۔
''یہاں پسند یا ناپسند کی کوئی گنجائش نہیں، ٹیٹ کو بھی مرنا پسند نہیں رہا ہوگا۔ لیکن اپنی پسند کے برخلاف اسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔
''بہرحال میں گھر آنے کے بعد دوبارہ یہاں سے باہر نہیں گیا۔''
''کیا اس کا ثبوت پیش کر سکتے ہو؟''
''اگر ضروری ہوا تو ضرور ایسا کروں گا۔''
''یہ تو بہت ضروری ہے۔''
مرفی چند لمحوں تک اسے گھورتا رہا۔ پھر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''ہم دونوں کے علاوہ یہاں آٹھ دس افراد اور بھی تھے۔ ڈرامے میں کام کرنے والی تین چار لڑکیاں اپنے دوستوں کو بھی لے آئی تھیں، ہماری یہ پارٹی تقریباً آدھے گھنٹے پہلے ختم ہوئی ہے۔ میں نے غلط تو نہیں کہا ایڈن۔'' اس نے تائید طلب نگاہوں سے ایڈن کی طرف دیکھا۔
''یہ درست ہے۔ اسٹیج شو ختم ہونے کے بعد ہم سیدھے یہاں آئے تھے اور اس وقت سے ہم میں سے کوئی ایک منٹ کے لیے بھی یہاں سے باہر نہیں گیا۔'' ایڈن نے اس کی تائید کی۔
''ٹھیک ہے فی الحال میں اتنا ہی جاننا چاہتا تھا۔'' لیڈل نے آخری گھونٹ بھرتے ہوئے گلاس میز پر رکھ دیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی، مرفی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا فون کی طرف بڑھ گیا۔
وہ ریسیور اٹھا کر کچھ دیر تک کسی سے باتیں کرتا رہا۔ پھر ماؤتھ پیس کر لیڈل سے مخاطب ہوا۔ ''پولیس! وہ لورین کی شناخت کے لیے مجھے بلا رہے

ہیں۔‘‘ اس نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ اٹھا کر کچھ باتیں کیں اور ریسیور رکھ دیا اور ہاتھ کی پشت سے بالائی ہونٹ پر آنے والا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔ ’’میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے پولیس سے پہلے یہ خبر مجھے پہنچادی۔ بہر حال اب کچھ اور تو نہیں پوچھنا میں وہاں جارہا ہوں۔‘‘

’’صرف ایک بات۔‘‘ لیڈل نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ’’کیا ان ہیروں کی شناخت ہوسکتی ہے۔‘‘

’’نہیں مرفی نے نفی میں سر ہلایا۔‘‘ وہ کسی ریکارڈ میں شامل نہیں تھے، غیر قانونی طور پر خریدے گئے تھے، کسی احمق نے مشورہ دیا تھا کہ انہیں فروخت کرنا زیادہ آسان نہیں ہوگا اور حکومت بھی ان کا کوئی سراغ لگاسکتی۔‘‘ اس نے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور اسے شعلہ دکھانے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لوئس بھی انہیں خریدنے میں دلچسپی لے رہا تھا اس کے خیال میں یہ ایک نفع بخش سودا ہوتا۔‘‘

’’کیا لوئس کو معلوم ہے کہ تم نے لورین کی حفاظت کے لیے ہماری ایجنسی کی خدمات حاصل کی تھیں۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ مرفی کی آنکھوں میں بے چینی کی لہر سی پھیل گئی۔ ’’مجھے خدشہ تھا کہ اگر اس کے کان میں اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ سودا منسوخ کردے گا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ یہ معاملہ راز ہی میں رہے۔ مجھے لورین اور خود اس کے سوا کسی کو اس کا علم نہ ہو۔‘‘

’’کیا تم نے کبھی اس بات کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔‘‘

’’کیا مطلب، کیا کہنا چاہتے ہو؟‘‘ مرفی سے اسے گھورا۔

’’فرض کرو تمہیں اور لورین کو کچھ ہوجاتا تو کوئی بھی یہ نہیں جان سکے گا کہ لورین کے پاس ڈیڑھ لاکھ کی مالیت کے ہیرے موجود تھے کیا ایسی صورت میں کوئی رقم خرچ کیے بغیر ہیرے لوئس کے قبضے میں نہ چلے جائیں گے۔

مرفی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سگریٹ اس کے ہونٹوں سے چھوٹ کر نیچے گر گیا، ’’کیا تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ لوئس ہم دونوں کو قتل کرنا چاہتا تھا؟‘‘

’’میرا مطلب یہی تھا۔‘‘ لیڈل نے کہتے ہوئے آگے بڑھ کر فرش پر پڑا ہوا سگریٹ اٹھا کر ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ’’ممکن ہے قاتل نے ٹیٹ کو یہ سمجھ کر گولی ماردی ہو کہ وہ تم تھے، اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ لوئس اس وقت یہ سوچ کر محفوظ ہورہا ہو کہ جن دو آدمیوں کو اس سودے کا علم تھا وہ موت کے منہ میں پہنچ چکے ہیں اور اب کوئی اس کی طرف انگلی اٹھانے والا نہیں رہا۔ وہ ہر لحاظ سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہا ہوگا۔‘‘

’’لیکن جب اسے حقیقت کا علم ہوگا تو۔‘‘ مرفی ہیجان سا ہو کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔

’’ایسی صورت میں وہ اپنی غلطی درست کرنے کی کوشش کرے گا لیکن ممکن ہے اس وقت تک وہ کوئی اور غلطی کر بیٹھے گا جس سے ہمیں اسے گرفت میں لینے کا موقع مل جائے گا۔‘‘ لیڈل سیٹ پر سر جماتے ہوئے بولا۔

’’میں اس وقت لوئس کی طرف جارہا ہوں ہوسکتا ہے اسے تمہارے زندہ ہونے کا علم ہونے سے پہلے میں اس سے کچھ اگلوانے میں کامیاب ہوجاؤں۔‘‘

لیڈل نے ایڈن کی طرف دیکھا جو صوفے پر نیم دراز ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ دروازے سے باہر جاچکا تھا۔

☆☆☆

لانگ آئی لینڈ کے علاقے میں واقع نائٹ کلب کی عمارت تو اتنی بڑی نہیں تھی لیکن اس سے متعلقہ رقبہ چاروں طرف کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا، عام طور پر یہاں شام کا اندھیرا پھیلنے سے لے کر صبح

پو پھٹنے تک عیش ونشاط کی محفلیں جمی رہتی تھیں لیکن آج تاریکی میں ڈوبی ہوئی اس عمارت پر سکوت طاری تھا۔ لیڈل نے کار عمارت سے تقریباً سو گز دور ایک درخت کے نیچے روک دی اور نیچے اتر کر عمارت کے عقبی دروازے کی طرف بڑھنے لگا کیونکہ کلب کے مالک لوئس کا پرائیویٹ دفتر اسی طرف تھا۔ دستک دینے کے چند سیکنڈ بعد دروازہ کھل گیا، لوئس کے اس ملازم کا چہرہ اگرچہ لیڈل کے لیے اجنبی ہی تھا لیکن تعارف کراتے ہی اس نے اندر آنے کا راستہ چھوڑ دیا۔ لیکن لیڈل جیسے ہی اندر داخل ہوا اس کے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ایک ریوالور کی نال اس کی پسلیوں کو چھو رہی تھی، لیڈل نے مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔ دروازہ کھولنے والے نے مزید پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اسے نہتا کر دیا۔

"باس تمہارا منتظر ہے۔ تمہیں دفتر کا راستہ تو معلوم ہی ہوگا۔ آگے بڑھتے رہو۔" ریوالور بردار کے لہجے میں تحکم نمایاں تھا۔

لیڈل راہداری میں چلتا ہوا اس دروازے کے سامنے رک گیا جس پر پرائیویٹ کی تختی آویزاں تھی، ریوالور بردار نے ہلکی سی دستک دے کر دروازے کو دھکا دے کر کھول دیا۔ سامنے ہی آرام چیئر پر لوئس نیم دراز تھا اس نے لیڈل کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا ریوالور بردار نے لیڈل کو کمرے کے وسط میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔

"ہیلو لیڈل، معلوم ہوتا ہے کہ تم راتوں کو بھی کام کرنے کے عادی ہو۔" لوئس نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ سر کے بالوں میں سفیدی کے علاوہ چہرے پر ایک آدھ جھری بھی نظر آرہی تھی۔ بات کرتے ہوئے لہجے میں نرمی اور ہونٹوں پر اگرچہ خفیف مسکراہٹ تھی لیکن آنکھوں میں سرد مہری نمایاں تھی۔

"میں مرفی کے بارے میں تم سے کچھ بات کرنے آیا ہوں۔" لیڈل نے یہ بات اس انداز میں کہی تھی کہ مرفی کے زندہ یا مردہ ہونے کے بارے میں کوئی وضاحت نہ ہو سکے۔

"آہ مرفی۔" لوئس نے ایک سگریٹ ہونٹوں سے لگا کر سلگاتے ہوئے کہا۔ "وہ ہیروں کے چکر میں بری طرح پھنس چکا ہے۔"

"یہ اس کا دردِ سر ہے۔" لیڈل نے کندھے اچکائے۔

"نہیں، اس میں تمہارا بھی کچھ حصہ ہے۔ مرفی پولیس کو یہ بیان دینے والا ہے کہ مجھ سے ہیروں کے سودے کی کہانی تم نے گھڑی تھی جبکہ اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے، تقریباً ایک گھنٹے پہلے لیفٹیننٹ نے مجھے فون کیا تھا اسے بھی میں نے یہی جواب دیا تھا کہ میں ان باتوں سے قطعی لاعلم ہوں۔"

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہاری مرضی کے مطابق چلوں گا۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھو کہ میرا ایک آدمی مارا جا چکا ہے اور میں اس کی موت کو آسانی سے فراموش نہیں کر سکوں گا۔"

لوئس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا۔ "میں تمہارے بارے میں سن چکا ہوں کہ تم بہت ضدی اور سخت ہو، لیکن شاید مجھے پوری طرح نہیں جانتے میں ایسے کسی معاملے میں ملوث ہونا پسند نہیں کرتا جس سے میری نیک نامی پر حرف آنے کا امکان ہو سمجھے؟"

"کیا مطلب؟" لیڈل نے اسے گھورا۔

"مطلب یہ کہ اگر مس لورین کے گھر میں کوئی ہیرے موجود تھے تو وہ تم نے غائب کر دیے ہیں۔ تمہارے اور ٹیٹ کے علاوہ صرف تین افراد ایسے تھے جو ہیروں کے وجود سے آگاہ تھے۔ لورین مر چکی ہے۔ مرفی رات بھر ایک عورت کے حسن وشباب میں مست رہا اور ایک لمحے کو بھی اپنے مکان سے باہر نہیں نکلا اور میں اپنے بارے میں خوب جانتا ہوں، اب تم رہ جاتے ہو اور ظاہر ہے ہیرے تمہارے سوا کون اڑا سکتا ہے۔"

"یہ تو تمہاری سوچ ہے لوئس، لیکن میرا نظریہ اس کے برعکس ہے، لورین اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔ مرفی کے پاس جائے واردات سے عدم

موجودگی کی ٹھوس شہادت موجود ہے اور میں اپنے ایک ایک منٹ کے حساب سے واقف ہوں۔ اب صرف تم رہ جاتے ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہیں کس طرح گرفت میں لیا جاسکتا ہے۔" لیڈل نے جواب دیا اس کے پیچھے کھڑے ہوئے ریوالور بردار نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھمالیا، وہ قد میں اگرچہ لیڈل سے قدرے چھوٹا تھا لیکن بازو پر اس کی گرفت مضبوط تھی، وہ درشت لہجے میں بولا۔

"میرا باس یہ پسند نہیں کرتا کہ تم جیسے آدمی اس کے سامنے اونچی آواز میں بات کریں آئندہ محتاط رہنا۔"

لیڈل کی نظریں اس کے چہرے سے ہوتی ہوئی ریوالور پر پہنچ گئیں۔

"تم جیسے چوہوں کا مقابلہ میں اس کے بغیر بھی کرسکتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس محافظ نے ریوالور لوئس کی طرف اچھال دیا۔ پھر اس محافظ اور لیڈل کے درمیان ایک مقابلہ ہوا جس میں لیڈل کا پلہ بھاری رہا اور محافظ بے ہوش ہوگیا۔

"پیکر تمہیں نہیں بخشے گا۔ اس نے نیوی میں کچھ اور فن بھی سیکھے تھے جو جوڈو سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔"

"تم تو مجھے ابھی سے خوف زدہ کررہے ہو۔"

لیڈل لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا لوئس کے سامنے پہنچ گیا۔

"اگر تم مجھے ختم کرنا چاہتے ہو تو ابھی گولی چلاؤ ورنہ یہاں سے نکلنے کے بعد میرا ایک ایک لمحہ تمہارے خلاف لورین کے قتل کا ثبوت فراہم کرنے میں مصروف ہوگا۔"

لوئس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا، ریوالور کے ٹرائیگر پر رکھی ہوئی انگلی میں ایک لمحے کو تناؤ سا پیدا ہوا لیکن اس کے بعد اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور ہونٹوں پر پھر وہی مسکراہٹ آگئی۔

"مطمئن رہو میں اپنے قیمتی قالین کو تمہارے گندے خون سے داغ دار نہیں کرنا پسند نہیں کروں گا۔ زندگی میں بہت سے مقام آئیں گے جہاں ہمارا سامنا ہوگا۔ لیکن اب تم مجھ سے محتاط رہنا۔ کہیں بے خبری میں نہ مارے جاؤ۔"

لیڈل مڑ کر بے ہوش محافظ کے پاس پہنچا اور اس کے لباس سے اپنا ریوالور نکال کر اپنے ہولسٹر میں رکھ لیا اور لوئس کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔

"ٹھیک ہے لوئس ...... مرفی پولیس سے الجھنا پسند نہیں کرے گا اور ظاہر ہے اس کا بیان تمہاری ہی مرضی کے مطابق ہوگا۔ لیکن میری بات یاد رکھنا کہ بعض اوقات ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی بھی انسان کو لے ڈوبتی ہے۔"

"میری زندگی جوا کھیلتے ہوئے گزری ہے میں جانتا ہوں کہ کس وقت کون سی چال چلنی چاہیے۔ لوئس نے جواب دیا اور لیڈل اسے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔

لیڈل نے تمام تحقیقات جاری رکھی تھیں اسی دوران ایک قتل ہوگیا جو ایڈن کا تھا۔ بڑی بے دردی سے اسے اس کے فلیٹ پر قتل کردیا گیا تھا۔ بہرحال لیڈل نے مرفی سے اس کی رہائش پر ملاقات کی اور اسے تمام حقائق بیان کرتے ہوئے مجرم ثابت کردیا تھا، اس نے تمام کڑیاں ملائی تھیں کہ مرفی نے پہلے لورین کو نقلی ہیرے خرید کردیئے تھے اس طرح اس نے پہلے ہی لورین کو لوٹ لیا تھا۔ اس کے بعد جب ہیروں کی فروخت کا وقت آیا تو مرفی نے سوچا کہ اب اس کا پول کھل جائے گا چنانچہ اس نے لورین کے ساتھ ساتھ ٹیٹ کو بھی قتل کردیا۔ اس کے بعد اپنی محبوبہ ایڈن سے لیڈل کو فون کروایا تاکہ لیڈل وہاں پہنچے اور پولیس اسے دہرے قتل کے الزام میں گرفتار کرلے لیکن یہیں اس سے غلطی ہوئی۔ لیڈل ایک ذہین سراغ رساں تھا اس نے پولیس کو تمام حقیقت بیان کردی بلکہ اس کی تمام تحقیقات کیں اور ایڈن کے قتل کا بھی سراغ لگالیا۔ لورین کے قتل سے پہلے جو فون کرایا گیا تھا وہ دراصل مرفی کی محبوبہ ایڈن نے کیا تھا جس کا تمام ریکارڈ نکلوالیا گیا تھا۔ بہرحال مرفی کو گرفتار کرتے وقت لیڈل نے اسے بہت بری طرح مارا تھا۔ ظاہر ہے قانون کی حد میں رہتے ہوئے مرفی سے ٹیٹ کا انتقام بھی تو لینا تھا۔

☆☆

مهرباں

راحت جہاں

ہمارے معاشرے میں لوگ اپنے خون کے رشتوں کو اپنے مفاد کے لیے کس کس طرح ختم کردیتے ہیں اس کا اندازہ زیر نظر کہانی سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ایک معصوم دوشیزہ کا قصہ، اسے ایک حادثے میں اپنے ماں باپ کے قتل ہونے کی خبر ملی تو اس پر قیامت گزر گئی۔ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ یہ عمل اس کے اپنے ہی رشتہ داروں نے انجام دیا۔

خود غرض رشتوں کو بے نقاب کرتی ایک تلخ حقیقت



میرے والد شجاعت حسین کا شمار شہر کے اہم تاجروں میں ہوتا تھا۔ وہ گروپ آف انڈسٹریز کے مالک تھے۔ میرے والد کو یہ کاروبار، دولت، جائداد ورثے میں نہیں ملی تھی۔ انہوں نے یہ سب کچھ اپنے قوت بازو سے حاصل کیا تھا، بچپن ہی سے انہیں محنت کرنے کا جنون تھا۔ وہ صرف دو بھائی تھے۔ چچا وجاہت ان سے چھوٹے تھے۔ انہوں نے زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ پھر بھی ابو نے انہیں اپنی فرم میں منیجر کا عہدہ دے رکھا تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی اکھڑ مزاج تھے۔ اس لیے ملازمین بھی ان سے تنگ رہتے۔ چچا کی شادی بھی ابو نے کرائی تھی۔ ان کے تین بچے تھے۔ بڑا بیٹا نعمان اور اس سے چھوٹی حرا اور سحر۔ میری والدہ چونکہ ایک سیدھی سادی خاتون تھیں لہٰذا انہیں کبھی بھی چچا چچی کے ساتھ رہنے پر اعتراض نہ ہوا بلکہ وہ تو انہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھتی تھیں، چچا خود اعلا تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے کبھی بھی تعلیم کو اہمیت نہیں دی۔ ان کے بچے بھی ان کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ حرا اور سحر نے میٹرک کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا جبکہ نعمان نے بڑی مشکلوں سے انٹر کیا تھا اور اب وہ جاب کی تلاش میں تھا۔ ابو نے اسے جاب کی آفر کی تھی لیکن اس نے حقارت سے یہ کہہ کر آفر کو ٹھکرا دیا تھا کہ ”میں ابو کی طرح ساری زندگی آپ کے آفس میں ایک ہی پوسٹ پر گزارا نہیں سکتا۔ میں تو اپنا الگ بزنس کرنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن بیٹے!“ ابو نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔ ”بزنس کے لیے تمہیں محنت کرنا پڑے گی۔ پہلے تم اپنی تعلیم مکمل کرلو۔ میری خواہش ہے کہ تم ایم بی اے کرلو پھر میں خود تمہیں سرمایہ فراہم کروں گا۔“

”مجھے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ آپ اپنی خواہشات علیشا سے پوری کروائیں۔ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں، یہ میں آپ سے بہتر جانتا ہوں۔“ نعمان نے گستاخانہ انداز میں کہا اور باہر نکل گیا۔ ابو حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

انٹر پری میڈیکل کا رزلٹ آیا تھا۔ میں نے پچاسی فیصد نمبرز حاصل کیے تھے۔ خوشی سے میرے قدم زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ میری شدید خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ جب میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار پاپا کے سامنے کیا تو انہیں بھی خوشی ہوئی۔ لیکن امی میرے ہاسٹل میں رہنے کے خلاف تھیں۔ پاپا اور میں نے مل کر امی کو بڑی مشکلوں سے راضی کیا اور میں اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے گھر سے ہاسٹل شفٹ ہوگئی۔ یہاں میری ملاقات مشعل سے ہوئی۔ مشعل خان آفریدی سرحدی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اس کے والد اپنے علاقے کے سردار تھے۔ کئی پشتوں سے اس کا خاندان اس علاقے میں حکمرانی کر رہا تھا۔ مشعل اپنے والد کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اسے بڑے شہر یار، شہباز اور حماد تھے۔ وہ دونوں شادی شدہ تھے۔ مشعل کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا اور ڈاکٹر بننا تو اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ بقول مشعل اگر حماد بھائی اس کا ساتھ نہ دیتے تو وہ شاید کبھی میڈیکل کالج تو کیا اسکول تک بھی نہ پہنچتی۔ حماد ایک لبرل، مائنڈڈ انسان تھا یا پھر بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے وہ اپنے والد اور بھائیوں سے جدا سوچ کا مالک بن گیا تھا۔

ان دنوں ہمارے میڈیکل سال اول کے ایگزام ختم ہوئے تھے۔ ہم بہت خوش تھے کیونکہ ہمارے پیپرز توقعات سے زیادہ اچھے ہوئے تھے۔ میں جب ویک اینڈ پر گھر جانے لگی تو مشعل بھی میرے ساتھ ہولی۔ میں نے اسے امی، پاپا سے ملایا۔ امی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور ہاسٹل کی زندگی کے بارے میں جو خدشات انہیں اکثر لگے رہتے تھے، ان میں کچھ کمی آگئی۔ مشعل نے پاپا سے اجازت لی کہ اگلی چھٹیوں پر وہ مجھے اپنے گاؤں لے جائے گی۔ پاپا نے ہنستے ہوئے اجازت دے دی کیونکہ انہیں مجھ پر مکمل بھروسا تھا۔ پھر ہم ہاسٹل لوٹ آئے۔

رات کے تقریباً نو بج رہے تھے اور میں مشعل

تھوڑی دیر پہلے اسٹڈی سے فارغ ہوکر سونے کی تیاری کر رہے تھے۔

"علیشا! تمہارا فون ہے۔" ساتھ والے کمرے کی اسما نے دروازے پر آ کر اطلاع دی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکا، اللہ خیر کرے اتنی رات گئے......

میں جلدی سے آفس میں پہنچی اور جو خبر مجھے ملی کاش کہ اس کے سننے سے پہلے میں مرجاتی۔ میں کس طرح گھر پہنچی مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔ صحن میں امی اور پاپا کی لاشیں پڑی تھیں پھر کسی نے ان کے چہروں سے چادریں سرکائیں، اف اللہ! پاپا کا چہرہ تو پہچانا بھی نہیں جارہا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے بڑا بھیانک ایکسیڈنٹ تھا۔ شاید گاڑی کے بریک فیل ہوگئے تھے اور پاپا کی چھوٹی سی آلٹو کسی ماچس کی ڈبیا کی طرح ٹرالر کے نیچے آ گئی تھی۔ چچا جان سر دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔ چچی دیوانوں کی طرح بال بکھیرے بیٹھی تھیں۔ حرا اور سحر کی چیخیں آسمان تک جارہی تھیں لیکن میں چپ تھی۔ میں اپنا دکھ کس کے سامنے ظاہر کرتی۔ میرے پسینے پر اپنا خون بہانے والے تو آج خود لہولہو تھے۔ میں آخر کس شانے پر سر رکھ کر اپنے آنسو بہاتی۔ کون میرے آنسو پونچھتا۔ چچی اور چچا والدین کی زندگی میں ہی مجھے درخور اعتنا نہیں گردانتے تھے۔ چونکہ میں اپنے والدین سے ہمیشہ اپنی ضدیں منواتی تھی تو یہ بات انہیں سخت بری لگتی۔ مجھے نہیں خبر کہ کب لوگ ان کی میت کو لے گئے۔ میں تو اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھی۔ میری زندگی میں تو رات کی بھیانک تاریکی چھا گئی تھی۔

چہلم تک میں نے چچا اور چچی کے رویوں سے اتنا اندازہ تو لگالیا کہ وہ مجھے ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ چہلم کے بعد میں نے ہاسٹل جانے کے لیے اپنا سامان باندھنا شروع کیا تو چچی جان میرے کمرے میں آئیں اور کہنے لگیں۔

"کہاں کی تیاری ہے؟"

"میں ہاسٹل جارہی ہوں۔" میں بدستور سامان سمیٹتی رہی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہاسٹل جانے کی۔ ارے اب تیرے اماں باوا بھی نہیں رہے، کوئی اونچ نیچ ہوجائے گی تو ہم دنیا والوں کو کیا جواب دیں گے۔" چچی کے دماغ کا فتور بول اٹھا۔

"چچی جان! آپ کو کسی کو جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنا اچھا برا سمجھتی ہوں۔ پلیز مجھے ایم بی بی ایس مکمل کرنے دیں۔"

"اے ہے لڑکی! اب مجھے آنکھیں دکھائے گی۔ سن رہے ہو سحر کے ابا! کیا کہہ رہی ہے تمہاری بھتیجی۔ ہمیں کوئی ضرورت نہیں اس کے بیچ میں بولنے کی۔ واہ بھئی واہ، کیا زمانہ آ گیا ہے۔" اور پھر چچی نے وہ واویلا مچایا کہ الامان۔ اس کے بعد جانے چچا کے ساتھ کیا مذاکرات ہوئے کہ شام کو چچا نے حکم صادر فرمایا کہ مجھے ہاسٹل جانے اور مزید تعلیم حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور پھر اس کے بعد میری زندگی کا بدترین دور شروع ہوگیا۔ چچا میرے سرپرست بنے ہر کسی سے ہمدردیاں بٹورنے لگے اور میں اپنے ہی گھر میں گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے لگی۔ چچی جان کو جانے مجھ سے کب کا بیر تھا۔ اب انہیں موقع ملا تو وہ ایک ڈکٹیٹر کی طرح ہر وقت میرے سر پر مسلط رہنے لگیں۔ اگر کبھی حرا یا سحر مجھ سے ہمدردی جتلانے لگتیں تو وہ انہیں ڈانٹ کر اپنے کمروں میں بھیج دیتیں۔

چچی اور چچا کے رویے کو میں کسی نہ کسی طرح برداشت کرتی رہی لیکن ایک دن حد ہوگئی جب نعمان نے مجھ سے دست درازی کی کوشش کی۔ میں نے نعمان کو بری طرح جھڑک دیا اور چچی جان سے اس کی شکایت کی لیکن چچی جان تو شاید اپنے بیٹے کو معصوم سمجھتی تھیں، انہوں نے الٹا مجھے ہی مورد الزام ٹھہرایا اور مجھے مارنا شروع کردیا۔ ساتھ ساتھ ان کی زبان سے ایسے رکیک جملے نکلنے لگے جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔

امی، پاپا کے انتقال کو تقریباً دو ماہ ہوچکے تھے۔ ایک دن وکیل صاحب کا فون آیا کہ وہ مجھ سے ملنا

چاہتے ہیں۔ چچا اور چچی نے یہ سنا تو مجھے دھمکیاں دینے لگے کہ اگر وکیل صاحب کو کچھ بتایا تو بہت برا ہوگا۔ میں خاموشی سے یہ سب سنتی رہی۔

دوسرے دن وکیل صاحب جو کہ پاپا کے دوست بھی تھے آئے۔ وہ بہت شرمندہ تھے کہ امریکا میں انہیں ڈھائی مہینے رہنا پڑا اور انہیں اس حادثے کی خبر نہ ملی۔ اس وقت چچا اور چچی بھی موجود تھے اور وہ میرے آگے پیچھے یوں بچھے جا رہے تھے، جیسے مجھ سے زیادہ اس دنیا میں انہیں کوئی عزیز ہی نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے بریف کیس کھول کر کہا۔

''میں آپ لوگوں کو شجاعت صاحب کی وصیت سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔''

''وصیت...... مگر کون سی وصیت...... بھائی صاحب نے ہم سے تو کبھی اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔'' چچا حیرانی کی تصویر بنے پوچھ رہے تھے۔

''جی ہاں، اس وصیت کے بارے میں کسی کو کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ یہ وصیت شجاعت صاحب نے دراصل اس وقت تیار کروائی تھی، جب ان کے دل کا بائی پاس ہونے والا تھا۔ یہ غالباً نو دس مہینے پہلے کی بات ہے۔''

''تو بھائی صاحب نے وصیت میں کیا لکھا ہے۔'' چچا جان وصیت جاننے کے لیے بے چین تھے۔

''جی ہاں، میں وہی بتانے آیا ہوں۔'' وکیل صاحب نے کہا۔ ''ان کی وصیت کے مطابق ان کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کی مالک علیشا شجاعت ہیں اور یہ سب کچھ علیشا شجاعت کے نام اس وقت ہوگا جب ان کی شادی ہو جائے گی اور اس کے بعد اگر علیشا چاہیں تو اس جائداد میں سے ان لوگوں کو تحفتاً کچھ دے سکتی ہیں جنہوں نے ان کی سرپرستی کی ہے اور اس کے علاوہ جب تک علیشا کی شادی نہیں ہو جاتی، انہیں ہر ماہ ایک معقول رقم اخراجات کی مد میں موصول ہوتی رہے گی۔'' وکیل صاحب نے اپنی بات ختم کی اور اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔

''دیکھ لیا ناں، میں نہ کہتی تھی شجاعت بھائی ہمیں ساری زندگی ترسائے رکھیں گے۔'' چچی جان کا پارہ ایک دم سے چڑھ گیا۔

''اری نیک بخت! چپ ہو جا۔ جاؤ علیشا بیٹی، اپنے کمرے میں آرام کرو۔'' چچا جان میں جانے کہاں سے اتنی انسانیت آ گئی تھی کہ وہ مجھے آرام کا کہہ رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں چلی آئی، مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا تھا۔

رات کو کھانے کی میز پر سب خاموش تھے، جیسے کسی بات کا سوگ منا رہے ہوں اور چچی جان کا رویہ میرے ساتھ بہت مخلصانہ تھا۔ جب سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو میں نے سوچا چلو اب تو سب کے رویے بدل گئے ہیں کیوں نہ چچا جان سے دوبارہ کالج جانے کی بات کی جائے۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر چچی کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اپنا نام سن کر ٹھٹک گئی۔

''اری نیک بخت! اسے شادی کے لیے راضی کرانا تمہارا کام ہے۔ اپنا رویہ اس کے ساتھ اچھا رکھو۔ اسے احساس دلاؤ کہ ہم اپنے پچھلے رویے پر نادم ہیں۔ اس کے ساتھ محبت جتاؤ۔'' یہ چچا جان کی آواز تھی جو چچی کو کچھ سمجھا رہے تھے۔

''لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ راضی ہو جائے گی اور نعمان سے تو وہ ویسے ہی چڑتی ہے۔''

''کوڑھ مغز عورت! اگر وہ راضی نہ ہوئی تو ہمیں کچھ نہیں ملنے کا...... نعمان سے اس کی شادی ہونے کے بعد ہی ہم اس جائداد کے مالک بن سکتے ہیں ورنہ کھیل ختم سمجھو۔ بھائی جان مرنے کے بعد بھی ہمارے لیے مشکلات کھڑی کر گئے۔'' اس کے بعد چچا جانے کیا کیا کہتے رہے، مجھ میں مزید سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج پاپا کی یاد شدت سے آ رہی تھی، واقعی جن کے سر پر والدین کا سایہ نہ ہو ان کی خبر تو شاید اللہ تعالیٰ بھی نہیں رکھتا۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ کچھ دنوں کے لیے

میں اس گھر سے دور چلی جاؤں۔ چچا چچی کے علاوہ کوئی رشتے دار بھی تو نہیں تھا۔ میرے ذہن میں مشعل کا سراپا لہرایا، میں نے اسی وقت ہاسٹل فون کیا۔ تھوڑی دیر بعد مشعل فون پر تھی۔

''کہاں رہ گئیں تم۔ کالج واپس آنا ہے کہ نہیں؟''

''نو مشعل! مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں، کیا تم کل میرے گھر آ سکتی ہو۔'' میں نے ان کے سوالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے علیشا! کوئی پرابلم۔'' مشعل مجھ سے پوچھ رہی تھی، میری آواز بھیگنے لگی۔

''بس تم جلدی سے مجھ ملو۔'' اور میں نے فون بند کر دیا۔

تیسرے دن مشعل مجھ سے ملنے آئی۔ چچا جان آفس گئے ہوئے تھے۔ نعمان بھی کہیں آوارہ گردی کر رہا تھا۔ حرا اور سحرا اپنے کمرے میں وی سی آر دیکھ رہی تھیں اور چچی حسب عادت مسز افتخار کے ساتھ شاپنگ پر گئی تھیں۔

میں مشعل کو لے کر سیدھا اپنے کمرے میں چلی آئی۔

''کیا بات ہے علیشا! تم نے اس دن فون بھی بند کر دیا تھا، خیریت تو ہے۔'' وہ پوچھنے لگی۔

میں نے اسے ساری کہانی سنا دی اور اپنے پروگرام سے بھی آگاہ کر دیا۔

''لیکن ابھی پچھلے ماہ تو میں گاؤں سے آئی ہوں۔ دوبارہ گاؤں جانے کے لیے کالج سے چھٹی لینا، خیر کوئی بات نہیں۔ تم تیاری کرو۔'' مشعل نے مجھے حوصلہ دیا اور دوسرے دن شام کو آنے کا کہہ کر چلی گئی۔

دوسرے دن شام کو مشعل وعدے کے مطابق پہنچ گئی۔

''السلام علیکم چچا جان! علیشا کہاں گم ہے۔ ایک عرصے سے اس کی کوئی خیر خبر ہی نہیں۔'' مشعل نے آتے ہی یہ ظاہر کیا جیسے مجھ سے ملے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔

''وعلیکم السلام مشعل بیٹی! آؤ بیٹھو۔ دراصل علیشا نے اس حادثے کا اتنا اثر لیا ہے کہ آج کل گھر سے باہر بالکل نہیں نکل رہی ہے۔ کالج جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ ہم سب بھی اس کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔'' چچا جان نے نہایت لگاوٹ سے کہا اور میں ان کی مکاری پر دل مسوس کر رہ گئی۔

''کیوں علیشا! یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ یہ تو بہت بری بات ہے۔'' مشعل نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ''چچا جان! میری مانیں تو علیشا کو تبدیلی آب و ہوا کے لیے کہیں بھیج دیں۔''

''ہاں بیٹی! علیشا سے میں نے کئی بار کہا ہے کہیں گھوم آؤ۔ مری چلی جاؤ، وہاں اس کے ماموں رہتے ہیں یا پھر سوات میں میرے دوست کا ریسٹ ہاؤس ہے، وہیں ہو آؤ لیکن یہ مانتی کہاں ہے۔'' چچا جان جس دھڑلے سے جھوٹ بول رہے تھے، اس پر تو میں تلملا کر رہ گئی۔

''چھوڑیں چچا! مری اور سوات۔ میں گاؤں جا رہی ہوں، اسے میرے ساتھ بھیج دیں۔ میری خالہ زاد کی شادی ہے، وہاں اس کا دل بھی بہل جائے گا اور پھر میں بھی ساتھ رہوں گی، چند دنوں بعد ہم لوٹ آئیں گے۔'' مشعل آہستہ آہستہ اصل موضوع پر آ گئی اور چچا جان اپنی ہی کہی ہوئی باتوں کے جال میں الجھے حیران و پریشان مشعل کو تکتے رہے۔

☆☆☆

پروگرام کے مطابق تیسرے دن میں اور مشعل گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن پر ایک خوبرو نوجوان نے ہمارا استقبال کیا۔ اس کی شکل مشعل سے کافی حد تک مشابہہ تھی اور پھر جب مشعل حماد بھائی کہہ کر ان کی طرف بڑھی تو میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ وہ مشعل کے بھائی تھے۔

''حماد بھائی! یہ ہے میری دوست علیشا۔ جس کے بارے میں میں نے فون پہ بات کی تھی۔'' مشعل نے کہا۔

"ہیلو علیشا! میں ہوں حماد خان آفریدی! مشعل نے مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ بتادیا ہے۔ اب آپ بالکل فکر نہ کریں، ہمارے ہوتے ہوئے کوئی آپ پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرسکتا۔" جانے حماد نے یہ بات کس زعم میں کہی۔ اس کے چہرے پر اعتماد اور آنکھوں میں خلوص کی چمک تھی اور میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ گاڑی حویلی کی طرف روانہ ہوچکی تھی اور ریکارڈ پلیئر سے نکلتی پروین شاکر کی خوب صورت غزل مہدی حسن کی جادو بھری آواز کے ساتھ عجیب سماں باندھ رہی تھی۔

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

سفر کب ختم ہوا۔ مجھے کچھ نہ خبر ہوئی۔ چونکی تو میں اس وقت جب مشعل نے مجھے گاڑی سے اترنے کو کہا۔

مشعل مجھے لیے ہوئے طویل کوریڈور سے ہوتی ہوئی ایک خوب صورت کمرے میں پہنچی جو ڈرائنگ روم تھا۔ وہاں اس کے خاندان کے تمام افراد موجود تھے شاید انہیں ہمارے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔

تمام لوگ نہایت خلوص سے ملے، خاص کر مشعل کی والدہ تو اتنی محبت سے ملیں کہ مجھے امی کی یاد آگئی۔ مشعل کے والد نے کہا۔

"بیٹی! تم مشعل کی سہیلی ہو اور ناتے میری بیٹی ہو۔ ہم تمہارے ساتھ ہونے والی زیادتی سے واقف ہیں۔ ہم نے تمہیں بیٹی کہا ہے اور ہمارا تم سے وعدہ ہے کہ تمہارے تحفظ کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔"

اس خاندان میں آکر مجھے لگا جیسے یہی میری منزل ہے۔ زبان کا مسئلہ بھی حائل نہ ہوسکا۔ مشعل کی بھابیاں علوینہ، شامہ مجھے بہنوں کی طرح عزیز رکھتیں۔ لاریب اور صندیلہ تو مشعل کو بھول کر میرے پیچھے گھومتی رہتیں اور ننھا شناور تو ایسے لگتا جیسے برسوں سے مجھے جانتا ہوں، ہر وقت پھوپھی یہ کام، وہ کام کرتا رہتا۔ میں یہاں آکر اپنے غموں کو بھلا بیٹھی تھی۔ ایک دن مشعل نے مجھ سے کہا۔

"علیشا ہمیں گاؤں ایک مہینہ ہونے کو آیا۔ تمہارے چچا کے بھی دو خطوط آچکے ہیں۔ کالج کی چھٹی بھی ختم ہوگئی، اب آگے تمہارا کیا فیصلہ ہے۔"

اور میں جو بے فکر ہو کر بیٹھ گئی تھی، ایک لمحے کے لیے چکرا رہ گئی۔

"میں کیا کروں مشعل! مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ میں سوسائڈ کرلوں گی۔"

"نہیں بیٹی! تمہارا فیصلہ بالکل غلط ہے۔ ہمارے ہوتے ہوئے تو یہ ناممکن ہے۔" مشعل کے بابا جانے کب وہاں آگئے تھے، ہمیں پتا ہی نہ چلا۔

"لیکن بابا پھر میں کیا کروں۔ وہ لوگ تو میری جان کے دشمن ہیں۔ اگر میں نے ان کا کہا نہ مانا تو شاید وہ مجھے جان ہی سے ماردیں۔" میں بھی انہیں مشعل کی طرح بابا کہنے لگی تھی۔

"بیٹی میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ تمہیں حماد کے ساتھ منسوب کرنے کا فیصلہ......اگر تمہارا نکاح حماد سے کردیا جائے تو وہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"لیکن بابا یہ سب کیسے...... وہ لوگ......"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دوں۔

"دیکھو علیشا! یہ نہ سمجھنا کہ ہم ایسا کسی لالچ کے تحت کررہے ہیں۔ یہ سب صرف تمہارے تحفظ کے لیے کررہے ہیں اور پھر حماد کی ذاتی پسند بھی اس فیصلے میں شامل ہے۔ خوب اچھی طرح سوچ لو اور پھر مجھے جواب دو۔" بابا میرے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر چلے گئے اور میرے سامنے حماد کا خوب صورت سراپا اور خلوص بھری آنکھیں گھوم گئیں۔

☆☆☆

آج ہم شہر جانے کی تیاری کررہے تھے۔ میرے قدم خوشی سے زمین پر نہیں رکھے جارہے تھے۔ میں بابا کی احسان مند تھی۔ انہوں نے جو کہا وہ کر دکھایا۔ حماد نے کہا کہ مجھے ایک بار اپنے چاچا کے گھر جانا چاہیے اور اس کے بعد وہ خود سب سنبھال لے گا اور میں اس کے اعتماد کے سہارے واپسی کا سفر طے کررہی تھی۔ چلتے وقت الوینہ بھابھی اور شامہ بھابھی نے مجھے ڈھیروں پیار کیا تھا اور اماں جی نے گلے لگا کر بہت سی دعائیں دی تھیں۔ شناور، لاریب اور صندیلہ مجھ سے واپسی کی

تاریخیں طے کر رہے تھے اور میں اتنا ڈھیر سارا خلوص، محبتیں اور دعائیں سمیٹے نفرتوں کی وادی میں جا رہی تھی۔

چچا جان مجھے دیکھ کر حسب عادت خاموش تھے لیکن چچی جان کی زبان چل پڑی۔

''اتنے دن لگاتے ہیں کہیں۔ ہماری آنکھیں ترس گئیں تمہیں دیکھنے کے لیے۔ اے ہے تم تو وہاں جا کر ہمیں بھول ہی گئی تھیں۔'' چچی جان کی محبت بھری باتوں سے میں تو جل ہی گئی اور خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

چند دن سکون سے گزرے، ایک دن چچی جان نے نہایت لگاوٹ سے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''میں چاہتی ہوں علیشا بیٹی کہ اب تمہارے ہاتھ بھی پیلے کر ہی دوں۔ آخر کو تم بھیا بھابھی کی امانت ہو۔ کتنا خوش ہوں گے وہ تمہیں نعمان کی دلہن بنا دیکھ کر۔'' ان کی دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔

''نعمان کی دلہن...... مگر یہ ناممکن ہے۔ میں نعمان سے شادی نہیں کروں گی۔''

''دیکھ بیٹی! وہ اپنی غلطی پر نادم ہے اور دیکھ وہ تیرا اپنا رشتے دار ہے۔ ہم تیرے اپنے ہیں، ہم سے زیادہ تجھے اور کون چاہے گا۔'' میری برہمی پر وہ خوشامد پر اتر آئیں۔

میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا اور فون کر کے مشعل کو تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ادھر چچی جان میری خاموشی کو رضامندی سمجھتے ہوئے شادی کی تیاریوں میں مشغول ہوگئیں۔ میں نے مایوں میں بیٹھنے سے انکار کر دیا تو انہوں نے صرف نکاح کرنے کا فیصلہ کیا۔

نکاح والے دن صبح سے میں بہت بے چین تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور پھر میرا انتظار ختم ہوا۔ نعمان کے ساتھ حماد اندر آ رہا تھا۔

''ابو جی یہ صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' میرے کانوں میں نعمان کی آواز آئی۔

''محترم مجھے آپ سے علیشا کے سلسلے میں ملنا تھا۔ ایک شادی شدہ لڑکی کی شادی کروا کے آپ نہ صرف قانون کے مجرم بن جائیں گے بلکہ شرعی طور پر بھی اس بات کی اجازت نہیں۔'' حماد کہہ رہا تھا۔

''کیا بکواس ہے میاں...... کس کی بات کر رہے ہیں آپ۔ ہماری بھتیجی کی آج شادی ہے ہمارے بیٹے سے اور اس شادی میں دونوں فریقین کی باہمی رضامندی شامل ہے اور یہ شادی شدہ کون ہے۔'' چچا جان بھڑک اٹھے۔

''آپ کی بھتیجی علیشا حماد اور میں حماد خان آفریدی...... منکوحہ ہے وہ میری......''

''کیا واہیات بک رہے ہو، کون ہو تم؟'' چچا جان آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔

حماد نے نکاح نامہ سامنے کر دیا اور چچا جان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ یہ سب کچھ ان کے لیے ناقابل برداشت تھا اور پھر وکیل صاحب نے آگے بڑھ کر تمام صورت حال سے چچا جان کو آگاہ کیا کیونکہ میں وکیل صاحب کو پہلے ہی سب کچھ بتا چکی تھی۔

چچا جان خاموشی سے اندر چلے گئے اور نعمان بکتا جھکتا باہر کی جانب بڑھ گیا کیونکہ اب وہ مجھے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

☆☆☆

اب میری زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔ حماد کے سنگ زندگی کے رنگ ہی نرالے تھے۔ چچا اینڈ فیملی بھی اب مداخلت نہیں کرتی تھی۔ کچھ دنوں سے میں دیکھ رہی تھی کہ چچا نعمان اور چچی اکثر کمرے میں گھسے نہ جانے کیا کھچڑی پکاتے رہے۔ میں نے ایک روز سوچا، مجھے بھی ان کی باتیں سننا چاہئیں، آخر یہ کیا پروگرام بناتے رہتے ہیں۔ میں کئی روز تک چھپ کر ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتی رہی اور پھر مجھ پر جس سازش کا انکشاف ہوا اس نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ وہ لوگ دراصل مجھے اور حماد کو مارنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ نعمان کہہ رہا تھا۔

''کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی اور وہ دونوں ہمارے راستے سے ہٹ جائیں گے۔''

''مگر بیٹے کس طرح...... کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ۔'' چچا جان پوچھ رہے تھے۔

''دیکھیے ابو! وہ روزانہ رات کو دودھ پیتے ہیں

اور ہم دودھ میں زہر ملا دیں گے۔“
”لیکن بیٹے! وہ لوگ تو ہمیشہ لیٹر پیک دودھ کا استعمال کرتے ہیں پھر یہ کیسے ممکن ہے۔“ چچا جان کی آواز آئی۔
”ہماری کامیابی کا راز لیٹر پیک میں ہی تو ہے۔ میں پیکٹ میں انجکشن کے ذریعے زہر داخل کردوں گا اور کسی کو شک نہیں ہوگا۔“ نعمان کا سازشی ذہن ہماری موت کے منصوبے بنا رہا تھا۔
”کل فریج میں صرف ایک دودھ کا پیکٹ ہوگا اور بس پھر کھیل ختم۔“ نعمان نے سفاکی سے کہا۔
مجھ میں مزید کچھ سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ میں اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ میں نے حماد کو تمام سازشوں سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے خاموش رہنے کو کہا اور کہنے لگا۔
”اب دیکھنا میں کیا کرتا ہوں۔“
دوسرے دن رات کو تقریباً آٹھ بجے حماد کے ساتھ ان کے دوست فاروق صدیقی، حماد کے کالج کے ساتھی تھے اور حال ہی میں سول سروس میں کامیابی حاصل کرکے اے ایس پی کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔
دونوں دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد نعمان بھی آ گیا۔ فاروق صدیقی نے اسے ڈرائنگ روم میں بلوایا اور اس سے باتیں کرنے لگے۔
کچھ دیر بعد انہوں نے مجھ سے کہا۔
”بھابھی ذرا فریج میں رکھا دودھ کا پیکٹ تو لائیں۔“
نعمان نے چونک کر فاروق کی طرف دیکھا لیکن پھر خود کو نارمل ظاہر کرنے لگا۔
”اور ہاں ایک گلاس بھی لیتی آیئے گا۔“ مجھے پیچھے سے حماد کی آواز سنائی دی۔
تھوڑی دیر بعد دونوں چیزیں فاروق صاحب کے سامنے رکھی تھیں۔ انہوں نے گلاس میں دودھ ڈالا اور نعمان سے کہا۔
”نعمان صاحب! یہ لیجیے، اسے پی لیں۔“

اور نعمان تو ”کاٹو تو لہو نہیں“ جیسا گم صم ہم سب کے چہروں کو تک رہا تھا۔
”نعمان! میں نے تم سے کچھ کہا ہے۔“
فاروق صاحب نے کرخت لہجے میں کہا۔
نعمان تیزی سے اٹھ کر باہر کی جانب لپکا۔ فاروق صاحب نے اس سے کہیں زیادہ تیزی سے اسے جکڑ لیا اور پھر حماد سے تھانے فون کرنے کو کہا۔
نعمان کے ساتھ چچا چچی بھی گرفتار کرلیے گئے اور پھر دوران تفتیش انہوں نے ایک ایسا انکشاف کیا کہ وہ لرز کر رہ گئی۔
چچا نے ممی، پاپا کے قتل کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ہی دولت کے لالچ میں اپنے بھائی کا قتل کیا۔ اس روز جب وہ لوگ مسز وقار کے ڈنر پر جارہے تھے تو ہم نے جانے سے انکار کردیا اور ان کی کار کے بریک میں خرابی پیدا کردی لہٰذا جب وہ لوگ روزانہ ہوئے تو کچھ ہی دیر بعد حادثے کا شکار ہوگئے۔
اس کے بعد ان پر کیس چلتے رہے۔
چچا کو سزا ہوگئی۔ نعمان چونکہ اقدام قتل کا مجرم تھا لہٰذا اسے دس اور چچی جان کو ان دونوں کا ساتھ دینے پر سات سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔
حرا اور سحر ہمارے ساتھ رہنے لگیں۔ وہ دونوں معصوم سی بے ضرر لڑکیاں تھیں جو اپنے ماں باپ اور بھائی کی سازشوں سے الگ اپنے آپ میں مگن رہتی تھیں۔
اب میں خوش ہوں۔ حرا اور سحر کی شادیاں ہوگئی ہیں اور میں حماد کے گاؤں والی حویلی میں لوٹ آئی ہوں۔ چونکہ میں نہیں چاہتی کہ میرے بیٹے اسامہ اور زید اس گھر میں پرورش پائیں جہاں نعمان اور چچا جان جیسے سفاک اور سازشی ذہن کے لوگ رہتے تھے۔ میں انہیں حماد اور بابا جان کی طرح بنانا چاہتی ہوں۔ آپ لوگ بھی میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے مزید امتحان سے بچائے اور میرے بچوں کو لمبی عمر عطا کرے، آمین۔

☆☆



فقیر شہزادہ

یاور

وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ ہر شے کو زوال ہے سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات۔ انسان بڑے بڑے منصوبے بناتا ہے لیکن وقت کے ہاتھوں سب مار کھا جاتے ہیں۔ تاریخ میں صرف وہی زندہ رہتے ہیں۔ جو حالات کے آگے جھکتے نہیں اور عزت سے جیتے ہیں عزت سے مرتے ہیں۔

وقت کی بدلی چال، ایک بہادر شہزادے کی کہانی جس نے مرتے دم تک انگریزوں کا مقابلہ کیا

وقت نے اچانک اپنی چال بدلی اور حالات نے ایک نئی کروٹ لی، سن ستاون کی سرسراہٹ دیکھ کر ، بے سکونی، عدم تحفظ بے چینی، بے یقینی اور جنگی جنون نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں اور اس کے ساتھ ہی خوش گوار ٹھنڈے ماحول پر گرمی کی لہر دوڑنے لگی اور آب وہوا میں طوفانی زور وشور کی آمیزش ہوتی محسوس ہونے لگی۔

وقت کی اس بدلی ہوئی چال نے انگریزوں کو ایک نیا حوصلہ دیا۔ انہوں نے اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے منصوبہ بندی کا آغاز کر دیا، اپنے خوابوں کو نت نئے رنگوں سے سجانے کے لیے انہوں نے اپنے ہاتھوں میں برش پکڑ لیے اور بازوں کی اس چھاؤنی کا سالار تھا فیروز شاہ......

فیروز شاہ کے بزرگوں کا خاندانی تعلق بہت پیچھے جا کر مغل خاندان سے جا ملتا تھا اور وہ تیموری خاندان کے امیر نظام بخش کا بیٹا تھا۔ تیئس برس کی بھرپور جوانی کا مالک، جس کے سینے میں انگریزوں کے لیے بے پناہ نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔

اس کی یہ فوجی چھاؤنی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد کے کھنڈر کی ایک ادھوری سی دیوار کے پیچھے تھی جہاں وہ اس کے جاں باز ساتھی، ہندوستان کی دھرتی پر سے انگریزوں کا نام ونشان مٹا دینے کی خفیہ تیاریوں میں مصروف رہتے تھے۔ فیروز شاہ نے اسی جگہ اپنی رہائش گاہ بھی بنا رکھی تھی۔ من پسند رنگوں کے انتخاب میں مشغول ہوگئے۔ قلم کو اپنی انگلیوں میں دبا کر قاعدے، قانون اور اصولوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے لگے۔ سارے عہد وپیمان توڑے جانے لگے اور سارے وعدے بالائے طاق رکھ دیے گئے۔ یہاں تک کہ اپنی طاقت کے زور پر کئی ایک ریاستوں کے ایوانوں پر تالے ڈال دیے گئے اور کئی حکومتوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا گیا۔ اور پھر دھیرے دھیرے دہلی کی مغل سلطنت بھی ان کی گرفت میں آگئی اور انہوں نے اسے اپنے داہنے ہاتھ کا کھلونا بنا لیا۔

وہ اس کھلونے سے کھیلتے رہے۔ اپنی طاقت کے نشے میں بدمست ہو کر کھیلتے رہے۔ اپنی عقل کے مطابق داؤ پیچ پھینکتے رہے اور کھیلتے رہے۔

لیکن ان کا ایک آدھ داؤ ہلکا پڑ گیا، جس سے ماحول میں ایک نئی تبدیلی رونما ہوئی۔ آب وہوا بدلنے لگی اور اس میں ایک نیا جوش اور نیا ولولہ جاگتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ کیوں کہ مالوہ میں مندسار کے مقام پر آزادی کے متوالوں نے انگریزوں سے مقابلے کے لیے ایک زبردست چھاؤنی بنائی تھی۔ جاں شاہی خاندان میں پیدا ہونے والے اس بہادر شہزادے کے دن رات اسی جگہ گزرتے تھے۔ ایک شاہ زادہ جس نے فقیری حالت میں چھپ کر دس ہزار سے زائد جاں بازوں کا ایک لشکر اسی دیوار کے پیچھے جمع کر لیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ انگریز فوجیوں کے آگے وہ آزادی کے متوالوں کا ایک ایسا پہاڑ کھڑا کر دے کہ اس پہاڑ کو پار کرنے میں ان کے دانتوں تلے پسینا آجائے۔ وہ ان کے آگے ایسا مورچہ بنانا چاہتا تھا جسے توڑ کر گزرنا کسی کافر کے لیے ممکن ہی نہ ہو۔ وہ ہندوستان کی سرزمین پر ایک بھی انگریز کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

فیروز شاہ نے اپنے لشکر میں افغانی، مکرانی اور میواتی جاں نثاروں کو زیادہ تعداد میں شامل کر رکھا تھا۔ جن کی لگام میں اپنے ہاتھ میں تھام کر اب وہ وقت اور موقعے کا انتظار کر رہا تھا۔ دن ایک ایک کر کے گزرتے جا رہے تھے، فیروز شاہ کی تمنا تھی کہ اس کی یہ جنگ ایک ایسی جنگ ہو جس کے سامنے اب تک لڑی جانے والی آزادی کی جنگیں پھیکی پڑ جائیں۔

یہ اس کا عزم اور حوصلہ ہی تھا کہ ایک قلیل مدت میں اس نے ایک بڑی فوج تیار کر لی تھی اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ انگریز اس کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر شدید دباؤ محسوس کر رہے تھے۔ مدھیہ پردیش میں انگریزوں کا بھارت میں جو ایجنٹ تھا اس کا نام ٹیوریننٹ تھا، جسے فیروز شاہ کا نام سن کر ہی پسینے آنے لگے تھے۔ اس نے گورنر جنرل کو فیروز شاہ کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت کی خبر دیتے ہوئے ایک تفصیلی خط لکھا اور اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔ اس نے گورنر جنرل سے کہا کہ اگر

جلد ہی اس کا کوئی تدراک نہ کیا گیا تو فیروز شاہ ہماری گردن تک پہنچ جائے گا۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ جلد سے جلد اس کی پیش قدمی کو روکا جائے۔ اس کے ارادوں اور اس کی فوجی طاقت کو کچل کر چنبل ندی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے۔

مندسار ایک چھوٹا سا علاقہ تھا جو چنبل ندی کے کنارے آباد تھا۔ ممبئی اور آگرہ کی طرف جانے والے تمام راستے مندسار کے قریب سے ہو کر ہی گزرتے تھے اس لیے انگریزوں کے لیے اس جگہ کی کافی اہمیت تھی۔ اور وہ کسی حالت میں بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس اہم ترین علاقے پر فیروز شاہ قابض رہے۔ لیکن ان کے لیے مشکل یہ تھی کہ وہ یہ سوچ ہی نہیں پا رہے تھے کہ فیروز شاہ سے کیسے نمٹا جائے؟

انہیں اپنے مخبر کے ذریعے فیروز شاہ کی خفیہ سرگرمیوں کا تھوڑا بہت علم تو ہو گیا لیکن ابھی انہیں اس کی طاقت اور اس کی فوجی تعداد کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ اس بارے میں ان کے مخبر بھی انہیں صحیح اطلاع دینے سے قاصر تھے۔

فیروز شاہ کے لشکر میں گھڑ سوار دستے تھے، تیر انداز تھے اور چاق چوبند ماہر تلوار باز تھے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس توپیں بھی تھیں۔ اس نے گولا بارود تیار کرنے کا کارخانہ بھی لگا لیا تھا، اس طرح روز بہ روز اس کی طاقت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی طاقت کو پھلتے پھولتے دیکھ کر انگریزوں کا دن کا چین اور راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ ان کی پلکوں پر کپکپاہٹ بڑھتی جا رہی تھی اور آنکھوں میں اندھیرا اترنے لگا تھا۔

اور آخر کار بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے اپنی چالاکیاں دکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے انہوں نے سو سپاہیوں کا ایک دستہ اس پیغام کے ساتھ فیروز شاہ کے پاس بھیجا کہ وہ مندسار چھوڑ کر چلا جائے۔ اصل میں یہ فیروز شاہ کو دھوکے سے گرفتار کرنے کی ایک چال تھی لیکن فیروز شاہ نے ان سپاہیوں کے دستے کے کمانڈر سے بات کرنے سے ہی انکار کر دیا بلکہ اس نے انگریز سپاہیوں کو اپنی طاقت کے ایسے ایسے نظارے دکھائے کہ انگریز دستہ سرحد چھوڑ کر بھاگ نکلنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے بعد ہی مندسار میں آزادی کی جنگ کی ابتداء ہو گئی۔ فیروز شاہ اب کھل کر میدان میں آیا گیا تھا اور اس نے اپنے تمام مورچے کھول دیے تھے۔ سب سے پہلے اس نے مندسار کے بڑے بڑے سرکاری عہدے داروں کو گرفتار کر کے اپنے تہ خانے مین ڈال دیا اور پھر قلعے کے اونچے اونچے برجوں آزادی کے سبز رنگ کے جھنڈے لہرا دیے۔ یہ انگریزوں سے کھلے عام جنگ کا آغاز تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے مالوہ کے کونے کونے میں آزادی کی چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔

فیروز شاہ نے کسی ایک آدمی کا خون بہائے بغیر فتح حاصل کی تھی۔ تباہی و بربادی، قتل اور خون ریزی اس کا مقصد نہیں تھا۔ وہ ایک مذہبی آدمی تھا، اسے گناہ اور ثواب کا پورا پورا ادراک تھا وہ تو اپنے دشمن کو بھی جان سے مارنا نہیں چاہتا تھا اور اسی لیے اس نے کسی سرکاری عہدے دار کو قتل کیے بغیر قلعے کے برجوں پر آزادی کا پرچم لہرا دیا تھا۔

دو سال قبل وہ اپنے دل کے سکون کے لیے حج کرنے بھی گیا تھا۔ حج کی سعادت حاصل کر کے جب وہ واپس آیا تو اس نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہندوستانی قوم کے پاؤں میں پڑی ہوئی غلامی کی بیڑیاں توڑ ڈالے گا۔ اور اس کے لیے اس نے دن رات محنت کر کے جاں بازوں کی ایک بڑی فوج بنالی تھی اور انگریزوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔

جنگ کی چنگاریوں نے ایک کے بعد ایک گاؤں اور ایک شہر کے بعد دوسرے شہر کو تاراج کرتے ہوئے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ انگریزوں کی چھاؤنیاں اجڑ چکی تھیں۔ ارزرا اور گھار کے قلعے ان کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے۔

اپنی ایک اہم ترین چھاؤنی سے ایک زبردست فوج لے کر آنے والا انگریز ایجنٹ ٹیور ینٹ گھار کی سرحد پر فیروز شاہ کے لشکر سے آٹکرایا اور گھمسان کی

لڑائی ہوئی۔ یہ لڑائی کئی دونوں تک جاری رہی۔ دونوں طرف کی فوجوں کا جانی نقصان ہوا مگر انگریزوں کا نقصان زیادہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ میدان میں ڈٹے رہے۔ وقفے وقفے سے ان کے لیے کمک بھی پہنچ رہی تھی جسے روکنا فیروز شاہ کے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

کئی روز سے جاری اس لڑائی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ اسی دوران میں فیروز شاہ ذرا آرام کرنے کی غرض سے اپنے لشکر سمیت گھار کے قلعے کے اندر چلا گیا تھا۔ چالاک انگریزوں نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا اور بڑی خاموشی سے انہوں نے قلعے کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔ جو جنگی قوانین کی سراسر خلاف ورزی تھی۔

رات کی آنکھوں میں اندھیرا لمحہ بہ لمحہ گہرا ہوتا جا رہا تھا مگر قلعے کیا ندر موجود فیروز شاہ کی آنکھوں میں ابھی تک چمک موجود تھی۔ کئی دنوں سے وہ سو نہیں پایا تھا۔ اس وقت بھی جب رات کے تقریباً دو بج رہے تھے وہ قلعے کے ایک بڑی کمرے میں دھیرے دھیرے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ سوچ کی لکریں اس کے ماتھے پر بکھری ہوئی تھیں۔ اس کمرے میں اس کے ساتھ اس کے لشکر کے دس بارہ عہدے دار بھی موجود تھے جو ایک قطار میں اس کے سامنے ہاتھ باندھے خاموش کھرے تھے۔

پچھلے پندرہ دنوں سے فیروز شاہ اپنے لشکر کے ساتھ قلعے کے اندر ہی تھا اور باہر انگریزوں کی فوج قلعے کا گھیرا ڈالے کھڑی تھی، فیروز شاہ جنگ میں وقفے کے دوران میں ہی دھوکا کھا گیا تھا۔ کیوں کہ وہ جیسے ہی آرام کرنے کے لیے قلعے کے اندر گیا تھا۔ ویسے ہی انگریز لشکر نے قلعے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اور ان کا یہ گھیرا اب تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

انگریزوں نے جو داؤ کھیلا تھا وہ جنگی قوانین کے خلاف تھا اور انہوں نے قانون توڑ کر دھوکے سے کام لیا تھا مگر اب جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ فیروز شاہ کے پاس اب کوئی راستہ ہی نہیں بچا تھا۔ انگریز باہر سے قلعے پر حملہ کر رہے ہیں اور قلعے کے اوپر سے فیروز شاہ کے سپاہی انہیں مسلسل جواب دے رہے تھے۔

انگریزوں نے دھوکے سے اور جنگی اصولوں اور جنگی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فیروز شاہ کو قلعے کے اندر بند ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس بات کا فیروز شاہ کو بے حد دکھ تھا اور اسی لیے اب وہ بڑی احتیاط، ہوشیاری اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اس وقت بازی انگریزوں کے ہاتھ میں آ چکی ہے اور انہوں نے قلعے کے تمام چھوٹے بڑے دروازوں کو باہر سے بند کر کے ان کا محاصرہ کر رکھا ہے تاکہ کھانے پینے کی چیزیں، اناج اور پانی وغیرہ کسی صورت میں قلعے کے اندر نہ جانے پائیں۔

یہ صورت حال فیروز شاہ کے لیے اور بھی تشویش کا باعث بنی ہوئی تھی کیوں کہ قلعے کے اندر اناج کا اتنا ذخیرہ نہیں تھا جو مہینوں تک چل سکتا۔ باہر سے رسد آنا ناممکن تھا۔ انگریزوں نے یہ بہت بڑی مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے فیروز شاہ اور اس کے ساتھیوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھی۔

انگریز اسے اپنی سب سے بڑی جیت سمجھ رہے تھے اور اگر دیکھا جائے تو انہوں نے ایک طرح سے فیروز شاہ کو اپنا قیدی ہی بنا لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنا محاصرہ ختم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن جب قلعے کے اندر کا راشن پانی ختم ہو جائے گا تو فیروز شاہ ہتھیار ڈال کر خود کو ان کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ فیروز شاہ کے سامنے بھی اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ لیکن اسے اپنی اور اپنے وطن کی عزت اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ اس لیے وہ کسی قیمت پر اپنی عزت گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ دن کے اجالے میں مورچے کھڑے ہوتے تھے اور رات کے اندھیرے میں قلعے کے اندر صلح مشورے ہوتے تھے۔ یہ سوچا جا رہا تھا کہ انہیں اب کیا کرنا چاہیے؟

فیروز شاہ سوچ میں ڈوبا ہوا کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا کہ تبھی اس کے ایک کمانڈر نے کہا۔ ”شاہ

زادے، ہم روزانہ ملتے ہیں اور روانہ ہی سر جوڑ کر گھنٹوں بیٹھتے ہیں۔ لیکن فیصلہ کرنے میں ہمیں تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہم کب تک یوں ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے؟"

"حیات خان!" فیروز شاہ اپنے ساتھی کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "زندگی میں پہلی بار آج میں کوئی فیصلہ کرنے میں اپنے آپ کو ناکام محسوس کر رہا ہوں، نہ جانے کیوں میں کچھ سوچ نہیں پاتا، کوئی فیصلہ کر نہیں پاتا۔" اتنا کہہ کر وہ ذرا دیر رکا اور پھر مایوسی کے لہجے میں آگے بولا۔ "لگتا ہے، میں بہت کم زور ہو گیا ہوں۔"

"آپ کم زور نہیں ہیں شاہ زادے۔" حیات خان نے کہا۔ "حالات نے تو سکندر اعظم جیسے فاتح کو بھی کم زور بنا دیا تھا اور یہ حالات ہی ہیں جو ہمیں بھی مجبور بنا رہے ہیں۔"

یہ سن کر ایک اور عہدے دار آگے بڑھا اور اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر ادب سے بولا۔ "شاہ زادے میں بیچ میں بولنے کی معافی چاہتا ہوں مگر ایک بات کہنے کے لیے میں مجبور ہوں۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو عنایت اللہ؟" فیروز شاہ نے اس کی طرف دیکھ کر نرم سے لہجے میں کہا۔ "یہاں ہم سوچ بچار اور صلاح مشورے کے لیے ہی بیٹھے ہیں۔ یہاں سب کو اپنی بات کہنے کی اجازت ہے بولو۔"

"شاہزادے انسانیت کا جو درد آپ کے سینے میں ہے اس درد کو ہم سبھی جانتے ہیں۔" عنایت اللہ نے کہا۔ "اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جنگ کے میدان میں بھی دشمن سپاہی کو جان سے مارنا آپ کو پسند نہیں ہے۔ لیکن اس وقت جس قسم کے حالات میں گھرے ہوئے ہیں اس کا انجام کیا ہونا ہے یہ تو آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اس طرح تو اور ایک ہفتہ بھی ہم گزار نہیں سکتے۔ کیوں کہ اس سے پہلے ہی قلعے کے اندر قحط کی سی حالت ہو جائے گی۔ اناج پانی ختم ہوتے ہی بھوک اور پیاس سے قلعے کے اندر لاشیں پڑی ہوں گی۔ اور اس کی ذمے داری سب لوگ آپ ہی پر ڈالیں گے۔ آپ کی اصول پسندی اور انسانیت نوازی کو ہی اس کا جواب دینا ہوگا۔"

عنایت اللہ کی بات سن کر دوسرے فوجی عہدے دار بھی چونک پڑے کیوں کہ یہ بات ان کے دلوں میں بھی ایک بھیانک سوال بن کر ہلچل مچا رہی تھی لیکن اپنے سالار کے سامنے کوئی بھی اس قسم کی بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

ہر ایک کو اپنے سالار پر پورا بھروسا تھا وہ شاہ زادے کے ہر فیصلے پر عمل کرنے کو اپنا فرض سمجھتے تھے اور اس کے فیصلے کو ہی آخری فیصلہ سمجھتے تھے۔ عنایت اللہ کی بات فیروز شاہ کے بھی دل کو چھو گئی تھی۔ وہ ذرا دیر تک خاموش رہا پھر گمبھیر لہجے میں بولا۔ "میرے دوست عنایت اللہ، تمہاری بات سو فیصد درست ہے مگر کیا تم لوگ یہ سمجھ رہے ہو کہ یہ ساری باتیں مجھے نہیں معلوم ہیں؟ میں ان سب باتوں پر سوچ رہا ہوں۔ لیکن میں کیا کروں، میں اپنے دو اصولوں کے بیچ میں دب کر رہ گیا ہوں۔ ایک جانب انسانیت کی پکار ہے اور دوسری طرف عزت کی آواز ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس کی طرف جاؤں۔ لیکن مجھے ان دونوں موتیوں کی حفاظت کرنی ہے اور ان کی حفاظت کرنا میرا فرض بھی ہے۔ انگریزوں نے جس مکرو فریب سے ہمیں گھیرا ہے میں اس کا جواب بھی انہیں اسی انداز میں دینا چاہتا ہوں اور یہ بھی میرا فرض ہے۔"

فیروز شاہ اپنے تمام ساتھیوں اور اپنے تمام سپاہیوں کو اپنا دوست سمجھتا تھا اور ہر ایک سے دوستانہ لہجے میں ہی بات کرتا تھا۔ اس روز بھی وہ ساری رات سب لوگوں سے صلاح مشورے کرتا رہا۔ حالات اتنے دگرگوں ہونے لگے تھے کہ تمام عہدے دار انگریزوں سے صلاح کرنے کے حق میں تھے کیوں کہ اسی میں ان سب کی بھلائی تھی۔ قلعے کے اندر موجود ہزاروں جاں باز سپاہیوں کو فاقے کی موت مرنے سے بچانے کا یہی ایک راستہ تھا۔

لیکن فیروز شاہ کا دل نہیں مان رہا تھا وہ سمجھ رہا تھا کہ صلاح کرنے کا مطلب تو یہی تھا کہ وہ انگریزوں

کی برتری اوران کی فتح کوتسلیم کر کے ان کے آگے اپنا سر جھکا رہا ہے۔ ایسا کرنے سے وہ وہ اپنی عزت کو اپنے ہاتھوں خاک میں ملا دے گا۔ ایسا کرنے سے بھلا عزت وآبرو کی حفاظت کیسے ہوسکتی ہے؟

قلعے کے باہر انگریزوں کا محاصرہ جاری تھا اور قلعے کے اندر فیروز شاہ کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ رات بھر صلاح مشورہ ہوتا رہا۔ لیکن رات بھر سر پکڑ کر بیٹھنے کے باوجود بھی وہ کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے اور رات گزرتی چلی جارہی تھی۔ پو پھٹنے میں ابھی تھوڑی دیر تھی۔ رات بھر بیٹھے بیٹھے سب لوگ تھک گئے تھے۔ فیروز شاہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے اٹھتے ان سب کو بھی جانے کے لیے کہا۔ اس طرح کسی نتیجے پر پہنچے بغیر آج کی یہ محفل بھی برخاست کردی گئی تھی۔ تمام عہدے دار اپنے اپنے دستے میں لوٹ گئے تھے۔

صبح ہوئی اور پہاڑوں کے پیچھے سے سورج نے اپنا سر اٹھایا، اس کی چمک دار کرنوں کی روشنی میں انگریز لشکر نے قلعے کی دیواروں کے اوپر برجوں پر سپاہیوں کے بجائے جب ایک سفید جھنڈا لہرتا ہوا دیکھا توان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

صلح کا یہ جھنڈا خود فیروز شاہ نے اپنے ہاتھوں سے قلعے کے اوپر لہرایا تھا۔ اپنے اس فیصلے سے اس نے کسی کو آگاہ بھی نہیں کیا تھا، نہ کسی سے مشورہ ہوا تھا اور نہ ہی اس کی کسی کو خبر ہوئی تھی۔ صلح کے اس جھنڈے کو لہراتے دیکھ کر ایک طرف تو سب کو اس پر حیرت ہو رہی تھی اور دوسری طرف سب نے صلح کی اس پیش کش کو خوشی سے قبول کرلیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ موت کا خوف بہادر سے بہادر آدمی کو بھی ہلا دیتا ہے۔ قلعے کے اوپر صلح کا سفید جھنڈا لہرایا تو انگریزوں کی چھاؤنی میں ساری ننگی تلواریں نیام کے اندر چلی گئیں اور ان تلواروں کی جگہ ہاتھوں میں شراب کی بوتلیں آگئیں۔

شراب کا دور شروع ہوگیا۔ چھاؤنی کے اندر چاروں طرف زور دار قہقہے گونج رہے تھے۔ انگریز ایجنٹ ٹیوریںٹ اپنے خیمے میں بیٹھا تھا۔ اس کا دل اپنی فریبی چال کی کامیابی پر خوشی سے اچھل رہا تھا اور اسے اپنے آپ پر فخر محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اب انگریزوں کے لیے کوئی راستہ بند نہیں ہے۔ وہ جہاں چاہیں بے خوف وخطر جاسکتے ہیں۔ اب ان کے لیے سارا میدان ہی کھلا پڑا ہے۔

ابھی وہ اپنی کامیابی کا جشن منانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ فیروز شاہ کا سفیر صلح کا پیغام لے کر آگیا ہے یہ سن کر ٹیوریںٹ فخر یہ انداز میں مسکرایا اور حکم دیا کہ فیروز شاہ کے سفیر کو اس کے سامنے پیش کیا جائے۔

فیروز شاہ کے سفیر نے دستور کے مطابق سلام پیش کرنے کے بعد کہا۔ ”تیموری خاندان کے امیر نظام بخش کے شہزادے فیروز شاہ جو مندر کے ساتھ سار کے تخت پر ہمایوں شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوئے ہیں اور جن کی خدمت کا مجھے شرف حاصل ہوا ہے۔ ہمارے اس شہزادے نے صلح کا پیغام دینے کے لیے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اب آپ بتائیں صلح کے لیے آپ کی کیا شرائط ہیں؟ اس کے علاوہ اگر آپ کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں تو اس پیغام کو اپنے بادشاہ تک پہنچانے کے لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔“

فیروز شاہ کے سفیر کے منہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ میں تلوار کی کاٹ تھی۔ سفیر نے جس ادب واحترام میں فیروز شاہ کی شان میں قصیدہ پڑھا تھا اسے انگریز ایجنٹ نے انگریزوں کی بے عزتی سمجھا۔ ان کی نظروں میں تو فیروز شاہ صرف ایک باغی اور دنگے فساد کرنے والوں کا سردار تھا جب کہ اس سفیر اسے شہزادہ اور بادشاہ کہہ رہا تھا۔

ٹیوریںٹ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ غصے میں اپنی جگہ سے اٹھا اور گرج کر بولا۔ ”تم سب باغی ہو اور وہ باغیوں کا سردار ہے......تم جا کر اس سے کہہ دو کہ صلح کے لیے ہماری صرف ایک ہی شرط ہے کہ کسی شرط کے بغیر ہتھیار ڈال دو اور اگر تمہارے سردار نے یہ بات قبول نہیں کی تو اسے بتادو کہ یہ جنگ اسی طرح جاری رہے گی۔“ یہ کہہ کر ٹیوریںٹ بڑی تیزی

سے اپنے شامیانے کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔
فیروز شاہ کے سفیر کو انگریزوں کا یہ سلوک بہت ہی ناگوار گزرا تھا لیکن وہ خاموشی سے سننے کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتا تھا؟
فیروز شاہ کا سفیر سفید جھنڈا لیے واپس آ گیا اور قلعے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا۔ دوسری طرف انگریز اپنی چھاؤنی میں فیروز شاہ کی پسپائی اور متوقع شکست کا جشن منا رہے تھے۔ شراب کی بوتلیں کھل رہی تھیں اور خالی ہو رہی تھیں۔ نشہ ان پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا اسی دوران میں اچانک توپیں گرجنے لگیں۔ اپنے سفیر کے ذریعے انگریز ایجنٹ ٹیورینٹ کا جواب سننے کے بعد فیروز شاہ غصے میں سرخ ہو گیا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ قلعے کے اوپر سے ان کی چھاؤنی پر گولہ باری شروع کر دی جائے۔
اس حکم کے ساتھ ہی اس نے خود اپنے ہاتھوں سے صلح کے اس سفید جھنڈے کو آگ لگا دی جسے لے کر اس کا سفیر صلح کے لیے انگریز کی چھاؤنی میں گیا تھا۔
نشے میں چور، بدمست لڑکھڑاتے ہوئے انگریز سپاہی، جو اپنے پاؤں پر سیدھے کھڑے بھی نہیں ہو پا رہے تھے گھبرا گئے، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک یہ کیسی قیامت ان پر ٹوٹ پڑی ہے۔
اس بار فیروز شاہ نے ان کی بے خبری کا فائدہ اٹھا کر اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کا بدلہ لے لیا تھا۔ ڈگمگاتے اور لڑکھڑاتے انگریز سپاہیوں نے بڑی دیر بعد خود کو سنبھالا اور قلعے کی دیواروں پر توپ کے گولے برسا دیے۔ ساری رات دونوں طرف سے توپیں داغی جاتی رہیں۔
صبح سویرے انگریزوں سپاہیوں نے حلقے کی ایک پچھلی دیوار کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا دیکھا تو وہ سب قلعے کے اندر داخل ہونے کے لیے اسی طرف دوڑ گئے اور پھر اندر داخل ہونے لگے۔ انگریز ایجنٹ ٹورینٹ کا خیال تھا کہ ان کی گولا باری سے فیروز شاہ اور اس کے لشکر کو بھاری نقصان ہوا ہے۔ بہت سے سپاہی ہلاک ہو چکے ہیں اور بہت سے زخمی ہو کر اندر پڑے سسک رہے ہوں گے۔ یہی سوچ کر اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اندر جا کر فیروز شاہ کو گرفتار کر کے اس کے سامنے لے آئیں۔
لیکن انگریز سپاہی فیروز شاہ اور اس کے سپاہیوں کو گرفتار کرنے کے لیے لوہے کی جو بیڑیاں اپنے ساتھ لے کر گئے تھے وہ سب ان کے ہاتھوں میں ہی رہ گئیں۔ کیوں کہ قلعہ بالکل خالی پڑا تھا اندر صرف آزادی کا سبز جھنڈا لہرا رہا تھا۔ فیروز شاہ رات کو ہی توپوں کی گولا باری کی آڑ میں انگریزوں کی آنکھ میں دھول جھونک کر اور اس کا گھیرا توڑ کر اپنے پورے لشکر کے ساتھ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
انگریز سر پکڑ کر رہ گئے۔ انہیں حیرت ہو رہی تھی کہ فیروز شاہ اپنے پورے لشکر کے ساتھ فرار کیسے ہو گیا؟
اپنے دونوں ہاتھوں کو ملتا ہوا انگریز ایجنٹ ٹیورینٹ نے اپنا غصہ قلعے کی دیواروں پر اتارنا شروع کیا۔ اس نے خالی پڑے ہوئے قلعے کی ایک ایک اینٹ اکھاڑ کر پھینک دی اور اس کے بعد تو انگریز بھوکے کتوں کی طرف فیروز شاہ کے قدموں کے نشان سونگھتے ہوئے اس کا پیچھا کرتے رہے۔ فیروز شاہ کو ڈھونڈتے رہے۔ قلعے سے فرار ہونے کے بعد بھی فیروز شاہ نے اپنی جدوجہد جاری رکھی ہوئی تھی، وہ موقع پا کر انگریزوں کی فوج پر حملے بھی کر رہا تھا۔ وہ مندسار سے نکل کر راجپوتانہ کے ریتیلے میدانوں میں گھس گیا۔ تو کبھی مدھیہ پردیش کی گھاٹیوں میں تو کبھی وہاں کے انتہائی گھنے اور خطرناک جنگلات میں اپنا پڑاؤ ڈالا۔ کبھی راستے میں آنے والی اونچی نیچی پہاڑیوں پر چڑھتا اترتا رہا اور کبھی تو آگرہ اور لکھنؤ کی پر پیچ سڑکوں اور گلیوں میں اس کی بھاگ دوڑ جاری رہی۔ ہر جگہ اور ہر طرف سے فیروز شاہ کی چھاپہ مار کارروائیاں جاری تھیں۔ اور انگریزوں کے لیے اس بات کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہو گیا تھا کہ فیروز شاہ کی اگلی کارروائی کب اور کہاں ہو سکتی ہے۔
فیروز شاہ کی غیر متوقع کارروائیوں اور اس کے حملوں کو روکنے کے لیے انگریزوں نے اپنی فوجی طاقت کو بھی کئی حصوں میں تقسیم کر کے مختلف سمتوں

میں تعینات کر دیا تھا، لیکن جہاں جہاں بھی آزادی
کے متوالوں سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی ہے وہاں وہاں انہیں
پسپائی کے ساتھ ساتھ اپنی لاشیں بھی اٹھانا پڑی ہیں۔

فیروز شاہ ہر بار چھلاوے کی طرح ان کا گھیراؤ توڑ
کر نکل جاتا تھا اور انگریزوں کی ساری حکمت عملی دھری
کی دھری رہ جاتی تھی۔ فیروز شاہ انگریزوں کے لیے
خوف و دہشت کی علامت بن چکا تھا اور انگریز یہ سمجھتے
تھے کہ جب تک فیروز شاہ ان کے ہاتھوں مارا نہیں جاتا
اس وقت تک وہ ہندوستان کی سرزمین پر بے خوف و خطر
رہ نہیں سکتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے کتے ہر جگہ فیروز شاہ
کی بو سونگھتے پھر رہے تھے لیکن فیروز شاہ ان کی چالاکی
اور مکاری سے غافل نہیں تھا۔ وہ انہیں اپنے پیچھے بھگاتا
اور تھکا تھکا کر مارتا رہا۔ انگریز چوہے بلی کے اس کھیل
سے بری طرح تنگ آگئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جلد
سے جلد اس کھیل کا خاتمہ ہو جائے مگر فیروز شاہ ان کے
ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ اس کی پھرتی ہوشیاری اور کام
یاب چھاپے مار کارروائیوں سے تو یوں لگ رہا تھا جیسے
اس نے انگریزوں کے ہاتھ زندہ حالت میں نہ آنے کی
قسم کھا رکھی ہے۔ وہ انتہائی مہارت سے اپنا داؤ کھیلتا اور
انگریز فوجیوں کو جانی نقصان پہنچا کر غائب ہو جاتا تھا۔

آزادی کے لیے لڑی جانے والی اس جنگ
میں فیروز شاہ کو صرف اپنے جاں نثار ساتھیوں کی ہی
مدد حاصل نہیں تھی بلکہ بے شمار محب وطن ہندو اور
مسلمان عورتوں کی نیک تمنائیں اور دعائیں بھی اسے
حاصل تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ انگریزوں کو ہر محاذ پر
ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔

مکار اور چالاک انگریزوں نے جب یہ سمجھ لیا
کہ فیروز شاہ زندہ یا مردہ ان کے ہاتھ نہیں لگے تو
انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی طرح فیروز شاہ کی بیگم کو
گرفتار کر لیا جائے تاکہ اپنی بیگم کی عزت اور اس کی
جان بچانے کے لیے فیروز شاہ خود کو انگریزوں کے
حوالے کر دے۔ اپنے اس ناپاک منصوبے کی تکمیل
کے لیے انہوں نے اپنے مخبر دوڑا دیے اور پھر جلد ہی
انہیں پتا چل گیا کہ فیروز شاہ کی بیگم مندسار کے ایک
گاؤں میں موجود ہے۔ لیکن انگریز گاؤں کی سیکڑوں
عورتوں میں فیروز شاہ کی بیگم کو شناخت نہیں کر سکے اور
اس طرح مندسار کی عورتوں نے بھی انگریزوں کے
عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ اس دوران فیروز شاہ کو بھی
معلوم ہو گیا تھا کہ اسے گرفتار کرنے کے لیے انگریز
اس کی بیگم کو چارہ بنانے کی کوشش کریں گے اور اسی
لیے اس نے اپنی بیگم کو مندسار کے علاقے سے نکال
لی اور بیگم کو اپنے ساتھ ساتھ رکھنے لگا۔ کبھی کھلے
میدانوں میں کبھی جنگلوں اور کبھی کبھی دریاؤں میں،
جہاں جہاں بھی فیروز شاہ کی چھاپہ مار کارروائیاں
ہوتی تھیں اس کی بیگم بھی اس کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔

فیروز شاہ انتہائی نیک، عبادت گزار اور اصول
پرست انسان تھا۔ وہ اگر چاہتا تو جنگ وجدل کے
ماحول سے دور رہ کر ایک شاہانہ زندگی گزار سکتا تھا۔
اس کے پاس اتنی قابلیت اور صلاحیت تھی کہ وہ اپنی
خاندانی جاگیر پر آرام سے حکمرانی کر سکتا تھا۔ لیکن
اس نے تمام دنیاوی عیش وعشرت کو ابتدا ہی سے ٹھوکر
مار رکھی تھی۔ وہ شاہی آداب والقاب کو پسند نہیں کرتا
تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے شہزادہ کہہ کر پکارا
جائے۔ وہ شروع ہی سے سادگی پسند تھا۔ عام غریب
لوگوں کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا اسے اچھا
لگتا تھا۔ وہ اونچ نیچ اور ذات پات کا قائل نہیں تھا۔
اس کی نظر میں ہر شخص برابر تھا، خواہ اس کا تعلق کسی بھی
مذہب سے ہو۔ اس کے دل میں ہر مذہب کے لوگوں
کا پورا پورا احترام موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جس
گاؤں اور جس شہر میں بھی چند دنوں کے لیے ٹھہرا
وہاں کے رہنے والوں نے اس کے ساتھ پورا پورا
تعاون کیا۔ فیروز شاہ اور اس کے جاں نثار ساتھیوں
کے کھانے پینے سے لے کر ان کی حفاظت کی ذمے
داری بھی انہوں نے سنبھالی تھی۔

فیروز شاہ اپنے وطن کے لوگوں کو انگریزوں کا غلام
بنانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے وطن کے لوگ
اپنے آزاد وطن میں آزادی کی زندگی گزاریں۔ اسی لیے
جہاں جہاں اور جس جس جگہ سے بھی آزادی کے نعرے

خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے مقبول ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
شہرِ دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
تیکے دا تماشا	شازیہ چوہدری	300/-
ہم سفر	فرحت اشتیاق	400/-
بن روئے آنسو	فرحت اشتیاق	300/-
متاعِ جاں ہے تو	فرحت اشتیاق	500/-
دل وادیس	ثمرہ بخاری	350/-
ہستی کا آہنگ	ثمرہ بخاری	300/-
وہ خبطی سی دیوانی سی	آسیہ سلیم قریشی	600/-
آرزو نکھر آئی	آسیہ سلیم قریشی	500/-
ایمان، امید اور محبت	عمیرہ احمد	300/-
لاحاصل	عمیرہ احمد	300/-
امربیل	عمیرہ احمد	750/-
اک دیا جلائے رکھنا	ماہا ملک	350/-
جو چلے تو جاں سے گزر گئے	ماہا ملک	250/-
میرے خواب ریزہ ریزہ	ماہا ملک	350/-
موسم تھا بے قرار	فریدہ اشفاق	300/-
دل اسے ڈھونڈ لایا ہے	آسیہ رزاقی	350/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	600/-
اجالوں کی بستی	فائزہ جبیں	400/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	300/-
مصحف	نمرہ احمد	450/-
میں عبد قادر ہوں	ثروت نذیر	300/-
اے وقت گواہی دے	راحت جبیں	350/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	500/-
رنگ، خوشبو، ہوا، بادل	افشاں آفریدی	500/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	550/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	300/-
میرے خواب لوٹا دو	نگہت عبداللہ	400/-

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	300/-
بساطِ دل بھی عجب شہر ہے	افشاں آفریدی	400/-
حسابِ دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
دستِ مسیحا	نگہت سیما	400/-
دل پھولوں کی بستی	نگہت عبداللہ	600/-
کوئی لمحہ گلاب ہو	نگہت عبداللہ	500/-
تو شریکِ سفر رہا	نسیم سحر قریشی	400/-
میرے دل، میرے مسافر	نسیم سحر قریشی	400/-
ستاروں کا آنگن	نسیم سحر قریشی	450/-
ڈھلے چاند دل کے پار	ثمرہ بخاری	350/-
دل ایک شہرِ جنوں	آسیہ مرزا	500/-
تیری راہ میں رُل گئی وے	میمونہ خورشید علی	300/-
وہ جو قرض رکھتے تھے	فرحت اشتیاق	300/-
دل سے نکلے ہیں جو الفاظ	فرحت اشتیاق	300/-
میرے ہمدم، میرے دوست	فرحت اشتیاق	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-
کسی راستے کی تلاش میں	میمونہ خورشید علی	350/-
تم آخری جزیرہ ہو	آمنہ ریاض	200/-
اماوس کا چاند	بشریٰ سعید	200/-
شب گزیدہ	عنیزہ سید	200/-
ریگ زارِ تمنا	ماہا ملک	600/-
بکھر نہ جائے خواب	آسیہ رزاقی	200/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شکستِ آرزو	حمیدہ کاشمیری	75/-
بساطِ دل	آمنہ ریاض	750/-
ستارہ شام	آمنہ ریاض	500/-
برگِ گل	ایم سلطانہ فخر	500/-
زرد زمانوں کا سویرا	نبیلہ ابر راجہ	200/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32735021

بلند ہوئے اس اس جگہ پر وہ ان نعروں میں اپنی آواز شامل کرنے کے لیے دوڑتا چلا گیا...... اس کے جذبہ جہاد، جنگی حکمت عملی، اس کی قیادت اس کی ہمت، محنت اور وطن کی آزادی کی لگن نے جہاں جھانسی کی رانی لکشمی بائی نانا صاحب پیشوا اور تانتیا جیسے لوگوں کو حیرت زدہ کر رکھا تھا۔ وہاں اس کے نام کی دہشت نے انگریزوں کی پتلونیں ڈھیلی کردی تھیں۔ انہوں نے فیروز شاہ کی چھاپہ مار کارروائیوں کے ڈر سے راتوں کو سونا بھی کم کردیا تھا۔ فیروز شاہ اب ایک آسیب بن کر ان کے ذہنوں پر سوار ہوچکا تھا۔

فیروز شاہ کو جتنی نفرت انگریزوں سے تھی، اس سے بھی زیادہ نفرت اسے انسانوں کا خون بہانے سے بھی تھی۔ اس کے فولادی سینے میں موم کا دل تھا جو کسی بھی معصوم بے گناہ انسان کا خون دیکھ کر کانپ اٹھتا تھا۔ اسے اپنے لشکر کے ان سپاہیوں سے بھی نفرت تھی جو آزادی کی جنگ کے نام سے لڑی جانے والی لڑائی میں اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کے مرتکب ہورہے تھے۔ ان سب کو فیروز شاہ کی تاکید تھی کہ سوائے دشمن کے سپاہیوں کے کسی بے گناہ شہری پر تلوار نہ اٹھائی جائے۔ چاہے وہ انگریز ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن جوش اور غصے کی رو میں بہہ کر وہ انگریزوں کی عورتوں اور بچوں تک کو قتل کرنے لگے تھے جو فیروز شاہ کی نظر میں انسانیت کا قتل تھا۔

آزادی کی اس بھرپور جنگ کے درمیان میں جب اسے یہ خبر ملی کہ کان پور دہلی اور اس طرح کے دوسرے شہروں میں خود اس کے سپاہی اور دیگر شرپسندوں نے انگریزوں کے گھروں کو لوٹنا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو تشدد کا نشانہ بنانا شروع کردیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اس نے آزادی کے متوالوں کو بھی اس کی اجازت نہیں دی تھی لیکن اس کے منع کرنے کے باوجود لوٹ مار اور بے گناہ معصوم لوگوں کے قتل عام کا سلسلہ جاری رہا۔ تو اسے لگنے لگا کہ جب اس کے لوگوں کے دلوں سے انسانیت ہی ختم ہوگئی ہے تو آزادی حاصل کرکے بھی کیا فائدہ ہوگا؟

عورتیں اور دودھ پیتے بچوں کا قتل عام، لوٹ مار کی بڑھتی ہوئی وارداتیں اور جگہ جگہ ہونے والے درندگی کے واقعات، انسانیت کے بہتے ہوئے خون پر دن رات ہونے والا یہ ماتم، آزادی کی جدوجہد کے لیے بڑا ہی کم نصیب ثابت ہوا اور ناامیدی کے نام سے ہمیشہ ناآشنا رہنے والا فیروز شاہ اب مایوسی اور ناامیدی کے اندھیروں میں بھٹکنے لگا تھا۔ اسے اب امید کی ایک بھی کرن نظر نہیں آرہی تھی۔ وقت اور حالات اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے اور انگریزوں کو اپنی دھرتی پر سے نکال دینے کا جو خواب اس نے دیکھا تھا وہ خوب پورا ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن پھر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس کے حملے جاری رہے۔ کبھی کبھی اس کا ہاتھ انگریزوں پر بھاری پڑجاتا تو انگریز فوجیوں کے لیے اپنے ساتھیوں کی لاشیں اٹھانا دوبھر ہوجاتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو انگریزوں کا ایسا داؤ پڑجاتا کہ فیروز شاہ کافی جانی نقصان اٹھاکر بھاگنا پڑتا تھا۔

حملے ہوتے رہے۔ دھرتی لہو پیتی رہی۔ گھوڑے ایک جگہ سے دوسری جگہ سرپٹ دوڑتے رہے اور دن گزرتے رہے اور انگریز فیروز شاہ کا تعاقب کرتے رہے۔

فیروز شاہ کو اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ جب تک ہندوستان کی دوسری بڑی طاقتیں متحد ہوکر انگریزوں کے مقابلے پر نہیں آئیں گی اس وقت تک انہیں مار بھگانا آسان نہیں ہوگا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ محب وطن لوگوں کے ساتھ ساتھ غدار وطن کی بھی یہاں کمی نہیں ہے اور یہی سوچنے کے بعد اسے لگنے لگا تھا کہ آزادی کے لیے لڑی جانے والی اس جنگ میں وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اکیلا ہی کھڑا ہے۔

دن گزرتے رہے، گھوڑے سرپٹ دوڑتے رہے، تلواریں ٹکراتی رہیں اور لاشیں گرتی رہیں لیکن انگریزوں نے فیروز شاہ کا تعاقب نہیں چھوڑا۔ انہوں نے اس کی گرفتاری کے لیے اپنا دباؤ بڑھا دیا تھا۔ انگریز ایجنٹ ٹیوریٹ کی تو سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ فیروز شاہ کو زندہ لوہے کی بیڑیوں میں

بڑا ہو اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا تھا۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ اور دوسری سے تیسری جگہ بغیر آرام کے اور بغیر کہیں ستائے ہر جگہ لڑتے لڑاتے اور بھاگتے بھاگتے، فیروز شاہ اور اس کے جاں نثار ساتھی بری طرح تھک چکے تھے اور ان کے گھوڑے بھی سست پڑنے لگے تھے۔ بھاگ دوڑ کے اس نہ ختم ہونے والے سلسلے میں فیروز شاہ کے وفادار ساتھی بھی ایک ایک کر کے بچھڑتے جارہے تھے۔ اس کے بیش تر ساتھی تو انگریزوں کے ساتھ جگہ جگہ ہونے والی مڈبھیڑ میں شہید ہو چکے تھے اور اس کے لشکر کے بہت سارے ساتھی انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار بھی ہوئے تھے۔ فیروز کی لشکری طاقت بہت کم ہوگئی تھی لیکن فیروز کم زور پڑ جانے کے باوجود انگریزوں کے قبضے میں نہیں آیا تھا۔ لیکن کب تک؟ اور آخر کار وہ وقت بھی آگیا جب فیروز شاہ کو اس بات کا پکا یقین ہوگیا کہ اب بازی اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے اور وہ آزادی کی اس جنگ میں بالکل تنہا اور بے یار مددگار رہ گیا ہے۔

انگریزوں نے اس کے راستوں میں ہر جگہ کانٹے بچھادیے تھے۔ ان کے مخبر کتوں کی طرح چاروں طرف اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ ایسے حالات میں مغل خاندان کے اس بہادر شہزادے کو اپنے ہتھیار پھینک کر اپنی بیگم کے ساتھ بھکاریوں کے بھیس میں چھپ کر ادھر اسے ادھر بھاگنا پڑ رہا تھا۔ اگر اس وقت زمانی بیگم اس کے ساتھ نہ ہوتی تو شاید اکیلا ہونے کے باوجود وہ تلوار اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑتا۔ مصیبتیں ایک ایک کر کے بڑھتی جارہی تھیں۔ پریشانیاں اور الجھنیں جان چھوڑتی نظر نہیں آرہی تھیں۔ پائی پائی کے لیے محتاجی کا سامنا تھا۔ ان دونوں کے لیے اب پیٹ کے گڑھے کو بھرنا بھی مشکل ہوگیا تھا لیکن اس کے باوجود فیروز شاہ کسی ایک جگہ بہت زیادہ دنوں تک نہیں ٹھیرا اور مسلسل ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک شہر سے دوسرے شہر دوڑتا رہا۔ لیکن کہیں بھی اسے اتنی مدد نہیں ملی کہ وہ انگریز فوج کا مقابلہ کرسکتا۔

انگریزوں پر حملے ہونے بند ہو چکے تھے اس لیے انگریزوں نے سمجھ لیا تھا کہ فیروز شاہ نے پسپائی اختیار کرلی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے انگریز ایجنٹ نیوریںٹ نے ہر جگہ اپنے مخبر لگا رہے تھے جب کہ فیروز شاہ کی بھاگ دوڑ بدستور جاری تھی۔ کیوں کہ وہ انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر ان کے قدموں میں اپنا سر جھکانا نہیں چاہتا تھا۔ انگریزوں کے آگے سر جھکانا اس کی نظر میں سب سے بڑی ذلت تھی اور اس ذلت اور رسوائی کو وہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

لیکن انگریز بھی تھک کر ہار ماننے والے نہیں تھے وہ صرف اور صرف یہ چاہتے تھے کہ فیروز شاہ جیسا ان کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ خطرناک دشمن اگر ان کے ہاتھوں مارا گیا یا ان کے قبضے میں آگیا تو پھر چھوٹے چھوٹے دشمن ان کے راستے میں آنے ہمت نہیں کریں گے۔ انہیں اس بات کا پورا یقین بھی تھا کہ آج نہیں تو کل فیروز شاہ کی تنی ہوئی گردن ان کے قدموں میں جھکی ہوئی ہوگی اور اسی لیے ان کی چوکنا نظریں اسے اندھیرے میں بھی ڈھونڈ رہی تھیں۔

فیروز شاہ کے ساتھ جب تک اس کے ساتھیوں کی طاقت تھی اور اس کا حوصلہ جوان تھا اس وقت تک اس نے انگریزوں کو کہیں چین لینے نہیں دیا۔ لیکن اب اس میں وہ پہلے جیسا دم خم نہیں تھا۔ اب اسے مجبوراً بھیس پر بھیس بدل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچ کر چھپنا پڑتا تھا۔ اب وہ بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ اسی حالت میں اسے اپنی بیگم کو بھی سنبھالنا پڑ رہا تھا کوئی ساتھی، کوئی ہمدرد اور کوئی مددگار نہیں تھا۔ وہ سرحد سے نکل کر پہلے وقندھار گیا لیکن وہاں بھی اس نے خود کو محفوظ نہیں سمجھا۔ اس لیے وہ پھر بھیس بدل کر قندھار سے نکل کر بخارا پہنچ گیا اور پھر وہ تہران پہنچ گیا۔ لیکن ہر جگہ اس کے لیے اجنبی تھی۔ ہر چہرہ ناآشنا تھا۔ ہندوستان کے حالات خراب تھے۔ وہاں سے کوئی

امید افزا خبر اسے نہیں ملی تو وہ افغانستان چلا گیا اور اس طرح وہ برسوں تک ایک جگہ سے دوسری اور تیسری جگہ بھٹکتا رہا۔ لیکن اس کے نام کا خوف ابھی تک انگریزوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ فیروز شاہ کو گرفتار تو کیا اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکے تھے۔ اسی لیے انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ فیروز شاہ کسی بھی وقت آندھی طوفان بن کر ان پر ٹوٹ پڑے گا۔ اسی لیے وہ ہر وقت چوکنا اور ہوشیار رہنے کے عادی ہو چکے تھے۔ فیروز شاہ کے ڈر اور خوف نے ابھی تک ان کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اتنا لمبا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی انہوں نے سرحدوں پر سے اپنے مخبر کو نہیں ہٹایا تھا بلکہ انہوں نے تو سرحدوں کی نگرانی پہلے سے زیادہ سخت کر دی تھی۔ فیروز شاہ کی صحت اب جواب دے چکی تھی۔ وہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا۔ اس کی ایک آنکھ کی روشنی بھی چلی گئی تھی اور بائیں پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے اس کے لیے چلنا پھرنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ زمانی بیگم نے قدم قدم پر اس کا ساتھ دیا اور ہر جگہ اس کا خیال رکھنے کی پوری پوری کوشش کی تھی لیکن مفلسی، مجبوری، لاشاری بے وطنی کی نت نئی الجھنوں نے اس کی صحت پر بھی برا اثر ڈالا تھا۔ پھر بھی وہ فیروز شاہ کی دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی تھی۔

افغانستان میں بھی جب ان کا رہنا مشکل ہو گیا تو فیروز شاہ اپنی بیگم کو لے کر مکہ چلا گیا۔ مکہ میں اس نے جیسے تیسے ڈھائی برس گزارے۔ اس دوران میں اس نے ہندستان میں اپنے ہم دردوں اور ہم خیال ساتھیوں سے رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر کہیں سے بھی اسے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آئی اور اسی ناامیدی اور محرومی کی حالت میں مکہ میں ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد انسانیت نے ایک بار پھر ماتم کیا سوگ منایا۔

فیروز شاہ کی موت کے بعد اس کی بیوہ سلطان زمانی بیگم اس اجنبی شہر میں اس قدر تنگ دست اور لاچار ہو گئی کہ لوگوں کے دیے ہوئے باس روٹی کے ٹکڑوں سے اسے اپنا پیٹ بھرنا پڑتا تھا۔

اور پھر ایک دن شاہی مغل خاندان کی اس بیوہ بہو سلطان زمانی بیگم کو اپنی پنشن کے لیے انگریز حکومت کو درخواست دینا پڑی۔ زمانی بیگم کی انگریزوں سے یہ درخواست بھی تاریخ کا ایک المیہ ہی تو ہے کہ جس فیروز شاہ نے جیتے جی انگریزوں کے آگے کسی بھی حالت میں اپنا سر نہیں جھکایا تھا اسی فیروز شاہ کی بیگم کو شوہر کی موت کے بعد آخر اس ذلت کا منہ دیکھنا ہی پڑا جس سے فیروز شاہ کو شدید نفرت تھی اور یہ نفرت فیروز شاہ کے دل میں اپنی زندگی کی آخری سانس لیتے وقت بھی اسی طرح موجود تھی۔

وقت کی یہ بدلی ہوئی چال بھی کتنی عجیب چال تھی کہ بیماری، مفلسی اور تنگ دستی کے ہاتھوں بے یار و مددگار ہو کر فیروز شاہ جیسے بہادر شہزادے کی بیوہ کو اپنی گزر اوقات کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے شوہر اپنی رعایا اور اپنے وطن کے دشمن سے مدد کی درخواست کرنا پڑ رہی تھی۔

لیکن قسمت کی ایک اور ستم ظریفی بھی دیکھیے کہ انگریز حکومت نے تین برس تک سلطان زمانی کی بیگم کی درخواست پر کوئی توجہ نہیں دی اور پھر تین برس اس درخواست پر انہوں نے غور کیا اور سلطان زمانی بیگم کے لیے پانچ روپے ماہانہ پنشن کی منظوری دے دی۔

ظالم انگریزوں نے فیروز کی بیوہ کی درخواست کا بہت مذاق اڑایا تھا۔ ماہانہ پانچ روپے کی پنشن منظور کر کے انہوں نے ایسے وحشیانہ قہقہے لگائے کہ ان قہقہوں کی گونج سے مغل بادشاہوں اور شہنشاہوں کی بنائی ہوئی شان دار اور عظیم الشان عمارتیں ہلتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اس کے بعد تو انگریزوں کے وہ بھیانک قہقہے صدیوں تک شاہی محلات کی اونچی اونچی دیواروں سے ٹکراتے رہے اور انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

☆☆